برگِ گُل

ایم سُلطانہ فخر

آتے جاڑوں کی رُت تھی۔

ایسا موسم کہ کبھی ٹھنڈ سی محسوس ہونے لگتی اور کبھی گرمی۔

ائیر کنڈیشنڈ خوابگاہ کے دروازے کھڑکیاں گو بند تھیں مگر مغربی سمت کی کھڑکیوں کے پردے سمٹے ہوئے تھے اور شیشوں کی رکاوٹ میں پار کرتی ہوئی ڈھلتی ہوئی سہ پہر کی نیم جان اور سنہری دھوپ اپنے پُرشکوہ ڈبل بیڈ پر بیٹھی بیگم زینت شعیب کے پیروں میں لوٹ رہی تھی۔

بیگم زینت شعیب فربہی مائل جسم۔

کھِلتی ہوئی گندمی رنگت۔ فربہی کی وجہ سے بھرے بھرے پُرگوشت گالوں پر دبی ہوئی کھڑی کھڑی سی ناک۔

لپ اسٹک کے نیچے سے شدت سے رنگے پتلے پتلے ہونٹوں، چھوٹے سے دہانے، غلافی پپوٹوں اور طویل جبین یعنی دوہری ٹھوڑی کے ساتھ، مجموعی طور پر ڈھلتی ہوئی عمر میں بھی قبول صورت نظر آرہی تھیں۔

ان کے گھونگھریالے ترشیدہ اور بوب کٹ سے، رنگے ہوئے سرخی مائل براؤن بال گیلے ہونے کی وجہ سے دونوں شانوں پر اور پیچھے کی طرف بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ سیاہ بارڈر والے ہلکے جیمنی رنگ کی ساڑھی میں ملبوس ایک کھلا ہوا خط ہاتھ میں لیے وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق تھیں کہ دفعتاً خوابگاہ کے غسل خانے کا دروازہ کھلا اور ان کے دراز قامت اور خوش شکل شوہر شعیب منصور ڈارک کلر کے باتھ گاؤن میں ملبوس تولیے سے اپنے گیلے بال پونچھتے ہوئے برآمد ہوئے۔ وہ چند گھنٹے قبل ہی اپنے کسی کاروباری دورے سے واپس لوٹے تھے۔ غسل خانے سے باہر آتے ہی انہوں نے بیوی پر ایک نظر ڈال کر پوچھا۔

"کیا تم نے اس خط کو ابھی تک پڑھا نہیں؟"

زینت اپنی محویت سے چونک کر قدرے اُلجھے ہوئے انداز میں بولیں۔

"نہیں، پڑھ تو لیا ہے مگر بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔"

"کیوں کیا لاطینی یا کوئی غیر ملکی زبان استعمال کی گئی ہے۔ اس خط میں جو تمہاری سمجھ سے بالاتر ہے۔" شعیب منصور نے بال پونچھتے پونچھتے ہاتھ روک کر پوچھا۔ پھر تولیے کو جھٹکتے ہوئے غسل خانے میں چلے گئے اور تولیے کو اسٹینڈ پر ڈال کر واپس

چلتے ہوئے انہوں نے کہا۔
"بھئی صاف اور سیدھی سی بات ہے۔ فاخرہ بی بی نے سلوطا کے معاملے کو صیغۂ راز میں رکھنے کی تاکید کی ہے اور بس۔"
شوہر کی بات پر زینت نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔
"مگر یہی راز واز میں رکھنے کی بات تو میری سمجھ میں نہیں آئی کہ آخر اس قدر اس لڑکی کو چھپانے سے فائدہ ہی کیا ہوگا۔ دیکھیں نا جب چاند چہرہ چھپاتا ہے تو کل عالم اسے دیکھتا ہے پھر سلوطا کا معاملہ تو ——"
"اوہو تو اتنی باریکیوں میں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ جب فاخرہ بی بی نے ایسا ہی لکھا ہے تو اس کے پیچھے بھی ان کی کوئی مصلحت ہی پوشیدہ ہوگی۔" شعیب منصور قدرے چڑ کر بولے۔
"واہ عجیب مصلحت ہے۔" زینت نے گردن نیہوڑا کر گویا چٹکی لی۔
"عجیب ہو یا غریب اس سے ہمیں یا تمہیں کیا غرض۔ انہوں نے تاکید نہیں ایک طرح کی درخواست کی ہے تو ہم پر بھی یہ لازم ہے کہ ان کی بات کا تھوڑا بہت پاس ضرور رکھیں اور اس سے ہمارا گھٹ بھی کیا جائے گا۔"
شعیب منصور نے ابھی بات ختم ہی کی تھی کہ صدر دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور اس کے ساتھ ہی ملازم نے چائے لانے کی اطلاع دی تو شعیب منصور جلدی سے لباس تبدیل کرنے غسل خانے میں چلے گئے۔ اجازت ملنے پر ملازم چائے کی ٹرالی لیے اندر داخل ہوا اور زینت کے آگے رکھ کر ابھی وہ واپس جانے لگا تو زینت نے ٹرالی کا ایک جائزہ لے کر پوچھا۔
"یہ چائے لانے سے پہلے تم نے اچھی طرح چیک بھی کر لیا تھا کہ خانساماں نے کیسی بنائی ہے۔"
"جی بیگم صاحب! ہم نے خود اپنے ہاتھ سے صاحب کے لیے یہ چائے دم کیا ہے۔ بڑا اسٹرونگ قسم کا بنایا ہے۔" ملازم اپنی فوقیت جتانے کی غرض سے دانتوں کی نمائش کرتا ہوا بولا۔
"اچھا ٹھیک ہے۔ خانساماں پر نظر رکھا کرو۔ نیا اور اجنبی آدمی ہے۔" انہوں نے کہا تو ملازم "جی بہتر ہے" کہتا ہوا کمرے سے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد شعیب منصور آف وائٹ سلکن کرتے پاجامے میں ملبوس غسل خانے سے برآمد ہوئے اور سامنے دیوار پر لگے خوبصورت ریک پر رکھا اپنا پائپ اٹھا کر ریک سے اس میں تمباکو بھرتے ہوئے بولے۔
"کیا پرانے خانساماں کو نکال دیا ہے جو نئے خانساماں کو رکھنے کی ضرورت پڑ گئی؟"
"میں نے تو نہیں نکالا بلکہ وہ خود ہی نکل گئے۔ روٹیاں جو اتنی پکی تھیں یا نہیں۔ ایک تو ان کے دماغ بہت ہو گئے تھے دوسرے مہینے بھر کا راشن آٹھ دن میں ختم۔ وہ تو مالی اور دربان نے ہی ایک دن ان کی چوری پکڑ لی۔ ایک دکان پر بیچ رہے تھے چاول اسی بات پر میں نے انہیں چیک کیا تو سامان اٹھا کر بلا نوٹس ہی غائب ہو گئے۔" زینت نے خانساماں کے جانے کی تفصیل بتائی۔
"ہوں۔ اصل میں خاتونِ خانہ کی بے توجہی اور غفلت سے یہ ملازمین بہت فائدہ اٹھاتے ہیں ورنہ ——"
"لیکن میں ان خواتین میں سے نہیں ہوں۔ جنہیں ہر وقت اپنے بناؤ سنگھار اور سیر و تفریح کی ہی پڑی رہتی ہے۔ میں مشغول ضرور ہوں اور ہر ایکٹیویٹی میں حصہ بھی لیتی ہوں۔ مگر گھریلو امور سے کبھی غافل نہیں رہتی۔ اور یہی تربیت میں نے اپنی بچیوں کو بھی دی ہے۔ اور آپ کو بھی یہ بات اچھی طرح معلوم ہے۔" زینت نے شوہر کی بات کو طنز پر محمول کرتے ہوئے اچھا خاصا لیکچر جھاڑ دیا۔
"ہاں ہاں بھئی، تمہاری اس خوبی کے تو ہم دل سے معترف ہیں۔ اور تمہاری انہی خوبیوں سے مرعوب ہو کر تو تم سے شادی کی تھی۔" پائپ کو لائٹر کا شعلہ دکھانے کے بعد دو تین لمبے لمبے کش لے کر شعیب منصور نے بیڈ کا رخ کرتے ہوئے کہا۔
"لیکن یاد رہے کہ ہماری ارینج میرج ہوئی تھی لو میرج نہیں۔ پھر بھلا آپ میرے اندر چھپی خوبیوں سے کیونکر مرعوب ہو سکتے تھے۔" زینت نے شوہر کی بات کو استہزا پر محمول کیا۔
"اپنے دل سے دل کو راہ ہوتی ہے نا بیگم اور دل کی آنکھیں ان ظاہری آنکھوں سے کہیں تیز ہوتی ہیں۔ سو ہم نے انہی کے ذریعے تمہارے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں کا اندازہ لگا لیا تھا۔" شعیب منصور نے بیڈ پر تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے کہا تو زینت نے کچھ کہنے کے بجائے اٹھلا کر ان کی طرف دیکھا۔ اور پھر ٹی کوزی ہٹا کر ٹی پاٹ سے پیالی میں چائے انڈیلنے لگیں۔
"پہلے چائے پی لیں پھر یہ نگوڑا پائپ کا زہر بھرا دھواں پھیپھڑوں میں اتار دیجئے گا۔" زینت شوہر کی تمباکو نوشی کی عادت سے سخت نالاں تھیں۔ انہوں نے چائے کی پیالی ان کی طرف بڑھاتے ہوئے قدرے ناگواری سے کہا۔
"اسے سب چلتا ہے زینت بیگم! اب آپ کے کہنے پر سگریٹ کے بجائے ہم نے یہ پائپ پینا شروع کر دیا ہے۔ تو آپ کو اس پر بھی اعتراض ہے۔" شعیب منصور نے ان کے ہاتھ سے چائے کی پیالی لے کر لاپرواہی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"اور یہ سگریٹ پینا یا پائپ پینا بات ایک ہی ہوئی۔ گویا کسی نہ کسی صورت میں تمباکو کو منہ لگانا۔" زینت اپنی پیالی میں چینی گھولتی ہوئی ہونٹوں کو ٹیڑھا کر کے بولیں۔ شعیب منصور خاموشی سے چائے پیتے رہے۔
"کمال ہے سگی بھتیجی کی شادی ہے اور ہمارا تو گویا یہ پہلا کاج ہے۔ پھر بھی آپ کی پھوپھی نے خود آنے کے بجائے اپنی نند کو بھیج دیا۔ وہ بھی اتنی نصیحتوں اور فضیحتوں کے ساتھ۔" زینت چائے کا گھونٹ حلق سے اتار کر خود ہی بولیں۔
"لیکن اور باتوں کے ساتھ انہوں نے اپنی مجبوری بھی تو ظاہر کر دی ہے کہ ثاقب انہیں اپنے ساتھ ورلڈ ٹور پر لے جا رہے ہیں۔ پھر بھلا وہ کیسے ہماری بیٹی کی شادی میں شریک ہو سکتی ہیں۔" شعیب منصور نے بہن کی طرف سے صفائی پیش کی تو زینت نے طنز سے کہا۔
"جی ہاں، جب ہی تو انہوں نے سلوطا کو اپنا ریپریزنٹیٹو (نمائندہ) بنا کر یہاں بھیج دیا ہے۔"
"چلو اگر بھیج بھی دیا ہے تو اس میں بھی ان کی کوئی مصلحت ہی ہوگی۔ میرا مطلب ہے کہ ان دونوں میاں بیوی کے جانے کے بعد سلوطا تنہا وہاں رہ بھی تو نہیں سکتی تھی۔"
"اونہہ — ہر بات میں مصلحت ہی مصلحت۔ کیا بات بات میں مصلحت برتنا فاخرہ کی کوئی حکمتِ عملی ہے۔" زینت جلے کٹے انداز میں بولیں۔
"ممکن ہے کہ حکمت عملی ہی ہو لیکن تمہیں اس بات پر اس قدر معترض نہیں ہونا چاہیے۔ آجکل تو یوں بھی تمہارے گھر مہمانداری کا سلسلہ چل رہا ہے۔ سلوطا کی دو روٹیاں تم پر بھاری تو نہیں ہوں گی۔" شعیب منصور بیوی کے جلے کٹے انداز پر چڑ کر بولے۔
"کیا آپ کے خیال میں، میں کوئی گری پڑی ہوں جو سلوطا کی دو روٹیاں بھاری سمجھوں گی۔ میرے تو سان و گمان میں بھی ایسا کبھی خیال کبھی نہیں آیا۔ میں تو صرف اس خیال سے کہہ رہی تھی کہ میرے نزدیک تو یہ کوئی معیوب بات نہیں جس کی فاخرہ اتنی پردہ پوشی کرنا چاہ رہی ہیں۔" زینت چیں بہ جبیں سی کیفیت میں بولیں۔
"تمہارے خیال میں نہ سہی لیکن فاخرہ بی بی کے خیال میں تو ہے۔ بلکہ بہت ممکن ہے کہ خود سلوطا ہی پسند نہ کرتی ہو۔ اور اس نے فاخرہ بی بی کو یہ سب لکھنے پر مجبور کیا ہو۔" شعیب منصور بیوی کے سامنے چھوٹی بہن کو ہمیشہ فاخرہ بی بی کہتے تھے اور زینت کو فاخرہ کے ساتھ یہ "بی بی" کی پخ بہت کھلتی تھی۔ یوں بھی نند کی اتنی طرف داری کرنے پر اندر ہی اندر جز بز سی ہو رہی تھیں۔ کڑوا سا منہ بنا کر بولیں۔
"خیر جو کچھ بھی سہی ہمیں کیا پڑی ہے پرائے پھٹے میں پیر اڑانے کی۔"
"ہاں، واقعی ہمارا کسی کی نجی باتوں سے کیا واسطہ۔ ویسے بائی دا وے تم نے اسے کیسا پایا؟" شعیب منصور نے پیالی خالی کر کے اسے میز پر رکھ کر اپنا پائپ اٹھاتے ہوئے پوچھا۔
"کسے؟" زینت بولیں۔
"سلوطا کو اور کسے۔"
"ابھی دو دن ہی تو ہوئے ہیں اسے یہاں آئے۔" وہ سلوطا کا نام سن کر بیزاری سے بولیں۔
"مگر پوت کے پاؤں تو پالنے ہی میں نظر آ جاتے ہیں۔" شعیب منصور نے ان کی بیزاری پر مسکرا کر کہا۔
"بظاہر تو خاصی معقول ہے۔ یوں بھی شروع شروع میں تو سب ہی اپنی بانگی دکھاتے ہیں۔" وہ میاں کے مسکرانے پر چڑ کر بولیں۔
"یہ بانگی دکھانے کا محاورہ نہایت بے محل ہے کیونکہ وہ تمہاری نند کی نند ہے۔ ملازمہ یا کام کرنے والی نہیں۔" شعیب منصور نے بیوی کو فوراً ہی ٹوکا۔
"افوہ! آپ تو میری ذرا سی بات کو بھی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ ورنہ میں نے ان معنوں میں تو یہ محاورہ استعمال نہیں کیا تھا۔ میں نے تو ایک عام سی بات کہی تھی۔ مگر بہن کا معاملہ ہے نا اس لیے آپ کو اس میں بھی برائی نظر آ رہی ہے۔" زینت بگڑ کر بولیں۔
"یہ بات صرف بہن کی نند کا معاملہ ہے۔ یعنی سمدھیانے کی بات ہے اور مجھے یہ بالکل گوارا نہیں کہ ہمارے کسی رویے سے ثاقب کے احساسات کو ٹھیس پہنچے اور کوئی شکر رنجی پیدا ہو۔ بس اس خیال سے تمہیں محتاط رہنے کی تلقین کر رہا ہوں۔" شعیب منصور سنجیدہ ہو کر بولے۔
"کمال ہے پچیس برس گزر گئے ہیں ہمیں ایک ساتھ زندگی گزارتے اور آپ اب تک میری فطرت اور مزاج کو نہیں پہچان سکے اور ادھر ایک دنیا میری عادات اور اخلاق کی گرویدہ اور معترف ہے۔" زینت نے شاکی سی نظروں سے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔ عجب کہ ان

کا لہجہ چبھتا سا تھا۔

"نہیں، گرویدہ اور معترف تو ہم بھی بہت ہیں۔ لیکن وہ جو ایک روایتی قسم کی جلیبی ہوتی ہے نند اور بھاوج کے درمیان اُن کے بیچ نظر کہہ رہے ہیں۔"

"میں نے کیا کہا، جلیبی۔ بیبی میں آپ کی بہن سے جلیس ہوں۔ بغض و حسد رکھتی ہوں ان سے۔ واہ کیا خوب صلہ دیا ہے آپ نے اتنے برس کی ریاضتوں اور قربانیوں کا۔" زینت شوہر کی طنزیہ باتوں پر ایک دم تلملا ہی اٹھیں۔

"بھئی یہ تم پر کوئی الزام یا بہتان تو نہیں، جو تم اس قدر بُرا مان رہی ہو۔ یہ تو ایک فطری سی بات ہے جس کا میں عینی شاہد ہوں۔ ایک دو مرتبہ نہیں بارہا فاخرہ بی کے ساتھ تمہارے رویے اور تیوروں کا مشاہدہ کیا ہے۔ خیر چھوڑو اس قصے کو اب گڑے مردے اکھیڑ کر خواہ مخواہ تلخیاں پیدا کرنے سے حاصل بھی کیا ہوگا۔" شعیب منصور نے پائپ کے تمباکو کو پریسر سے دباتے ہوئے کہا۔

"رہنے دیں، تلخیاں تو آپ گھول ہی چکے ہیں۔ اور جب آپ نے بات شروع ہی کی ہے تو میں بھی یہی کہوں گی کہ آپ کی چہیتی بہن نے کبھی میری حیثیت کو تسلیم ہی نہیں کیا۔ کبھی پیار کرنے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ بارہ برس کی تھیں جب میں بیاہ کر آپ کے گھر میں آئی تھی۔ یہ سوچ کر کہ اکلوتی نند ہے بہن کی شکل میں ہے، اس پر بے ماں کی بچی ہے۔ اس لیے اسے سر پر بٹھا کر رکھوں گی۔ میں نے اس کا خیال رکھنے میں کوئی کسر اٹھا نہ چھوڑی۔ مگر وہاں میری محبت و شفقت کے جواب میں ہمیشہ بے مہری اور بے گانگی سے ہی نوازا گیا۔ اب آپ بُرا مانیں یا بھلا، میاں یہ عادت ہے کہ کوئی اکڑتا ہے یا کترتا ہے تو ہم بھی اس کی طرف پلٹ کر دیکھنا پسند نہیں کرتے مگر چونکہ اکلوتی نند کا معاملہ تھا اس لیے جی کو دل پر جبر کر کے جھکنا پڑتا تھا۔ ان کے سامنے اصل میں آپ لوگوں کے بے جا لاڈ پیار نے فاخرہ کو کچھ زیادہ ہی اوور کانفیڈنس کر کے رکھ دیا تھا۔" زینت نے بڑے ڈھکے چھپے انداز میں نند کی فطرت اور مزاج پر چوٹ کی۔

"اصل میں فاخرہ بی ایک ہی تو بہن ہیں ہم تینوں بھائیوں کی۔ بھائی جان نے خیر لندن جا کر اپنی دنیا ہی الگ بسا لی تھی لیکن میں اور سہیل ہی رہ گئے تھے ان کے ناز اٹھانے کو۔ وہ صرف چار سال کی تھیں جب بی اماں کا انتقال ہوا تھا۔ ابا میاں نے ان کے انتقال کے تین چار ماہ بعد ہی عقد ثانی کر لیا تھا۔ اور بیوی کو لے کر ہم سے علیحدہ ہو گئے تھے۔ یہ کہہ کر کہ اتنی سی بچی کو ہم دونوں بھائیوں نے ہی ماں اور باپ کی شفقت دی تھی بلکہ بھائی جان نے بھی کیونکہ اس زمانے میں تو وہ ہی ہم دونوں سے بڑے تھے۔ یہی کوئی سولہ سترہ سال کے مگر یہ حقیقت ہے کہ دوسرا خواہ بچے کو کتنا ہی پیار دے اس کے باوجود بھی والدین سے محرومی کا احساس بچے کو اندر ہی اندر کھوکھلا کر کے رکھ دیتا ہے۔ سو یہی کچھ فاخرہ بی کے ساتھ بھی ہوا تھا۔ اس پر بھائی جان کی جدائی نے بھی انہیں گم صم سا کر کے رکھ دیا تھا۔ تمہارا یہ شکوہ بھی بے جا نہیں کہ وہ سگی بھتیجی کی شادی میں شریک نہیں ہو رہیں۔ مگر کیا کریں ان کی فطرت ہی کچھ ایسی بے پروا اور روکھی پھیکی ہے۔ بس ہمارے لیے تو یہی بہت ہے کہ وہ اپنے گھر میں سکون چین سے رہ رہی ہیں۔" شعیب منصور نے متعدد بار بتائی ہوئی بات پھر دہرائی تو زینت بڑی دیر سے دل میں کھٹکتی ایک بات کو زبان پر لے آئیں۔

"ہاں دیکھیں ادھر آپ دونوں بہن پر جان چھڑکنے والے بھائی ہیں اور ادھر وہ آپ کے بہنوئی عاقب صاحب ہیں کہ اپنی سیر و تفریح کی خاطر بیچاری اکلوتی بہن کو یہاں بھیج دیا۔ وہ بھی سروس کرنے کی غرض سے۔ جب کہ ان کے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ ماں جائی ایک ہی بہن وہ بھی بیچاری عزیزہ۔ اسے تو عاقب کو سینے سے لگا کر رکھنا چاہیے تھا۔ یا دیکھ بھال کے کسی کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ تھما دیتے۔"

"تو عاقب بھی بھلا کوئی آدمی ہیں جو ان سے اس قسم کی توقع رکھی جائے۔ پتا نہیں کیسی عجیب مٹی سے اٹھایا گیا ہے ان کا خمیر کہ زمانے بھر کا اکھڑ پن ان میں سما گیا ہے۔ اگر پوچھو کہ بھئی کیسے حال چال ہیں تو جواب ملتا ہے کہ بس اللہ کا کرم ہے۔ اور اگر پوچھا جائے کہ آج کل کیا مشغلہ ہے تو کہیں گے کہ کوئی خاص نہیں یا کام کیسا چل رہا ہے تو کہا جائے گا کہ بس ویسا ہی جیسا کہ ہمیشہ سے چلتا آ رہا ہے۔ وہ بھی کچھ اتنے کڑوے تو ڑے انداز میں کہ معلوم ہوگا جیسے حلق میں نیچے کوئی ریت پھیلتی جا رہی ہے۔ وہ بندۂ خدا تو محض ضرورتاً ہی بات کرتا ہے اور اس کے ساتھ رہ کر وہ ہماری فاخرہ بھی یوں لگتا ہے جیسے انہوں نے گونگی کا تجربہ کر رکھا ہو۔ وہ بھی مروتاً ہی بات کر لیتی ہیں۔"

شوہر کی باتوں سے زینت کبیدہ خاطر ہو رہی تھیں پھر بھی انہوں نے جس انداز میں اپنے بہنوئی کے نندوئی کا نقشہ کھینچا تھا اس پر ہنسے بنا نہ رہ سکیں۔

"چلیں یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ عاقب کو بیوی بھی ہم مزاج ہی ملی ورنہ کوئی شوخ و شنگ مل جاتی تو گزارا مشکل سے ہی ہوتا۔ کہ ازدواجی زندگی میں تو آپس کی انڈر اسٹینڈنگ کے ساتھ ساتھ خیالات اور مزاج کی ہم آہنگی بھی بہت ضروری ہوتی ہے جب

کر دونوں اولاد جیسی نعمت سے محروم بھی ہیں۔ پھر بھی کسی نہ کسی طرح نبھ رہی ہے۔ خیر فاخرہ کو خدا سدا سکھی رکھے۔"

"آمین۔" شعیب منصور بولے۔

"ارے ہاں، ایک پیالی اور بنا دوں آپ کے لیے۔" زینت کو کچھ خیال آیا تو انہوں نے پوچھا۔

"ہاں بنا دو۔ چائے کے تو ہم سدا سے رسیا ہیں یا تمہارے اس نازک سے وجود کے۔" شعیب منصور نے چاہت بھری نظروں سے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔

"آپ بہانے بہانے میرے موٹاپے کو نشانہ کیوں بناتے ہیں۔ آخر میری عمر تو دیکھیں بڑھاپے کو چھونے لگی ہے اور اس عمر میں تو ۔۔" زینت نے ان کی بات کو طنز پر محمول کر کے بُرا ماننے کے سے انداز میں کہا تو شعیب منصور نے تکیے سے کمر ہٹا کر سیدھے ہوتے ہوئے ان کی بات کاٹی۔

"خدا نہ کرے جو تم بوڑھی ہو۔ ذرا میری نظروں سے تو خود کو دیکھو جن میں تم ویسی ہی دھان پان، نازک بدن اور سیم تن سی نظر آتی ہو۔"

"اے بس چھوڑیں بھی یہ چکنی چپڑی باتیں۔ میں خوب جانتی ہوں کہ آپ کی نظروں میں میری کیا وقعت اور حیثیت ہے۔" زینت ان کی پیالی میں چینی ڈالتے ہوئے بولیں۔

"کیوں کیا میں نے تمہارے حقوق کی ادائیگی میں کسی کوتاہی سے کام لیا ہے۔ تمہاری محبت میں کبھی خیانت سے کام لیا ہے جو آج میرے لیے تمہارے احساسات اس قدر منفی ہو رہے ہیں۔"

زینت نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور چائے کی پیالی خاموشی سے ان کی طرف بڑھا دی لیکن انہوں نے ایک ہاتھ سے پیالی کے نیچے ان کا ہاتھ پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے پیالی لے کر سائیڈ پر ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

"سنو جانِ من، تمہیں میری صاف اور کھری گفتگو سے تکلیف پہنچی ہے تو آئی ایم سوری۔ کہ والدین، بہن بھائی، اولاد سب کے لیے جذبہ ایک ہی ہوتا ہے یعنی محبت۔ لیکن اس محبت میں بھی رشتوں کی مناسبت سے ایک تفریق ضرور ہوتی ہے کہ والدین کے لیے محبت کے ساتھ احترام، تابعداری اور آداب کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔ اسی طرح بھائی، بہن اور اولاد کے رشتوں کے تقدس کو ملحوظ رکھتے ہوئے محبت کی جاتی ہے اور اسی تفریق کے ساتھ بیوی کی محبت کے انداز ہی کچھ نرالے ہوتے ہیں۔ وہ رفیق سفر بھی ہوتی ہے اور دکھ سکھ کی ساتھی بھی۔ اور ایک چاہنے والے اور باوفا شوہر کو کتنی عزیز ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ شاید تم کبھی لگا ہی نہیں سکتیں۔ لیکن تم تعلیم یافتہ ہو جوان جوان بچوں کی ماں ہو۔ محبت کی اس تقسیم پر ایک بار ٹھنڈے دل سے غور کر لو تو پھر ہمارے درمیان شکوے شکایت کی کوئی گنجائش ہی باقی نہ رہے گی۔" شعیب منصور سمجھ گئے تھے کہ وہ کس وجہ سے اتنی دل گرفتہ ہو رہی ہیں۔ انہوں نے ان کا ہاتھ تھامے تھامے سمجھانے کے سے انداز میں کہا۔

"اچھا اچھا ٹھیک ہے۔ آپ میرا ہاتھ تو چھوڑیے۔" زینت ان کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش میں بولیں۔

"نہیں پہلے وعدہ کرو کہ آئندہ ایسی فضول باتوں پر اپنا دل نہیں جلاؤ گی۔ پھر۔" انہوں نے پھر زیادہ ہی مضبوطی سے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"واہ یہ بھی زبردستی ہے۔ چھوڑیے نا۔ اگر کوئی آ گیا تو کیا سوچے گا بھلا۔" زینت جھینپے جھینپے انداز میں مسکرا کر بولیں۔

"ہاہاہا۔ آج اس گھر میں اتنے عرصے بعد بھی تمہیں کسی کے آ جانے کا دھڑکا لگا ہوا ہے۔ کمال ہے مشرق کی عورت میں یہ شرم و احتیاط شاید تمہارا ہی حصہ ہے۔" شعیب منصور نے ان کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہا۔

"ہاں تو ڈھلتی ہوئی عمر کے اس دور میں شرم و حیا کوئی مٹ تو نہیں جاتی۔" زینت ٹرالی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولیں۔

"لیجیے آپ کچھ کھائیں تو۔ دوپہر کا کھانا بھی آپ نے نہیں کھایا۔" انہوں نے ٹرالی شوہر کی طرف کھسکا کر کہا۔

"نہیں دوپہر کا کھانا تو جہاز میں ہی کھا لیا تھا۔ پھر یہاں کا کس پیٹ میں بھرتا۔" شعیب منصور بولے۔

"ہاں، خوب معلوم ہے کہ کتنا کھایا ہوگا۔ یوں بھی آپ گھر سے باہر کچھ کھانے پینے کے عادی نہیں ہیں۔ وہاں بھی دو چار لقمے ہی حلق سے اتار دیے ہوں گے۔" زینت دلار سے بولیں۔

"نہیں، خیر گھر سے باہر کا نہیں شہر سے باہر کا معاملہ تھا۔ اس لیے اپنی اس عادت کو بحالت مجبوری چند روز کے لیے ترک کرنا ہی پڑا۔"

"اچھا نہیں اب تو کچھ کھا لیں۔ گرم گرم یہ چکن پیٹیز اور بسکٹ ہی چکھ لیں۔" وہ زینت اصرار کرنے کے سے انداز میں بولیں۔ اور

چکن چیز کی پلیٹ اور بسکٹوں کا کوکی پچھلے خانے سے اٹھا کر ٹرالی کی بالائی ٹرے پر رکھ دی۔

"او ہو آپ یہ کھلائیں اور ہم نہ کھائیں۔ ہماری بھلا یہ کیا مجال مگر یہ بسکٹ کے لیے چکھنے کا کام اور وہ بھی خوب ہے۔" شعیب منصور نے کوکی سے ایک بسکٹ اٹھاتے ہوئے ہنس کر کہا۔

"الٹی سیدھی باتوں میں پھر چائے ٹھنڈی کر لی آپ نے۔" زینت بولیں۔

"کوئی مضائقہ نہیں۔ تمہاری قربت میں ہمیں ٹھنڈی چائے بھی ایک دم کڑک لگتی ہے۔" شعیب منصور نے سیدھا ان کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔ تو زینت نظریں کترا کر بولیں۔

"کچھ معلوم بھی ہے کل سے شادی کی رسمیں شروع ہونے والی ہیں اور ادھر بابا صاحب اب تک کا خاندان دہلی کی سیر سے ہی نہیں لوٹے۔ ادھر آپ بھی دورے پر تھے۔ مجھے جتنی دقت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ میرا ہی دل جانتا ہے۔"

"کیوں سہیل اور زریاب تو ایک ہفتے قبل ہی آ گئے تھے۔ کیا انہوں نے تمہاری کوئی مدد نہیں کی؟" شعیب منصور نے ایک بڑی گھونٹ میں پوری پیالی ختم کر کے اسے ٹرالی میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں مدد تو بہت کی دونوں نے ہی مگر زریاب بھاگ دوڑ کے کام تو نہیں کر سکتی تھی نا۔ سب کچھ بے چارے سہیل منصور پر ہی پڑ گیا۔ پھر بھی لڑکی کی شادی میں تو زینتی یک شو سو بکھیڑے ہوتے ہیں۔ صاحبزادے کو کم از کم اتنا تو احساس ہونا چاہیے تھا کہ زندگی میں یہ پہلا خوشی کا موقع ہے وہ بھی بہن کی شادی کا۔ گھر باہر کی ہوا لگ کر تو ان کی نظر میں رشتوں ناطوں کی بھی کوئی اہمیت نہیں رہی۔" زینت کی باتوں سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کے لاابالی پن سے بہت نالاں ہیں۔

"اوہو کچھ زیادہ ہی ناراض معلوم ہوتی ہو اپنے لاڈلے بیٹے سے لیکن یہ تو تمہیں بھی معلوم ہے کہ وہ آوارہ گردی کی نیت سے نہیں گیا بلکہ اپنے غیر ملکی دوستوں کو پاکستان کے پُر فضا مقامات کی سیر کرانے کی غرض سے گیا ہے۔ ویسے اسے اب تک واپس تو آ جانا چاہیے تھا۔ بہت ممکن ہے کہ شام کے پلین سے آ جائے۔"

"ہوں۔ آ بھی جائیں گے تو کون سا تیر مار لیں گے۔ ہر معاملے میں اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں۔" زینت آہستہ سے سر کو جھٹک کر بولیں۔

"لو اس سہرے نہ اس سہرے۔ آخر تم اس سے چاہتی کیا ہو۔ بے چارا — چار سال تک تو ملک سے باہر ہی رہا اور یہاں بھی رہتا تھا تو زیادہ تر اپنی نصابی سرگرمیوں میں ہی مشغول رہتا تھا۔ اسے بھلا آٹے دال کا بھاؤ کہاں معلوم ہوگا۔ ویسے بائی دا وے کیا کسی چیز کی کمی باقی رہ گئی ہے؟" شعیب منصور نے بیٹے کی طرف سے صفائی پیش کرنے کے بعد پوچھا۔

"دیکھیے کوئی ایک چیز کی کمی رہ گئی ہے۔ وہاں تو ابھی بے شمار چیزیں باقی رہ گئی ہیں — ابھی تو نشان کے طور پر دولہا کو خوانوں میں جو جوڑے چڑھائے جاتے ہیں۔ ان پر چھڑکنے کے لیے کھیلیں بتاشے میٹھی کھیلیں یعنی سفید شکر کے لاگی والے بھی نہیں منگوائے پنڈیوں کے لیے میوہ اور کھانے بھی نہیں آئے۔ باقی کا دولہا زینی کا دوشالہ اور سلیپنگ سوٹ تک نہیں خریدا۔ ادھر آج جیولر نے بھی بلوایا ہے۔ کیونکہ میں چاہتی ہوں کہ چھوٹی موٹی چیزیں اور درست کرانے کے علاوہ کم از کم چار سیٹ تو بھاری قسم کے دے دوں بیٹی کو۔" زینت بولیں۔

"لیکن ہمارا جیولر تو بہت پرانا بلکہ خاندانی ہے تم نے اکثر سے زیورات کے سیٹ یہیں منگوا کر پسند کر لیے ہوتے۔ خود جانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔" شعیب منصور نے پائپ کا دھواں چھوڑ کر منہ سے باہر نکالتے ہوئے کہا۔

"وہ بے چارے تو سر آنکھوں پر دوڑا دوڑا آ جاتا مگر دکان پر جانے کی بات اور ہوتی ہے۔ وہاں اور بھی بہت سے ڈیزائن نظر پڑ جاتے ہیں۔ جب کہ یہاں وہ لے جا پوری دکان اٹھا کر لانے سے تو رہا تھا۔ زیادہ سے زیادہ — آٹھ دس سیٹ ہی لے آتا۔" زینت بولیں۔

"اچھا تو پھر اٹھو ابھی تو صرف ساڑھے پانچ ہی بجے ہیں۔ یعنی دکان بند ہونے میں آدھا پون گھنٹہ باقی ہے۔ آج ہم اپنی جیب خاص سے ایک علیحدہ سیٹ خرید کر آپ کی نذر کریں گے۔" شعیب منصور اٹھنے کی غرض سے سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے بولے۔

"سچ کہا ہے؟" زینت نے خوش ہو کر پوچھا۔ پھر الجھی ہوئی بولیں۔

"لیکن اگر بھاری ہوا تو اسے بھی میں اپنی بیٹی کے جہیز میں لگا دوں گی۔"

"نہیں وہ ہماری طرف سے تمہارے لیے ایک گفٹ ہوگا اور بیٹی کے لیے زیور کی کیا کمی ہے۔ چار نہیں تم چھ بھاری سیٹ دے دینا۔ چلو اب دیر نہ کرو۔" شعیب منصور نے جوتوں میں پیر ڈالتے ہوئے کہا۔

"اچھا اچھا بس ایک منٹ میں ذرا یہ لباس تبدیل کر لوں۔" زینت مسکراتے کا رخ کرتی ہوئی بولیں جس سے ملحق ان کا ڈریسنگ روم تھا۔

"مگر تمہارا یہ لباس کونسا برا ہے۔ کتنا سوٹ بھی کر رہا ہے تم پر۔" شعیب منصور نے ان کے لباس کا ایک سرسری جائزہ لے کر کہا۔

"ہاں زرد سلک کی ساڑھی ہے جو میں نے سنگاپور سے خریدی تھی مگر گھر میں استعمال کی ہے بس ایک منٹ میں چینج کر کے آتی ہوں اسے۔"

زینت یہ کہتی ہوئی جلدی سے ٹوائیلٹ میں گھس گئیں۔ پھر جب دو منٹ بعد باہر آئیں تو انہوں نے ہلکے آسمانی رنگ کی سیلف پرنٹ کی ایک بہت ہی خوبصورت قیمتی ساڑھی زیب تن کر رکھی تھی جو ان پر بڑی طرح کھب رہی تھی۔ شعیب منصور نے انہیں دیکھ کر شوخ سے انداز میں سیٹی بجائی۔ اور پھر گاڑی کی چابی سائڈ ٹیبل سے اٹھا کر ان کے ساتھ باہر آ گئے۔

باہر پورچ میں شعیب منصور کی نئے ماڈل کی مرسیڈیز کھڑی تھی جس میں بیٹھنے سے پہلے زینت نے ملازم کریم کو بلا کر کچھ ہدایات دیں اور پھر شعیب منصور نے دروازہ کھول کر پہلے انہیں سیٹ پر بٹھایا اور پھر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر کار اسٹارٹ کی اور اپنے پُر شکوہ بنگلے سے باہر نکل آئے۔

باہر ایک گہما گہمی تھی۔ غروب آفتاب کے نزدیک بھی زندگی کے ہنگامے عروج پر تھے۔ سڑکوں پر ٹریفک کا ایک سیل بہا بہہ رہا تھا۔ زینت کا دل خوش تھا۔ روح مگن تھی اور دماغ آسودہ اس لیے انہیں چاروں طرف خوشیاں ہی خوشیاں بکھری نظر آ رہی تھیں۔

نیون سائن پر رقص کرتی روشنیاں۔

دکانوں میں جلتے قمقمے۔

مکانوں میں جلتی روشنیاں۔

کاروں بسوں اور رکشاؤں کی ہیڈ لائٹیں۔

اور شام کی سنہری فضاؤں میں سرسراتی ہوائیں۔ انہیں مسرت و شادمانی کا سندیس دیتی لگ رہی تھیں۔ فرنٹ سیٹ پر اپنے چاہنے والے اور محبوب شوہر کے ساتھ بیٹھی وہ خود کو فضاؤں میں پرواز کرتا محسوس کر رہی تھیں۔

دولت، ثروت، حیثیت، اسٹیٹس، خوبصورت اور لائق فائق اولاد۔ شوہر کا التفات اور سب سے بڑھ کر دلی طمانیت اور سکون۔

کونسی ایسی نعمت تھی جس سے وہ محروم تھیں۔

کار میں ٹیپ ریکارڈر پر مغربی موسیقی کی ہلکی سی دھن بج رہی تھی۔ جس سے اپنے طور پر شعیب منصور محظوظ ہو رہے تھے۔ زینت اپنی کسی خوبصورت سوچ میں گم کر ٹیپ بند کرتی ہوئی بولیں۔

"معلوم بھی ہے میں نے کیا سوچا ہے؟"

"ہاں کیا سوچا ہے؟"

"نازیہ کی شادی کے بعد بابا کو بھی ازدواجی بندھن میں باندھ دوں گی۔ بہت چھٹے چھٹے پھرتے ہیں ہر وقت۔ یوں بھی اب انہوں نے اپنی تعلیم مکمل کر لی ہے۔"

"لیکن تعلیم اس لیے مکمل تو نہیں کی کہ اسے ختم کر کے شادی کر کے بیٹھ جائے۔ پہلے اسے اپنے فیلڈ میں قدم تو جمانے دو۔" شعیب منصور نے کہا۔

"قدم بھی جانتے ہیں انہیں روپے پیسے کی کوئی کمی تو نہیں ہے اتنی ساری جائداد اور سرمایہ، دو دو فیکٹریاں اور اتنا بینک بیلنس کیا کم ہیں ان کی اکیلی جان کے لیے۔" زینت بولیں۔

"پھر اکیلی جان تو نہ ہوا بھی دو بیٹیاں اور بھی ہیں تمہارے سامنے اور پھر یہ جو تم جائداد اور سرمایہ وغیرہ کے حوالے سے بات کر رہی ہو تو یہ قطرہ قطرہ کر کے نہ یا خود بنایا ہے تم نے۔ وہ بھی برسوں میں جا کر لیکن خرچ ہونے میں چند دن ہی لیتا ہے اور میری خواہش ہے کہ اسفند خود اپنے زور بازو سے کمائے اور معاشرے میں اپنا ایک مقام بنائے۔ کیونکہ والدین کے پیسے یا اپنی وراثت پر تکیہ کر کے بیٹھ جائے۔

واے لوگ زندگی میں کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ ان کے اندر دوسروں کی محتاجی اور بے حسی کی علت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے کیمبرج کے اخراجات بھی میں اسے ایک حد سے میں بھیجتا۔ یا جیسے تم میری کنجوسی پر محمول کرتی تھیں۔ مگر مجھے معلوم تھا کہ وہاں کا ماحول اور معاشرہ کیسا ہے اور پیسے کی طرف سے بے فکری ذرا سی دیر میں انسان کو بھٹکا دیتی ہے۔ اب دیکھو تو چار سال بعد واپس آیا ہے تو کسی میم ویم کو ساتھ لٹکا کر نہیں لایا۔" شعیب منصور نے بیوی کی بات پر اتنا لمبا لیکچر جھاڑا تو وہ اکتا کر بولیں۔

"ٹھیک ہے۔ میں خود اس معاملے پر ان سے بات کر دوں گی۔"

"کس معاملے پر؟" شعیب منصور نے پوچھا۔

"یہی کہ وہ شادی کرنے کے موڈ میں ہیں یا ابھی پریکٹس شروع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔" زینت نے بیزاری سے کہا۔

"ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نے اس کے لیے کوئی لڑکی تلاش کر لی ہے۔" شعیب منصور نے قیاس آرائی کرنے کے سے انداز میں کہا۔

"ہاں۔ لڑکی کو دیکھ کر تو سچ مچ میری رال ٹپک رہی ہے۔"

"اچھا تو کیا وہ املی یا انجیر کی خاصیت رکھتی ہے۔ کیونکہ عموماً کھٹی چیزوں کو دیکھ کر ہی رال ٹپکنے لگتی ہے۔" شعیب منصور نے ہنس کر کہا۔

"اب آپ تو ہر بات کو یا تو مذاق میں اڑا دیتے ہیں یا پھر سیریس ہو جاتے ہیں۔ وہ لڑکی آپ کے دوست احمد مرزا کی خالہ زاد ہے۔ بڑے ہی رئیل آف لوگ ہیں اور زرناش تو اتنی خوبصورت ہے جیسے خدا نے اسے اپنے ہاتھ سے ہی بنایا ہو۔ اس پر تعلیم یافتہ اور اسمارٹنس بھی بہت ہے اور با اخلاق اور ذہین۔ مجھ کو بھی ایسی کڑیوں لگتا ہے جیسے تھوڑی تھوڑی دیر بعد کلیاں سی چٹک رہی ہوں۔" زینت نے لڑکی کا نقشہ کھینچا۔

"بہت خوب۔ بہت خوب۔ گویا لڑکی نہ ہوئی کلیوں کا گلدستہ ہو گئی۔ مگر بیٹی کی سسرال سے بہو لانے کی کبھی سوچنا بھی نہیں۔ کیونکہ اگر تمہارے بیٹے کا مزاج اس سے ملا نہیں جس کے امکانات یقینی ہیں تو تمہاری اپنی بیٹی کی ازدواجی زندگی تلخیوں کی بھینٹ چڑھ جائے گی۔"

"واہ آپ کو کیا الہام ہوا ہے کہ اسفند کا مزاج اس سے نہیں ملے گا۔ مونہہ! یہ کہیے کہ آپ بیٹے کا سہرا دیکھنے کی آرزو ہی نہیں رکھتے۔" زینت برا سا منہ بنا کر بولیں۔

"آپ میری ذات کو اپنے طنز کا نشانہ نہ بنائیں۔ بھلا کون باپ ایسا ہوگا جسے بیٹے کا سہرا دیکھنے کی آرزو نہ ہو۔ لیکن ہر کام موقع اور محل پر ہی اچھا لگتا ہے۔ ابھی اس کی دو دو بہنیں اور بیٹھی ہیں۔ چلو اگر نیلا چھوٹی بھی ہے تو کم از کم نیلوفر تو اس قابل ہے کہ ایک آدھ سال بعد اس کی شادی کر دی جائے۔ اور پھر سب سے بڑھ کر ہمیں اپنے بیٹے کے خیالات بھی معلوم ہیں کہ وہ کیسی لڑکی چاہتا ہے۔ کم از کم زرناش جیسی لڑکی کو تو بالکل پسند نہیں کرے گا کیونکہ وہ فطرتاً سادگی پسند ہے۔" شعیب منصور کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ فی الوقت بیٹے کی شادی کرنے کے حق ہی میں نہیں ہیں۔ زینت بھی سمجھ گئیں۔

"خیر۔ یہ تو اس کا عندیہ لینے کے بعد ہی معلوم ہوگا کہ زرناش اس کے معیار پر پوری اترتی ہے یا نہیں اترتی۔ مگر یہ آپ کہاں بڑھے جا رہے ہیں۔ کیا بھول گئے جوہری کی دوکان۔ وہ پیچھے رہ گئی ہے۔ مگر آپ کار یہیں روک دیجیے۔"

زینت نے ان کی بات کا جواب دیتے ہوئے انہیں جوہری کی دوکان کے بارے میں بتایا تو انہوں نے بیک ویو مرر میں دیکھ کر کار کو وہیں روکنے کے بجائے دو بار گھما کر واپس بیک کیا کہ اتفاق سے پیچھے کار پارکنگ کا حصہ خالی تھا۔ پھر دونوں میاں بیوی کار سے اتر کر جوہری کی دکان میں داخل ہو گئے۔

شعیب منصور کے والد منصور احمد اوسط درجے کے زمیندار تھے۔ یعنی چار مربعے اور تھوڑی سی جائداد ہی ان کی ملکیت تھیں۔ ان کی بیوی خدیجہ بیگم رشتے میں ان کی پھوپھو زاد بھی تھیں۔ خدیجہ بیگم کے بطن سے منصور احمد کی اولادیں تو کئی ہوئی تھیں مگر تین لڑکے اور ایک لڑکی ہی زندہ رہ سکی تھی۔ لیکن بیٹی کی پیدائش کے بعد کسی اندرونی خرابی کی وجہ سے وہ بیمار رہنے لگی تھیں۔ منصور احمد اچھے خاصے آسودہ حال تھے۔ اس لیے انہوں نے بیوی کا علاج معالجہ بھی خوب کرایا۔ مگر شاید وہ تیس برس کی عمر ہی لکھوا کر لائی تھیں۔ جو مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی کے مصداق صحت یاب ہونے کے بجائے ان کی صحت گرتی ہی گئی۔ اور وہ فاخرہ کو جنم دینے کے پورے چار سال بعد سفر آخرت پر روانہ ہو گئیں۔

ان کے سب سے بڑے بیٹے شعیب منصور عمر کی سولہویں منزل میں قدم رکھ چکے تھے۔ شعیب ان سے چار سال چھوٹے تھے اور سہیل منصور آٹھ برس۔ اور تین سال کی چار سالہ بچی فاخرہ گھر کے کونے کونے میں ماں کو تلاش کرتی نظر آتی تھی۔ باپ کچھ فطرتاً کم گو مزاج کے واقع ہوئے تھے۔ انہوں نے شروع سے ہی اولاد پر کچھ زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ جس کی وجہ سے ان کی بیرونی دلچسپی بھی بچوں کی تعلیم کی طرف سے بھی لاپرواہ رہے۔ کیونکہ ایک تو خود انہوں نے زیادہ تعلیم نہیں پائی تھی۔ دوسرے زمیندار گھرانے اور ان کا خیال تھا کہ ان کے بیٹے بھی بڑے ہو کر زمینوں کا کام سنبھال لیں گے۔ مگر خدیجہ بیگم کے میکے میں تعلیم کا بہت چرچا تھا۔ ان کے والد بھی ایک مدرسے میں معلم رہ چکے تھے اور دادا بھی اپنے وقت کے جید عالم تھے۔ وہ خود بھی خاصی پڑھی لکھی تھیں۔ اس لیے انہوں نے میاں کی مخالفت کے باوجود اپنے تینوں بیٹوں کو اسکول میں داخل کرا دیا تھا۔ شعیب کو خود بھی تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا اور سولہ سال کی عمر میں انہوں نے میٹرک بھی پاس کر لیا تھا۔

گھر میں باپ کے بعد بڑی اولاد یا بڑے بھائی کی حیثیت بھی سربراہ کی سی ہوتی ہے۔ اگر بڑا بھائی اچھی عادات، عمدہ خصائل، اخلاق اور کردار کا ہو تو اس سے چھوٹی اولادیں ان کی تقلید ضرور کرتی ہیں۔ شعیب منصور کا رجحان تعلیم کی طرف نہ تھا۔ ہر وقت کھیل کود، دھینگا مشتی اور آوارہ گردی میں ہی مصروف نظر آتے۔ آٹھ سالہ سہیل منصور بھی ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتے تھے مگر شعیب منصور دونوں کو ٹھونک بجا کر کسی نہ کسی طرح راہ راست پر لانے میں کامیاب ہو گئے۔ ادھر ماں کی وفات نے بھی شدت اختیار کر لی تھی۔ ماں کے بعد تینوں بھائی ہم دیوار تھے۔ کچھ اس لیے بھی شعیب منصور نے بڑے بھائی کے احکامات پر خاموشی سے سر جھکا

دیا تھا۔ سہیل تو یوں بھی چھوٹے تھے اور باپ سے زیادہ وہ بڑے بھائی سے ان کی جان نکلتی تھی۔ اس لیے ان پر شعیب کو زیادہ محنت صرف کرنی نہیں پڑی تھی۔

پھر یوں ہوا کہ ایک روز خدیجہ بیگم جیسی جان چھڑکنے والی اور عزیز ترین ماں ان چاروں بچوں کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ کر ان سے منہ موڑ گئیں۔ اور زندگی کا یہ سب سے بڑا المیہ ان تینوں بھائیوں کے لیے سانحہ سے کم ثابت نہ ہوا۔

ماں کے انتقال کے بعد باپ جو تیسرے چوتھے دن گھر میں نظر آجاتے تھے۔ دسویں کی فاتحہ تک ہی اپنے بچوں کا ساتھ نباہ سکے تھے۔ اس کے بعد دسویں پندرھویں ہی ان کی صورت دیکھنے کو ملتی تھی۔ زمین جائیداد کے قیام کی غرض سے گھر میں آتے بھی تو بیٹوں کی شامت آجاتی۔ سب سے زیادہ شعیب ہی سے نالاں رہتے جو زمینوں کا کام سنبھالنے کے بجائے تعلیم کی طرف راغب تھے۔ اپنی اولاد میں اگر تھوڑا بہت لگاؤ تھا تو وہ معصوم سی چار سالہ فاخرہ سے ہی تھا۔ اصل میں تو وہ اسی کے خیال سے کبھی جاتے تھے مگر معلوم کیوں فاخرہ ان سے بہت گھبراتی تھی۔ بلانے پر ان کی گود میں چلی تو جاتی تھی مگر باپ تو رونے لگتی یا مچل کر فوراً ہی اتر جاتی۔

بہرحال بیوی کے انتقال کے بعد پر شروع کے چوٹ لگے تھے۔ باپ کے دل میں قدرت نے شاید اولاد کے لیے کوئی نرم گوشہ رکھا ہی نہ تھا۔ جو منصور احمد نے رفتہ رفتہ آمد و رفت بالکل ہی کم کر دی تھی۔ البتہ خرچ بڑی باقاعدگی سے بھجوا دیا کرتے تھے۔

پھر ایک روز وہ آئے تو ان کے ساتھ ایک اجنبی صورت خاتون بھی تھیں۔ جن کا تعارف بچوں سے انہوں نے "تمہاری چھوٹی امی" کہہ کر کروایا۔ دو چار روز انہی خاتون کے ساتھ گھر میں قیام فرما رہے۔ اس کے بعد گئے تو معلوم ہوا کہ چھوٹی حویلی میں مستقل سکونت اختیار کرلی ہے۔ اس وقت شعیب ہی ساری اولادوں میں کچھ باشعور تھے۔ حالات کی تلخیوں نے اس نوعمری ہی میں ان پر فہم و ادراک کے دروازے کھول دیے تھے۔ انہوں نے باپ کی زندگی ہی میں باپ کی جانشینی اختیار کرکے بھائیوں اور بہن کو پڑھایا لکھایا۔ وقت بہتے دریا کی مانند آگے ہی بڑھتا رہا اور تشنۂ علم دریائے علم سے سیراب ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ خود شعیب نے ایم اے، ایل ایل بی کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کرلیا۔

شعیب بھی اس دوران میں گریجویشن کر چکے تھے اور چونکہ سہیل پڑھائی میں ان سے زیادہ دلچسپی لینے لگے تھے۔ اس لیے وہ بھی ان کے پیچھے پیچھے تقریباً برابر میں آگئے تھے اور فاخرہ نے میٹرک پاس کر لیا تھا۔ شعیب کو بیرون ملک جاکر بار ایٹ لاء کی ڈگری لینے کا سودا سمایا۔ اور وہ بھائیوں کو بہن کا خیال رکھنے کے ساتھ ساتھ تعلیم جاری رکھنے کی بھی تاکید کرکے انگلستان روانہ ہوگئے۔

شعیب کا رجحان واقعی پڑھائی کی طرف نہیں تھا پھر بھی بڑے بھائی کی تاکید پر مارے باندھے انہوں نے تعلیم جاری رکھنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ مگر اسی دوران میں ایک بڑا خوبصورت حادثہ رونما ہو گیا تھا۔ سوتیلی ماں خلاف توقع اس قدر سوتیلی ثابت نہیں ہوئی تھیں جیسی کہ روایتی سوتیلی مائیں ہوتی ہیں۔ وہ خود تو ان کے گھر نہیں آئی تھیں مگر جب بھی سوتیلے بیٹے باپ سے ملنے چھوٹی حویلی جاتے تھے وہ بڑی مہر و لگاوٹ سے پیش آتی تھیں۔ ان دنوں شعیب منصور نے ایم اے پریویس میں نیا نیا داخلہ لیا تھا۔ نصاب کی قیمتی کتابیں خریدنے کا مسئلہ درپیش تھا۔ جس کا حل ڈھونڈنے وہ باپ کے پاس گئے تھے۔ وہیں ایک خاتون موجود تھیں۔ بڑی طرح دار اور باوقار سی۔ انہوں نے شعیب منصور کو دیکھتے ہی اپنی بیٹی کے لیے پسند کر لیا۔ وہ شعیب منصور کی سوتیلی ماں کی سہیلی تھیں۔ شعیب منصور کے جانے کے بعد انہوں نے ان سے اپنی بیٹی کے رشتے کی بات کی تو سوتیلی ماں سلمیٰ بیگم یہ رشتہ طے کرانے پر فوراً تیار ہوگئیں۔

پھر ایک دن انہوں نے کسی بہانے سے شعیب منصور کو بلاکر زینت کو بھی دکھا دیا۔ شعیب منصور کے تو فرشتوں کو بھی معلوم نہ تھا کہ سوتیلی ماں نے کیا چکر چلا رکھا ہے۔ وہ تو بعد میں بات کھلنے پر ہی علم ہوا کیونکہ انہوں نے زینت کے بارے میں ان کا عندیہ لیا تھا۔ اور چونکہ چہیتی بیوی کی خواہش تھی۔ اس لیے باپ بھی فوراً ہی اس رشتے کے لیے راضی ہو گئے تھے اور انہوں نے شعیب منصور کے ہزار عذر تراشنے کے باوجود بالآخر انہیں راضی کر ہی لیا تھا۔ روپے پیسے کی تو کوئی کمی ہی نہ تھی۔ اس لیے ایک دن ایک مختصر سی تقریب میں دونوں کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کر دیا گیا۔

شعیب کو اطلاع دی گئی تو جواب میں انہوں نے بڑی ڈانٹ ڈپٹ کا ایک خط لکھا جس میں مبارکباد کے ساتھ ساتھ تعلیم جاری رکھنے کی سختی سے تاکید کی گئی تھی۔ اس لیے بے دلی سے ہی مگر شادی کے بعد بھی شعیب منصور پڑھتے ہی رہے۔ حتیٰ کہ انہوں نے ایم اے کا امتحان بھی پاس کر لیا۔ اور اسی ساری کارکردگی اور کارگزاری میں تین سال کا عرصہ لگ گیا۔

فاخرہ سترہویں سال میں قدم رکھ چکی تھیں۔ ان کی شادی بھی سلمیٰ بیگم نے ہی کرائی تھی۔

سلمیٰ بیگم گو اوسط طبقے سے تعلق رکھتی تھیں مگر پڑھی لکھی تھیں۔ انہوں نے گریجویشن کے علاوہ اردو میں بیچلرز میں ادیب عالم اور ادیب فاضل کے امتحانات امتیازی نمبروں سے پاس کر رکھے تھے۔ زیادہ خوبرو نہیں تھیں مگر پرکشش ضرور تھیں اوسط طبقے سے

تعلق رکھتی تھیں۔ جس کی چادر اتنی مختصر ہوتی ہے کہ بڑی مشکل سے کھینچ تان کر انسان کی پردہ پوشی کر لیتی ہے۔ جہاں اعلیٰ تو کیا معمولی جہیز مہیا کرنا بھی کار دارد ہی ہوتا ہے۔ اور سلمیٰ بیگم کی تو تین تین جوان بہنیں اور بھی تھیں۔ یہ حالات زیادہ تر اوسط طبقے کے ہی کہے جاتے ہیں ___ اس لیے گھر کی تنگ حیثیت دیکھ کر ایسے جاتے کر پھر کبھی واپس نہیں لوٹتے تھے۔ اور پھر یوں زندگی کے کسی مضبوط سہارے کی آرزو میں بیٹھے بیٹھے سلمیٰ بیگم کے بال پکنے لگے۔ چہرے سے بھی جوانی کی تمازت شادابی رخصت ہو گئی۔ اور وہ ایک اسکول میں پڑھاتے پڑھاتے مرجھایا ہوا پھول بن کر رہ گئی تھیں۔ ایک دن ایک مشاطہ قسم کی عورت نے جو شہر شہر قریہ قریہ گھوم کر آسمانوں پر تحریر کیے رشتوں کو زمین پر ملانے کا فریضہ انجام دیتی تھی۔ سلمیٰ بیگم سے منصور احمد کے بارے میں بات کی۔

منصور احمد کی عمر اس وقت اڑتیس سال کے لگ بھگ تھی جب کہ سلمیٰ بیگم اس سے ایک آدھ سال اوپر پچاس تک پہنچ چکی تھیں۔

گو وہ اس ڈھلتی ہوئی عمر میں شادی رچانے کے لیے بالکل تیار نہ تھیں مگر اس مشاطہ کے سمجھانے بجھانے پر انہوں نے بھی سوچا کہ آئندہ معلوم کتنا عرصہ اور جینا پڑے تو کیا ساری عمر بچوں کو تہذیب و اخلاق کا درس دے کر اور پڑھا لکھا کر گزاری جا سکے گی۔ عورت کے لیے مرد کا وجود تو ایک کمین گاہ کی طرح ہوتا ہے جس کے تلے بیٹھ کر وہ دنیا کی سرد و گرم ہی سے نہیں برائیوں اور خطرات سے بھی محفوظ رہ سکتی ہے۔ والدین کب تک بیٹی کا ساتھ دے سکتے ہیں۔ ان کے بعد لڑکیاں بھائیوں سے زیادہ بھاوجوں کے رحم و کرم پر رہ جاتی ہیں۔ اگر خوش قسمتی سے بھائی اچھے بھی ہوتے ہیں، تب بھی بھابیاں بے سہارا نندوں کے وجود کو برداشت ہی نہیں کرتیں۔ اور ہر طرح سے بھائیوں کی مٹی پلید ہوتی ہے۔

سلمیٰ کا بھی ایک ہی بھائی تھا۔ جو نہ صرف شادی شدہ تھا بلکہ اس کے دو بچے بھی تھے۔

چونکہ سلمیٰ کے والدین زندہ تھے اس لیے بھائی بھاوج مع بچوں کے ساتھ ہی رہتے تھے۔

گھر آئے دن کسی نہ کسی بات پر تو تو میں میں ضرور ہوتی رہتی تھی۔ سلمیٰ کا گھر پر خاصا رعب تھا۔ چونکہ وہ سب سے بڑی اولاد تھی پھر سلمیٰ پڑھی لکھی اور سمجھدار تھی اور مستقبل کے آئینے میں آنے والے حالات کا عکس دیکھ چکی تھی۔ اس لیے بحالت مجبوری اس نے منصور احمد سے عقد کر لیا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ سوتیلی روایتی ماؤں سے بالکل مختلف تھی۔

زینت کی والدہ سے سلمیٰ بیگم کی پرانی شناسائی تھی وہ بھی کچھ یوں کہ زینت جب چھوٹی سی تھیں تو انہی کے اسکول میں پڑھتی تھیں اور چونکہ حساب اور جغرافیہ میں کمزور تھیں۔ اس لیے کچھ عرصہ سلمیٰ سے ٹیوشن بھی لیتی رہی تھیں۔ اب یہ محض اتفاق ہی تھا کہ زینت کی والدہ سلمیٰ سے ملنے ان کے گھر آئی ہوئی تھیں کہ شعیب منصور آگئے۔ بہرحال سلمیٰ کا حلقۂ احباب کافی وسیع تھا۔ عاقب کی پھوپھی خالہ سے بھی ان کی گاڑھی چھنتی تھی کیونکہ ان کی بیٹی بھی سلمیٰ کے اسکول میں پڑھتی تھی بلکہ سلمیٰ اس کی کلاس ٹیچر تھیں۔ گو سلمیٰ کی حیثیت ان کے لباس اور سادگی سے فوراً ہی ظاہر ہو جاتی تھی لیکن ان کی شخصیت میں ایک وقار سا تھا۔ اور بات کرنے کا انداز بھی کچھ ایسا پرکشش تھا کہ دوسرا ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا تھا۔ چنانچہ عاقب کی خالہ بھی جو خاصی متمول تھیں۔ ان سے جلد ہی گھل مل گئی تھیں۔ اور ان سے دوستی کا سلسلہ شادی کے بعد بھی چلتا رہا تھا کہ شادی کے بعد تو وہ سردار منصور احمد کی اہلیہ بن کر صاحب حیثیت ہو گئی تھیں۔ اس لیے جو کبھی بنظر حقارت بھی انہیں دیکھتے تھے وہ بھی ان سے ملنے کھنچے کھنچے چلے آتے تھے۔

پھر اسی عرصے میں جب شعیب منصور فارغ التحصیل ہو کر کسی ملازمت کی تلاش میں تھے۔ خدا نے انہیں ایک بہت خوبصورت بیٹے سے نواز دیا۔ زینت کی مستقل اقامت تو اس گھر میں تھی جس میں ان کے شوہر، جابجا دیور اور نند پل بڑھ کر جوان ہوئے تھے۔ لیکن شادی کے بعد شعیب منصور چونکہ سوتیلی ماں کے اخلاق اور کردار سے بہت متاثر ہو گئے تھے۔ اسی لیے ان کی آمد و رفت باپ کے یہاں بھی رہتی تھی۔ وہ بیوی اور بچے کو بھی چھوٹی حویلی لے جاتے تھے۔ اور یہ بھی خدا کی شان ہی تھی کہ منصور احمد نے اولاد کے کبھی چاؤ چونچلے نہیں کیے تھے مگر وہ پوتے کے شیدا تھے کہ پوتا بھی اصل سے سود زیادہ عزیز ہوتا ہے۔ وہ پوتے کو ایک منٹ بھی نظروں سے اوجھل نہیں کرنا چاہتے تھے۔ سلمیٰ بیگم بھی چونکہ بے اولاد تھیں۔ اس لیے یہ بچہ ان کی آنکھوں کا تارا تھا۔ بس اس کی محبت میں دونوں میاں بیوی کچھ ایسے گرفتار ہوئے تھے کہ انہوں نے چھوٹی حویلی کی رہائش چھوڑ کر شہر میں اپنی پرانی وضع کی کوٹھی میں جس میں ان کے بچے رہائش پذیر تھے سکونت اختیار کرلی تھی۔

دادا نے پوتے کا نام سردار محمد اسفند رکھا تھا اور اپنی زندگی میں ہی اپنی آدھی جائیداد اس کے نام منتقل کر دی تھی۔ شعیب منصور کو بیٹے کی پیدائش کے فوراً ہی بعد منسٹری آف ہیلتھ میں اچھی ملازمت مل گئی تھی۔ سہیل کو چونکہ پودوں اور درختوں سے بہت دلچسپی تھی۔ اس لیے وہ باٹنی کے سبجیکٹ میں ایم ایس سی کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ بچپن ہی سے جب کبھی انہیں زمینوں پر جانے کا اتفاق ہوتا تو وہ ہمیشہ جڑی بوٹیاں اور نباتات ہی تلاش کرتے نظر آتے تھے اور شعیب منصور کی سفارش پر ہی باپ نے [illegible]

کے باوجود انہیں کینیڈا جانے کی اجازت دی تھی کیونکہ ساری اولاد میں پہلوٹے کی وجہ سے اور کچھ اس لیے کہ باپ کی خوشی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے شعیب منصور نے زمینوں اور جائیدادوں کی دیکھ بھال شروع کردی تھی۔ باپ کی نظروں میں ان کی قدر و منزلت کچھ سوا ہوگئی تھی۔

پھر چار برسوں پر محیط وقت تیزی سے آگے نکل گیا۔ اور شعیب کو قدرت نے ایک عدد بیٹی سے بھی نواز دیا۔ بیٹے پر تو باپ نے اپنی ساری محبت اور شفقت پہلے ہی نچھاور کر کے ایک طرح سے قبضہ کرلیا تھا اور شعیب منصور کو ہمیشہ سے بیٹی کا بہت ارمان تھا کیونکہ ان کے خاندان میں بیٹیوں کی بہت کمی تھی۔ اور اسی لیے بیٹیوں کی بہت قدر کی جاتی تھی۔ کچھ اس لیے بھی شعیب منصور بیٹی کو بہت چاہتے تھے۔ دادا بھی پوتی کی پیدائش پر بہت خوش تھے لیکن موت نے انہیں اتنی مہلت ہی نہیں دی کہ پوتی سے بھی مال گون کرتے۔ وہ دمے کے پرانے مریض تھے اور پرہیزی کھانا کھاتے تھے مگر ان دنوں ایک تو سردی کی شدید لہر آئی ہوئی تھی۔ اس پر نہ جانے کیا سوجھی یا یہ بھی سفر آخرت پر روانہ ہونے کا ایک بہانہ ہی تھا کہ بیوی کے لاکھ منع کرنے کے باوجود فریج میں رکھی ٹھنڈی کھیر کھالی۔ بس اس تھوڑی سی کھیر نے ان کی جان پر بنا دی۔ دمے نے کچھ ایسا شدید حملہ کیا کہ وہ دو دن میں چٹ پٹ ہو کر رہ گئے۔

باپ کے انتقال کے بعد شعیب گو ورثے میں چھوڑی جائیداد وغیرہ کا بٹوارہ نہیں کرنا چاہتے تھے کہ ایک تو دونوں بھائی بیرونی ممالک میں رہ رہے تھے۔ دوسرے سب سے بڑا مسئلہ اس آدھی جائیداد کا تھا جو باپ نے اپنی زندگی میں ان کے بیٹے کے نام کردی تھی۔ شعیب منصور اس معاملے میں بھی ان کے بہت کام آئے۔

اصل میں باپ کے مرنے سے وہ کچھ ایسے بددل ہوئے تھے کہ انہوں نے بھائیوں سے بھی کنارہ کشی اختیار کرلی تھی۔ لندن میں ہی سیٹل ہوگئے تھے بلکہ وہیں ایک ترک خاتون سے شادی کرلی تھی جس سے ان کی دو بیٹیاں بھی تھیں۔ اور انہوں نے باپ کی ورثے میں چھوڑی جائیداد سے دستبرداری کے اعلان کے ساتھ ہی شعیب منصور کو یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ وہ بھائی، بہن اور سوتیلی ماں کے حصے ان تینوں کے حوالے کر کے اپنے حصے میں آئی ہوئی رقم سے کوئی معقول سا کاروبار کرلیں۔

سو شعیب منصور نے بھی بھائی کے مشورے کو بہت مناسب جانا کیونکہ یوں بھی تین ہزار کا مشاہرہ ان کے شایان اخراجات کے لیے بہت ناکافی ہوتا تھا اور سروس میں ترقی کی بھی کوئی امید نہ تھی۔ باپ کی زندگی میں انہوں نے شادی کے بعد کبھی ان سے ایک پائی بھی لینی گوارا نہیں کی تھی۔ لہٰذا سب کا حصہ دے کر اور بیٹے کا حصہ نکال کر بھی اتنا بچا تھا کہ انہوں نے اس سے تمام چینی کے برتن بنانے اور گلاس ورکس کی دو فیکٹریاں لگا لیں۔

بیٹے کی جائیداد سے جو آمدنی ہوتی تھی۔ اسے تو وہ اس کے سیونگ اکاؤنٹ میں جمع کرتے رہتے تھے۔ مگر ان کی زمینوں اور جائیداد سے جو کچھ بھی حاصل ہوتا تھا فیکٹری کی آمدنی کے ساتھ چند برسوں میں اتنا۔۔ ہو گیا کہ بڑے ساہوکاروں میں ان کا شمار ہونے لگا اور ان کا کاروبار ملکی حدود سے نکل کر تالیبون کاروں اور ایکسپورٹرز دین تک پھیل گیا۔ مگر ان کی طبیعت میں بڑی سادگی تھی۔ خصلت اور گو ان کے بھی بہت اچھے تھے۔ غرور نام کو نہیں تھا۔ تھوڑے سے مذہبی خیالات کے بھی حامل تھے۔ اور اپنے معبود حقیقی سے ڈرتے تھے۔ ان کے مقابلے میں زینت قدرے روشن دماغ واقع ہوئی تھیں۔ ان کے مزاج میں تھوڑا سا تلوّن تھا۔ قوت فیصلہ تو مضبوط تھی مگر وہ ظاہر ایسا کرتی تھیں جیسے دوسروں سے مشورہ لیے بغیر کوئی عملی قدم ہی نہ اٹھا سکتی ہوں۔ مگر روشن اور آزاد خیال ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد فرض شناس اور میاں کے تیور دیکھ کر چلنے کی عادی تھیں۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ شوہر پر اتنی حاوی نہ تھیں جتنی کہ عام طور پر چہیتی بیویاں ہو جاتی ہیں۔

بہرکیف آپس میں انڈر اسٹینڈنگ تھی اس لیے بڑی اچھی طرح نباہ ہو رہا تھا۔ قدرت نے انہیں مزید دو بیٹیوں سے نوازا تھا۔ اس لیے اسفند کی اہمیت کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔

سردار محمد اسفند اپنے نام کے آگے باپ کا نام لکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ عجیب سی خصلت اور عادات کا مالک تھا وہ بھی۔ یا دوسرے معنوں میں وہ باپ سے زیادہ دادا کی خصلت اور مزاج اس کے اندر حلول کر گئی تھیں۔ اس لیے سخت لاابالی ہونے کے ساتھ ساتھ خشک مزاج اور تند خو بھی تھا۔ کچھ بے جا اور بے انتہا لاڈ و پیار نے بھی اس کے مزاج میں غصہ اور تمکنت سی پیدا کردی تھی۔ اس پر بہنوں کے مقابلے میں خود کو کسی بزرگ سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ اس لیے خاص طور پر نازبرور کو ہمیشہ ہی ارمان رہا کہ اس کا اکلوتا بھائی کبھی تو ہنس کر اس سے بات کرے یا کم از کم اس کے ساتھ کھیلے، لڑے اور ناز اٹھائے جیسے گھر میں شریک ہو جائے۔ مگر کبھی وہ سیدھے منہ اس سے بات ہی نہ کرتا تھا۔ بلکہ ہمیشہ اپنی بڑائی کا رعب ہی جھاڑتا نظر آتا تھا۔ گھر میں صرف نیلما ہی تھی۔ سب سے چھوٹی ہونے کی وجہ سے جس سے کبھی وہ ہنس بول لیتا تھا۔ باپ سے زیادہ وہ اس کی دوستی چاہتی تھی۔

باپ سے تو وہ صرف ضرورتاً ہی بات کرتا تھا۔ ماں سے بھی وہ اتنا فری نہ تھا جیسے کہ عموماً اکلوتے اور لاڈلے بیٹے ہوتے ہیں۔ اگر کسی کو چاہتا تھا اور کسی سے فری تھا تو وہ اس کی دادی سلمیٰ بیگم ہی تھیں۔ جن کے پاس بیٹھ کر وہ پہروں باتیں کرتا رہتا تھا۔ اور انہیں سے اپنی شکایتیں اور دکھ سکھ کہتا تھا اور سوتیلی ساس ہونے کی وجہ سے زینت اس بات پر بہت خار کھاتی تھیں۔ یوں تو شعیب منصور کے دل میں بھی سوتیلے پن کا احساس ضرور تھا مگر سلمیٰ بیگم کی خدمت اور خلوص کے آگے وہ خود کو بے بس سا محسوس کرتے تھے۔ اور اسی وجہ سے بیوی کے شکوے شکایتوں کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دیتے تھے۔

بہرحال یہ تو اس وقت تک کی باتیں تھیں جب اسفند لڑکپن کے دور میں تھا۔ اس کے بعد تو کاروبار میں توسیع ہو جانے کے بعد شعیب منصور کراچی چلے آئے تھے۔ اور وہاں مستقل اقامت اختیار کرلی۔ بلکہ بنگلور ٹاؤن میں ہی ڈرگ روڈ پر ایک عالیشان بنگلہ بھی تعمیر کرا لیا تھا۔ جس میں اب ان کی اقامت تھی۔

بیٹیاں بھی اسکولوں کی سرحدیں پار کر کے کالجوں میں پہنچ گئی تھیں اور بیٹا میڈیکل سائنس کی سب سے اعلیٰ ڈگری حاصل کرنے کے بعد ڈاکٹریٹ کرنے کی غرض سے بیرون ممالک جانے کے لیے پر تول رہا تھا۔ ہوش سنبھالنے کے بعد اس کے مزاج میں سنجیدگی اور بردباری آگئی تھی۔ نیز دادا اور ابا کے بعد تعلیم نے کسی حد تک اسے واکر لیے تھے۔ اس لیے رشتوں کی پہچان کا شعور بھی آگیا تھا۔ مزاج میں وہ طنطنہ اور بد خلقی بھی بڑی حد تک کم ہوگئی تھی۔ والدین کے مرتبے کا بھی احساس ہوگیا تھا۔ اور بہنوں کی حیثیت کا بھی۔ مگر ایک عادت سی بن گئی تھی۔ سیے و دیے رہنے کی۔ اس لیے ایک گھر میں رہ کر بھی وہ سب سے الگ تھلگ سا رہتا تھا۔ ایک ماں ہی تھیں جو ہر وقت اس کی ناز برداریوں میں لگی رہتی تھیں۔

پھر ایک دن وہ عازم سفر ہوا اور پورے چار برس تک دیار غیر کی آزاد فضاؤں میں سانس لیتا رہا۔ ایک تو باپ بھی اخراجات کے لیے ایک معقول رقم بھیجتے تھے اس پر اس کی زیرک و ذہین رہنے کی عادت اور مزاج میں طنطنے نے اور کچھ وہاں جا کر ایک انسٹی ٹیوٹ میں ٹیوشن پڑھانے کی وجہ سے اسے اتنا وقت ہی نہ ملا کہ وہ وہاں کی آزاد اور اخلاقی قیود سے باہر نکلی ہوئی رنگین فضاؤں میں بھٹک جاتا۔ اس پر مستزاد گھر اور اپنے لیے زیادہ چاہنے والوں اور پیاروں سے وہ دور چلا گیا تھا۔ تو وہاں کی اجنبی فضاؤں میں اپنی کوتاہیوں کا خیال گھومتا کہ اسے ایک پچھتاوا اس کے ذہن پر مسلط رہتا تھا۔ گھر اور ملک سے باہر جانے کے بعد انسان کو اپنے گھر والوں کی قدر و قیمت معلوم ہوتی ہے۔ اور یہ احساس کبھی کبھی خون کے آنسو رلا دیتا ہے۔ ہر چند کہ اسفند سخت لاابالی اور بے پروا فطرت کا حامل تھا۔ لیکن یہ احساس ایک پچھتاوا بن کر ذہن اسے تکلیف پہنچاتا رہا تھا۔ گو وہاں کے ماحول میں انسان کو بہت چست اور چاق و چوبند رہنا پڑتا ہے کہ ہر کام حتیٰ کہ ضروریات زندگی سے متعلق امور بھی وقت کی پیمائش میں محدود کر کے انجام دیے جاتے ہیں۔ اصل میں بیرونی ممالک کی روز افزوں ترقی کا راز یہی ہے کہ وہاں وقت کی قدر کی جاتی ہے۔

ہر شعبہ زندگی میں ہر بات اور ہر معاملے میں وقت کو ہی اہمیت دی جاتی ہے۔ گویا انسان وقت کو نہیں بلکہ وقت انسان کو گزارتا ہے۔

اپنے تعلیمی مشاغل، نصابی سرگرمیوں اور ٹیوشن پڑھانے سے اسفند کو اتنی فرصت ملتی ہی نہ تھی کہ وہ فارغ الذہن ہو کر کچھ سوچ سکے۔ شام تک وہ اتنا تھک جاتا تھا کہ لیٹتے ہی نیند آجاتی تھی۔ مگر لیٹنے کے بعد نیند آنے تک کے قلیل عرصے میں کبھی اپنوں کی یاد آجاتی تو خیالات کے سائے دھانے گھر کی طرف ہی بھٹکنے لگتے تھے۔

بہرحال پورے چار برس کے بعد ڈاکٹریٹ کی ڈگری لینے یا علم کے سمندر کی گہرائیاں ناپنے کی وجہ سے وہ زینت کے بقول انسان بن کے یا مکمل کر نہیں آیا تھا۔ بلکہ یہ اس کے احساسات کی بیداری تھی جس نے اسے ایک دم تبدیل سا کر کے رکھ دیا تھا۔ اور شعیب منصور کو یہ بات یا خیال کچھ غلط نہ تھا کہ باہر کے ماحول نے اس کے اندر کا جمود توڑ دیا ہے۔ اب وہ باپ سے بھی کھل مل کر بات کرتا تھا۔ ماں کے کمرے میں بھی نظر آتا تھا اور بہنوں سے بھی ہنس بول لیتا تھا۔ سلمیٰ بیگم اب کافی ضعیف ہوگئی تھیں۔ اس پر وہ ان کے بقول انگلستان سدھار گیا تھا۔ اس لیے گھر انہیں کاٹنے کو دوڑتا تھا اور وہ اپنے بھائی کے یہاں چلی گئی تھیں۔ مگر اس نے آتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا تھا کہ انہیں ان کے بھائی کے گھر سے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ اسے وطن واپس آئے صرف تین ماہ ہی ہوئے تھے۔ نازپرور کی نسبت تو اس کے ۔۔۔ آنے سے پہلے ہی طے ہو چکی تھی۔ مگر اس کے آنے کے فوراً بعد ہی شادی کی تاریخ بھی مقرر ہوگئی تھی۔ اور جیسے زور و شور سے شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہا جا سکتا تھا۔ کہ اس کے چند نادر دوست پاکستان کی سیاحت کی غرض سے آگئے گو ان کا پروگرام تو بھارت اور نیپال وغیرہ تک جانے کا تھا مگر چونکہ وہ کراچی آئے تھے اس لیے وہ انہیں وادی کاغان اور سوات وغیرہ کی سیر کرانے کی غرض سے لے گیا تھا۔ اور پورے پندرہ روز ہوگئے تھے اسے گئے ہوئے۔

اگلے روز سے شادی کی رسومات شروع ہونے والی تھیں اور اس کا کوئی پتا اور نشان نہیں تھا۔ اور اسی بات پر زینت سخت پتا سی ہو رہی تھیں کہ گھر کی بڑی اولاد تھا۔ بڑا بھائی جس کی موجودگی نہ صرف بہت ضروری تھی بلکہ اصل میں تو اسے ہی بڑھ چڑھ کر بہن کی شادی میں حصہ لینا چاہیے تھا۔ مگر اسے کسی بات کی کچھ پروا ہی نہ تھی۔ جب کہ سہیل منصور جنہوں نے شادی کے بعد کینیڈا میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ شادی سے ایک ماہ قبل ہی اہل و عیال کراچی آگئے تھے۔ انہوں نے بھی کینیڈا میں ہی اپنی ایک ہم جماعت پاکستانی لڑکی سے شادی کی تھی جس سے ان کی ایک بیٹی تھی کوثر جو نیلما کی ہم عمر تھی۔

رات گیارہ بجے کا عمل تھا۔ بزرگ پارٹی اپنے اپنے کمروں میں محو خواب تھی۔ لیکن نازپرور کے کمرے میں اس کے تیز و شیلوں اور گہما گہمی کی وجہ سے دن کا سا سماں ہو رہا تھا۔ کہ آج دوپہر سے ہی مہمان آنے شروع ہو گئے تھے۔ اور نازپرور کی دونوں بہنوں نیلوفر اور نیلما سمیت چچازاد اور ماموں زاد، خالہ زاد اور شعیب منصور کی فرسٹ کزن کی لڑکی بھی موجود تھی اور سلوطی بھی۔ ایک کونے میں رکھے بیڈ پر بیٹھی تھی۔ سامنے قالین پر دیوار کے قریب کپڑے میں بندھی ڈھولک! دو بار سوئم بھی رکھا ہوا تھا۔ لڑکیاں آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ تمام گفتگو نازپرور کی شادی کے بارے میں ہو رہی تھی۔ بوریت کے آثار تقریباً سب کے ہی چہروں سے ہویدا تھے کہ نیلما نے کسی کے سوال کے جواب میں بڑی بیزاری سے کہا۔

"ہاں، پتا نہیں یہ ممی کو کیا سوجھی جو مایوں کی رسم کل پر ملتوی کر دی۔ ورنہ اس وقت ہم کتنا انجوائے کر رہے ہوتے۔"

"لیکن مایوں کی رسم پر ہی کیا موقوف ہے۔ گانے تو آج سے بھی شروع کیے جا سکتے ہیں۔ پہلے زمانے میں تو سنا ہے کہ مہینہ بھر پہلے سے ہی دروازے پر نوبت رکھ دی جاتی تھی، اور شادی کے گیت گائے جاتے تھے۔" نازپرور کی ماموں زاد عمیرہ نے کہا جو نازپرور کی ہی ہم عمر تھی۔

"ہاں واقعی۔ یہ تو خوشی کا موقع ہے کوئی ضروری تو نہیں کہ مایوں والے دن سے ہی گانا بجانا شروع کیا جاتا۔ سچ ہم تو اگر پہلے سے آجاتے تو کب سے ہی شادی کے گیت شروع کر دیتے۔" شعیب منصور کی فرسٹ کزن کی لڑکی یعنی نازپرور کی پھوپھی زاد درخشاں بولی۔ یہ بھی نازپرور کی ہم عمر ہی تھی۔

"تو پھر بسم اللہ آپ ابھی سے شروع کر دیجیے تاکہ اس بوریت سے کچھ تو نجات ملے۔" اسماء بولی، جو نازپرور کی خالہ زاد تھی۔

"نہیں بھئی اس وقت گیارہ بج رہے ہیں۔ تمہارے شور شرابے سے بزرگ لوگ ڈسٹرب ہو جائیں گے۔" نازپرور نے کہا۔

"اب اس ڈسٹربنس کو چند روز کے لیے تو ان لوگوں کو برداشت ہی کرنا پڑے گا، ویسے بھی تو آپ کا بیڈ روم الگ تھلگ ہے۔" نیلوفر نے کہا۔

"دراصل میں ناز و آپا نخلیے کی ریہرسل کرنا چاہتی ہیں۔ جبھی تو ہمیں کسی طرح یہاں سے ٹالنا چاہ رہی ہیں۔" عمیرہ ہنس کر بولی۔

"نہیں خیر ایسی تو کوئی بات نہیں۔" نازپرور لجا کر بولی۔

"مگر آپا اس طرح مل بیٹھنے کے مواقع ——— بار بار تو نہیں آتے کہ تقریباً ساری کزنز اکٹھی ہوں۔ ایسے میں تھوڑا بہت انجوائے تو کرنا چاہیے نا۔" نیلما سب سے زیادہ بوریت محسوس کر رہی تھی۔

"ہاں اور مشکل تو یہ ہے کہ ہمیں نیند بھی نہیں آرہی۔ نیند اگر آتا نہیں تو کم از کم کوئی اور شغل ہی ہونا چاہیے۔" حمیرا نے نیلما کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

"ارے ہاں واقعی کیوں نا ان ڈور گیمز ہی کھیل لیتے ہیں۔" حمیرا کی تجویز پر نیلما نے اپنی جمائی روک کر کہا۔

"ان ڈور گیم؟ مگر کونسا؟ کارڈز، کیرم ——— کرکٹ، اسکریبل ... جو بھی کھیلو گی اس میں اتنے سارے پارٹنرز تو شریک نہیں ہو سکیں گے، جتنے یہاں موجود ہیں۔" نیلوفر نے نکتہ چینی کرنے کے سے انداز میں کہا۔

"تو پھر تم ہی بتاؤ کہ کونسا گیم ہو جو دلچسپ بھی رہے گا۔ ہم سب کے لیے۔" حمیرا کتاہٹ سے بولی۔

"کوڑا جمال شاہی۔" درخشاں نے برجستگی سے کہا تو سب کو ہنسی آگئی۔

"یہ کوڑا جمال کے بجائے اگر کوڑا جلال شاہی ہوتا تو کچھ بات بھی بنتی معنوی اعتبار سے یعنی جلال شاہی کا کوڑا۔" اسماء ہنسنے کے بعد بولی۔

"بھئی اصل میں یہ کھیل تاریخی نوعیت رکھتا ہے۔" نیلوفر کچھ سوچ کر بولی۔

"اچھا۔ کیا واقعی!" نفیسہ نے تعجب سے پوچھا، جو نیلوفر کی خالہ زاد تھی۔

"ہاں بھئی۔ پرانے زمانے میں ایک بادشاہ ہوا کرتا تھا جمال شاہ۔ مگر فطرت اور مزاج کے اعتبار سے وہ اپنے نام کی ضد تھا۔

۔ اس نے اپنے فریادیوں کا منہ بند کرنے کے لیے ایک ایسی سزا تجویز کی کہ وہ کسی نہ کسی بہانے فریادیوں کو جمع کرتا تھا اور ایک دائرے کی صورت میں کھڑا کر کے اپنے سپاہیوں کے ہاتھوں میں شاہی کوڑے تھما دیتا تھا اور وہ سپاہی فریادیوں کے چاروں طرف گھومتے رہتے تھے اور با آواز بلند پوچھتے تھے کہ بتاؤ کس کو کیا شکایت ہے۔ اور جو فریادی بھی پلٹ کر اپنی شکایات پیش کرتا تھا اسے کوڑے مار مار کر ادھ موا کر دیتے تھے۔"

نیلوفر نے جس طرح سوچ سوچ کر یہ ساری حکایت بیان کی تھی، درخشاں کو سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ گپ ہانک رہی ہے۔ اس پر نازپرور نے بھی جو اپنے بیڈ پر بیٹھی تھی گھٹنوں میں منہ دے کر اپنی مسکراہٹ چھپائی۔

"چلو چلو اب اتنی بڑی گپ نہ ہانکو کہ ایک معمولی سے کھیل کو ہسٹوریکل میٹر پر بھی پیش کر دیا۔" درخشاں نے جتانے والے انداز میں ہنس کر کہا۔

"ہاں ہاں واقعی۔ اور یہ بھول گئیں کہ کوڑے سے کسی کو مارا نہیں جاتا بلکہ جس کے پیچھے کوڑا رکھا جاتا ہے۔ وہ اٹھ کر رکھنے والے کو مارتا ہے۔" عمیرہ نے بھی ٹھٹھہ مار کر کہا۔ تو سب لڑکیاں ہنسنے لگیں۔

"نہیں خیر کھیل تو یہ تاریخی نوعیت کا ہی ہے مگر نیلوفر نے اسے لیجنڈ بنا کر پیش کیا ہے۔" نازپرور مسکرا کر بولی۔

"اف تو یہ کیا فضول بحث لے کر بیٹھ گئے آپ لوگ۔ بور کرنے کی حد ہوتی ہے۔" نیلما بڑی بیزاری سے بولی۔

"اصل میں نیلوفر کی سمجھ میں کوئی موزوں گیم نہیں آیا ہوگا نا۔ اس لیے یہ قصے کہانیاں سنانے میں لگ گئیں۔" حمیرا جلے کٹے انداز میں بولی۔

"اگر مجھ سے پوچھتی ہو تو میں یہی مشورہ دوں گی کہ اب جا کر آرام سے سو جاؤ کیونکہ یوں بھی گیارہ بج چکے ہیں۔" نازپرور نے کہا۔

"جی ہاں بڑا سو جاؤ۔ سب سے زیادہ تو آپ ہی بور کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ ورنہ سوتے تو ہم روز ہیں مگر رتجگے کے مواقع بار بار تو نہیں آتے نا۔" بہن کے مشورے پر نیلما چمک کر بولی۔

"تو پھر سوچو ناں کونسا شغل اختیار کیا جائے یوں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنا بھی تو اچھا نہیں لگ رہا۔" سہیل منصور کی بیٹی کوثر جو اتنی دیر سے خاموش بیٹھی سب کی باتیں سن رہی تھی زچ ہو کر بولی۔

"سوچ لیا، سوچ لیا۔" تبھی نیلوفر نے پنجوں پر تھوڑا سا اچکتے ہوئے کہا۔

"کیا؟" سب نے یک زبان ہو کر پوچھا۔

"آنکھ مچولی۔" نیلوفر نے بتایا۔

"ارے ہاں اچھا بڑا مزہ آئے گا۔ پلیز آپا۔" نیلما بہن کی تجویز پر خوش ہو کر نازپرور سے بولی۔

"دماغ تو نہیں چل گیا تمہارا۔ بھلا میں اس وقت تمہارے ساتھ آنکھ مچولی کھیلوں گی۔" نازپرور دراصل آنکھیں دکھاتی ہوئی بولی۔

"کیوں آج کیا خاص یا غیر معمولی بات ہو گئی آپا؟ آپ تو اکثر و بیشتر ہمارے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتی ہی رہتی ہیں۔" نیلما نے کہا۔

"ہاں اور ابھی تو آپ مایوں بھی نہیں بیٹھیں کہ کمرے سے نکلنے پر پابندی عائد ہو۔"

"اور دو روز تک ان کے کام آنے کا احتمال ہی ہو سکتا ہے۔" درخشاں نے حمیرا کی بات میں گویا حاشیہ لگایا تو ایک بار پھر سب لڑکیاں ہنسنے لگیں۔

"ارے دیکھیں نا آپا! کس غضب کی سحر انگیز چاندنی ہے۔" نیلوفر جو اس اثنا میں کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی تھی۔ کھڑکی کا پردہ سمیٹ کر باہر بکھری ہوئی کیف بداماں چاندنی پر ایک نظر ڈال کر نازپرور سے کہا۔

"ارے ہاں آج تو فل مون ہے نا۔ اس پر موسم بھی عاشقانہ سا ہو رہا ہے۔ بس اب جلدی سے اٹھ جائیں آپا!" نیلما نے بھی میٹھے میٹھے پن سے لپک کر کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں اٹھیں نا پلیز ناز و آپا! کل سے تو آپ مایوں بیٹھ کر گوشہ نشین ہی نہیں بلکہ پردہ نشین بھی ہو جائیں گی۔" حمیرا نے بھی نیلما کے اشارے پر اصرار کیا۔

"ہاں اور اس کے بعد تو شاید کبھی ایسا موقع نصیب ہو بلکہ ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ شادی کے بعد تو لڑکیاں بالکل ہی بدل کر رہ جاتی ہیں۔" میزبان بہن عمیرہ بولی۔

"کیوں کیا شادی کے بعد لڑکیوں کے سینگ وینگ نکل آتے ہیں؟" نازپرور نے ہنس کر پوچھا۔

"نہیں سینگ وینگ تو نہیں نکل آتے البتہ ایک بغیر سینگوں والا مینڈھا ہر دم خدائی فوجدار کی طرح قابض ہو رہتا ہے۔" درخشاں نے کہا تو ایک قہقہہ پڑا۔

"اف توبہ کس بری طرح وقت کے ساتھ ناانصافی کر رہی ہیں اپیا آپ پتا بھی ہے ساڑھے گیارہ ہو چکے ہیں۔ اب آپ کی ناں ناں میں دو بج گئے تو اندر سونے والے یہی سمجھیں گے کہ پائیں باغ میں رات کی بلائیں نازل ہو گئی ہیں۔" نیلما نے خفگی کے انداز میں کہا۔

"تم ویسے بھی کسی بلا سے کم ہو کیا جو پیچھے جھاڑ کر میرے پیچھے ہی پڑ گئیں۔ اب بھلا اتنی رات گئے پائیں باغ میں آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے کسی زہریلے کیڑے نے ڈس لیا تو۔" نازپرور نے انہیں یوں ڈرایا کہ کسی نہ کسی طور پر وہ خود کو کھیل سے بچانا چاہ رہی تھی۔

"اوہو بہانہ بازی نہیں بلکہ بہانہ سازی کوئی اپیا سے سیکھے۔" نیلما زچ ہو کر بولی۔

"یوں بھی کون بیوقوف اس وقت آنکھ مچولی کھیلیں مکمل ہے اپیا! پائیں باغ میں چھپنے کی جگہ ہی کہاں ہے ہم تو وہ بلائنڈ بفلیو کھیلیں گے آج۔ آپ کو تو یہ کھیل بہت پسند ہے اپیا!" نیلوفر نے جو ہمیشہ اپنی ہی چلانے کی عادی تھی۔ کھیل کا فیصلہ سناتے ہوئے نازپرور سے کہا۔

"بلائنڈ بفلیو۔" سب نے زیر لب کہا۔

"ہا ہا ہاؤ فنی — کچھ گئی سمجھ گئی۔ مگر سیدھی سیدھی طرح اردو میں ہی کیوں نہ کہہ دیا۔ کہ اندھا بھینسا کھیلنے کو جی چاہ رہا ہے۔" حمیرا چمکتی آنکھوں کے ساتھ ہنستی ہوئی بولی۔

"یعنی اصل میں اردو میں بہت غیر شاعرانہ سا بن جاتا ہے یہ "اندھا بھینسا" کا لفظ۔" نیلوفر نے گویا وضاحت کی۔

"نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ——— یہ نیلوفر خود کو ایشین گیمز ایتھلیٹ سمجھتی ہیں نا اس لیے — اس لیے ہر گیم کو انٹرنیشنل میٹر پر رکھ کر بات کرتی ہیں۔" نیلما نے ہنس کر فقرہ چست کیا، تو کوثر ہنستے ہنستے دوہری ہو گئی۔ مگر نیلوفر جھینپنے یا خفیف ہونے کے بجائے بڑی متانت سے بولی۔

"یعنی اصل میں انگریزی میں ہونے سے معمولی گیم کو بھی بین الاقوامی سطح پر رکھ کر پیش کیا جائے تو اس کی قدر و منزلت بڑھ جاتی ہے۔"

"اوہ! ہر بات کو اتنا طول کیوں کھینچنے لگتے ہیں آپ لوگ۔ اب کسی طرح اٹھو بھی چکیں۔" نیلما پر بس کھیل کی ہی دھن سوار تھی۔

"ہاں بھئی اٹھو ورنہ ہم ڈنڈا ڈولی کر کے بھی تمہیں باہر لے جا سکتے ہیں۔" سمیرا نے گویا وارننگ دی۔

"ہاں چلو اٹھو تمہاری خاطر آج میں بھی اس کھیل میں شریک ہو جاؤں گی۔" درخشاں بولی۔

"آہا بڑی نوازش بڑا کرم ہے آپ کا جو آپ نے خود ہی اعلان کر دیا ورنہ آپ کی اطلاع کو ہم تو اس کمرے کی جگہ کسی پر آپ کو مامور کرنا کبھی گوارا نہ کرتے۔" نیلما ہنس کر بولی۔

"ارے یہ نیلما تو بڑی تیز ہو گئی ہے"

"تسلیمات! مگر اب باتوں میں وقت ضائع نہ کریں۔ اور کسی طرح اپیا کو لے کر باہر آ جائیں۔" نیلما نے کہا۔

"او کے ڈیئر کزن — آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔" حمیرا بڑے کھلے سے انداز میں بولی پھر سب نازپرور کو زبردستی کھینچ کر باہر لے جانے لگیں تو عمیرہ نے سلوطہ کی طرف دیکھ کر آہستہ سے نیلوفر کے کان میں کچھ کہا تو نیلوفر چلتے چلتے پلٹ کر اس سے بولی۔

"آپ بھی آ جائیے ناں سلوطہ! یہ ہمیشہ اپنی ڈریم ہوائیٹ کی الگ تھلگ کر کے بیٹھ جاتی ہیں۔" کہنے کا انداز بھی ایسا کٹیلا سا تھا کہ عمیرہ بھی محسوس کیے بغیر نہ رہی اور اس کے نزدیک آ کر بولی۔

"میں تو آپ کی خاموشی کو آپ کی آمادگی پر محمول کر رہی تھی اور آپ ہیں کہ ابھی تک یہیں بیٹھی ہیں۔ آئیے چلیے نا پلیز۔"

"نہیں نہیں میں بھلا آپ سب کے ساتھ کھیلتی کیا اچھی لگوں گی عمیرہ! آپ سب بچیاں ہیں۔ آپ کی عمر سے بیٹھنے کی مجھے تو معاف ہی رکھیے۔" سلوطہ نے کہا۔

"اوہ بچیاں —" نیلما منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگی۔

"ایمان سے آپ نے تو دادی اماں کو بھی مات کیا سلوطہ آپا! آپ خود کیا ہیں یوں کس پینسٹھ اور خزاں بیوہ کی مالکہ ہیں۔ ہم سے پوچھیے۔" کوثر بولی۔

"ہاں ہاں بھئی، وہ تو ہم بھی دیکھ رہے ہیں مگر یہ کچھ زیادہ ہی اپنی تعریف کرانا چاہتی ہیں۔" حمیرا بولی۔

"نہیں نہیں میں ایسی کسی خوش فہمی میں مبتلا ہوں نہ کسی بات کی داد ہی چاہتی ہوں۔" سلوطہ نے مسکرا کر کہا۔

"اوہو۔ بہت کسر نفسی سے کام لے رہی ہیں آپ تو۔" نیلما چھیڑنے کے انداز میں بولی۔

"اوہ بھئی کن فضولیات میں پڑ گئیں تم۔ چلو جلدی سے باہر چلو۔ اتنی مشکلوں سے تو اپیا تیار ہوئی ہیں اگر دوبارہ اندر آ گئیں تو پھر کوئی طاقت بھی انہیں باہر نہیں لے جا سکے گی۔" نیلوفر نے بڑی ناگواری سے کہا۔

"ہاں ہاں بھئی! آپ لوگ جائیے نا۔ میری وجہ سے بیکار میں اپنا وقت کیوں برباد کر رہی ہیں۔" سلوطہ کوثر اور عمیرہ وغیرہ سے بولی۔

"نہیں جناب آپ کو ہر قیمت پر ہمارے ساتھ چلنا ہو گا۔ چلیں اٹھیں ابھی اسی۔" سمیرا نے کہا۔ اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانے لگی۔ تو ناچار اسے بھی اٹھنا ہی پڑا۔

باہر وسیع و بسیط آسمان پر بدر کامل اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ اپنی نور افشاں چاندنی کے خم پر خم لٹاتا نظر آ رہا تھا۔ طویل و عریض پائیں باغ کے گوشے گوشے پر پھیلی ہوئی چاندنی کے طلسم کا گمان ہو رہا تھا۔

ہوائیں بھی پھولوں کی خوشبو چراتے بڑی شوخ سی ہو رہی تھیں۔

وہ سب کی سب یعنی نازپرور، نیلوفر، نیلما، درخشاں، اسماء، حمیرا، عمیرہ، کوثر، فضیلہ، فضیلہ کی چھوٹی بہن راحیلہ جو نیلما سے بھی چھوٹی تھی اور سلوطہ۔ کچھ دیر تک تو منظر کی سحر انگیزی میں کھوئی رہیں پھر نیلوفر سب کو دائرے کی صورت میں کھڑا کر کے "[illegible]" کہتے ہوئے ہر لفظ کے ساتھ ہر لڑکی کے سینے پہ انگلی رکھتی گئی مگر چونکہ لڑکیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اس لیے دس کا لفظ آنے کے بعد بھی چار لڑکیاں باقی رہ گئیں۔ لہٰذا طے یہ ہوا کہ نازپرور آنکھوں پر دوپٹہ باندھ کر جس لڑکی پر ہاتھ رکھے گی وہی اندھا بھینسا بنے گی۔ چنانچہ یہی ترکیب آزمائی گئی اور سب سے پہلے درخشاں ہی چور بنی اور یوں گویا کھیل شروع ہو گیا۔

"دیکھو چیخنے چلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ورنہ میں اندر چلی جاؤں گی۔" کھیل کے آغاز پر ایک بار پھر نازپرور نے تاکید کی۔

"ہاں ہاں بھئی دادی اماں بننے کی کوشش نہ کرو۔ ہم کوئی بچیاں نہیں ہیں جو کلکاریاں مار مار کے گھر تو کیا محلے والوں کو جگا دیں گے۔" عمیرہ چڑ کر بولی۔

"ناؤ لیں ریڈی۔" نیلوفر نے درخشاں کے دوپٹہ کس کر اس کی آنکھوں پر باندھنے کے بعد گویا کھیل شروع کرنے کا اعلان کیا۔ اور پھر کھیل شروع ہو گیا۔

باری باری سب لڑکیاں چور یا اندھا بھینسا بنتی رہیں۔

مگر سلوطہ جو چیرن کے اس کھیل میں شامل ہو گئی تھی اور بڑی پھرتی سے کھیل رہی تھی اب تک کسی کے ہاتھ نہیں آئی تھی اور آتی بھی کیسے وہ تو چور کی آنکھوں پر پٹی بندھتے ہی بھاگ کر دور جا کھڑی ہوتی۔ آخر کوثر اور عمیرہ کی ملی بھگت پر وہ ان کے ہاتھ آ ہی گئی تو سب نے اسے گھیر لیا۔ اور اس کے لاکھ منع کرنے کے باوجود اس کا ہی دوپٹہ کس کر اس کی آنکھوں پر باندھ دیا۔

"دیکھو بڑی مشکل سے ہاتھ آئی ہیں یہ انہیں ذرا لمبا چکر دینا۔" نیلوفر نے باری باری ساری لڑکیوں کو تاکید کی۔

اس کی آنکھوں پر پٹی بندھتے ہی وہ دور دور تک پھیل گئیں۔ پٹی بھی اس طرح کس کر باندھی گئی تھی نیلوفر نے کہ آنکھیں اور کنپٹیاں دکھنے کے علاوہ اسے سانس لینے میں بھی دقت محسوس ہو رہی تھی۔ اس پر آوازوں کی سمت کا اندازہ لگا کر مشکل سے ادھر بڑھنے لگتی۔ کبھی پیچھے خوب آتی اور کبھی دائیں بائیں مڑ جاتی مگر کوئی ہاتھ ہی نہ آتا کہ سب سرکتی سرکتی بہت دور چلی گئی تھیں ——— ———

اور نازپرور تو موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اندر چلی گئی تھی۔ اور اس کی تقلید میں درخشاں ———

نیلوفر اور عمیرہ بھی پیچھے سے اندر کھسک آئی تھیں۔ اب حمیرا، کوثر، اسماء، فضیلہ اور راحیلہ رہ گئی تھیں۔ جو سلوطہ کے بہت آگے نکل جانے پر بھاگ کر پھر پیچھے چلی گئی تھیں۔ مگر وہ یہی سمجھتی رہی کہ وہ قریب ہی کہیں کھڑی ہیں۔ ادھر آنکھوں پر پٹی کس کر بندھی ہونے کی وجہ سے کچھ اتنی تکلیف تھی کہ جی چاہ رہا تھا نوچ کر پھینک دے۔ اسی لیے وہ چیخ چیخ کر کہنے لگی۔

"دیکھو بے ایمانی نہیں چلے گی فرینڈز۔ اب مجھے زیادہ نہ تھکاؤ۔ یوں بھی تم لوگوں نے دوسروں کو تو اتنا دق نہیں کیا تھا۔ اب جلدی سے میرے قریب آ جاؤ ورنہ میں پٹی اتار پھینکوں گی پھر تم یہ نہ کہنا کہ میں نے بے ایمانی کی ہے۔" ابھی چند لمحے بعد ہی اسے اپنے بالکل قریب آہٹ سنائی دی۔ اندازہ لگا کر اس طرف بڑھی اور نکلتے ہی سمجھے اس نے "آہا پکڑ لیا نا" کہہ کر کسی کا بازو پکڑا ہی تھا کہ یوں لگا جیسے قیامت آ گئی ہو۔

ہاں وہ قیامت ہی کی ایک حرکت تھی۔

کیونکہ اگلے ہی لمحے دو انتہائی سخت اور کرخت ہاتھوں نے کچھ اتنی بے دردی سے اس کی آنکھوں پر مضبوطی سے بندھی پٹی کو

اطراف میں بڑی ہی خوبصورت ریلنگ لگی تھی اور وہ دونوں ہاتھوں میں طشت تھامے قدرے محتاط انداز میں نیچے دیکھتی تیسری سیڑھی پر آئی تھی کہ تبھی اس کی نظر نیچے سے آتے ایک شخص پر پڑی جو اپنی ہی کسی دھن میں ریلنگ سے نیچے دیکھتا اوپر آ رہا تھا۔ اُف۔ یہ تو دیو جانوروں سا انسان تھا۔ گو اس نے سلوط کو دیکھا نہیں تھا مگر اس کا رخ تو اسی کی طرف تھا۔ اس سے دوبارہ سامنا ہونے کے خیال سے ہی خوف سلوط کی سٹی گم ہو گئی تھی بلکہ وہ کچھ سہم سی گئی اور کچھ اتنی بوکھلائی کہ یہ بھی خیال نہ رہا کہ وہ سیڑھیاں اتر رہی ہے۔ پیر اگلی سیڑھی پر پڑنے کے بجائے تیسری سیڑھی پر پڑا تو وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ ادھر اس کے ہاتھوں میں اٹھن کے طشت بھی تھے ورنہ کم از کم ریلنگ کو ہی تھام لیتی۔ بس لڑھکتی ہوئی سیدھی اس پہاڑ پر گری تو وہ جو اس ساری صورت حال سے یکسر بے خبر اور لاعلم تیزی سے اوپر آ رہا تھا بری طرح اس کی لپیٹ میں آ کر لڑھکتا ہوا فرش پر جا گرا۔ ایک دم تو اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ یہ آفت ناگہانی اچانک کیسی ٹوٹ پڑی۔ اوپر سے ستم یہ ہوا کہ اٹھن کے دونوں طشت کچھ اس ترتیب سے اسی پر آ گرے تھے کہ نہ صرف اس کا نیا نیا سا لباس بلکہ چہرہ اور بال بھی اٹھن میں بری طرح تھڑ گئے تھے اور یہ دوسری مصیبت اس کے لیے سخت پریشان کن تھی۔ دھڑ۔ دھڑ۔ دھڑاک۔ دھم۔

ایک چھناکا ہی نہیں بلکہ دھماکا سا ہوا۔ تو قریب ہی ایک کمرے میں بیٹھی خواتین الٹی چیخ کرتی ہوئی باہر بھاگیں اور وہاں جا پہنچیں جس میں زینت سب سے آگے تھیں۔ بیچ میں قدم رکھتے ہی انہوں نے دیکھا سلوط دینے کی بجلی سیڑھی کے آگے گھٹنوں کے بل جھکی بیٹھی ہے اور وہ سر تا پاؤں اٹھن میں لتھڑا ہوا۔ اس کے سامنے کھڑا اپنی پاٹ دار آواز میں اسے چنگھاڑ رہا ہے۔

"کیا اندھی ہو جو دیکھ کر نہیں چلا جاتا۔ ایک تو اسکائی لیب کی طرح مجھ پر آ گریں کہ میری پسلیاں توڑ دیں۔ اس پر میرے کپڑوں کا بھی ستیاناس کر دیا۔ میں کوئی ہوا یا آدم خور تو نہیں تھا کہ جو تمہیں کچا چبا جاتا۔ نہ اتنا خوبصورت ہی ہوں کہ مجھے دیکھ کر تم پھسل پڑیں امپوسیبل کہیں کی۔"

"کیا ہوا۔ کیا بات ہو گئی سنی بیٹے۔؟" زینت نے اس کے قریب پہنچ کر سخت تردد کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"ہونا کیا تھا۔ کیا آپ دیکھ نہیں رہیں میری گت جو اس لڑکی کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ اس لڑکی نے" وہ سخت جھنجھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ مگر زینت بیٹے کی گت سے زیادہ اتنے سارے اٹھن کے ضائع ہو جانے پر دل ہی دل میں کھول رہی تھیں۔ انہوں نے سلوط کو مخاطب کر کے بڑے سخت لہجے میں پوچھا۔

"کیوں بھئی۔ یہ کیا حرکت تھی سلوط۔ اور یہ اٹھن تمہارے ہاتھ کیسے لگا؟" انہوں نے دوسرا سوال کیا تھا۔ مگر اتنے سارے لوگوں کے سامنے اپنی ذلت اور توہین۔ سلوط کی گردن کچھ زیادہ ہی جھک گئی۔

"جو ہونا تھا ہو چکا۔ یہ سب پوچھنے سے اب فائدہ ہی کیا ہو گا امی۔ غلطی سراسر آپ کی ہے جو آپ بلا جانے بوجھے نامعلوم کیسے کیسے نمونوں کو ملازم رکھ لیتی ہیں۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم پہلے انہیں ٹرینڈ تو کر لیا کیجیے۔"

"کیا ہوا۔ یہ کس کو ٹرینڈ کرنے کی ہدایت کی جا رہی ہے اور یہ آپ سب یہاں کیوں مجمع لگائے کھڑے ہیں؟" شعیب منصور جو تیار ہو کر اپنے کمرے سے برآمد ہوئے تھے بیٹے کو گرجتا اور کڑکتا دیکھ کر ادھر ہی چلے آئے تھے جہاں سب کھڑے تھے۔

"تماشا ہو رہا ہے اور یہاں" زینت جل کر منہ ہی منہ میں بولیں۔

شعیب منصور اسی اثنا میں بیٹے کے قریب آ گئے تھے۔ اس پر نظر پڑتے ہی مسکرا کر بولے۔

"یہ تم نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے سنی۔ کیا اٹھنا کھیلنے کا بہت ہی شوق چرایا تھا تمہیں؟"

"جی نہیں۔ مجھے نہیں۔ ان محترمہ کو ہی چرایا تھا۔ تبھی تو انہوں نے دو طشت پورے کے پورے میرے اوپر تھوپ دیے۔" وہ بے حد جلے کٹے انداز میں بولا۔

"ہائیں یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ یہ تو سلوط ہے۔ کسی اور نے تم سے یہ بیہودہ مذاق کیا ہو گا۔" شعیب منصور نے متعجب سے انداز میں کہا اور تبھی انہیں کچھ خیال آیا تو وہ تشویش بھرے انداز میں براہ راست سلوط سے مخاطب ہو کر بولے۔

"یہ تم اس پوزیشن میں کیوں بیٹھی ہو سلوط۔ آخر معاملہ کیا ہے؟" تو زینت بولیں۔

"معاملہ کیا ہو گا۔ سیڑھیوں سے پھسل گئی تھیں اس لیے اس پوزیشن میں بیٹھی ہیں۔"

"ہائیں۔ جیسی گر پڑی تھی اور تم لوگوں نے اٹھانے کی کوشش بھی نہیں کی اور اپنی اپنی بولیاں بولنے میں لگ گئے۔ کم از کم یہ تو دیکھ لیا ہوتا کہ اس کے کہیں چوٹ تو نہیں آئی۔" شعیب منصور نے ملامت بھرے انداز میں کہا اور پھر قدم بڑھا کر سلوط سے پوچھا۔

"تمہیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی بیٹی؟"

تب سلوط نے چہرے کے ساتھ ساتھ پلکوں کی چلمن اٹھا کر ایک نظر اسفند پر ڈالی اور پھر شعیب منصور کو دیکھ کر نفی میں سر ہلا دیا۔

"اچھا اچھا۔ تو یہاں کیوں بیٹھی ہو۔ چلو اٹھو میں تمہیں تمہارے کمرے میں چھوڑ آؤں۔" شعیب منصور اس کا بازو پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولے۔ اس کے گھٹنے اور کہنیاں چوٹ لگنے کی وجہ سے پھوڑا ہو رہی تھیں۔ اٹھ کر کھڑے ہونے میں اسے سخت دقت پیش آئی تھی۔ پھر بھی کسی نہ کسی طرح اپنی تکلیف پر قابو پاتے ہوئے وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ شعیب منصور سمجھ گئے تھے کہ اسے کافی چوٹ آئی ہے۔

"واہ! ہم تو شاید لوہے اور فولاد سے ڈھالے گئے ہیں جو دو ہزار پونڈ وزنی بم اچانک آ گرنے کے باوجود ہمیں ہماری چوٹ کا کسی کو خیال نہیں۔" وہ باپ کو سلوط پر اس قدر مہربان دیکھ کر سر کو جھٹکتے ہوئے بڑی ناگواری سے بولا۔ سارا غصہ تو اسے اپنے کپڑوں کی بربادی پر آ رہا تھا۔

"اگر آپ کے چوٹ بھی لگی ہے تو سمجھو یہ اچھا شگون ہے اسفند بھائی۔ اب دیکھ لیجیے گا تازہ کے بعد آپ کی ہی شادی ہو گی۔" عمیرہ جو کہ تازہ گاتے گاتے اٹھ کر سنی بیگم کے لیے چائے لانے کی غرض سے اسما کے ساتھ باہر آ گئی تھی اور بہت سی خواتین کو زینے کے آگے کھڑا دیکھ کر ادھر ہی آ گئی تھی اور اسفند کی ہیئت کذائی پر بری طرح ہنس رہی تھی۔ اس نے ہنس کر کہا۔ اور وہ تو پہلے ہی جلا بھنا سا ہو رہا تھا چیخ کر بولا۔

"ہاں۔ ہو گی تو مگر یہ بات بھی اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ تم سے ہرگز نہیں ہو گی۔" تو سب کے جواب پر عمیرہ کٹ کر بولی۔

"ہائے آپ تو بہت ہی بیہودہ ہیں اسفند بھائی!"

"ہاں۔ ہوں تو مگر تم سے کم ہی ہوں۔" اس نے پھر دوبدو کہا۔ اس کی بات پر سب کو ہنسی آ گئی اور عمیرہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔

شعیب منصور اس وقت وہیں کھڑے تھے اور اس نے باپ کا ادب و لحاظ بھی ملحوظ نہیں رکھا تھا۔ شعیب منصور کو ناگوار تو بہت گزرا مگر انہوں نے یوں ظاہر کیا جیسے سنا ہی نہ ہو۔ ادھر ادھر دیکھ کر سلوط کو سہارا دینے کی غرض سے اسما کو بلایا اور سلوط کو لے کر آگے بڑھ گئے۔

"ویسے بائی دی وے بھی۔ اس نئی دریافت کا سہرا کس کے سر ہے؟" اس نے جان کر انہیں ستانے کو اونچی آواز میں پوچھا تو زینت نے اسے گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"فضول باتیں نہ کرو۔ یہ سلوط تمہاری پھوپھو فاخرہ کی نند ہے۔ ثاقب بھائی کی بہن۔"

"ہاں بلکہ اکلوتی بہن۔" شعیب منصور کی فرسٹ کزن عائشہ نے گویا لقمہ لگایا۔

"اوہ۔ اچھا۔" اس تعجب انگیز انکشاف پر بھنویں اچکا کر وہ اسی قدر کہہ سکا اور تبھی زینب زینے سے نیچے آتی نظر آئیں۔ ان کی نظر پہلے اسفند ہی پر پڑی۔ وہ شاکی انداز میں بولیں۔

"لے لو۔ یہاں تو اٹھنا بھی کھیلا جا چکا اور مجھے کسی نے بتایا تک نہیں۔ بلوانا تو دور کی بات۔"

"ارے کیسا اٹھنا آپا! اٹھنے کا تو بیڑا ہی غرق کرا دیا آپ نے سلوط کے ہاتھ بھجوا کر۔" زینت زینے کے قریب ہو کر بولیں۔

"کیوں۔ خیر تو ہے۔ سلوط نے ایسا کیا کیا؟" زینب تیزی سے سیڑھیاں اترتی ہوئی تردد سے بولیں۔ اور آخری سیڑھی پر آ کر رک گئیں تو زینت نے ان کے قریب ہو کر انہیں سارے واقعہ کی تفصیل بتانے کے بعد کہا۔

"کھلی بدشگونی ہوئی ہے تو سچ آپا۔ مجھے تو بڑا وہم آ رہا ہے۔"

"ہاں بھئی وہم تو مجھے بھی آ رہا ہے۔"

"کس بات پر؟" زینب نے پوچھا۔

"لے لیجیے آپا۔ ایک تو کوئی کو لگنے سے پہلے ہی سارا اٹھنا ملیامیٹ ہو گیا۔ اس پر آپ نے بھیجا بھی تو کس کے ہاتھ۔" ان کے پوچھنے کے انداز پر ان کی بھاوج عفت جہاں چہک کر بولیں۔

"لے ہاں آپا بیگم! آپ کو بھی اسی کے ہاتھ بھجوانا رہ گیا تھا اٹھنا۔ اس پر سے گر بھی پڑا سارا کا سارا۔ کیا یہ وہم اور بدشگونی کی بات نہیں ہے!" عائشہ خانم بھی منہ زبان سے بولیں۔

"لے پڑھی لکھی ہو کر تم جاہلوں کی سی باتیں کیوں کر رہی ہو۔ آخر وہ بے چاری بھی ہماری تمہاری طرح انسان ہی ہے۔ اور تمہارے آگے تو بیٹیاں بھی ہیں ایسی بات نہ کرو جو خدا کو بری لگ جائے۔ اور اٹھنے کا کال تو نہیں پڑا۔ آدھے سے زیادہ تو اوپر بچا پڑا ہے۔ ابھی جا کر گندھوا لے ری بولی۔ اے ہاں ایسے کون سے اتنی گھوڑے لگیں گے اس کام میں۔" زینب نے تینوں کو بری طرح لتاڑا اور پلٹ کر اوپر چلی گئیں۔

"آخر بات کیا ہے زینت چاچی! یہ آپا فاخرہ کی نند کیا نحس ہے یا پھر بیوہ ہے؟" زینت کی ایک رشتے کی دیورانی نے پوچھا تو اسفند جو نہ جانے کیوں اور کس مقصد سے ابھی تک وہیں اپنی جگہ کھڑا کسی سوچ میں گم تھا اس نے چونک کر ماں کی طرف دیکھا اور ماں کا جواب سننے کے لیے ہمہ تن گوش سا ہو گیا۔ مگر۔ "نہیں خیر نحس ہے نہ بیوہ ہے" سے زیادہ وہ کوشش کے باوجود کچھ بھی نہ سن سکا کیونکہ شعیب منصور سلوط کو چھوڑ کر واپس آ گئے تھے۔ شاید اس لیے اپنی دیورانی کو پوری بات بتانے کا موقع نہیں ملا تھا۔

سب یہی سمجھ رہے تھے — وہی سب جو اس کی فطرت اور مزاج سے واقف تھے کہ چونکہ ابھی اس ڈرگت پر اس کا موڈ آف ہو چکا ہے اگر لیے وہ مایوں کی رسم میں شرکت نہیں کرے گا۔ زینت کو ملال ہی یہی تھا کہ اس کا کریم کلر سلک کا نیا اور قیمتی شلوار سوٹ جو اس نے خاص طور پر مایوں کی رسم پر پہننے کی غرض سے سلوایا تھا آچنے میں لت پت ہو کر بالکل ناکارہ ہو گیا ہے بلکہ وہ بخوبی جانتی تھیں کہ اب وہ لباس تو ضرور تبدیل کرے گا لیکن تیار ہو کر یا تو کہیں گھومنے پھرنے نکل جائے گا یا پھر کمرے میں بند ہو کر بیٹھ رہے گا۔ اس لیے وہ اس سے یہ بھی نہیں کہہ سکتی تھیں کہ جاؤ جلدی سے لباس تبدیل کر کے آجاؤ تاکہ مایوں کی رسم ادا کی جائے کیونکہ مایوں کی رسم میں باپ، بھائی، چچا، ماموں وغیرہ کی شرکت ضروری بھی جاتی تھی کہ کچھ لین دین کا معاملہ بھی ہوتا تھا۔ بس یہ سے انہوں نے اس سے بس اتنا ہی کہا۔

"اُف تمہارے سوٹ کا تو بالکل ہی ستیاناس ہو گیا۔ جاؤ بابا کم از کم انہیں تبدیل تو کر لو۔"

"ڈونٹ وری ماما جی — ستیاناس تو ہونا ہی تھا۔ آخر اپنا کیسے میں بھی تو داغ دھبے پڑ ہی جاتے سو اب پہلے سے ہی پڑ گئے ہیں۔ خیر اب تو میں ذرا اوپر جا رہا ہوں تاکہ خالہ امی کا تھوڑا سا ہاتھ بٹا دوں۔ تب تک آپ جا کر رسم کی تیاری کیجیے۔"

یہ اسفند یار کہہ رہا تھا اتنی صلاحیت اور دانشمندیت سے۔

شاید زندگی میں پہلی بار ان کی توقع کے خلاف اس نے اتنی معقولیت برتی تھی۔

انہیں اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

کچھ دیر وہ منہ کھولے تعجب سے دیکھتی رہیں۔

مگر پھر اسے اوپر کا رخ کرتے دیکھ کر مسرت سے جھومتے دل کے ساتھ عائشہ بیگم اور عفت سمیت دوسری خواتین کے ساتھ نازپرور کے کمرے میں چلی آئیں۔ لڑکیاں جو بڑی دیر سے سہاگ گیت گا رہی تھیں ان کے آنے کی غرض وغایت جان کر انہوں نے مایوں کا گیت شروع کر دیا۔

پیلا جوڑا پہن کے
تیل ابٹن لگا کے

ریشم کی سیج سجا کے
سنہرے چھپر تلے

نازو مایوں بیٹھے گی
بنو مایوں بیٹھے گی

چاند مکھڑا چھپا کے
بھیگی پلکیں جھکا کے

سپنے کے خواب سجا کے
خوب لجا شرما کے

نازو مایوں بیٹھے گی
گوری مایوں بیٹھے گی

"ارے یہ گانا وانا چھوڑو اور جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ معلوم بھی ہے بابا خود انہیں لے کر آ رہے ہیں۔" زینت نے بہت فخریہ لڑکیوں کو بتایا۔

"باجی کیا واقعی اسفند بھائی ابٹنا لے کر آ رہے ہیں؟ پھوپھو جان؟" ہمیرا نے جو ڈھولک بجا رہی تھی ہاتھ روک کر نہایت بے یقینی سے پوچھا۔

"ہاں ہاں بھئی واقعی۔ بھلا میں غلط بیانی سے کام کیوں لینے لگی؟" زینت کی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔

"واہ، ڈیئر! ازان کر یہ بات تو ناقابلِ یقین ہے۔" نیلوفر نے حسبِ عادت انگلش جھاڑی۔

"ہاں اگر سچ پوچھو تو اب سے کچھ دیر پہلے مجھے بھی یقین نہیں آیا تھا۔ مگر آج تو بابا نے کمال ہی کر دیا۔" زینت بولیں۔

"اچھا کیا کوئی خاص بات ہو گئی تھی؟" نیلو نے پوچھا۔

"خاص بات کیا، اصل میں ان کے کپڑوں پر ابٹنا گر گیا تھا۔ وہی نیا شلوار سوٹ جو سلوایا تھا اس پر — اور میں تو سمجھ رہی تھی کہ اب موڈ اتنا خراب ہو گا کہ وہ رسم میں شریک ہی نہ ہوں گے۔ مگر وہ تو خوشی خوشی ابٹنا لینے چل دیے اوپر اور مجھے تیار رہنے کا کہہ کر یہاں بھیج دیا۔"

زینت نے مختصر الفاظ میں بتائی۔

"لیکن خالہ جانی! تیاری تو ساری مکمل ہی ہے پھر آپ کس تیاری کی بات کر رہی ہیں؟" درخشاں نے پوچھا۔

"ہاں، اس وقت تو صرف انتظار کا مرحلہ درپیش ہے ورنہ تیار تو ہم کل سے ہی بیٹھے ہیں۔" شفیلہ نے ہنس کر کہا تو زینت بھی مسکرا دیں۔

"بس اب تمہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا تیزی سے بابا کسی دم آتے ہی ہوں گے۔"

نازپرور کا کمرہ بہت بڑا تو نہیں مگر خاصا کشادہ تھا۔ داخلی دروازہ کمرے کی دیوار کے بیچوں بیچ تھا اور دروازے کے مقابل کی دیوار میں کھڑکیاں بنی ہوئی تھیں جن پر گلابی شیڈ کے پھول دار پردے پڑے ہوئے تھے۔ دائیں طرف دائیں ہی کونے میں کمرے سے ملحق بیچ غسل خانہ تھا اور دائیں ہی طرف کھڑکیوں کے آگے اس کا بیڈ پڑا تھا۔ بیڈ کے پاس ہی دروازے کے قریب ہی چھوٹی سی کھونٹی تھی جو کونے میں رکھی تھی اور بیڈ سے تھوڑے فاصلے پر کھڑکیوں کے آگے اور دیوار کے ساتھ ساتھ صوفے ہی صوفے رکھے تھے۔ بائیں سمت بیڈ کے عین مقابل میں اور کمرے کے دوسرے سرے پر ایک دیوان پڑا تھا اور بائیں طرف بھی دیوار کے ساتھ دروازے تک صوفے رکھے گئے تھے۔ فرش پر بچھے ہوئے گلابی رنگ کا قالین بچھا تھا بڑی عمروں کی خواتین صوفوں اور دیوان پر بیٹھی تھیں جن میں گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے سلمیٰ بیگم بھی ایک طمطراق سے متمکن تھیں اور نیچے قالین پر۔ تو شادی شدہ لڑکیاں اور عورتیں بکھری ہوئی تھیں اور آدھے کمرے میں نازپرور کی بہنیں، کزنز اور سہیلیاں بیٹھی تھیں۔ گویا کمرے میں اس وقت تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ حتیٰ کہ نازپرور کے بیڈ پر بھی اس کے ساتھ بہت سی لڑکیاں بیٹھی تھیں اور وہیں ایک طرف ایک تپائی پر پھولوں کے دونے رکھے تھے۔

زینت اپنی ذرد ساڑھی سنبھالتی اور سب کے درمیان میں سے اپنی جگہ بناتی آگے بڑھیں تو ان کی نظر سب سے پہلے پھولوں کے دونوں پر ہی پڑی۔ انہوں نے جھک کر دونوں کو چھوتے ہوئے پوچھا۔

"ارے یہ پھول کس مصرف کے لیے منگائے ہیں۔ کیوں چچی جان مایوں کی رسم میں دلہن کو پھول تو نہیں پہنائے جاتے نا؟"

"نہیں۔ مایوں بٹھانے سے پہلے تو زیور تک اتار لیا جاتا ہے۔ عطر اور پھول تو دور کی بات اور آجکل تو رنگ کا استعمال ہونے لگا ہے، ورنہ ہمارے زمانے میں تو پرانے سوتی کپڑے رنگوا کر دلہن کو پہنائے جاتے تھے۔ کیونکہ اُبٹنے کا رنگ دھونے نہیں اترتا۔" شبیب منصور کی چچی کشور جہاں نے کہا۔

"اے آج کل کا تو چلن ہی کچھ اور ہو گیا ہے کہ لڑکیوں کو بس ایک دو روز ہی مایوں بٹھایا جاتا ہے۔ وہ بھی بس رسم پوری کرنے کو۔ ورنہ ہمارے زمانے میں تو لڑکی کو شادی سے ایک ماہ پہلے مایوں بٹھایا جاتا تھا۔ روزانہ دن میں کئی کئی بار کھلی ابٹن کی مالش ہوتی تھی اور ایسے مرغن کھانے کھلائے جاتے تھے کہ شادی کے دن لڑکی کے چہرے پر ایسا نور اترتا تھا کہ سرخی پاؤڈر لگانے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔ ایک — اور عزیزہ بولیں جو کشور جہاں کی ہم عمر تھیں۔

"اوہو۔ اوفوہ۔ پھر تو بغیر میک اپ کے دلہن بے چاری بیمار ہی لگتی ہو گی۔" نازپرور کی سہیلی نے کراہت سا منہ بنا کر آہستہ سے کہا۔

"بھئی اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو۔" درخشاں بولی۔ زینت ابھی تک پھولوں کی طرف ہی متوجہ تھیں۔

"ممی یہ پھول تو آپ کی یہ چاروں بھتیجیاں لائی ہیں۔ شاید یہ ان کے یہاں کوئی رسم ہو گی۔" شکیلہ نے ان کی توجہ دولہا کی بہنوں کی طرف دلائی جو بیڈ سے کچھ فاصلے پر صوفے پر بیٹھی ہوئی تھیں۔

"اے آپ کب آئیں۔ مجھے تو خبر تک نہ ہوئی۔" زینت ان کی طرف بڑھتی ہوئی بولیں۔

"میں ابھی گئے پیچھے سے آئی۔ اور یہ پھول تو امی نے آپ کو بھیجے ہیں۔" ان چاروں لڑکیوں میں سے ایک نے جو دولہا کی بہنوں میں سب سے بڑی تھی، انہیں سلام کرنے کے بعد کہا۔

"اوہ۔ بے حد شکریہ۔ پھر تو میں یہ ضرور پہنوں گی۔ میری بہن نے اتنی محبت سے جو بھیجے ہیں۔" زینت خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولیں۔

"تو بھلا مایوں کی رسم میں لڑکے والوں کا کیا کام۔ مایوں کی رسم تو بہت گھریلو قسم کی ہوتی ہے جس میں سب اپنے ہی اپنے شریک ہوتے ہیں لے کہیں یہ بھی دیکھا ہے کہ اس رسم میں پرائے گھر کے لوگ بھی شریک ہوں۔" سلمیٰ بیگم کے تو گھر کی بات ہی نرالی ہے کہ رشتے داروں میں سے بھی کسی صاحبہ نے ناک بھوں چڑھا کر کہا تو زینت نے شرمندہ ہو کر جلدی سے بات بنائی۔

"بھئی یہ چاروں بچیاں کوئی غیر تو نہیں، اپنی نیلوفر کی سہیلیاں اور سب سے بڑھ کر ہمارے بیٹے احمد سروش کی بہنیں ہیں۔ یہ تو اگر نہ بھی آتیں تو ہم زبردستی انہیں بلوا لیتے۔" پھر انہوں نے لڑکیوں کو مخاطب کر کے آہستہ سے کہا۔

"ایسی محفلوں میں ہر طرح کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ بچیوں تم کچھ خیال نہ کرنا تو احمد سروش کی وہی بہن نائیدہ اٹھلا کر بولی۔

"ارے نہیں آنٹی۔ ہم تو آپ کو اپنا ہی سمجھ کر آتے ہیں۔ آخر یہ ہمارے بھائی کا ہی تو گھر ہے نا۔ پھر بھلا ہم کیوں مائنڈ کرنے لگے ایسی اسٹوپڈ باتوں کو۔" مگر باقی تینوں لڑکیاں نہ بھلا سکیں اور گم صم بیٹھی رہیں۔ اور زینت ان کے آگے بچھی جا رہی تھیں۔ ان کی خاطر تواضع کرنے کا ارادہ ہی کر رہی تھیں کہ تبھی اسفند یار دونوں ہاتھوں پر اسٹیل کے طشت اٹھائے اپنے تین چار کزنز کے ساتھ اندر آ گیا۔ لڑکیاں جو عیرہ اور اسما کی زبانی اس کی درگت کا قصہ سن چکی تھیں اس کے کپڑے اور صورت دیکھ کر ہنسنے لگیں۔ اچانک اس پر نظر پڑی تو لڑکیوں کو ہنستا دیکھ کر وہ کچھ خفیف سا ہو گیا تھا، ادھر ادھر دیکھ کر بولا۔

"ارے زینت یہ تم یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو باہر تمہاری سسرال والیاں تمہیں پوچھ رہی ہیں۔ یہ کیا ان کی معقولیت ہے بھلا کہ میزبان تو غائب اور مہمان بے چارے اکیلے کھڑے ہیں۔" یکایک زینب نے کمرے میں داخل ہو کر کہا مگر وہ اپنی بات کہتے کہتے یکایک خاموش ہو گئیں۔

"کیوں خیر تو ہے یہ تم سب کے چہروں پر ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں؟" وہ باہر تھیں اسی لیے انہیں کچھ معلوم ہی نہ تھا۔

"خیریت ہی تو نہیں ہے آپا۔" زینت تھوڑا سا منہ بسور کے بولیں اور پھر انہیں دولہا کی بہنوں کے نخرا کرنے — چلے جانے کی تفصیل بتا دی۔

"اوہو یہ تو برا ہوا۔ اب کیا کرو گی؟" پوری بات سننے کے بعد زینب نے تردد سے پوچھا۔

"کرنا کیا ہے۔ ان لڑکیوں کی بے ہودگی کی وجہ سے اب مجھے خود جا کر سمدھن کے منہ سے ناک سے سات لکیریں کھینچنی پڑیں گی۔" زینت بے حد جلے کٹے انداز میں اپنی بھانجیوں اور بھتیجیوں کی طرف دیکھ کر بولیں۔

"ہائے ہائے بھلا دیکھو تو یہ بیٹھے بٹھائے اور سر پھر پڑی۔ ورنہ ایسے موقعوں پر تو اس سے کہیں زیادہ بے ہودہ مذاق ہوتے ہیں آج کل تو خیر دستور ہی ختم ہو گیا۔ ورنہ تو بیٹے ڈومنیاں اور میراثنیں گانے ہی گانے میں ایسی بیچ بیچ بیری گالیاں دیتی تھیں سمدھنوں کو سننے والا شرم سے پانی پانی ہو جاتا تھا۔ دولہا کی بہنیں بہت خود دماغ معلوم ہوتی ہیں تبھی تو اتنے سے مذاق کو بھی نہ سہار سکیں۔" عائشہ بیگم نے کہا جو زینت کے پاس کھڑی تھیں۔

"ہاں یہ تو نیت ہی کچھ جیکی نا پپ۔ کالج میں بھی ذرا ذرا سی بات پر بگڑ بیٹھتی ہے۔" نیلوفر نے کہا۔

"ارے ہاں کیا مجھے تو وہ میٹرک ہی ایسی ہی لگتی ہیں غامز کو کس قسم کی۔ اب نہ معلوم گھر والے کیسے ہوں۔" ڈاکٹر نے نزلے زدہ کڑوے سے آواز میں کہا۔

"ارے بیٹی۔ دیگ میں تو ایک چاول ہی دیکھا جاتا ہے جو اگر کچا تو سمجھا تو سارے چاول ہی کچے ہوتے ہیں۔" زینب نے طنز بھرے انداز میں ہنس کر کہا۔

"ارے نہیں خالہ جان۔ احمد بھائی کی ساری فیملی بہت ایجوکیٹڈ اور ایڈوانس ہے میرے خیال میں تو وہ لوگ اس بات کو اتنا سیریس نہیں لیں گے جتنا ہم سمجھ رہے ہیں۔" نیلوفر بولی۔

"جیلیں خیر یہ تو نہ کہو۔ یہ لڑکے والے خواہ کتنے ہی روشن خیال اور تعلیم یافتہ کیوں نہ ہوں ان معاملات میں لکیر کے فقیر ہوتے ہیں۔ بس ذرا سی کوئی خلاف مرضی بات ہو جائی شرط ہوتی ہے ان کے لیے پھر تو یہ ایسی آنکھیں پھیرتے ہیں کہ تو کون اور میں کون۔" عائشہ بیگم نے کہا۔

"جی ہاں۔ اور مجھے تو خالہ بیگم یہ سب کے سب اپ سٹارٹس (نودولتیے) لگتے ہیں۔ سنا ہے آپ نے کیسے لوٹ کیا ہوا اس روز جب تاریخ مقرر ہونے کی خوشی میں انہوں نے مٹھائی کے بجائے پر اپنے گھر مدعو کیا تھا تو کیسی شو آف کر رہی تھیں وہ سب کی سب اپنے زیور اور کپڑوں کی۔ بھلا سمدھنوں کے سامنے اپنی کاروں، بزنس اور بینک بیلنس کا ذکر بھی کہیں کیا جاتا ہے۔ لگتا ہے سب کچھ زندگی میں پہلی بار نصیب ہوا ہے تبھی تو اتنی چھچھوری حرکتیں کر رہے تھے۔" درخشاں شاید سب سے زیادہ جلی بیٹھی تھی اس لیے ایک طرح لڑکے والوں کے عیب گنوانے۔

"ارے بچی اب ساتھ کھا کر ذات کیا پوچھتی۔ یہ سب تو اس وقت معلوم کرنا چاہیے تھا جب بات پکی ہو رہی تھی۔" زینب نے کہا۔

"خیر اپنے طور پر تو ہم نے اچھی طرح چھان بین کر لی تھی۔ گر وہ جو کہتے ہیں کہ قسمت میں اگر خواری لکھی ہوتی ہے تو ہو کر ہی رہتی ہے۔ اب ایک اتنی سی بات پر مجھے ہی ان لوگوں کے سامنے ہاتھ پیر جوڑنے پڑیں گے۔"

"ارے خدا نہ کرے آپ کیوں جوڑیں ہاتھ پاؤں۔ میری مانیں تو شعیب بھائی کو بلا کر ساری بات بتا دیں وہ خود ہی نمٹا لیں گے ان لوگوں سے۔" عائشہ بیگم نے مشورہ دیا۔

"اے نوج۔ کیا سر پھول گیا تھا میری جو مردوں کی مردوں میں بچوں میں نکا مشورہ دے رہی ہو عائشہ بیگم۔ ایسی باتوں کو ہوا تک نہیں دی جاتی مردوں کو۔ ہاں البتہ اگر معاملہ بالکل ہی ختم کرانے کا ارادہ ہے تو اور بات ہے۔ کیونکہ مردوں کو بتانے کا مطلب تو یہی ہے کہ ذرا سی بات کا بتنگڑ بن کر وہی مثل ہوگی کہ سارا جھگڑا ہی ختم کر کے تم اپنے گھر خوش اور ہم اپنے گھر خوش۔" زینب عائشہ بیگم کے مشورے پر بھڑک کر بولیں۔

"خدا نہ کرے آپا! شیطان کے کان بہرے۔ ایسی بد فالیں منہ سے نہ نکالیے۔ عائشہ آپا نے اگر غلط مشورہ بھی دیا ہے تو ذہن تو سب ہی کے ماؤف ہیں اس پریشانی میں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کیا جائے۔" زینت نے اپنی بہن اور نند کے رشتے کی نزاکت کے پیش نظر بہن کی کھری کھری بات کو ان سنا کر لیا۔

"اے چھوڑیں بھائی یہاں یہ سارا کیا دھرا تو زینب آپا کا ہی ہے۔ میرا تو اس وقت ماتھا ٹھنکا تھا جب انہوں نے تقاول کیے تھے۔ اب دیکھ لیں بڑی نازک میں بھنگ۔" عائشہ بیگم بھی خاموش بیٹھنے والی نہ تھیں انہوں نے فوراً ہی بدلا اتارا۔

"اے ہاں دو منٹ میں لیٹ کر کیوں نہ دیں ہو بہن۔ صاف صاف کیوں نہیں کہتیں کہ میں نے یہاں بوجھ کر اپنی بچی کے حق میں کانٹے بوئے ہیں۔" زینب برا مان کر بولیں۔ اور تب زینت کا دل چاہا کہ کہیں عائشہ آپا کچھ غلط تو نہیں کہہ رہیں آپا ہی تو پہلے دن ٹھنک گئی تھی کہ اسی کی وجہ سے ایسا ہوا ہے۔ مگر کچھ کہہ کر بہن کی ناراضگی مول لینا نہیں چاہتی تھیں اس لیے منت عاجزی سے بولیں۔

"تم ہے آپا اس وقت میرے ہوش ٹھکانے نہیں ہیں خدارا آپ ہی خاموش ہو جائیں۔" زینب خود بھی بہت معاملہ فہم اور زیرک تھیں انہوں نے جلدی سے بات کا رخ موڑتے ہوئے کہا۔

"پریشانی اٹھانے سے فائدہ۔ ابھی لڑکیاں گھر بھی نہ پہنچی ہوں گی تم جلدی سے روانہ ہو جاؤ۔"

"نہیں امی! میں آپ کو ہرگز جانے نہیں دوں گی۔" نازیہ جو اب تک خاموش بیٹھی تھی ماں کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔

"واہ نہیں جانے دو گی کیا تم چاہتی ہو کہ سچ مچ ہی سب لوگوں کے سامنے میری ناک کٹ جائے۔" زینت نے بیٹی کو معاملے کی نزاکت کا احساس دلایا۔

"ہاں نازو بیٹی ان کا جانا اس وقت بہت ضروری ہے کیونکہ اگر یہ نہ گئیں اور بات مردوں تک پہنچ گئی تو اور بھی برا ہوگا۔" خالہ نے بھی نازو کو سمجھایا۔

"نہیں! یہ تو کسی صورت ٹھیک نہ ہوگی وہاں جا کر ان لوگوں سے بیگ کرنا۔ آپ ٹھہریں میں خود فون پر احمد سے بات کر لوں گی۔" نازیہ پورے خاندان کی بات کا نوٹس لیے بغیر کہا۔

"ارے نہیں۔ ایسا تو غضب بھی نہ کرنا نازو کہ لڑکے سے خود بات کرو۔ لاکھ وہ اس سے تمہاری انڈر اسٹینڈنگ سہی لیکن جب مرد شوہر بن جاتا ہے تو عورت کی ایک معمولی سی کمزوری کو بھی رائی کا پہاڑ بنا لیتا ہے اور کسی نہ کسی موقع پر اسے طعنہ ضرور دے بیٹھتا ہے۔" زینت نے گویا ایک طرح مرد کی فطرت اور خصلت سے بیٹی کو خبردار کیا۔

"اُف آپ بھی نہ معلوم کس زمانے کی بات کر رہی ہیں ممی۔ آج کل کا زمانہ کچھ اور ہی ہے۔ آج کل تو لڑکی والے ان ساری باتوں کو گردانتے ہی نہیں۔ مجھے تو یقین ہے آپ سے کہتی ہوں کہ اگر وہ لوگ زیادہ اکڑ دکھائیں تو آپ بھی صاف صاف انکار کر دیجیے۔ جو نہ ہو، آل کیرلوز ہو تو۔" نازیہ اور جو تحت غصے میں تھی، تو پھر وہ تو فیصلہ کن ہو کر بولی۔

"تم اپنا منہ بند ہی رکھو نازو ایک ساں جو کر چہ بڑ بڑ بولے ہی جا رہی ہو، جو بھلا کسی کے کانوں میں بھنک بھی پڑ گئی کہ لڑکی انکار کرنے کے پیچھے لگی ہے تو ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گی۔ پہلے ہی کہا کہ میرے دم پہ بنی ہوئی ہے، بس خدا عزت رکھ لے۔" اماں نے بری طرح لتاڑا تو نازیہ رو کر تکیوں میں منہ دے کر رونے لگی۔

"اے چھوڑو تم کہاں بچی کے ساتھ لے کے بیٹھ گئیں۔ چلو اب چاہو بھی چلو سمدھیانے ورنہ بات بڑھ گئی تو سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔" زینب نے بہن سے کہا۔ "اللہ خیر" بھابی نے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔

"اس خوشی کے موقع پر رو دو تو تمہیں پتہ ہے بڑی بدشگونی کی بات ہوتی ہے یہ رونا دھونا۔"

"ادھر بدشگونی کی ابتدا تو خود اپنے ہاتھوں سے کی ہے اور پھر ہمیں بدشگونی کا احساس دلانے۔" عائشہ خاتون نے جلے کٹے انداز میں جمیل منصور کی بیوی نازش سے کہا تو انہوں نے ہاتھ دبا کر احتجاجاً انہیں منع کرتے ہوئے زینت سے کہا۔

"مگر آپ کو وہاں جانے کی کیا ضرورت ہے بھابھی جان۔ بیچ والی تو وہ آپ کی دوست نگار آپا ہیں آپ ان سے کہیے کہ وہ جا کر بات کریں۔ خود جائیں گی تو تکلفات اور مصلحت کی وجہ سے کھل کر کچھ بھی نہیں کہہ سکیں گی ان لوگوں سے۔"

"ارے واہ چھوٹی دلہن تم تو بڑی دور کی کوڑی لائی ہو۔ لے بھلا تو پریشانی میں واقعی عقلوں پہ پتھر پڑ گئے تھے۔ کہاں ہیں یہ نگار زینت ذرا انہیں بلا لاؤ بھئی۔" ترتیب نازش کے مشورے پر جیسے پھڑک اٹھیں اور ان کی پیٹھ پر تھپکی دینے کے بعد زینت کو مخاطب کر کے بولیں۔

"ساری مصیبت تو یہی ہے کہ نگار آج آئی ہی نہیں۔ ان کے میاں کو بھی آج ہی جانا تھا اور گیا تھا پانی۔" زینت بولیں۔

"مگر ابھی تو شام سے پہلے سے کب کے چلے گئے ہوں گے ممی۔ اب تو ساڑھے نو بج رہے ہیں۔ آپ انہیں فون پر کنٹیکٹ کرنے کی کوشش تو کیجیے۔" تینو فرح نے کہا۔

"ہاں ہاں بلو فرح ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ نگار آپا کو فون کر کے ساری بات بتا دیجیے۔ دیکھیں وہ کیا کہتی ہیں۔" نازش نے کہا تو فرح سے تائی کے لیے زینت نگار کو فون کرنے چل دیں۔ مگر جاتے جاتے انہوں نے اپنی دونوں بیٹیوں درخشاں، نازلی اور عمیرہ سے کہا جو کچھ دیر پہلے ہی نازیہ وغیرہ کے لیے کھانا لے کر آئی تھیں۔

"دیکھو بیٹیوں خبردار جو یہ بات میرے آنے تک کمرے سے باہر نکلی۔ تم سب اندر سے دروازہ بند کر کے یہیں بیٹھ جاؤ۔ دلہن آپ بھی ذرا خیال رکھیں اور آپ ذرا باہر جا کر مہمانوں کی خاطر تواضع کریں۔ اگر نگار نے مجھے ساتھ لے جانے کو کہا تو میں بالا ہی بالا چلی جاؤں گی۔" پھر وہ عائشہ بیگم کا ہاتھ پکڑ کر فون کرنے اپنے کمرے میں اس مصلحت سے لے گئیں کہ ان کا پیٹ ذرا ہلکا تھا اور ان کو اپنے ساتھ لے جا کر یہ جتانا مقصود تھا کہ تم سے بڑھ کر قابل اعتماد میرا اور کوئی نہیں ہے۔ نگار فرزند علی ان کی بہت گہری سہیلیوں میں سے تھیں۔ شعیب منصور اور فرزند علی کی بیرون ملک مشترکہ بزنس تھی کہ دونوں ہی بزنس مین تھے۔ اس لیے بیویوں میں گاڑھی چھننے کی وجہ سے شوہروں کا بھی آپس میں دوستانہ ہو گیا تھا۔ نگار کا حلقہ احباب زینت سے کہیں زیادہ وسیع تھا جس میں تقریباً تمام ہی احباب ہائی جنٹری (اعلیٰ طبقہ) سے تعلق رکھتے تھے۔ احمد سرورش کی فیملی بھی ان احباب میں شامل تھی۔ خصوصاً احمد سرورش کی چھوٹی بہن خالہ فوزیہ سے ان لوگوں کے بہت گہرے مراسم تھے اور نگار نے ہی بیچ میں پڑ کر یہ رشتہ طے کرایا تھا۔ نگار سے سب لوگ ہی دبتے تھے کہ ہر طرح میں پالیسی اور ذہانت کی نمائش میں وہ سب سے پیش پیش بلکہ ممتاز ہوتیں۔ اس پر کھری اور حاضر جوابی یعنی بہت تھیں۔ فون پر زینت کی زبانی نازیہ کے بگڑ کر بیٹھ جانے کا تمام قصہ سنا تو ایک دم ہی جلال میں آ گئیں حالانکہ میاں کو ایئرپورٹ چھوڑ کر تھکی ہاری آئی تھیں کیونکہ میاں کی فلائٹ لیٹ ہو گئی تھی پھر بھی احمد سرورش کے یہاں جانے کے لیے فوراً ہی کمربستہ ہو گئیں۔ پہلے زینت کو اپنے ساتھ لے جانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا پھر فوراً ہی ملتوی کر کے بولیں۔

"نہیں تمہارا وہاں جانا کسی طور پر بھی مناسب نہیں۔ میں خود جا کر ان سے بات کر لیتی ہوں۔ اور اگر انہوں نے زیادہ ساتھ پانچ کی تو پھر یہ قصہ ہی ختم کر کے آؤں گی تاکہ وہ اس خیال میں نہ رہیں کہ ان کا بیٹا عرش سے اترا ہے۔ ہماری نازو کو اس سے کہیں بڑھ کر ایک سے ایک لڑکے مل سکتے ہیں۔"

"اف انہیں یہیں نگار بہن یہ تو نہ کہیے۔ یہاں تو بچی کو مایوں بھی بٹھا دیا۔ مہمان داری بھی شروع ہو گئی۔ اب خدانخواستہ کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو خاندان تو کیا کسی کو بھی منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے لوگ بھی بھلا شریفوں میں کہیں ایسا — بھی ہوتا ہے۔" زینت گھبرا کر بولیں۔

"ارے چھوڑو تم جیسے لوگ خاندان اور شرافت کی وجہ سے ہمیشہ خسارے ہی میں رہتے ہو ورنہ آج کل کا زمانہ ٹٹ فور ٹیٹ کا ہے سمجھیں۔ بس ایک ذرا سا اپنے اندر حوصلہ پیدا کرو تو یہ ساری نزاکتیں اور احتیاطیں سب کی سب خود ہی چھو ہو کر اڑ جائیں گی — یوں بھی ڈیئر فرینڈ اپنی ذہنی اپنا اپنا کا زمانہ ہے یہ۔"

"ہاں وہ ٹھیک ہے مگر میرے خیال میں بات اتنی بھی نہیں بگڑی ہو گی۔ آپ جا کر بات تو کریں، وہ تو میرے خیال میں آپ کی شکل دیکھتے ہی بلوں میں گھس جائیں گے۔" زینت نے انہیں ٹھنڈا کرنے کی غرض سے کہا۔

"واہ کیا خوب یعنی میں تمہارے خیال میں کوئی جنگلی بلی ہوں۔" نگار نے ہنس کر کہا اور پھر بولیں۔

"اچھا خیر تم بالکل مطمئن رہو میں جا کر سب سنبھال لوں گی۔ ہاں اتنا ضرور کرو کہ تھوڑا سا کیک وہاں ابھی بھجوا دو — میں ان لوگوں کو تھوڑی سی لفٹ آج چھوٹ دینا چاہتی ہوں۔"

"اچھا" کہہ کر زینت ریسیور رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور باہر جا کر جلدی جلدی بڑی بڑی تھیلیوں میں کیک نکلوایا اور پھر اپنی کار میں رکھوا کر ڈرائیور کے ہاتھ سمدھیانے بھجوا دیا۔

شادی کا گھر تھا اور تقریباً تمام عزیز و اقارب آئے ہوئے تھے۔ ان میں سے کچھ دن بھر گپ شپ لڑانے کے بعد تھک تھکا کر سو گئے تھے اور کچھ لوگ ڈرائنگ روم نشست گاہ میں نازیہ کی والدہ نسرین اور چھوٹی خالہ نورین سمیت ٹی وی کے آگے بیٹھی ایک انگریزی فلم دیکھنے کے ساتھ ساتھ آپس میں باتیں بھی کر رہے تھے کہ نازیہ اپنی دونوں کزنز کے ساتھ دندناتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی — دوپٹہ ایک طرف پھینکا اور پرس ایک طرف اچھالا اور ماں کے پاس دیوان پر دھب سے بیٹھتی ہوئی بولی۔

"پتا نہیں کیا خوبی نظر آئی تھی آپ کو اس لڑکی میں جو کچھیاں قسمت وہاں پھوڑ دی۔ تو یہ اتنے ذلیل لوگ ہیں کہ شاید ہی کوئی ہو۔" ابھی نہیں بلکہ نازیہ وغیرہ کی بگڑی بگڑی صورتیں دیکھ کر ہی سب نے اندازہ لگا لیا تھا کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ نورین نے اٹھ کر ٹیپ اسٹاپ کر دی۔

"کیوں کیوں کیا ہوا نازیہ۔ کیا کچھ کہا ان لوگوں نے تمہیں؟" نسرین نے تیزی سے بڑھ کر پوچھا۔

"کہنا تو بہت چھوٹی بات ہے ممی انہوں نے تو باقاعدہ ہمیں گالیاں دی ہیں۔" نازیہ نے گلوگیر لہجے میں کہا اور رونے لگی۔

"ہائے گالیاں دی ہیں ان کمینوں نے تمہیں؟" نسرین بیٹی کی بات اور پھر اس کے رونے پر تلملا کر بولیں۔

"بھئی صاف صاف بتاؤ آخر بات کیا ہوئی ہے تاکہ ہم بھی انہیں ایسا مزہ چکھائیں کہ وہ بھی یاد کریں۔" نازیہ کی چھوٹی پھوپھی شاداب نے بہت غصے میں پوچھا۔ تو نازیہ نے خوب نمک مرچ لگا کر انہیں ساری بات بتا دی۔

"اے ہے یہ کیا ان لوگوں نے شروع ہی سے ہمیں دیکھ کر منہ بنا لیا تھا۔" نازیہ کی کزن نزہت بولی۔

"منہ کیا بنا لیا تھا بلکہ صاف صاف منہ پر کہہ دیا کہ یہ دولہا کی بہنیں مایوں کی رسم میں کیوں آئی ہیں۔ ان کا بھلا کیا موقع تھا یہاں آنے کا۔"

"ہاں اور بتاؤ بے عجیب وہ ساری کی ساری ابٹنا کھیل رہی تھیں تو نازو کی آنٹی کے منع کرنے کے باوجود نازو کی کزنز نے یہ کہہ کر اگر ہمیں سے بچانا تھے تو یہاں آئی ہی کیوں تھیں۔ جان جان کر ہمارے کپڑوں پر ابٹنا ملا۔ ورنہ منہ اور سر پر بھی مل سکتی تھیں استغفر اللہ لڑکیاں۔" نکہت بولی۔

"ہاں اور وہ جو اپنے پھول بھیجے تھے نا ان پر بھی نازو کی ممی نے بہت اعتراض کیا تھا کہ کیوں بھیجے ہیں اور کس کے لیے بھیجے ہیں۔" ثانیہ نے مزید شوشا لگایا۔

"ہاں اور نازو کا بھائی تو لگ رہا تھا جیسے کسی انڈر ورلڈ گروپ کا بچہ ہو۔ ایسا آکڑ فوں اور خر دماغ کہ سیدھے منہ کسی سے بات ہی نہیں کر رہا تھا۔" نزہت بولی۔

"بیٹا وہ تو جان کر اسے اونچا دکھانے کی کوشش کر رہے تھے سب کے سب۔ لیکن مر کر دوبارہ بھی پیدا ہو جائے تو میرے بھیا کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔" راحیلہ بولی۔

"ہاں مگر بعد میں تو اس نے بھی اپنی ساری اوقات دکھا دی تھی ابٹنا لگنے کے وقت۔ اس نے اپنے سارے کزنز کو بلا لیا تھا اور

سے بھی مٹی جلوں لیے جاری ہے نالوں کی رسم میں کتنے اصرار سے بلایا تھا۔ مگر فرقان کی وجہ سے جا ہی نہیں سکی تھی۔" نگار کی بات پر سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا مگر بولا کوئی نہیں۔

"افسوس تو اس بات پر ہے کہ ہم لوگ خواہ کتنے ہی ایجوکیٹڈ اور ایڈوانس کیوں نہ ہوں۔ ذرا ذرا سی باتوں کو اپنی عزت (وقار) کا مسئلہ بنا کر خود اپنے لیے ہی ڈفیکلٹیز (مشکلات) پیدا کر لیتے ہیں۔ وہاں پہنچی تو یوں محسوس ہوا جیسے سارے گھر پر ضعف، تم بھی ہو۔ کیونکہ سارا ماحول ہی ڈسٹربڈ (منتشر) سا لگ رہا تھا۔ پوچھنے پر پتا چلا کہ تمہاری بھابھیاں وہاں کوئی سین کری ایٹ (فتنہ کھڑا) کر کے آئی ہیں۔" نگار نے جس طرح اصل مسئلہ اٹھایا، سب ہی اپنی اپنی جگہ بل کھا کر رہ گئے۔

"واہ آنٹی! آپ بھی ان ہی کی سائیڈ لے رہی ہیں۔ بڑے اپ ٹو ڈیٹ قسم! لیکن یہ انصاف نہیں ہے۔" شاداب چمک کر بولی۔

"ہاں واقعی۔ وہی سامنے ہستی... ان پر یقین کر لینا کوئی انصاف تو نہیں ہے جبکہ آپ کی اور نورین آنٹی کی آپس کی پرانی فرینڈشپ بھی ہے۔" نورین نے بھی شاداب کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

"ارے چھوڑو بھی نورین یہ آنٹی ان کی سکھائی ہوئی آئی ہیں۔ ان سے کچھ کہنا بیکار ہی ہوگا۔"

شاداب جلے کٹے سے انداز میں بولی۔

"دیکھو بچیو! میں تمہارے بڑوں سے بات کرنے آئی ہوں۔ تم سب مجھے چاروں طرف سے گھیرنے کی کوشش نہ کرو۔ بہتر یہی ہے کہ تم خاموش رہو۔" نگار نے ڈانٹنے کے سے انداز میں کہا تو نسرین بول اٹھیں۔

"ہاں مسز فرزند علی ٹھیک ہی کہہ رہی ہیں۔ تم خاموش بیٹھ کر سنو۔ زیادہ چڑ چڑ کرنے کی ضرورت نہیں۔" ایک تو نورین اور شاداب سے نسرین کا سسرالی رشتہ ہوتا تھا۔ دوسرے نسرین خود بھی بھری بیٹھی تھیں۔ بڑی بہن کا نند اور شوہر کی بھتیجی کو ڈانٹنا نہیں سخت ناگوار گزرا اور انہوں نے تیوری چڑھا کر کہا۔

"باجی! آپ بلا سوچے سمجھے ہی سب کو ڈانٹنے لگتی ہیں۔ دراصل ان لڑکیوں کی ایسی غلطی بھی نہیں ہے۔ نگار بہن واقعی بہت ایک طرف کی سن کر کہہ رہی ہیں۔ اور ہمیں ہی قصور وار گردان رہی ہیں حالانکہ انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ ہماری بھی کچھ سنتیں۔ ہم سے بھی کچھ پوچھتیں۔ اس کے بعد کسی نتیجے پر پہنچتیں تو کوئی بات بھی ہوتی۔"

"مگر کسی نتیجے پر پہنچنا اور پہنچانا تو آپ کا مسئلہ ہے میرا نہیں۔ کیونکہ میری حیثیت تو اس وقت ایک ثالث کی سی ہے جو کچھ انہوں نے کہا میں نے خاموشی سے سن لیا اور جو آپ کہیں گی وہ بھی اسی طرح سن لوں گی لیکن سننے سے پہلے یہ ضرور معلوم کرنا چاہوں گی کہ آپ کے ارادے کیا ہیں۔ یعنی آپ اس بات کو سیریس لیں گی یا پھر نبھانے والوں کی ایک گروہ کی طرح نظرانداز کر دیں گی؟" نگار نے ایک بار پھر نسرین کے طنز کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

"کمال ہے۔ آپ کے کان کچھ زیادہ ہی بھر دیے ہیں ان لوگوں نے۔ خیر تو پھر میں بھی کہوں گی کہ ہم بہت غلط لوگوں میں پھنس گئے۔ بھلا یہ اندھیر بھی کہیں دیکھا ہے کہ لڑکے کی بہنوں کی اس قدر توہین کی جائے کہ ان کا بیٹھنا دوبھر ہو جائے ——— جب کہ وہیں لڑکی والے ہو کر لڑکی والے تو الٹی جوتیاں ہی سیدھی کرتے نظر آتے ہیں لڑکے والوں کی۔" نسرین بڑے برہم انداز میں بولیں۔

"اصل میں یہی ایک کمزوری ہی ہوتی ہے لڑکی والوں کی۔ آخر بیٹی بھی تو دیتے ہیں نا۔ مگر معاف کرنا نسرین! یہ بڑی فرسودہ سوچ ہے تمہاری۔ بہرحال انہوں نے کیا نامعقول باتیں کی تھیں انہوں نے جو آپ کی بچیوں کی توہین کا سبب بنیں؟"

نگار بھی پھر کمال کی خاتون تھیں۔ انہوں نے آنے میں توقف دینے کے بعد ہی یہ سوال اٹھایا تھا۔ نسرین خود بھی یہی چاہ رہی تھیں کہ جلد از جلد سب کچھ ان کے گوش گزار کر دیں لیکن نورین نے ان کے کچھ کہنے سے پہلے ان کو مخاطب کر کے کہا۔

"آپا! ایسا کیوں نہ کریں کہ ان چاروں کو یہیں بلوا لیں۔ وہ خود انہیں سب کچھ بتا دیں گی کیونکہ بدقسمتی سے ہم تو وہاں موجود نہیں تھے نا۔"

"چلو خیر ان کو بھی بلوا کر دیکھو تو مگر کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ میرا مطلب ہے مسز فرزند علی ان کی باتوں پر یقین کر لیں گی بھی نا؟" نسرین نے پھر نگار پر طنز کیا۔

"نہیں۔ میں کوئی ان لوگوں کی وکیل بن کر تو نہیں آئی۔ نہ ان کا دیا ہی کھاتی ہوں۔ ہاں البتہ میرا قصور یہ ہے کہ میں نے آپ دونوں کے بیچ میں پڑ کر یہ رشتہ طے کرایا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ آپ فضول باتوں سے گریز کریں اور اگر مناسب سمجھیں تو

لڑکیوں کو بلوا لیجیے۔"

نگار نے بھی کوئی رواداری برتنے کی ضرورت نہیں سمجھی اور ترو ترخے سے انداز میں کہہ دیا۔ نسرین سے ان کی بات کا کوئی جواب نہ بن سکا تو انہوں نے شاداب سے کہا کہ وہ چاروں لڑکیوں کو بلا لائے اور وہ فوراً ہی اٹھ کر ان چاروں کو بلا لائی۔

"ہاں بھئی! تم چاروں میں سے جس کا نام ثانیہ ہے وہ ذرا یہ بتلائے کہ آخر ایسی کیا بات ہوئی تھی جو تم بچیوں کی توہین کا سبب بنی اور سبب بھی نہیں بلکہ اس حد تک بڑھ گئی کہ اب تمہاری پھوپھو کو غلط لوگوں میں پھنس جانے کا ملال ہو رہا ہے۔" ان کے سوال کرنے کا انداز بھی ایسا کاٹ دار تھا کہ ثانیہ سے جواب نہ بن سکا تو اس نے گھور کر کہا۔

"ملال بھی ہو رہا ہے آنٹی تو کچھ غلط تو نہیں ہو رہا۔ وہ لوگ ہیں ہی ایسے لوکلاس۔ پکے طبقے کے۔"

"واہ۔ ماشاءاللہ بڑی بالغ جواب ہے تمہاری۔ بھابھی تو دلہن بن کر پہلے ہی گھر میں آ رہی ہیں اور منہ ڈال کر رہی ہیں پھر کسی کو برا بھلا کہنے بیٹھی ہو۔ اور یہ تو بات کا جواب تو نہ تھا جو تم نے دیا ہے۔" نگار نے نورین سے کہہ کر مخاطب کیا تو ثانیہ ماں سے مخاطب ہو کر بڑی بدتمیزی سے بولی۔

"بس جو ہو گیا سو ہو گیا ممی۔ اب میں کسی کے سامنے دکھڑے نہیں روؤں گی۔ پہلے ہی میرا دماغ خراب ہو رہا ہے۔ آپ کو صفائی پیش کرنی ہے تو خود ہی کر دیں۔" مگر ماں نے جواب میں کچھ نہ کہا بلکہ نظریں جھکا لیں۔ لڑکیاں کی فطرت اور مزاج بہن سے بہت مختلف تھے۔ اس سے پہلے نگار کچھ بولتیں۔ انہوں نے ثانیہ کو گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"اف ہو! یہ بڑی سلیقہ تمیز سے پیش آؤ ثانیہ! یہ بڑا نازک مسئلہ ہے کوئی معمولی بات نہیں اور پھر کیا تم نے جھوٹ بولا تھا جو بتلاتے ہوئے کترا رہی ہو۔"

"ہاں یہی سمجھ لیں۔" اس نے آہستہ سے کہا اور نورین اس کی گستاخی پر خون کے گھونٹ پی کر رہ گئیں۔

"چلیں پھر میں ہی بتا دیتی ہوں۔" دانیہ نے کچھ ایسے تمسخرانہ انداز میں ہنس کر کہا۔ جیسے اس فتنہ و فساد پر بہت خوش ہو۔ نگار لوٹیں تو سب کر رہی تھیں مگر بولیں کچھ نہیں۔ پھر دانیہ نے شروع سے لے کر آخر تک بلکہ اپنی طرف سے جھوٹ سچ جوڑ کر انہیں ساری بات بتا دی۔ نگار نہایت غور اور خاموشی سے سب سنتی رہیں پھر کچھ توقف کے بعد بولیں۔

"ہوں! جہاں تک میں نے اندازہ لگایا ہے، اس کے مطابق تم سب کا ایسا اچھا نہ تھا۔ تمہاری فیلنگس ہرٹ (احساسات مجروح) ہوئی ہیں ورنہ اچنا کھیلنے میں تو تقریباً ہر جگہ ہی ایسا ہوتا ہے کہ جو دولہا کے بھاگنے کی کوشش کرتا ہے اسے ہی سب سے زیادہ نشانہ بنایا جاتا ہے اور آپس میں ہم عمر لڑکیاں بالیاں ہی کھیلتی ہیں اچنا جس میں بھائی اور کزنز بھی شریک ہوتے ہیں اور کیا تمہیں کبھی ایسی کسی رسم میں شریک ہونے کا اتفاق نہیں ہوا؟"

"نہیں ہوا کیوں نہیں۔ ویسے یاد ہو ہمارے منع کرنے پر انہوں نے ہمیں کچھ کر کر بھی کہا تھا کہ اگر کپڑے خراب ہونے کا اتنا خیال تھا تو پھر مایوں کی رسم میں شرکت کرنے کیوں آ گئیں آپ۔ بھلا ہمیں ایسے ہی کہتے ہیں لڑکے والوں کو آنٹی!" دانیہ چلا اٹھی۔

"ان کا کہنا ہے بلکہ ان سے بھی کہیں زیادہ کہتے ہیں۔ کیونکہ اچنا کھیلنے کی رسم تو ہنسی مذاق پر ہی مبنی ہے اور میرے خیال میں تو یہ اتنی معمولی سی بات اس قدر تنازع کی صورت تو نہیں تھی کہ تم نے اسے عزت و وقار کا مسئلہ بنا لیا۔ اس قدر نازک احساسات رکھتی ہو تو تمہیں مایوں کی رسم میں جانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ کیونکہ یہ رسم تو اچنا کھیلنے کے لیے ہی ہوتی ہے۔" نگار نے سمجھانے کا انداز اختیار کیا مگر وہ بھی صاف گوئی سے نام لے کر سانحہ کے ساتھ ان کی اچھی طرح کھنچائی بھی کرتی جا رہی تھیں۔

"اب اور کیا بتاتی ہے خود ہی ان لوگوں کو کتنا منع کیا تھا کہ مایوں کی رسم میں جانا ٹھیک نہیں ہے مگر یہ سنتی ہی کس کی ہیں۔" نورین بھی نگار کی باتوں پر تائید کر کے بولیں۔

"لیکن آنٹی اگر ہم پہلے بھی گئے تھے تو انہیں اسی طرح لینا ہی تو نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ان کی شاید کوئی رشتے دار بھی تھیں جنہوں نے بار بار ہمیں برا بھلا کہنا شروع کر دیا تھا کہ دولہا کی بہنوں کا مایوں کی رسم میں کیا کام۔ یہ تو ہماری ایک بکی سی رسم ہے وہ انہیں برداشت نہیں کر سکیں اور اگر آ ہی گئی تھیں تو رسم سے پہلے ہی چلتا کر دیا ہوتا۔" دانیہ سے کوئی جواب نہ بن سکا تو ثانیہ نے ایک اور شکایت پیش کی۔

"جی ہاں اور مزے کی بات یہ کہ نینت آنٹی نے انہیں ڈانٹنے کے بجائے الٹا ہم سے کہا کہ ہم ان کی باتوں کا برا نہ مانیں۔ کیونکہ ایسے موقعوں پر بعض لوگ اسی قسم کی باتیں کرتے ہیں۔" نگہت نے گویا لقمہ دیا۔

"اس تو کہنے والے کی زبان تو نہیں پکڑی جا سکتی نا۔ البتہ تو کانوں کو بند کر سکتا ہے۔ وہ بھی اگر خود اپنے کانوں سے سن لیا جائے۔" نگار نے اس بات کو بھی غیر اہم ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں، تبھی تو اپنے کانوں سے سن کر انہیں ٹوکنے کے بجائے زینت آنٹی نے الٹا ہمیں ٹوک دیا تھا۔" وانیہ نے ان کی بات کا مذاق اڑاتے ہوئے ہنس کر کہا تو دوسری لڑکیاں بھی ہنسنے لگیں۔ نگار کو غصہ تو بہت آیا مگر انہوں نے بڑے تحمل سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "خیر یہ لوگ اتنا تو نہیں کہنا چاہ رہے ہوں گے۔"

"ہم یہ سب نہیں جانتے۔ آنٹی ان کے دلوں میں ہماری طرف سے کھوٹ تھا، اسی لیے انہوں نے ہمارے لائے پیارے تحفوں کو بھی نہیں بخشا اور نہ صرف ان کی بے عزتی کا مذاق اڑایا بلکہ میوہ فروش اور دوا فروش تک کہہ دیا۔ یہ ساری ان کی جانب سے ہمیں ذلیل کرنے کی بات تھی۔" وانیہ جو اتنی دیر سے منہ پھلائے اور بگڑے ہوئے موڈ لیے بیٹھی تھی۔ اس نے نگار کی مصالحانہ گفتگو پر جل کر کہا۔

"لیکن میوہ فروش اور دوا فروش کہنے سے کوئی میوہ اور دوا فروش بن تو نہیں جاتا۔ اور پھر تمہیں اس بات کو اپنا ذاتی ایشو تو نہیں بنانا چاہیے تھا۔ یہ تو چور کی داڑھی میں تنکا والی بات ہو گئی کہ جو نہیں جانتے وہ بھی تمہارے اس طرح بھڑک اٹھنے سے جان جائیں۔ اب میرے شوہر کو ہی دیکھو جن کے پاس آج اتنی دولت ہے کہ بڑے بڑے سیٹھ ساہوکاروں کو خرید کر پھینک دیں۔ انہوں نے بھی اپنا کاروبار نیلام میں بولی دے کر اسکریپ کا ایک چھوٹا سا ٹرک (07) خرید کر کیا تھا۔ تجارت میں اتار اور چڑھاؤ ہوتے رہتے ہیں۔ اصل میں تو ساری بات قسمت اور مہارت پر منحصر ہے۔ کوئی ایک دم ہی ترقی کر کے اوج ثریا تک پہنچ جاتا ہے اور کوئی محنت کر کے آہستہ آہستہ بڑھتا ہے۔ تمہارے دادا میوے کی تجارت کرتے تھے۔ ان کا وہ بزنس ٹھپ ہونے لگا تو انہوں نے کریانے کی دکان کھول لی۔ اور جب اس میں بھی کوئی فائدہ نظر نہ آیا تو تمہارے والد نے اسے ڈرگ اسٹور میں تبدیل کر لیا جس میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ قسمت نے یاوری کی، کاروبار بڑھایا اور آج اعلیٰ پیمانے پر بزنس کر رہے ہیں۔ پھر بھلا اگر انہوں نے مذاق میں تمہارے بھائی کو دوا فروش کہہ دیا تو اس میں اس قدر مائنڈ کرنے کی کیا بات تھی کہ آپس میں دل برے ہو گئے۔" نگار نے ایک تسلسل سے بات تو کہہ ڈالی تھی مگر دوشالے میں لپیٹ کر کہی تھی یا پھر ساتھ کے ساتھ ان لوگوں کی اصلیت ان پر جتا دی تھی۔ وانیہ تنک کر بولی۔

"جو ہمیشہ برا مذاق میں کہہ دیا۔ آپ سے کرتیں وہ ایسا مذاق اور آپ برا نہ مانتیں تب میں دیکھتی۔" وانیہ کا لہجہ بہت گستاخانہ تھا۔ نگار کو یہ سن کر صدمہ سا ہو گیا۔ انہوں نے نورین کو مخاطب کر کے کہا۔

"نورین، یہ تمہاری بھانجی تو بڑی گستاخ اور منہ زور ہے۔ کیا تم لوگوں نے اسے بڑوں سے بات کرنے کی تمیز نہیں سکھائی؟"

"نہیں، تمیز تو ایسی سکھائی ہے کہ یہ دوسروں کو بھی سکھا دے۔ لیکن چونکہ یہ غلط بات برداشت کرنے کی عادی نہیں ہے اس لیے ایک دم ری ایکٹ کر کے اکھڑ ہو جاتی ہے۔" نورین کے بجائے نسرین بیٹی کی حمایت میں بولیں جو نگار کی باتوں پر پہلے ہی پیچ و تاب کھا رہی تھیں۔

"مگر یہ تو بڑی تباہ کن عادت ہے۔ نسرین یہ ذرا ذرا سی بات پر ایک دم ری ایکٹ ہو جانا۔ اور مجھے تو تعجب اس بات پر ہے کہ آپ اسے باز رکھنے کے بجائے الٹی شہ دے رہی ہیں۔ گویا دوسرے معنوں میں خود اپنے ہاتھوں سے بیٹی کے حق میں کانٹے بچھا رہی ہیں۔ یہ بیٹی ذات ہے اور اسے پرائے گھر بھی جانا ہے۔ اگر اس کی بدزبانی اور خود سری کا یہی عالم رہا تو اس کا نباہ کسی سے بھی نہیں ہو سکے گا۔ اور ابھی تک تو میں یہی سمجھتی رہی تھی کہ ان لوگوں نے شہود کو کوئی سیدھی سی بات کہہ دی ہو گی جو یہاں تک نوبت آ گئی۔ مگر آپ کی بیٹی کی چرب زبانی سے اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ اس نے دانستہ آپ کے اور ان لوگوں کے درمیان تلخیاں گھولنے کی کوشش کی ہے۔" نگار نے بھی انہیں اچھی طرح آئینہ دکھا دیا۔

"خیر یہ میرا ذاتی معاملہ ہے اور میری بیٹی جیسی بھی ہے۔ میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں۔ لیکن ان لوگوں نے واقعی بڑی کمینگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اور ایسے گھٹیا لوگوں سے کوئی رشتہ جوڑنا مجھے بالکل گوارا نہیں۔" نسرین اپنی چہیتی بیٹی کے بارے میں نگار کی تنقید سن کر طیش میں آ گئیں اور مزید لحاظ رکھے بغیر بولیں۔

"ہائیں، آخر کیا مطلب ہے آپ کا؟ یعنی آپ کہنا کیا چاہ رہی ہیں؟" نگار بھی غضب ناک ہو کر بولیں۔

"مطلب یہی ہے کہ آنکھوں دیکھی مکھی تو نگل نہیں سکتے ہم۔ یہ بھی بہت غنیمت ہے کہ ان کی اوقات ہم پر پہلے سے ہی کھل گئی۔ اور اب ہم اپنے بیٹے کی شادی وہاں نہیں کریں گے۔" نسرین اپنے لڑکے کی ماں ہونے کے زعم میں بڑی

نخوت سے بولیں۔

"لو اب یہ بات تو صاف ہو گئی ہے۔" نگار نے جذب میں آ کر اٹھتے ہوئے کہا اور نورین سے بولیں۔

"تو نورین! تم اپنے بہنوئی، میاں اور لڑکے کو بلاؤ۔ میں ابھی اور اسی وقت ان سے دو ٹوک گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔"

اور نسرین جو لڑکے کی ماں ہونے کے زعم میں یہ بھول رہی تھیں کہ چونکہ وہ لڑکے کی ماں ہیں، اسی لیے نگار ان کی باتوں سے مرعوب ہو جائیں گی۔ نگار کے تیور دیکھ کر اور سب سے بڑھ کر اپنے شوہر، بہنوئی اور بیٹے کو ان کے بلوانے کے خیال سے ہی ان کے چھکے چھوٹ گئے کیونکہ ان کے مردوں کو تو ابھی تک کسی بات کا علم ہی نہیں ہوا تھا اور نگار انہیں بلوا کر ان سے اپنا یہ کہتیں کہ تمہاری بیوی، سالی اور ماں نے یہ رشتہ توڑ دیا ہے تو بہنوئی تو خیر رشتے کی مناسبت سے حیران ہی رہ جاتے مگر میاں اور بیٹا اس بات کو کبھی برداشت نہیں کرتے اور یوں بھی ان کے میاں مزاج کے بڑے تیز تھے اور غصے میں موقع محل کا خیال نہیں رکھتے تھے۔ نورین بھی اسی خیال سے سخت ہراساں ہو رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ نگار سے کہے تو کیا کہے۔ اور ادھر بہن جنہیں بہن کی حماقت پر سخت غصہ آ رہا تھا اور وہ منہ ہی منہ میں انہیں برا بھلا کہہ رہی تھیں۔ آخر نگار سے بولیں۔

"نہیں، نہیں نگار بہن۔ یہ نسرین تو غصے میں کہہ گئیں۔ آپ ہی سوچیے، بٹیا اپنے بھائی کی سسرال سے روتی ہوئی آئی تو کون سی ماں ایسی ہو گی جسے غصہ نہیں آئے گا۔ آپ ان کی باتوں کا خیال نہ کیجیے۔ بھلا ایسی معمولی معمولی باتوں پر بھی خدا نہ کرے کہیں رشتہ توڑا جا سکتا ہے۔ وہ بھی عین شادی کے وقت۔"

"نہیں مہجبین آپا، پرائی بیٹی کا معاملہ ہے۔ دلوں میں پہلے ہی کدورت پڑ گئی ہے۔ کل کلاں کو اسے آپ لوگوں سے کوئی تکلیف پہنچی تو وہ بھی ہمیں کوسے گی۔ اور پھر میرے آگے بھی بیٹیاں ہیں۔ میں کسی مظلوم کی آہ نہیں لینا چاہتی۔ بہتر یہی ہے کہ ابھی بڑوں کے سامنے معاملہ صاف ہو جائے۔" نگار اسی تیقن سے بولیں۔

"دیکھا آپا! اور مرچیں ہوا اس تانیہ کی بچی کو۔ یہ تو ابھی نہ معلوم کس کس کا گھر تباہ کرے گی اپنی ان حرکتوں سے۔ لو بھلا ابھی بھائی کا گھر بسا بھی نہیں کہ اس نے اجڑوا کر رکھ دیا۔" نورین نے نگار کی بات سن کر چپکے سے بہن کا تعین یہ کیا، تو نسرین بگڑ کر بولیں۔

"نہیں، نہیں۔ خدا نہ کرے جو میرے بیٹے کا گھر اجڑے۔ تم بھی کیسی منحوس زبان بول رہی ہو۔"

"ہاں، میں تو منحوس زبان بول رہی ہوں اور تم جو چپکی کھڑی سب ختم کر دینے پر تلی ہوئی ہو تو یہ کوئی بات ہی نہیں۔ اب کہو ان سے کچھ ورنہ بھائی جان اور احمد اندر آ گئے تو ایک حشر بپا کر کے رکھ دیں گے۔" نورین نے بہن کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔ تو نسرین کی اور کچھ سمجھ میں نہ آیا تو گھبرا کر رونے لگیں۔

"اب رو کر کیا اپنا پچھتاوا ظاہر کرو گی، وہی تماشا ہوا ان کے سامنے۔" مہجبین نے دانت پیس کر آہستہ سے کہا۔ دونوں بہنوں کے درمیان وہ واقعی سینڈوچ بن گئی تھیں۔ جیسے نگار سارا ہی سب کرنے کو تیار کھڑی تھیں۔ آخر جلدی سے آنسو پونچھ کر انہوں نے نگار سے کہا۔

"آئی ایم ویری ساری مسز فرزند علی! میں نے تو بس غصے میں کہہ دیا تھا کہ چار دن طرف سے کوتاہی ہو گئی تھی۔ ورنہ شریفوں میں بھی بھلا کہیں رشتے توڑا کرتے ہیں۔"

"نہیں نہیں، نسرین! آپ اپنی بات پر شرمندہ ہونے کی کوشش نہ کریں۔ یہ کوئی ہنسی کھیل نہیں، بڑا ہی سیریس معاملہ ہے۔ اپنا فیصلہ بدلنے کے لیے کوئی آپ کو مجبور بھی نہیں کرے گا۔ کیونکہ ناخوشگوار رشتوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ یہ آپ کے یہاں بات چلے ہو گئی تھی، ورنہ میں تو ذرا کہنے کے پیچھے کے لیے لے لینا چاہ رہی تھی۔ خیر یہ تو بعد میں دیکھا جائے گا۔ مگر اس وقت تو آپ مردوں کو بلوا دیجیے۔"

نگار کسی طرح بھی ٹلنے پر آمادہ نہیں تھیں۔ نسرین نے ان کی بات تسلیم ہی نہیں کی تھی بلکہ بیٹی کو بھی ان سے منہ لگوا لیا تھا اور وہاں لوگوں کی بیماری اگر مکروہ شکل دینا چاہ رہی تھیں۔ ورنہ دل ہی دل میں تو بہت خوش ہو رہی تھیں کہ شکر ہے رشتہ ٹوٹا نہیں۔ ورنہ عین وقت کے وقت انکار کا زہر بھی کسی لڑکی کا مستقبل اگر تاریک نہیں کرتا تو بہت سی الجھنیں اور مشکلات ضرور پیدا کر دیتا ہے۔ لڑکی خواہ امیر گھرانے کی ہو یا غریب گھرانے کی۔ اس معاملے میں ایسا ہی ہوتا ہے کہ جیسے قسمت کی ہی کوئی کل ٹوٹ گئی ہے۔ نگار کا جواب سن کر نسرین کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ مزید کیا کہیں تو انہوں نے نورین سے کہا۔

"تم ہی انہیں سمجھاؤ نورین! آخر یہ تمہاری اتنی پرانی دوست ہیں۔"

"میں کیا سمجھاؤں؟ نہیں، تم نے تو اپنے بیٹے کے گھمنڈ میں آ کر کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔ اس نامراد کی چھوکری کو بھی ان کے سر چڑھا دیا۔ یہ معلوم ہوتے ہوئے بھی کہ وہ کیا شے ہیں۔ اور میری دوستی کے طعنے دے رہی ہو تو وہ صلح صفائی کروانے آئی تھیں۔ اپنے گھر کی دوستی کو بھی ختم کرا دیا۔" نورین جیسے انہیں کاٹ کھانے کو دوڑیں۔ تب مہجبین نے نگار کا ہاتھ پکڑ کر لجاجت سے کہا

"یہ بیٹھے بٹھائے نئی کیا افتاد ہے تمہارے دماغ میں؟ تانیہ بہتر ہے کہ خاموش رہو۔" لوبین اسے ڈانٹنے کے انداز میں بولیں
اور وہ چڑ کر کچھ کہنے ہی والی تھی کہ تبھی اس کی نظر سامنے کھڑی سلوطا پر پڑی۔ تو سب کچھ بھول بھال کر اس نے پاس بیٹھی نزہت
کا شانہ ہلا کر آہستہ سے کہا۔

"ہائے ذرا دیکھنا یہ مس یونیورس (حسینۂ عالم) یہاں کیسے ٹپک پڑی؟" تو نزہت نے بھی سامنے کچھ فاصلے پر کھڑی
سلوطا کی طرف دیکھا اور بولی۔

"ہاں واقعی۔ مگر یہ ہے کون؟" تو اسے جواب دینے کے بجائے تانیہ نے نیلوفر سے پوچھا۔

"اے سنو نیلوفر یہ سامنے جو ایک آفت کی پرکالہ کھڑی ہے یہ کون ہے؟"

"یہ — یہ سلوطا ہیں۔" نیلوفر نے گول مول سے انداز میں بتایا۔

"کون سلوطا؟ کیا تمہاری کوئی کزن ہیں؟" تانیہ نے سوال کیا۔ تو نیلوفر لمحہ بھر سٹپٹا کر بولی

"نہیں — کزن تو نہیں ہیں۔ بس ان سے ہمارا کچھ ایسا ہی رشتہ ہوتا ہے جیسے تمہارا شاہین رضا سے۔" اصل میں شاہین
تانیہ کی بڑی پھوپھی کی نند تھی۔

"او — اچھا اچھا — یعنی سمدھیانے کا رشتہ ہوتا ہے تمہارا ان سے۔ مگر اب تک تم نے انہیں کہاں چھپا رکھا تھا؟"
تانیہ مسلسل سلوطا کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ نیلوفر کو تانیہ کا سلوطا میں دلچسپی لینا کچھ اچھا نہ لگا۔

"بھئی ہم کیوں چھپاتے انہیں۔ یہ خود ہی کچھ آدم بیزار سی ہیں کسی کے سامنے آتی ہی نہیں ہیں۔"

"اصل میں ان کے ساتھ کچھ ٹریجڈی ہو گئی ہے اس لیے یہ سب سے الگ تھلگ ہی رہتی ہیں۔" نیلما بولی۔

"ہائے ویری سیڈ۔ مگر ایسی کیا ٹریجڈی ہوئی ہے؟" تانیہ نے افسوس کرتے ہوئے بہت تجسس سے پوچھا۔

"اچھی طرح تو معلوم نہیں لیکن شاید ان کے منگیتر نے کچھ بے وفائی کی ہے۔ یا پھر وہ مر گیا ہے۔ بس اسی کے غم میں
دنیا تیاگ بیٹھی ہیں۔" نیلما کے بجائے نیلوفر نے بتایا۔

"اف ٹائے دیکھو تو ذرا۔ گلاب کا نو شگفتہ پھول لگ رہی ہیں یہ تمہاری پھوپھی کی ان لاز میں سے جو ہیں۔" تانیہ نے
ان لاز میں سے جو ہیں کچھ اس طرح کہا کہ ارد گرد بیٹھی لڑکیوں کو ہنسی آ گئی۔

"سچ مجھے تو افسوس اس بات پر ہے کہ میں — نے انہیں بہت دیر میں دیکھا۔ پہلے دیکھ لیتی تو اپنے جھیا کے لیے
انہیں ہی سلیکٹ کرتی۔" تانیہ نے نزہت کے کان کے قریب سرگوشی کی تو نزہت اسے گھور کر بولی۔

"چلو فضول باتیں بند کرو کسی نے سن لیا تو خواہ مخواہ ہی۔"

"سن لیا تو سن لے لیکن میں نے ایسی اوریجنل بیوٹی نہیں دیکھی۔ سچ لگتا ہے اللہ میاں نے اسے اپنے ہاتھ سے
گھڑا ہے۔" تانیہ حسب عادت اونچی آواز میں بولی اور اوریجنل بیوٹی کہنے پر تو نزہت لوٹ لوٹ گئی۔ "نیچے ابھی نازو
کی تعریف میں منہ خشک ہو رہا تھا اور اب سلوطا کے آگے انہیں سب پھیکے نظر آ رہے ہیں۔" درخشاں نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں اور ذرا تشبیہات ملاحظہ ہوں۔" کمیرو ہنس کر بولی۔

"تشبیہات کیسی۔ میں کچھ غلط تو نہیں کہہ رہی۔ میری بھابی تو بالکل ایسی کلی لگ رہی ہیں جو کسی دم بھی کھلنے والی
ہو۔ جس میں خوشبو بھی ہو اور بانکپن بھی۔ اور یہ آپ کی سلوطا یہ واقعی کسی نو شگفتہ پھول کی طرح ہیں۔ جس میں
نزاکت، مہک اور رعنائی ہوتی ہے۔ جیسے کچھ دیر پہلے ہی کھلا ہو۔ بلکہ پورا ہی کھل گیا ہو۔"
اور تانیہ کی بے تکی تشبیہ دینے پر سب بری طرح ہنسنے لگے۔

"اے یہ اپنی نازو کی نند تو بڑی پٹاخہ ہے۔ کیسی کترنی کی طرح زبان چل رہی ہے اس کی۔" تم نے نا پہلے پڑھی
شعیب کے رشتے کی ایک پھوپھی سردار جہاں بیگم نے کشور جہاں سے کہا۔

"اے ہاں آپا سردار جہاں بیگم آج کل کی لڑکیوں کی زبانوں کے تو تانتے ہی ٹوٹے ہوئے ہیں۔" کشور جہاں بولیں۔

"اے ٹوٹے کیا بلکہ بنائے ہی نہیں گئے تانتے۔ بے تانتوں کے بچے پیدا ہو رہے ہیں آج کل۔" ایک اور عزیزہ
کلثوم نے گردن کو شانوں میں دباتے ہوئے ہونٹوں کو پھیلا کر کہا تو بزرگ خواتین ہنسنے لگیں۔

"اے پھپھو بیگم کرو ڑوں اربوں سالوں سے بھی زیادہ عرصے سے آسمان پر جو روحیں جمع ہیں وہ اب بوڑھی ہو
کر زمین پر اترتی ہیں نا۔ آج کل تو چھٹی کے اندر اندر ہی نومولود بچے آنکھیں ملتے ہی مسکرانے لگتے ہیں۔ جبکہ ہمارے

زمانے میں پانچویں چھٹے مہینے کہیں جا کر بچہ صورتیں پہچانتا تھا۔" ایک اور خاتون بولیں۔

"اے ہاں بہن۔ اصل میں قرب قیامت ہے۔ ہمارے بزرگ کہتے تھے کہ قرب قیامت میں گائے ڈھور بھی گے سیر تر ہو گے
جنگل میں منتقل ہو گا۔ نمک میں مٹھاس نہ رہے گی مٹھاس میں مٹھاس نہ رہے گی۔ گائے گو کھائے گی اور کنواری بر مانگے گی۔ یہ
سات نشانیاں ہیں قرب قیامت کی اور عجیب کہ لڑکی بر مانگنے لگی ہے تو وہ دن بھی تو ہیلائے گی۔ اور دیکھو تو آج کل کی
لڑکیاں کیسی بے حیائی کی باتیں کرتی ہیں۔ نہ بڑوں کا ادب نہ چھوٹوں کا لحاظ اور نہ موقع محل کا خیال۔ زبان کے آگے کنواں
آگے یا کھائی کہیں پر سے ہی چلی جائیں گی۔" کشور جہاں نکتہ چینی کرنے کے انداز میں بولیں۔

"اے ہاں آج کل کا تو واقعی یا وا آدم ہی نرالا ہو گیا ہے۔ لڑکوں کی تو خیر بات ہی دوسری ہے مگر لڑکیوں کی آنکھوں
کا تو پانی ہی ڈھل گیا ہے۔ اے ذرا اندھیر تو دیکھو۔ کہ شادی بیاہ کے موقعوں پر لڑکیاں بالیاں لڑکوں کے ساتھ مل کر گاتی ناچتی
ہیں اور ایسا ہڑ دنگا مچاتی ہیں کہ شیطان بھی چلو بھر پانی میں ڈوب مرتا ہو گا۔ اے ہمارے زمانے میں اگر لڑکیوں کے ایسے
طور چلن ہوتے تو اماں باوا انہیں زمین کھود کر گاڑ دیتے۔" سردار جہاں بیگم نے کہا۔

"اے پھپھو بیگم جیسا زمانے کا چلن ہوتا ہے اس کے مطابق تو چلنا پڑتا ہے۔ اب یہ زمانہ ہماری تیسری نسل کا ہے۔
اور پہلے سے بہت زیادہ ترقی بھی کر گیا ہے۔ اب اس زمانے کی بچیاں آپ کے زمانے کے رواج اور دستور اپنا کر بیٹھ
جائیں تو موجودہ زمانے کے تقاضوں کو ہی نہ گر رہ جائیں گی۔ وہ جو کہتے ہیں نا کہ چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی تو کچھ غلط تو نہیں
کہتے۔ انسان کو زمانے کے ساتھ تو چلنا ہی پڑتا ہے۔" عائشہ بیگم ان لوگوں کے اعتراضات سے اکتا کر بولیں۔ اور تبھی زینب اور
نازش نے آ کر سب کو کھانا لگ جانے کی اطلاع دی تو دولہا والوں سمیت سب ہی نے کھانا کھانے کی غرض سے لان میں
تنے شامیانوں کا رخ کیا۔

باہر شامیانوں کے نیچے مکس حساب کتاب — تھا۔ یعنی خواتین کے ساتھ کھڑے مرد اور سمدھیانے سے آئے ہوئے لڑکے
بھی کھانے میں شریک تھے۔ کہ یکا یک زینت کو بیٹے کی غیر موجودگی کا احساس ہوا۔ انہوں نے پہلے سارے مہمانوں میں
اسے ادھر ادھر تلاش کیا پھر شائستہ بیگم کے لڑکے اسد سے پوچھا۔

"یہ بابا نظر نہیں آ رہے۔ اسد بیٹے کیا تم نے انہیں کہیں دیکھا ہے؟"

"ابھی کچھ دیر پہلے تو اندر لان میں ہی تھے ممانی جان۔ کہیں اپنے کمرے میں نہ چلے گئے ہوں یا پھر اندر ہی کہیں رہ گئے
ہوں؟" اسد بولا۔

"اے تو ذرا دیکھو تو جا کر آخر بیٹے کہاں گئے۔ یہاں تو کھانا بھی شروع ہو گیا اور مجھے مصروفیت میں خیال ہی نہ رہا۔"
اسد پلیٹ ہاتھ میں لیے کھانا کھا رہا تھا۔ نوالہ منہ میں رکھ کر بولا۔

"جی اچھا ممانی جان۔ بس ابھی جا کر دیکھتا ہوں۔"

"نہیں تم اطمینان سے کھانا کھاؤ میں خود ہی دیکھ لیتی ہوں۔" زینت نے اسد کو کھانا چھڑوا کر بھیجنا مناسب نہیں سمجھا
اور خود بیٹے کو دیکھنے اندر چل دیں۔

ان کا خیال درست ہی نکلا۔ وہ اپنے کمرے میں ہی موجود تھا اور اپنے بیڈ پر تکیے سے لگا ٹانگیں پھیلائے کوئی کتاب
پڑھ رہا تھا۔ ماں کو آتا دیکھ کر اس نے کتاب بند کی اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور اسے اطمینان سے کتاب پڑھتا دیکھ کر زینت
جز بز سی ہو کر بولیں۔

"یہ بھی بھلا کمرے میں بند ہو کر کتاب پڑھنے کا موقع ہے بیٹے۔ تم بھی حد کر دیتے ہو بد اخلاقی کی۔ وہاں سب کھانے پر
تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔"

"لیکن میں کوئی چیف گیسٹ (مہمان خصوصی) تو نہیں ہوں ممی جو میرے جائے بغیر کوئی نوالہ نہیں توڑے گا۔" وہ
ناگواری سے بولا۔

"چیف گیسٹ تو نہیں ہو لیکن لڑکی کے بڑے اور اکلوتے بھائی تو ہو۔ اسی لیے لڑکے والے بھی تمہیں پوچھ رہے ہیں۔"
زینت کو مجبوراً غلط بیانی سے کام لینا پڑا۔

"پھر چھوڑیے ہیں تو آپ بھی ان سے کہہ دیجئے ممی کہ لڑکی کے بڑے اور اکلوتے بھائی کا اس وقت کمرے سے باہر جانے
کا بالکل موڈ نہیں ہے بلا تکلف کھانا کھائیں۔" وہ قدرے بدتمیزی سے بولا۔

"واہ واہ اب سمدھیانے والوں سے جا کر بھلا میں یہ کہوں گی کہ لڑکی کے بھائی کا کمرے سے نکلنے کا موڈ نہیں ہو رہا۔ یہ تم کیسی الٹی باتیں کرتے ہو بیٹے۔ کیا یہ چاہتے ہو کہ بہن کو اس کی سسرال والوں کی نظروں میں بالکل ہی گرا دو۔ سب کو تجسس پیدا ہو گا کہ لڑکی کا بھائی گھر میں موجود ہوتے ہوئے بھی کھانے میں شریک نہیں ہوا۔ کچھ معلوم بھی ہے کہ لڑکی کا معاملہ کتنا نازک ہوتا ہے۔ اور لڑکے والے ایک ذرا سی بات کی بھی کس طرح گرفت کرتے ہیں۔"

"اگر یہ لوگ ایسے ہی نیرو مائنڈڈ اور کوتاہ نظر ہیں تو پھر نازو کا رشتہ ان کے ہاں کرنا ہی نہیں چاہیے تھا۔"

"ارے یہی لوگ کیا ساری دنیا کے لڑکے والے کچھ ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

"اچھا تو گویا جب آپ بھی لڑکے والی بننے کی پوزیشن میں ہوں گی تو ایسی ہی ثابت ہوں گی جیسے ساری دنیا کے لڑکے والے ہوتے ہیں؟" وہ ہمیشہ ماں کی باتوں کی گرفت کچھ اسی طرح کرتا تھا۔ زینت کو اس کی بات پر دکھ تو بہت ہوا مگر وہ جواب گول کر کے بولیں۔

"وہ تو بعد میں دیکھا جائے گا۔ مگر تم کسی طرح اٹھو تو سہی۔ وہاں تو کھانا بھی کب کا شروع ہو چکا۔"

"کھانا شروع ہو چکا تو آج کل تو لوگ کچھ اتنی تیز رفتاری سے کھانا کھاتے ہیں کہ کب کا ختم بھی ہو چکا ہوگا۔ پھر میرے باہر جانے کی ضرورت تو باقی نہیں رہ جاتی۔ اُف کتنا جھمیلا اور بیسٹ دھرم تھا وہ۔" زینت اس کی باتوں پر زچ سی ہو کر رہ گئیں۔

"اچھا جب تم نے طے ہی کر لیا ہے کہ تم جاؤ گے ہی نہیں تو پھر میں نے یہاں آ کر جھک ہی ماری۔ اس سے تو اچھا تھا کہ میں اماں جان کو تمہارے پاس بھیج دیتی۔ ان کی بات ماننا تو تم اپنا ایمان سمجھتے ہو نا۔ پھر بھلا میری کیا حیثیت کیا اوقات۔" زینت کو سچ مچ ہی غصہ آ گیا تھا اور شاید پہلی بار آیا تھا۔ وہ مڑ کر جانے لگیں تو اس نے انہیں پکارا۔

"ممی!"

"ہاں کہو کیا بات ہے؟" انہوں نے وہیں رک کر پوچھا۔

"مجھے معلوم ہے کہ ماں کا رتبہ کیا ہے؟" اس کے منہ سے انہوں نے پہلی بار ایک انوکھی سی بات سنی تھی۔ انہیں سخت اچنبھا ہوا۔

"اچھا معلوم ہے پھر بھی دوسروں کو مجھ پر ترجیح دیتے ہو؟" وہ اس کے نزدیک آتی ہوئی بولیں۔

"نہیں یہ بات نہیں ممی۔ ماں کے مرتبے کے لحاظ سے اماں جان کی حیثیت کچھ بھی نہیں ہے۔ میں نے بحمد اللہ باقاعدہ ترجمے کے ساتھ قرآن شریف پڑھا ہے۔ اور اسی نے ہی مجھے ماں کی عظمت اور مرتبے سے روشناس کرایا ہے۔ لیکن اماں جان کے مجھ پر بہت سے وہ احسانات ہیں جو آپ کو مجھ پر کرنے چاہیے تھے اور وہ فرائض بھی جو آپ کو ادا کرنے چاہیے تھے انہوں نے ادا کیے ہیں۔ یوں بھی ممی اگر وہ سوتیلی بھی ہیں تو ڈیڈی کی چچی اور پھوپھو کے لیے ہی ہوں گی۔ آپ کو تو انہیں سوتیلا نہیں سمجھنا چاہیے کیونکہ انہوں نے ہی بڑے شوق و دلچسپی سے آپ کی شادی ڈیڈی سے کرائی تھی۔" اُف زینت تو سمجھ رہی تھیں کہ ان کے خفا ہو جانے پر اگر وہ ان کو منائے گا نہیں تو اپنی معذرت ضرور پیش کرے گا۔ مگر وہ تو ابھی دادی کے قصیدے پڑھ رہا تھا۔ وہ جل کر بولیں۔

"اچھا تو تم نے گویا یہی سب کچھ کہنے کے لیے مجھے روکا تھا۔"

"نہیں ممی بلکہ آپ کو آپ کے رتبے سے آگاہ کرنے کے لیے روکا تھا۔ جو میرے دل میں آپ کے لیے ہے۔" وہ پہلی بار مسکرایا اور جھک کر پیر نیچے فرش پر لٹکا لیے۔

"ہونہہ جبھی تو میری ہر بات رد کر دیتے ہو۔ بات بات میں دل توڑ دیتے ہو۔" وہ شاکی سے لہجے میں آزردگی سے بولیں۔

"اوہ نو ممی۔ میں نے آپ کی بات رد نہیں کی۔ بلکہ میرے سر میں سخت درد ہو رہا ہے۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ میں زیادہ شور و غل اور لوگوں کے ہجوم میں رہنے کا عادی نہیں ہوں۔ پلیز ممی۔ میری مجبوری کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔" وہ کتنی لجاجت سے کہہ رہا تھا جبکہ اس سے پہلے تو کبھی ایسے لب و لہجے میں ان سے بات ہی نہیں کی تھی۔ ہزار اس سے شاکی سہی لیکن آخر تو وہ ماں تھیں اور وہ ان کا اکلوتا اور لاڈلا بیٹا تھا۔ انہیں بھی معلوم تھا کہ ان کا بیٹا شور و غل کا بالکل عادی نہیں۔ ان کی ممتا نے ایک دم ہی جوش مارا تو وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔

"بیٹے تمہارے سر میں درد تھا تو تم نے مجھ سے آتے ہی کیوں نہ کہہ دیا۔ چلو آرام سے لیٹ جاؤ۔ میں ابھی فون کر کے کرنل ختی کو بلوا لیتی ہوں۔ وہی آ کر تمہارے لیے کوئی دوا تجویز کر دیں گے۔"

"نہیں نہیں ممی اب ایسا بھی سیریس کیس نہیں ہے جس پر ڈاکٹر سے کنسلٹ کیا جائے۔" وہ ڈاکٹر کے نام سے بدک کر بولا۔

"نہیں خدا نہ کرے۔ چلو خیر سر درد کی گولی کھا لو۔ میں ابھی گولیاں اور چائے لے کر آتی ہوں۔ پھر تمہارا سر بھی دبا دوں گی۔"

"اوہ نو ممی۔ میں دوا کھانے کا قائل ہی نہیں۔ جبھی تو آج تک اپنی زندگی میں کبھی بیمار نہیں پڑا۔ یہ دیکھیں کیسا ہٹا کٹا ہوں ایک دم باڈی بلڈرز کی طرح۔"

"اے ماشاء اللہ۔ چشم بد دور۔ خدا تمہیں یونہی صحیح سلامت رکھے۔ اس طرح منہ بھر کر تو نہ کہو۔ ٹوک لگ جاتی ہے۔"

"واہ کیا خوب لاجک ہے۔" وہ ہنس کر بولا۔

"اچھا تھوڑا سا کچھ کھا ہی لو پیٹ خالی ہونے کی وجہ سے بھی سر میں درد ہو جاتا ہے۔ یہاں کراچی میں تو ایسڈیٹی سے بڑھنے کی شکایت عام ہے۔" زینت کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح بیٹے کے سر سے درد جھٹک دیں۔

"ٹھیک ہے آپ کہہ رہی ہیں تو کھانا ضرور کھا لوں گا۔" اس نے ابھی اسی قدر کہا تھا کہ نیلما بھاگتی ہوئی اندر آ گئی۔ اس کا سانس پھول رہا تھا پھر بھی بھائی کو دیکھ کر معذرتی لہجے میں بولی۔

"سوری بھائی جان میں بغیر اجازت کے اندر آ گئی ہوں لیکن ایمرجنسی ہی کچھ ایسی ہے۔"

"کیوں خیریت تو ہے۔" زینت نے گھبرا کر پوچھا۔

"ممی آپ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر سارا گھر چھان مارا۔ وہ سلوطا آپا بری طرح جل گئی ہیں نا۔" نیلما نے قدرے ہانپتے ہوئے بتایا۔

"کون؟ کون؟" وہ جو ماں کے کہنے پر لیٹ گیا تھا اس نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"سلوطا آپا۔ وہی جنہوں نے آپ کو آئینے میں جھلایا تھا۔" نیلما نے بتایا۔

اور بیٹی کے اس سے اس طرح سلوطا کا تعارف کرانے پر زینت چڑ کر بولیں۔

"مگر جلی کیسے گئی وہ؟"

"وہ خانساماں اسٹو سے کیتلی اتار رہا تھا۔ ہینڈل بہت گرم تھا اس پر گرپ نہ رکھ سکا کیتلی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر سلوطا آپا کے پیروں پر جا پڑی جو قریب ہی کھڑی پیالیاں سیٹ کر رہی تھیں۔ بیچاری پنڈلیوں تک آبلے پڑ گئے ہیں گھٹنے بھی سخت متاثر ہوئے ہیں۔" نیلما نے اس کے جلنے کی وجہ بیان کی تو زینت نہایت ناگواری سے بولیں۔

"اُف تو یہ لڑکی جب سے آئی ہے ہر روز کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا کر دیتی ہے۔"

"مگر ممی یہ تو ایک اتفاقی حادثہ ہی ہے۔ کوئی جان بوجھ کر تو نہیں جلائے انہوں نے اپنے پیر۔"

"اے ایسا ہی اتفاقی حادثہ کل بھی تو ہوا تھا اس کے ساتھ۔ معلوم بھی ہے حالات کس حد تک خراب ہو گئے تھے وہ تو [illegible] صلح صفائی نہ کرتیں جا کر تو اس وقت اس گھر میں تو کوئی بول رہا ہوتا۔"

"پھر بھی ممی چل کر دیکھ تو لیں انہیں۔" نیلما ماں کی بے حسی پر مزید زچ ہو کر بولی۔

"ہاں چلو۔ دیکھ لوں۔ مگر کچھ کھانے کو کیا رہا۔ میں تو کھانا سرو ہوتے ہی یہاں آ گئی تھی۔ یہ بابا کے سر میں درد ہو رہا تھا نا۔ اب پتا نہیں باہر کا حشر کیا ہوا ہوگا۔" زینت بولیں۔

"ممی آپ فکر نہ کریں سب اطمینان سے کھانا کھا رہے ہیں۔ بلکہ اب تو ختم کرنے والے ہیں۔ اچھا خیر اگر بھائی جان کے سر میں درد ہو رہا ہے تو آپ انہیں کے پاس رہیں میں چلی جاتی ہوں سلوطا آپا کے پاس۔" نیلما بولی۔

"ارے نہیں تم جا کر اطمینان سے کھانا کھا لو۔ میں بھی بس ابھی آتی ہوں۔" زینت نے لاپروائی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں ممی میں کھا چکی ہوں کھانا۔ ڈیڈی نے مجھے آپ کو بلانے بھیجا تھا وہ سلوطا آپا کے کہنے پر ہی کرنل ختی کے آنے کا انتظار کر رہے ہیں جب تک آپ جلدی سے آ جائیں۔" نیلما نے باہر کا رخ کرتے ہوئے کہا۔ اور شوہر کا نام سن کر زینت بیگم گھبرا کر اٹھیں اور باہر کا رخ کرتے ہوئے پیچھے بولیں۔

"دیکھا بعض گھڑی ایسی ہوتی ہے کہ جو منہ سے نکل جائے وہ کسی نہ کسی طرح پورا ہو کر رہتا ہے۔ اب جب تو تمہیں دکھانے کی غرض سے کرنل ختی کو بلوانا چاہا وہ اسی وقت آ گئے ڈیڈی نے سلوطا کے لیے بلوا لیا۔ مگر شکر ہے تم بچ گئے۔" اور پھر وہ شوہر کی خفگی کے خیال سے فوراً ہی اس کے کمرے سے باہر نکل گئیں۔

اور اگر ولن بھی ہوتا تب بھی میرا اس کی احوال پرسی کو جانا کسی طور پر بھی مناسب نہ ہوتا۔ کیونکہ پہلے ہی اس کے ہاتھوں میری کافی کم عزتی افزائی ہوئی ہے۔ لہٰذا بہتر یہی ہے مائی ڈیئر اسفند کہ لائٹ بند کر کے آنکھیں بند کر لو۔ اور خوابوں کے کسی خوبصورت جزیرے کی سیر کو نکل جاؤ۔ ناؤ لی کام اینڈ کوائٹ۔ اینڈ شب بخیر۔

پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر سرہانے لگا لیمپ آف کیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

شادی کے تیسرے روز دعوت ولیمہ تھی۔

لڑکے والوں نے ہوٹل شیرٹن میں ڈنر رکھا تھا۔

مہمان وہاں کی بہت بڑی تعداد میں مدعو کیے گئے تھے۔

ایک سے ایک بڑھ کر حسین، متمول اور طرح دار لڑکی موجود تھی۔

جو اپنے لباس اور زیورات کی نمائش میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی پوری پوری تیاری کر کے آئی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی فیشن پریڈ ہو رہی ہو۔

یا پھر پریوں کا کوئی جھرمٹ کسی طلسم زار میں بھٹکتے بھٹکتے شیرٹن کے بینکوئٹ ہال لالہ زار میں نکل آیا ہو۔

زینت کبھی کسی لڑکی کا ہاتھ پکڑے اس کے پاس آ جاتیں اور اس سے اس کا تعارف کرواتیں۔ تو کبھی اس کا ہاتھ پکڑ لڑکیوں کے کسی جھرمٹ میں جا پہنچتیں اور فرداً فرداً ہر لڑکی سے اس کا تعارف کراتیں۔ کیونکہ رخ دیا ان کا انداز بڑا دوست تھا۔ کہ کوئی اچھے پاس کھڑا ہوتا تو ایک جھپکتے ہی بھیڑ میں گمشدہ ستارا کے نکل جاتا اور دوسری نئی صورت پاس آ کھڑی ہوتی۔ گو زینت نے اک پراپا لڑکیاں دکھانے کا مقصد واضح نہیں کیا تھا۔

نہ خود اس نے بھی معلوم کرنے کی کوشش ہی کی تھی۔

پھر بھی وہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ ماں کیا چاہتی تھیں۔

اب یہ بھی نہیں تھا کہ اس کی پسند بہت اعلیٰ اور نایاب تھی۔

اور معیار بہت اونچا۔ کہ وہ کسی تخیلاتی آئیڈیل قسم کی حسینہ کا یا پھر پریوں کی شہزادی کا متمنی ہوتا۔

چنانچہ لڑکیاں تو وہاں موجود مہمانوں میں بعض بعض انتہائی حسین تھیں جن سے ماں تعارف کرا چکی تھیں اور ان کے علاوہ بھی بہت سی۔ جن میں سے جسے کو بھی وہ پسند کرتا شریک زندگی کی حیثیت دے سکتا تھا۔ لیکن ابھی دور دور تک بھی زندگی کی رفاقت کے لیے کسی کا ہاتھ تھام کر چلنے کی وہ ضرورت ہی نہیں محسوس کرتا تھا۔

کیونکہ صرف اعلیٰ تعلیم کی ڈگری ہاتھ میں لے کر والدین کی جائیداد اور روپے پیسے کے بل بوتے پر زندگی گزارنے کا وہ بالکل قائل نہ تھا۔ بلکہ خود اپنے زور بازو سے اپنا مستقبل سنوارنے کا مصمم عزم رکھتا تھا۔

جبکہ عزم ہی عمل کا دروازہ ہوتا ہے جس سے گزر کر ہی انسان تسخیر کائنات کی مہم کا آغاز کر لیتا ہے۔ اور اس کے ارادے بہت بلند اور نیک تھے۔ وہ اپنا مستقبل بھی سنوارنا چاہتا تھا تو اس نیت اور ارادے سے کہ اس کی ذات سے متعلق خدا کو فیض حاصل ہو یا اس کے فن یا پیشے سے ہر خاص و عام استفادہ حاصل کر سکے اور اس کے ارادوں اور خیالات سے زینت بیگم لاعلم تھیں۔

ہوٹلوں میں گھر کا سا حساب کتاب تو نہیں ہوتا کہ مہمان کا جب دل چاہے چلا آئے اور جب منہ اٹھے چلا جائے۔ بلکہ ایک قاعدہ اور اصول ہوتا ہے کہ کھدو وہ مقررہ وقت پر ہی سب آ سکتے ہیں۔ ڈنر کے بعد تو لوگ کم ہی ٹھہرتے والی تھی۔ مگر چونکہ سلمیٰ بیگم۔۔۔ جوڑوں کے درد میں اضافے کے باعث دعوت ولیمہ میں شرکت نہیں کر سکی تھیں اور گھر پر نوکروں کی نگہداشت میں رہ گئی تھیں لہٰذا اس لیے بھی وہ کھانا کھاتے ہی نسرین سے اجازت لے کر سب سے پہلے گھر واپس لوٹ آیا تھا۔ جو آتے ہی اس نے سیدھا اسی کمرے کا رخ کیا تھا جو اتفاق سے سلمیٰ بیگم کے تصرف میں تھا۔ سلمیٰ بیگم اپنے بیڈ پر لیٹی تھیں اور ان کے سرہانے بیڈ کی پٹی پر ٹکی دونوں پیر بیڈ کے نیچے پیڑھی پر رکھے ہلکے آسمانی رنگ کے لباس میں ملبوس سلوطہ بیٹھی آہستہ آہستہ ان کا سر دبا رہی تھی۔

وہ ایک دم ہی اندر داخل ہوا تو سلوطہ نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ اور یوں دونوں کی نظریں چار ہو گئیں۔ وہ چند لمحے متعجب اور مرعوبیت سے اندازہ ہی اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اور بے دھیانی میں پیر تپائی سے ہٹا کر نیچے قالین پر رکھے تو درد کی شدت کو ضبط کرنے کی کوشش میں چہرہ سرخ ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے منہ سے ایک سسکاری سی نکل گئی۔ اور جانے کیوں کرا دیے۔۔ وہ چونک کر اس کے نزدیک آ گیا۔ اور بے حد غیر ارادی طور پر جھک کر اس نے بڑی احتیاط سے سلوطہ کے دونوں پیر پھر تپائی پر رکھ دیے اور یہ سب کچھ

اس قدر اچانک اور غیر متوقع ہوا کہ سلوطہ سے باز بھی نہ رکھ سکی۔ اس نے جیسے جھٹکے ہی چہرہ اوپر اٹھا کے اس کی طرف دیکھا ایک پل پلک جھپکا بغیر اس کی نظریں گنتی کر کے سیدھا ہوتا ہوا بولا۔

"کاتعاون ہے جناب وہ خود ہی نظریں چرا کر سیدھا ہوتا ہوا بولا۔ پیروں کا یہ حال ہے کہ پھیلا سمٹے ہوئے مشتری کا نقشہ پیش کر رہے ہیں۔ فرش پر ٹکائے بھی نہیں جا رہے۔ پھر کیا مسئلہ ہے بل چل کر یہاں آئی تھیں آپ۔۔ اور آنے کی ضرورت بھی کیا تھی؟ انداز لتاڑنے کا سا تھا مگر لہجے سے ہمدردی عیاں تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے جواب دینا پڑا۔

"وہ مجھے بیڈ پر بیٹھا ہو جانے کی وجہ سے اماں جان کے سر میں سخت درد ہو رہا تھا اس لیے۔" اس سے نظریں ملائے بغیر جواب دیتے دیتے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"کمال ہے۔ کیا مجلی بیٹی کے غم سے واقف ہیں جو اپنے کرے میں بیٹھے بیٹھے آپ کو اماں جان کے سر درد اور بخار کا علم ہو گیا تھا۔ ورنہ اماں جان خود آ کر آپ کو یہاں لانے سے تو رہی تھیں۔" وہ بھنویں اچکا کر تیکھے سے لہجے میں بولا۔ اس کا جی ہی نہیں چاہ رہا تھا اس سے بات کرنے کو مگر سلمیٰ بیگم کی موجودگی کے خیال سے جواب دینا ہی پڑا۔

"مہمان داری کی وجہ سے آج کل اماں جان بھی اسی کمرے میں رہ رہی ہیں۔" اس نے یوں کہا جیسے زیادہ بات کرنے سے اس کی انرجی ضائع ہو جانے کا خدشہ لاحق ہو۔ کچھ بخار کی وجہ سے اور کچھ سلوطہ کے نرم اور نازک ہاتھوں سے سر دبنے کی وجہ سے سلمیٰ بیگم کی آنکھ لگ گئی تھی گو وہ دھیمی آواز میں ہی بول رہا تھا پھر بھی اس کی آواز پر ان کی آنکھ کھل گئی۔

"ارے کون ہے سلوطہ بیٹی۔" انھوں نے کراہتے ہوئے پوچھا۔

"وہ۔ وہ۔ یہ۔"

"وہ وہ یہ یہ کیا ہے۔ اس طرح کہہ کیوں نہیں دیتیں کہ اسفند ہے۔ اب میرا آپ سے کوئی قانونی رشتہ تو نہیں جو میرا نام لیتے آپ کو شرم آئے۔" وہ اس کے ہکلانے پر چڑ کر تیز و تند لہجے میں بولا۔ وہ اپنی روانی میں بڑی سے بڑی بات کہہ جاتا تھا۔ اس بات کی پروا کیے بغیر کہ دوسرے پر اس کی بات کیا اثر کرے گی۔ وہ بھی اس کے آخری فقرے پر کٹ کر رہ گئی۔ اور اندر ہی اندر کھول ہی اٹھی۔

"ہیں اسفند ہوں اماں جان آپ کا بیٹا۔" وہ اس کے احساسات کی پروا کیے بغیر دوسری طرف سے آ کر وادی پر جھک گیا۔ "کیسی طبیعت ہے آپ کی؟" وہ سوال کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے ان کی پیشانی کو چھو کر دیکھا پھر نبض پر ہاتھ رکھ کر شاید اٹھنے کی دھڑکنیں گننا چاہی مگر وہ اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دے پایا تھا۔ نبض دیکھنے کے بعد بستر سے ان کی کلائی چھوڑ کر پریشانی سے لہجے میں بولا۔

"انھیں تو کافی تیز بخار ہے۔ کوئی دوا بھی دی گئی ہے انھیں؟" براہ راست نہ کہا مگر وہ سلوطہ سے ہی مخاطب تھا۔

"جی ہاں صرف جوڑوں کے درد کی۔" اس نے مختصراً کہا۔

"بخار کی کیوں نہیں۔" تھوڑا سا غور کر کے اس نے پوچھا۔

"کیونکہ بخار ابھی دو تین گھنٹے قبل ہی چڑھا ہے۔" وہ بھی درشتی سے بولی۔

"ہاں ہماری ممی کو تو اپنے فیشن اور ایکسپوژر سے فرصت ہی نہیں مگر ڈیڈی کو تو پلٹ کر دیکھنا چاہیے تھا مگر وہ بھی۔" وہ نہایت غصے سے اپنی بات کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

"لیکن وہ بھی کیا کرتے۔ دعوت ولیمہ میں ان کی شرکت بھی تو بہت ضروری تھی۔" اس نے شعیب منصور کی طرف سے صفائی پیش کرنی چاہی۔

"میں نے آپ سے تو جواب طلب نہیں کیا تھا۔" وہ چڑتے ہوئے انداز میں بولا۔ تو وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔

"یہ تجھے تیز ہو رہا کس کی سے بات کر رہے ہو۔" سلمیٰ بیگم نے آنکھیں کھول کر اسے ٹوکا۔

"کیا کروں۔ بے حسی کی انتہا ہے۔ سب مزے سے اپنے اپنے چکروں میں مصروف ہیں اور آپ یہاں تنہا تیز بخار میں تپ رہی ہیں۔ کم از کم ڈیڈی ہی آپ کے پاس رک جاتے یا پھر ممی اپنی لاڈلی بہوؤں میں سے کسی کو آپ کے پاس چھوڑ دیتیں۔ مگر سوتیلوں کے نرغے۔"

"اسے اسے۔ یہ تم سوچے سمجھے بغیر جو منہ میں آتا ہے بک دیتے ہو۔ شعیب نے تو خود آج میری وجہ سے جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔ زینت بھی بہت پریشان ہو رہی تھیں وہ منیلما کو میرے پاس چھوڑ کر جا رہی تھیں کیونکہ ان کی شرکت ضروری تھی۔ بلکہ نازش تو جا ہی نہیں رہی تھیں مگر میں نے خود زبردستی ان سب کو بھیجا ہے۔ گھر میں ہی تو پڑی ہوں کسی مرگ کی فٹ پاتھ پر تو نہیں اور خدا خوش رکھے اس بچی کو یہ بھی تو میرے پاس کوئی وجہ۔ پھر خواہ مخواہ ہی اچھے دن سے برے دل کرنے۔" سلمیٰ بیگم نے دھیمی آواز میں اسے سمجھایا۔

"مگر یہ بیچاری تو خود معذور ہے پھر آپ کی تیمارداری کیسے کر سکتی ہے۔" دادی کے سمجھانے کے باوجود بھی اسے تاؤ آ گیا۔

"اللہ نہ کرے معذور کیوں ہونے لگی۔ اور پھر میں آخری دکو اندر تو نہیں ہوں جو تیمارداری کرا ڈالوں گی۔ جتنا بولتے ہے

دعوت ولیمہ کے بعد تقریباً دو ہفتوں تک جالوں اور دعوتوں کا سلسلہ چلتا رہا تھا پھر نازبرو اپنے شوہر احمد مرتضیٰ کے ساتھ ہنی مون منانے سوئٹزرلینڈ چلی گئی تو اس کے جانے کے بعد گویا حالات پھر معمول پر آگئے تھے۔

مہمان تو شادی کے چند روز بعد ہی اپنے اپنے گھروں کو سدھار گئے تھے۔

گل بہار میں صرف سہیل منصور ان کی بیوی نازش اور بیٹی کوثر ہی رہ گئے تھے لیکن سہیل منصور کا قیام بھی عارضی ہی تھا اصل میں وہ کراچی میں سیٹل ہونے کی غرض سے پورے سترہ برس بعد وطن واپس لوٹے تھے۔ اور اپنے لیے کراچی کے کسی معزز علاقے میں مکان خریدنے کا ارادہ رکھتے تھے، بلکہ کوشاں تھے جبکہ شعیب منصور کی خواہش تھی کہ وہ انہی کے گھر اقامت اختیار کریں۔ لیکن سہیل منصور بھائی اور بھابی پر اپنی رہائش کا بار ڈالنا نہیں چاہتے تھے بہرکیف۔ ابھی تو وہ بھائی کے یہاں ہی قیام پذیر تھے۔ ان کے علاوہ سلمیٰ بیگم تھیں جو بھائی کے پاس واپس جانے کا ارادہ تو رکھتی تھیں لیکن کچھ اس وجہ سے کہ غذا میں بد پرہیزی کی وجہ سے چونکہ ان کے جوڑوں کے درد کا اضافہ ہو گیا تھا اور اس عرصے میں وہ کافی علیل رہی تھیں اور کچھ اس لیے کہ اسفند ان کے بھائی کے یہاں واپس جانے کے حق میں نہ تھا بلکہ کسی طور پر انہیں جانے ہی نہیں دے رہا تھا اور اس کی خاطر سلمیٰ بیگم کو دنیا میں سب سے زیادہ عزیز تھی اس لیے انہیں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی خوشی کی خاطر رکنا ہی پڑا تھا۔

اب ان کے لیے دے کے سلوطاری ہی رہ جاتی تھی۔

جسے گل بہار میں اس طرح دھرنا دے کر بیٹھنے کا کوئی حق نہ تھا خود اس کی طبیعت نے گوارا کر لی تھی۔ لیکن اس کی مجبوری ہی کچھ ایسی تھی کہ یہ سارے احساسات رکھنے کے باوجود اسے نہ چاہتے ہوئے بھی یہاں رہنا پڑ رہا تھا۔

لیکن یہ مجبوری صرف اس لیے نہیں تھی کہ اس کے بھائی اور بھاوج لندن ٹور پر گئے ہوئے تھے یا ان کے ورلڈ ٹور پر جانے کی وجہ سے چونکہ وہ گھر میں تنہا رہ جاتی اس لیے اسے کراچی بھیج دیا گیا تھا اور ان کے واپس لوٹتے ہی وہ بھی واپس چلی جاتی۔ بلکہ وہ تو کراچی میں مستقل اقامت کی غرض سے آئی تھی۔ اور یہی سوچ کر آئی تھی کہ کوئی معقول ملازمت ملتے ہی اپنی رہائش کا بھی بندوبست کرے گی لیکن سروس ملنا تو گویا اسے تو ابھی تک ملازمت تلاش کرنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ جس کی وجہ ایک تو اس کے پیروں کے زخم اور دوسری سلمیٰ بیگم کی علالت تھی۔

کیونکہ اپنے دکھتے ہوئے زخمی پیروں کے ساتھ پوری تندہی سے سلمیٰ بیگم کی تیمارداری بھی کی تھی۔

یوں تو نازش، کوثر اور شیلا بھی سلمیٰ بیگم کا بہت خیال رکھتی تھیں اور ظاہرداری کے طور پر کبھی کبھی زینت اور نیلوفر بھی ان کی پوچھ گچھ اور خبر گیری رکھتی تھیں۔ مگر ان کے پاس زیادہ دیر تک ٹکتا کوئی بھی نہ تھا۔

نازش اور کوثر گھر کی آرائش کے ساتھ ساتھ گھر کی زیبائش کے لیے نئی نئی چیزیں مہیا کرنے اور رشتہ داروں اور واقف کاروں سے ملنے ملانے کے سلسلے میں زیادہ تر گھر سے باہر ہی رہتی تھیں۔ اور نیلوفر اور شیلا کالج چلی جاتی تھیں۔

سہیل منصور بھی بھائی کے ساتھ ان کے آفس اور کبھی اپنے کسی کام کے سلسلے میں سارا سارا دن گھر سے باہر ہی رہتے تھے۔

زینت کی بھی اپنی مصروفیات تھیں۔ صبح سے دن کے کھانے کے وقت تک گھریلو امور انجام دیتی ہیں۔

دوپہر سے سہ پہر تک آرام کرنے اور سہ پہر سے رات تک کا وقت بیرونی مصروفیات میں۔

شعیب منصور اور زینت کراچی جم خانہ کے ہی نہیں کراچی روٹری اور لائنز کلب کے ممبر بھی تھے اور دونوں میاں بیوی ہفتے میں ایک بار جم خانہ ضرور جاتے تھے اور خاص خاص موقعوں یا تقریبات پر دونوں بیٹیوں کو بھی ساتھ لے جاتے تھے۔

شعیب منصور کو بہت روشن خیال اور براڈ مائنڈ قسم کے انسان تھے۔ لیکن چونکہ اعتدال پسند تھے۔ اس لیے انہوں نے ان ساری تقریبات یا کلبوں وغیرہ کے لیے کچھ اصول وضع کر رکھے تھے اور پھر سب سے بڑھ کر وہ ایک کاروباری آدمی تھے اس لیے وہ ہر بات پر اپنی کاروباری مصروفیات کو ہی ترجیح دیتے تھے۔

یعنی جب کلب میں بھی جاتے تھے اپنی کاروباری مصلحتوں کو ہی مدنظر رکھ کر جاتے تھے اس لیے خصوصاً بیٹیوں کو کم ہی ساتھ لے جایا کرتے تھے۔

یوں بھی انہوں نے بیٹیوں کو ایک حد تک ہی آزادی دے رکھی تھی کہ وہ انہیں اپنے ساتھ ہی لے جاتے تھے تنہا کہیں نہیں بھیجتے تھے۔

البتہ سہیلیوں کے یہاں تقریبات میں شریک ہونے کی اجازت دے رکھی تھی باقی تو تمام معاملات اور تربیت کی ذمہ داری انہوں نے زینت کو ہی سونپ رکھی تھی۔ کہ ان کے خیال میں ماں ہونے کی حیثیت سے بیٹیوں کی تربیت وہی اچھی طرح کر سکتی تھیں۔ اگرچہ زینت کو ہمیشہ سے ان سے یہی شکوہ رہا تھا کہ انہوں نے ان کے ہوتے ان کے پہلوٹھی کے بیٹے کو دادا اور دادی کی تحویل میں دے کر صرف ناانصافی کا ثبوت دیا تھا بلکہ بیٹے کے سامنے ان کی اہمیت کو بالکل ہی ختم کر کے رکھ دیا تھا۔ کچھ اس وجہ سے بھی وہ زینت کے معاملات میں دخل نہیں دیتے تھے۔ جو ان سے کچھ زیادہ ہی روشن خیال تھیں اور یہی وجہ تھی کہ نازبرو جسے گھر میں بڑی اولاد کی حیثیت حاصل تھی۔ اور جو ماں کی دست راست تھی اس نے ماں ہی کے خیالات و ہیئت بلکہ عادات و مزاج جیسے دیگر ماں کی ہی صحبت کا گہرا اثر قبول کیا تھا۔ اور نیلوفر جو نازبرو سے دو برس چھوٹی تھی بڑی بہن کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتی تھی۔۔۔ اور ماں کے اشاروں پر چلتی تھی تاکہ گھر والوں کی نظروں میں بڑی بہن کی طرح اپنی حیثیت منوا سکے۔

اور ایسا شخص جو دوسرے کی پیروی کرتا ہو یا دوسرے کے زیر اثر رہتا ہو اس کی اپنی کوئی شخصیت نہیں ہوتی۔

نیلوفر کے مزاج میں گو طنطنہ بھی تھا اور تیکھا پن بھی۔ لیکن شخصیت میں جو ہلکا پن تھا وہ اس کی عادات اور خصلت کو نمایاں کرتا تھا۔

ماں اور بہن نے کسی کے بارے میں جو کچھ کہہ دیا بس وہ آنکھیں بند کر کے اس پر یقین کر لیتی تھی۔ اونچا دیکھنے کی عادی تھی اس لیے اپنے سے اونچی حیثیت کے لوگوں سے مرعوب ہو جاتی تھی۔ بلکہ خود بھی بہت اونچا اڑنے کی کوشش کرتی تھی۔ دوسرے معنوں میں خود پسند بھی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ فیشن کی بھی بہت دلدادہ تھی اور بہت ماڈرن تھی۔

شیلا سب ہی ایسی نہیں تھی جو ان کے ہوتے تھے اس کا حلقہ احباب بھی بہت وسیع تھا۔ اور سہیلیاں بھی وہ دیکھ بھال کر بنانے کی قائل تھی اور ہم حیثیت طبقے کی لڑکیوں کو ہی بناتی تھی۔ اور کالج کے بعد اس کا اکثر و بیشتر وقت اپنی سہیلیوں کے ساتھ ہی گزرتا تھا۔ گو ہوش سنبھالنے کے بعد اس نے خود کو ایک پرتعیش اور آسودہ حال ماحول میں سانس لیتے دیکھا تھا۔ ایسے ماحول میں جہاں اولاد کے درمیان کوئی تفریق نہیں رکھی گئی تھی سب کے لاڈ پیار ایک ہی ترازو میں تول کر کیے جاتے تھے یعنی کسی اولاد کے لیے یہ تاثر نہیں دیا جاتا تھا کہ وہ دوسری اولادوں سے بہت منفرد خوبصورت، بہت ذہین اور سعادت مند ہے۔ اس کے باوجود بھی وہ سب کو اپنی انفرادیت کا احساس دلانے میں کوشاں رہتی تھی۔ جبکہ شیلا سب سے چھوٹی اولاد ہونے کی وجہ سے خاص طور پر باپ کی بہت لاڈلی تھی دوسری بہنوں کے مقابلے میں خود اسفند بھی اسے بہت عزیز رکھتا تھا۔ زینت تو بالکل چھوٹے بچوں کی طرح اس سے پیش آتی تھیں۔ اس کو چونکہ ہر طرف سے لاڈ پیار ہی ملا تھا اس لیے حد درجہ لاابالی ہونے کے باوجود خود اعتمادی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

اس نے طبیعت بھی بہت سلجھی ہوئی پائی تھی اور دل بھی نرم۔ دلوں سے بھی اسے دلی انسیت تھی۔ اسے آنکھ کھول کر ہر طرف سے

پیار اور پیار ملا تھا اس لیے وہ بھی سب سے خلوص و محبت سے پیش آتی تھی اس پر مستزاد گھر کا ماحول بہت سلجھا ہوا تھا اور خود نازش ماں سے زیادہ وہ باپ سے متاثر تھی۔ اور انہی کا سا مزاج اور طبیعت پائی تھی۔ ان کے مزاج میں سادگی بہت تھی گو بعض اور خیالات میں وہ نیلوفر کی ضد ثابت ہوئی تھی۔

اس کے باوجود بھی چونکہ گھر کے ماحول میں ایک دوسرے سے محبت کرنا سکھائی گئی تھی اور نیلوفر سے چاہتی بھی بہت تھی۔ اس لیے آپس کی کشمکش اور ضد بحث کا دور تک گزر نہ تھا۔

بہر حال اب تو دونوں بہنیں اپنے اپنے تعلیمی مشاغل میں مصروف عمل تھیں کیونکہ نازش پرویز کی شادی کی وجہ سے ان کی پڑھائی کا خاصا حرج ہوا تھا۔ اور سمسٹر بھی سر پر آگئے تھے۔ نیلوفر کا بی اے کا فائنل ایر تھا وہ پڑھائی کے معاملے میں بھی خاصی ذہین تھی۔ اور ہمیشہ کوئی نہ کوئی پوزیشن بھی لاتی تھی جبکہ نیلما ایک دو مضامین میں کمزور تھی اور اسے بہت زیادہ محنت کرنی پڑ رہی تھی کچھ ایسا بھی دادی سے اتنی انسیت ہونے کے باوجود اسے ان کی تیمارداری کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ ویسے نیلوفر کی تو بات ہی اور تھی اسے اگر موقع بھی ملتا تو چونکہ ماں کی طرح سوتیلی پن کے جراثیم اس کے ذہن میں بھی سرایت کر گئے تھے وہ دادی کی تیمارداری تو کیا خبر گیری تک رکھنے کی روادار نہ ہوتی۔

شعیب اور سہیل منصور نے تو کتنا چاہا بھی تھا کہ سلمیٰ بیگم کی دیکھ بھال اور خدمت انجام دینے کے لیے ایک نرس مقرر کر دیں لیکن خود سلمیٰ بیگم نے انہیں سختی سے ممانعت کر دی تھی۔

سلوطہ جس کی نرم خو طبیعت تھی جو غلامانہ فطرت بن کر رچ بس گئی تھی۔ جو وہ ایک انسانی فریضہ تھا دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونے اور مدد کرنے کا اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ جب مہمانوں کو ٹھہرانے کے لیے گھر میں کوئی کمرہ باقی نہیں رہا تھا تو زینت نے نازش سے کہہ کر سلوطہ کو اس کے سامان سمیت سلمیٰ بیگم کے کمرے میں منتقل کرا دیا تھا۔ اور چونکہ سلمیٰ بیگم اور وہ ایک ہی کمرے میں رہ رہی تھیں ———— وہ سلمیٰ بیگم کا خیال رکھنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ اور سلمیٰ بیگم بھی اس سے بھی اس پر بہت مہربان ہو گئی تھیں۔ اور ہر آئے گئے کے سامنے اس کی تعریفوں کے پل باندھتی نہ تھکتی تھیں اور یہ بات زینب کو بہت گراں گزرتی لیکن وہ ساس کو اس کی تعریف کرنے سے باز رکھ سکتی تھیں نہ اس سلسلے میں کسی سے کچھ کہہ ہی سکتی تھیں ماسوا نیلوفر کے کیونکہ شوہر اور دیور دونوں ہی سلمیٰ بیگم پر بہت مہربان تھیں۔ یوں بھی نازش بہت تعلیم یافتہ اور فراخ دل کی مالک تھیں۔ اس پر خوبصورت بھی بہت تھیں اس لیے بھی زینت ان سے مرعوب تھیں۔

یوں تو زینت کی سلوطہ سے کوئی ذاتی پرخاش نہیں تھی۔ البتہ چونکہ وہ ان کی نند کی نند تھی اس لیے اس سے ان کا کوئی رشتہ نہ واسطہ۔ اور اسے اپنے گھر میں رکھ کر بھی بہت سی گھریلو اور نجی باتیں اس پر عیاں کرنا انہیں بالکل گوارا نہ تھا۔ بالخصوص گھر اس کے گھر ٹھہرنے کی وجہ سے ان کی پرائیویسی میں خلل پڑ رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بہت محتاط ہو گئی تھیں۔ اگرچہ وہ تذبذب میں بھی تھیں۔

نازش پرویز کی شادی پر جو کچھ واقعات رونما ہوئے تھے ان کا سبب وہ اسے ہی گردانتی تھیں۔ لیکن شوہر، دیور اور ساس کی وجہ سے برا کچھ کہنے کا حوصلہ نہیں رکھتی تھیں۔ بلکہ دل پر جبر کر کے انہیں سلوطہ سے خندہ پیشانی سے بات بھی کرنی پڑتی تھی اور اس کا خیال بھی رکھنا پڑتا تھا۔ لیکن وہ ضرورتاً ہی اس سے بات کرتی تھیں۔

صبح کا ناشتہ تو عام تعطیل کے دن بھی سب علیحدہ علیحدہ ہی کرتے تھے اور یہی معمول کچھ دوپہر کے کھانے کا بھی تھا کیونکہ شعیب منصور پرائیویٹ آفس سے ڈھائی بجے کے قریب لوٹتے تھے۔ وہ دونوں لڑکیاں کالج سے تین ساڑھے تین بجے کے قریب سہیل منصور بھی اپنے کام کے سلسلے میں تیسرے پہر تک لوٹتے تھے۔ البتہ نازش اور کوثر گھر میں موجود ہوتیں تو زینت ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا لیتی تھیں یا شوہر کے ساتھ ہی کھاتی تھیں۔ سلمیٰ بیگم کا پرہیزی کھانا ہوتا۔ بارہ بجے ہی ان کے کمرے میں پہنچ دیا جاتا تھا اور یوں سلوطہ کو دوپہر کا کھانا زیادہ تر تنہا ہی کھانا پڑتا تھا۔ البتہ رات کے کھانے پر گھر کے تقریباً تمام افراد موجود ہوتے تھے۔ جس میں سلوطہ بھی شریک ہوتی تھی تاہم اسفند بھی جو نہ معلوم سارا دن کہاں غائب رہتا تھا۔ اور شام کو ہی واپس لوٹتا تھا۔

اس روز بھی سب کھانے کی میز کے گرد بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔

شعیب اور سہیل منصور آپس میں اپنے کاروبار کے متعلق کوئی گفتگو کر رہے تھے کہ دونوں کے درمیان زینت نے شوہر سے کہا۔

"یوں تو ماشاء اللہ گھر میں سب ہی موجود ہیں لیکن میری نازو کے جانے سے کتنی بے رونقی ہو گئی ہے کبھی یہ بھی نوٹ کیا آپ نے" شعیب کو بہت دکھ ہوا یہ سن کر۔ مگر وہ بات کو کاٹ کر انہوں نے قطع کی تھی۔ اس لیے شعیب منصور نے بیزاری سے جس میں لاپرواہی بھی تھی بولے۔

"ہاں کیا کہوں منہیں مگر یہ بھی ایک رہت رہی ہے اس لیے جانے کی فرصت نہیں ملی۔"

"ایں میں کیا مطلب تھا اپنی بات کم بولی بے تدبر ہوتے دیکھا تو زینت چونک کر بولیں۔

"مطلب یہی کہ لڑکیاں تو پیدا ہی اس لیے ہوتی ہیں کہ والدین کی بیس بائیس سالہ محنت پر پانی پھیر کر پرائی ہو جائیں والدین کو دکھ تو بہت ہوتا ہے لیکن اپنے ایک فرض کے ہیش نظر دلوں پر صبر کی سل رکھنی ہی پڑتی ہے۔"

"بھابی جان آپ صرف نازو کے جانے پر تنہائی محسوس کر رہی ہیں ابھی تو آپ کو ان دونوں کے فرض سے بھی سبکدوش ہونا ہے۔ ان کے جانے کے بعد تو آپ بالکل ہی تنہا رہ جائیں گی۔" نازش بولیں۔

"ہاں واقعی، یہ خیال تو ابھی سے میرے لیے پریشانی کا باعث بن رہا ہے۔" زینت نے دیورانی کی بات پر متفکر سے انداز میں کہا۔

"خیر پہلے سے پریشانی میں مبتلا ہونے سے سوائے ذہنی سکون برباد کرنے کے حاصل ہی کیا ہوگا جبکہ ابھی تو ان دونوں کے فرائض سے سبکدوش ہونے میں بھی ایک مدت ہی درکار ہوگی۔" شعیب منصور بولے۔

"لیکن مجھے کیا پتا کہ معلوم کتنی مدت درکار ہوگی، لڑکیوں کی قسمت کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا کب کھل جائیں۔ یہ تو خواب دیکھتی بند آنکھوں کی طرح ہوتی ہے۔" نازش نے کہا تو شعیب منصور ایک ہلکا سا قہقہہ لگا کر بولے۔

"واہ، بہت خوب بڑی منطقانہ مثال دی ہے آپ نے نازش۔" تو سہیل منصور بھی ہنسنے لگے اور نیلوفر اور نیلما ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا دیں۔

"لیکن بھوکی دلہن کچھ غلط تو نہیں کہہ رہیں۔ واقعی لڑکیوں کی قسمت کا کوئی اعتبار ہی نہیں ہوتا۔ اب نازو کی مثال تو سامنے ہی ہے۔ ایک دم ہی پیغام آیا منظور ہوا اور دو ماہ کے اندر اندر شادی بھی ہو گئی۔ جبکہ نازو کا ارادہ تو بہت کچھ پڑھنے کا تھا۔" زینت دیورانی کی بات کی تائید کرتی ہوئی بولیں۔

"خیر خیر، یہ تو میں مانتا ہوں کہ شادی کا بھی ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ لیکن ان دونوں کے بارے میں ابھی کچھ سوچنا قبل از وقت ہی ہوگا۔ ابھی تو انہیں آرام سے پڑھنے ہی دو۔"

شعیب منصور کو بیٹیوں کی موجودگی میں ایسی قیاس آرائیاں مناسب نہیں لگیں اس لیے انھوں نے یہ قصہ کوتاہ کرنے کی غرض سے کہا۔

"خیر یہ مسئلہ تو اپنی جگہ بھابی جان۔ آپ اسفند کی شادی کیوں نہیں کر دیتیں گھر میں بہو کے آنے سے رونق ہی رونق ہو جائے گی۔" نازش اپنی دانست میں بہت دور کی کوڑی لائیں۔

"ہاں، واقعی صدق دل سے رونق یعنی دو سے تین۔ تین سے چار گویا دیکھتے ہی دیکھتے ایک گلزار سا کھل اٹھے گا۔ گل بہار کی اس مہکتی ہوئی پھلواری میں۔" سہیل منصور نے ہنس کر لقمہ دیا تو اسفند کے سوا سب ہی ہنسنے لگے۔

"ارے بھیا ہماری تو یہ دلی تمنا ہے۔ ارمان ہے مگر ہمارے یہ بابا صاحب ہماری بات مانیں تب نا۔" زینت حسرت زدہ سے لہجے میں بولیں۔

"کمال۔ بات جب ماننے کی ہو رہی ہے تو آپ نے یقیناً انہیں کوئی لڑکی بھی دکھائی ہوگی۔" نازش نے قدرے معنی خیزی سے پوچھا۔

"ارے ایک دکھائی ہے میں نے تو انہیں سیکڑوں لڑکیاں دکھا دیں مگر نہ معلوم ان کی پسند کیسی ہے جو ایک سے ایک بڑھ کر قابل حسین دوشیزہ نہ تو ان کے معیار پر پوری ہی نہیں اتریں۔" زینت بولیں تو سہیل منصور نے اسے مخاطب کر کے پوچھا جو لاتعلق سا بیٹھا نہایت بے مروتی سے کھانا کھا رہا تھا۔

"کیوں میاں صاحبزادے! یہ میں کیا سن رہا ہوں۔" سہیل منصور نے رعب جھاڑنے کے سے انداز میں مذاق سا کیا۔

"درست ہی کہہ رہی ہیں بھابی جان میاں۔" اس نے پلیٹ پر جھک کر آہستہ سے کہا تو نیلوفر نیلما اور کوثر ہنسنے لگیں جبکہ شعیب منصور کو یہ جواب نہایت نامعقول لگا۔ لیکن انھوں نے کانٹے میں پھنسا ہوا کوفتے کا ٹکڑا اٹھاتے ہوئے تنبیہی نظروں سے زینت کی طرف دیکھا جبکہ سہیل منصور پھر سے ہنسنے لگے۔ اسفند کی طبیعت میں زبردستی کی مٹھاس نہیں تھی جبکہ سہیل منصور سے وہ شروع ہی سے بہت بے تکلف تھا اور ان کی عادت کی وجہ سے فاخرہ کی طرح وہ انہیں چچا کہنا اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ اس وجہ سے بھی سہیل منصور اس کا کچھ زیادہ خیال کرتے تھے۔

اصل میں چچا جان۔ ممی اپنے معیار کے پیمانے میں میری پسند کو تولنا چاہتی ہیں۔ نازو کی دعوت ولیمہ میں جو بھی خوبصورت شکل

اپنے معیار کا تعین انسان اپنے ذوق۔ ذہنیت، مزاج اور پسند کے مطابق ہی کرتا ہے۔ اور یوں تو میرا ذوق اور پسند بہت اعلیٰ ہے لیکن زندگی کے سفر میں کسی ہم سفر ساتھی کے بارے میں اب تک سنجیدگی سے میں نے کچھ سوچا ہی نہیں۔ جبکہ اس کا احساس ممی بار بار مجھے دلا بھی چکی ہیں۔

پھر زندگی میں پہلی بار اس نے واقعی سنجیدہ ہو کر سوچا۔

کہ کس مزاج اور عادات و خصائل کی اور کیسی لڑکی اس کے معیار پر پوری اتر سکتی ہے۔

ایسا تو نہ تھا کہ اس نے کبھی حسین اور طرح دار لڑکی کو نہ دیکھا ہو۔

بلکہ اس نے تو ایک سے ایک حسین اور مہ جبین لڑکیوں کو دیکھا تھا۔

اور ماں نے بہن کی شادی کے موقع پر جو لڑکیاں دکھائی تھیں۔

ان میں سے بعض تو ایسی حسین و جمیل تھیں کہ ایک بار جو نظر اٹھتی تو تھم کر ہی رہ جاتی مگر اس کے خیال میں دولت کی طرح صرف لاابالی سا ظاہری خوبصورتی ہی کافی نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ صورت کے ساتھ سیرت۔ مزاجوں کی ہم آہنگی، ایک دوسرے کا احترام، آپس کی انڈر اسٹینڈنگ، نباہ کرنے کا حوصلہ۔ مہر و وفا کا ہونا از حد ضروری ہوتا ہے۔

ورنہ ازدواجی زندگی ایک ایسی سیج بن جاتی ہے جس کے پھول سوکھ کر چبھن کا احساس دلانے لگتے ہیں اور تشنگی کا احساس ساری امنگوں اور خوشیوں کو جھلسا کر رکھ دیتا ہے۔

جیسے گرم جاڑے سے پالا تو نہیں پڑتا لیکن گھٹن اور تپش محسوس ہوتی ہے۔

لیکن ان دواجی زندگی کا یہ سارا گلہ و گنج پر بڑا کتنوں سے بخوبی علم تھا البتہ وہ اپنی رفیق حیات میں یہ ساری صفات دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ بہت سی خوبیوں کی مالک ہو۔ مکمل ہو اور اس کی خوشی کو مقدم رکھنے والی ہو۔ مگر جو لڑکیاں اس کی ممی نے اسے دکھائی تھیں ان کا ظاہری حسن بہت دل موہ لینے والا بلکہ بھٹکا دینے والا تھا۔

لیکن اپنی دولت اور حیثیت کی نمائش کرنے کی وجہ سے اندر سے وہ بہت کھوکھلی نظر آ رہی تھیں۔ اور اس کا خیال کچھ غلط نہ تھا کہ دولت، خوبصورتی، تعلیم اور اخلاق کی ایک شخصیت میں یکجا نہیں ہو سکتے کوئی نہ کوئی خامی تو ہوتی ہی ہے انسان میں۔

یعنی اگر کسی کی ملیحی یا رحم دلی حد سے تجاوز کر جائے تو وہ بھی ایک بیماری بن جاتی ہے کیونکہ اس فریبی دنیا کے باسی اس کی ملیحی سے فائدہ اٹھا کر اس کو نقصان پہنچانے کے درپے ہو جاتے ہیں۔

بہر حال۔ شریک سفر کے بارے میں یہ سب کچھ اس نے ماں کے شادی کے معاملے کو ہوا دینے کے بعد ہی سوچا تھا۔

مگر اب کچھ روز سے اس کے دل میں ایک انجانا سا جذبہ بہک رہا تھا۔ کیسا جذبہ تھا یہ اور کیا تھا؟

کس وجہ سے اچانک ہی دل کے پاتال میں سے ابھرا تھا؟

اور اب اس نے بڑا محنت اور تحقیق سے اس کا کھوج لگا لیا تھا۔

کہ وہ شروع دن سے ہی اسے بہت اچھی لگی تھی۔ اور اس کے چلے جانے کے بعد کافی دیر تک وہ اپنے نازیبا سلوک پر پچھتاتا رہا تھا اور یہ خواہش بھی رہا تھا کہ اس سے کسی طرح سامنا ہو تو وہ اس سے معذرت کرے مگر اگلے روز اس سے سامنا بھی ہوا تو وہ کسی بلا کی طرح ورنہ ماں کی طرح اپنے ایک ڈیڑھ من وزنی نخوت اٹھائے اس پر آگری تھی۔

پہلے تو اس نے اس کے یا رشتہ دار ہی کی رائے قائم کی تھی کہ وہ بھی کوئی مہمان ہے جو شادی میں شرکت کرنے کی غرض سے آئی ہے۔

لیکن اگلے روز اسے سادہ سے لباس میں ملبوس طشت اٹھائے دیکھا تو یہی سمجھا کہ کام کی زیادتی کی وجہ سے اس کی ماں نے اسے عارضی طور پر ملازم رکھ لیا ہے حالانکہ دل اس خیال کی نفی ہی کر رہا تھا۔

اور حقیقت کھلنے پر اسے اس کے سوا کوئی چارہ نظر ہی نہ آیا تھا کہ اس سے معذرت کر لی جائے لیکن معذرت کرنے کے بعد ذرا سی ندامت اور پچھتاوے کا بوجھ کچھ سوا ہی ہو گیا تھا۔ اور وہ یہی سمجھتا رہا کہ چونکہ اس نے بُری طرح دھتکار دیا ہے یا پھر اس کے ساتھ بہت حقارت آمیز رویہ اختیار کیا ہے اس لیے اس کے دل میں چبھن سی کا احساس ہے۔

لیکن اس کے باوجود ممی ماں اور پھوپی وغیرہ کے رویے کے پیش نظر اسے اس سے کچھ ہمدردی سی ہو گئی تھی اور جس وقت اس نے اس کے پیر چھلنے کی خبر سنی تھی تو اس ہمدردی کے تحت وہ کچھ بے چین سا ہو گیا تھا۔ دل کہہ رہا تھا کہ جا کر اسے دیکھ آئے یا کم از کم پرسش احوال ہی کر لے لیکن بعض وقت سر کی خودداری اور انا نے دل کے اس مشورے کو رد کر دیا تھا۔ لیکن اس وجہ سے نہیں کہ اس نے اس کی توہین کی تھی بلکہ اس خیال سے کہ بھلا اس سے اس کا تعلق ہی کیا تھا۔

مگر کتنا گہرا اور اٹوٹ تعلق تھا یہ جس کا بھید آج ہی اس پر کھلا۔

حقیقت وہ لاکھوں ہزاروں میں نہیں بلکہ ہزاروں میں ایک تھی۔

حد درجہ حسین، بردبار، خوددار، باحیا اور دوسروں کا دکھ بانٹنے والی۔

بہت زیادہ نہیں تو اس نے تعلیم پائی تھی اس نے۔

بس ایک دولت مند ہی نہیں تھی۔ کیونکہ اگر دولت مند ہوتی تو کراچی سروس کرنے کے ارادے سے کبھی نہ آتی۔

تو وہ اس کے لیے ہی نہیں بلکہ سب کے لیے ہی ایک مثال تھی۔

مگر جیسے بہار کی طوفانی لہروں کے پانیوں سے اٹکھیلیاں کرتا ہوا دریا اونچی ہو جاتی ہے تو وہ بہار کے سوا اپنے ساتھ ہر چیز بہا لے جاتی ہے۔ اور پھل پھول سارا گلشن لے کر بہہ جاتا ہے جس کے آنچل پر بے شمار تصویر بازی کے نقش ماتم کرنے جاتی ہے۔ اور جلوہ گر رہتی ہے وہ عبارت کے حروف پر اس کی آنکھیں، ہونٹ اس کے سراپا کو یکجا کر کے اس کی تصویر بناتا اور مٹاتا رہا۔

پھر بڑی بے دلی سے کتاب بند کر کے اس نے لیمپ کے پاس تپائی پر رکھی اور اپنی خوابگاہ کے کھلے دریچے میں جا کر کھڑا ہو گیا۔

باہر سیاہ گھور سی رات میں زندگی کے ہنگامے ابھی سرد نہیں پڑے تھے۔

پونے دس کا عمل تھا اور شاہراہ فیصل اپنی مرکری ٹیوبس کی اسٹریٹ لائٹس میں جگمگ کر رہی تھی۔ ٹریفک کا ایک دریا سا بہہ رہا تھا اور شروع شروع تاروں کا ہالہ سا چاند مغربی افق کی پہنائیوں میں تیزی سے غروب ہوتا جا رہا تھا۔

اور یہ سب سے کتنا اچھا لگ رہا تھا۔

ایکدم دل میں اتر جانے والا۔

کسی دلفریب منظر سے کبھی نہیں بھلا۔

کہ جذبے جب جوان تازہ نوخیز اور شوق اور وارفتگی کے پیرہن میں ملبوس ہوتے ہیں۔

کیف و مستی کے سمندر میں کچھ اس طرح ڈوب جاتے ہیں کہ سطح پر ابھرنا گوارا ہی نہیں کرتے لیکن اندر ہی اندر مکمل ہی پیتے رہتے ہیں۔

گو اس کے جذبے میں ابھی اتنی حدت اور شدت نہیں آئی تھی۔

وہ تو کسی نوزائیدہ بچے کی طرح دنیا میں وارد ہوتے ہی آہستہ آہستہ آنکھیں کھول رہا تھا۔

پھر بھی اس کا دل چاہ رہا تھا کہ جگ کر جائے اور سلوٹ کو یہ چونکا دینے والی خوشخبری سنا کر آئے کہ وہ اس سے محبت کرنے لگا ہے۔

لیکن اس کے ساتھ وہ اپنے اس نئے اور اچھوتے سے جذبے کے سحر میں کچھ ایسا کھویا ہوا تھا کہ۔ اسی مسحور کن سی کیفیت میں دریچے سے ہٹ کر اپنے پلنگ تک آیا اور پھر لباس تبدیل کیے بغیر ہی بستر پر لیٹ کر اسی مسحور کن سی کیفیت میں ڈوبا ڈوبا کچھ ہی دیر بعد نیند کی آغوش میں ... سو گیا۔

ان دنوں مستقبل کی عمارت تعمیر کرنے کے لیے اس کے ذہن میں کئی منصوبے تھے۔ بیسٹرن اور اعلیٰ سند تو اس نے انگلینڈ میں ہی حاصل کی تھی اور اب تو اسے وطن واپس آئے ہوئے بھی پانچ ماہ ہو گئے تھے اور اتنے عرصے تک ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنا اسے بالکل گوارا نہ تھا۔ یوں بھی واپسی سے پہلے ہی اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وطن پہنچتے ہی وقت ضائع کیے بغیر اپنا کام شروع کر دے گا لیکن وطن آنے کے بعد اب تک کوئی عملی قدم نہیں اٹھا پایا تھا۔ اصل میں اس کا ارادہ تو اپنا ذاتی کلینک کھولنے کا تھا لیکن باپ اور چچا کی خواہش تھی کہ پہلے وہ کسی بڑے ہسپتال میں ملازمت کر کے تجربہ حاصل کرے بلکہ نام پیدا کرے اس کے بعد کلینک کھولنے کا سوچے۔ مشورہ مناسب ہی تھا کیونکہ ابھی کلینک تعمیر کرنے میں کچھ عرصہ لگتا۔ اور پھر وہ کراچی میں اپنے کام کی ابتدا کرنا نہیں چاہتا تھا مگر وطن کے کسی دور دراز اور پسماندہ علاقے میں جہاں کے باشندوں کو طبی سہولتیں فراہم نہیں کی جاتیں اپنا کلینک کھولنا چاہتا تھا۔ جبکہ شعیب منصور اس بات کو محض اس کی جذباتیت تصور کرتے تھے۔ وہ اسے اس کے اس ارادے پر عمل پیرا ہونے سے باز نہیں رکھ سکتے تھے کیونکہ اس کی خودسری اور من مانی کرنے کی عادت سے اچھی طرح واقف تھے۔

بلکہ بھی اسے ذہن کی تحویل میں دے دینے کا تھا انہیں اب اندازہ ہی نہیں ہو رہا تھا کہ وہ جہاں زیب بھی بھگت رہے تھے۔ اور اسے اس کے ارادے سے باز رکھنے کے سلسلے میں کچھ کہہ کر اپنی بات کھوٹی کرنا نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ انہوں نے چھوٹے بھائی سے اس معاملے پر مشورہ لیا تھا کیونکہ وہ پہلا منصور کی بات بہت مانتا تھا۔ کچھ قدرتی طور پر بھی اسے اپنے چھوٹے چچا سے بڑی انسیت تھی اس کی وجہ کچھ

سے پڑھنے کے بعد بولی۔

"ہاں ہاں اب اتنی جھینپ منانے کو یہ کہہ دیجیے کہ تار بیٹی کی نہیں گئی بلکہ شادی کی گئی ہے۔" وہ جلے کٹے انداز میں بولا۔

"ارے تو اس میں اس بے چارے سلوط کا کیا قصور جو وہ جھینپے اور شرمائے۔ یہ سب کیا دھرا تو تمہاری پھپھو کا ہے انہوں نے میکے والوں کی طرف سے میاں کو جیسا متاثر دیا اسی طرح وہ پیش آگئے ہیں۔" مگر سلمیٰ بیگم نے جس طرح بے چارے کہتے ہوئے سلوط کہا تو اپنے قہقہوں میں اس نے ان کی پوری بات سنی ہی کب۔

"واہ یہ بے چارے سلوط بھی ان کا کوئی القاب ہے؟" اس نے ہنس کر پوچھا۔

"اے تم بھی! پہلے تو کبھی تم نے ایسی باتیں نہیں کیں۔ پھر یہ اب اچانک تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" سلمیٰ بیگم بڑے سخت الجھنے کے انداز میں اکر بولیں۔ تو وہ ایک دم ہی سنجیدہ سا ہو کر بولا۔

"ہوا تو کچھ بھی نہیں اماں جان! وہ اصل میں وقت کے ساتھ انسان کے اندر بھی انقلابات اور تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ وہ بچپنے سے لڑکپن کے دور میں آ جاتا ہے پھر جوانی کا دور عبور کرتا ہوا بڑھاپے کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے۔ تو ظاہر ہے اپنی زندگی کے ان ادوار سے گزرتے ہوئے اس کے مزاج اور خیالات میں بھی ردوبدل ہوتی رہتی ہے۔" اور پھر وہ ان کو الجھن، حیران اور متعجب سا چھوڑ کر وہ ایک دم ہی اس کی طرف گھوم گیا۔

"لائیے اب کسی طرح یہ تار تو واپس کر دیں اب اس کا تعویذ بنا کر گلے میں تو ڈالنے سے رہیں آپ۔" لہجہ بھی انتہائی خفا تھا اور کرخت تھا جس سے گھبرا کر سلوط نے فوراً ہی تار کا کاغذ اس کی طرف بڑھایا تو کاغذ نہایت مضبوطی سے پکڑ کر سرگوشیانہ سے انداز میں کہا۔

"میں اس وقت آپ کو محض یہ بتانے آیا تھا کہ میں دل کی تمام تر گہرائیوں سے آپ کو چاہنے لگا ہوں۔ کبھی آپ ذرا اس کے لب و لہجے پر جھنجھی لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی وہ انہیں آنکھوں کو دیکھ کر بولا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے اسے جڑ بنیاد سمیت کسی نے ہلا کر رکھ دیا ہو۔ مگر اگلے ہی لمحے یہ احساس مزید اس کی جان پر بنا گیا کہ سلمیٰ بیگم بھی کمرے میں موجود ہیں اور سامنے ہی بیٹھی ہیں وہ سخت وحشت زدہ اور گھبرائے ہوئے انداز میں اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑاتی ہوئی بولی۔

"اچھا۔ آپ کاغذ تو چھوڑیے۔" آواز گھٹی گھٹی تھی اور لہجے سے خوف و پریشانی سی ہو یدا تھی۔ اس نے بھی بلا کچھ کہے جلدی کا تار کے کاغذ ——— چھوڑ دیا۔ اور سروادی کی طرف گھوم کر ناراضگی کا اظہار کرتا ہوا بولا۔

"ٹھیک ہے۔ اگر میری بات کا یقین نہیں آیا تو میں اس کی تصدیق کرا کے ہی چھوڑوں گا۔"

اسے اس قدر تحیر اور ہراساں دیکھ کر اسفند نے یہ فقرہ معنی بات کہی۔ اور پھر اس کی کو نظر انداز کرتا کمرے سے نکل گیا۔ اور اس کے جانے کے بعد انتہا کو پہنچتے ہوئے تعجب اور تجسس کے بوجھ میں دبی سلمیٰ بیگم۔ کچھ دیر تک تو وہ کچھ اسی عالم میں ساکت رہیں۔ اسفند کی فطرت اور مزاج میں اتنی زبردست تبدیلی کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتی رہیں۔ کیونکہ وہ زینت سے زیادہ اس کی فطرت مزاج اور عادات حتیٰ کہ خصلت سے واقف تھیں۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ وہ کچھ شروع ہی سے لڑکیوں میں چلنے کا عادی نہ تھا اسی وجہ سے بہنوں سے بھی بہت لیا دیا رہتا تھا۔ اور چونکہ اس کی فطرت تنہائی پسند تھی اس لیے اس کا حلقہ احباب بھی بہت محدود تھا اس کے گنتی کے دوست تھے وہ اسکول کے زمانے سے اس کے ساتھ پڑھتے پڑھتے اعلیٰ تعلیمی مدارج طے کر گئے تھے جن میں سے ایک اسٹیٹس میں تھا اور دوسرا کویت میں۔ اور تیسرا ابھی کو تعلیمی دور میں کالج تک ہی اس کا ساتھ دے سکا لیکن اس سے اس کی دوری کی رشتے داری بھی ہوتی تھی اور ایک عرصے تک اس کے ساتھ بھی رہ چکا تھا پھر کمیشن حاصل کر کے آرمی میں گیا تھا۔ پھر کیفیت جو کچھ بھی تھا۔ وہ کچھ فطرتاً اکھڑ کھرا اور تنہائی پسند تھا اور بہت خود دار رہتا تھا۔ اگر اس کی کسی سے ذہنی ہم آہنگی نسبت تھی تو وہ خود ان سے ہی تھی۔ ہمیشہ تو نہیں مگر کبھی کبھی وہ انہیں اپنی نجی باتیں بھی بتا دیتا تھا۔ اپنا کوئی دکھ اپنے احساسات تک ان پر ظاہر کرنے سے دریغ نہیں کرتا تھا۔ اور چونکہ عہد طفولیت سے ہی ہوسٹل میں زندگی گزارتا آیا تھا۔ اس لیے اسے بات کرنے کا ڈھنگ آتا تھا نہ سلیقہ ہی۔ اس لیے صاف گو اور منہ پھٹ بھی سمجھا جاتا تھا۔ وہ مذاق وذاق کے بارے میں تو وہ جانتا ہی نہ تھا کہ کس چڑیا کا نام ہوتا ہے البتہ اپنی بے جا ضد اور خود سری کرنا اس کی فطرت ثانیہ بن گئی تھی۔ اصل میں اپنی عمر کے اس حصے میں جو انسان کا حتمی دور ہوتا ہے وہ دادا کی گود میں پروان چڑھتا رہا تھا انہی کی محبت میں رہا تھا۔ اس لیے ابھی کی سی بزرگانہ عادتوں اور خصلتوں کو اپنا لیا تھا۔ لیکن یہ سب عادتیں خصلتیں فطرت اور مزاج تو اس وقت تک ہی تھے جب وہ لاہور میں زیر تعلیم تھا۔ انگلینڈ جانے کے بعد اس چار سال کے عرصے میں ہی سلمیٰ بیگم کے خیال میں اس کے اندر یہ زبردست انقلاب آیا تھا۔ لیکن ان کے اس خیال میں بھی کوئی پائیداری نہ تھی۔

یہ باتوں میں مزاح بھی۔

چہرے کا انداز بھی۔

اخلاق اور اخلاص بھی۔

شناسی اور شگفتگی بھی۔

لحاظ اور احترام بھی۔

آخر یہ سب اس نے کہاں سے سیکھا؟ یا پھر یہ ساری باتیں کرنی اسے کیسے آ گئیں؟

جبکہ گھر میں اس کی سگی بہنیں بھی موجود ہیں اور چچازاد بہن بھی مگر ان سے تو وہ کھنچا کھنچا سا رہتا ہے۔

مگر سلوط سے یہ اس قدر وابستگی آخر کس وجہ سے ہے۔

وہ کیوں اس کے نجی معاملات میں دلچسپی لیتا ہے۔ بلکہ باقاعدہ طور پر دخل بھی دیتا ہے۔ اگر اسے چھیڑ چھاڑ یا مذاق پر بھی محمول کیا جائے تو بھی اس کا آخر اس سے کیا تعلق۔ کیا وابستگی؟

پھر بھی۔۔۔ سب سوچتے سوچتے انہوں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو اسے بھی اب تک گم صم سا کھڑا پایا۔ اسے اسی عالم میں دیکھ کر ان کے دل میں کچھ کھٹکنے سا لگا۔ کیونکہ ان کی آنکھوں کے سامنے ہی وہ اس کی طرف گھومتا تھا اور آہستہ آہستہ اس سے کچھ کہتا بھی رہا تھا اور اس کے جانے کے بعد۔ اس کا یوں گم صم سا کھڑا ہونا بہت کچھ معنی بھی رکھتا تھا۔ یہ وہ نہ صرف چہاندیدہ تھیں بلکہ کئی عمر تک سینکڑوں بچوں کو تعلیم بھی دیتی رہی تھیں۔ خود اسفند کی پرورش بھی انہوں نے ہی کی تھی۔ اس کی چوٹ لگنے کے پر گویا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ وہ سلوط سے پوچھنا تو بہت کچھ چاہ رہی تھیں مگر بہت مصلحت کوش تھیں۔ چنانچہ احتیاط کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے اسے پکارا۔

"سلوط بیٹی!" تو سلوط پر چھایا سکوت یوں ٹوٹا جیسے گہری اور گمبھیر خاموشی میں اچانک کوئی زور کا چھناکا ہونے سے ماحول پر چھایا ہوا سناٹا ٹوٹ جاتا ہے۔ اور اس نے بری طرح چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

"جی اماں جان!" بری طرح چونک اٹھنے کی وجہ سے ہی شاید اس کی آواز بھی مرتعش سی ہو گئی تھی۔ جسے سلمیٰ بیگم نے بڑے واضح طور پر محسوس کیا۔

"بیٹی وہاں کھڑی کھڑی جواب کیوں دے رہی ہو۔ ادھر میرے پاس آکر بیٹھو تو کچھ کہوں بھی۔" ان کے لہجے میں ناراضگی نہیں تشفقگی تھی۔ سلوط نہایت خاموشی سے قدم بڑھا کر ان کے قریب آ گئی۔ انہوں نے بڑی محبت سے ہاتھ پکڑ کر جو بڑی طرح سرد ہو رہا تھا اسے اپنے پاس بٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"تم کس بات پر اتنی پریشان ہو؟ کیا بھائی بھاوج کی آمد کی متوقع نہیں تھیں یا پھر ان دونوں کی طرف سے تمہیں کوئی خدشہ لاحق ہے؟" حالانکہ وہ پوچھنا یہ چاہ رہی تھیں کہ یہ ابھی ابھی اسفند آہستہ سے تم سے کیا کہہ کر گیا ہے۔ مگر انہیں بات کرنے کا ڈھنگ پھر بارہا ہی آتا تھا۔ اور ان کی بات کے سوال پر متحیر سے انداز میں بولی۔

"نہیں اماں جان۔ بھلا بھائی اور بھاوج کی طرف سے بھی کسی بہن کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ جبکہ، جبکہ۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی تو سلمیٰ بیگم جلدی سے بولیں۔

"ہاں ہاں، ہو، ہو۔ خیر مجھے بھی تو معلوم ہو کہ تمہاری پریشانی کا سبب کیا ہے اور کیا تم مجھے اب بھی غیر سمجھتی ہو۔ ارے بچی رشتے بانکا ہوتا اور خلوص سے ہی استوار ہوتے ہیں اور صداقت ان کی روح ہوتی ہے ورنہ اگر یہ نہ ہو تو سگے بھی غیروں سے بدتر ثابت ہوتے ہیں۔" یہ کہہ کر گویا سلمیٰ بیگم نے اسے شیشے میں اتارنے کی کوشش کی۔

"اور نہیں اماں جان۔ یہ بات نہیں۔ پہلے نہ سہی لیکن اب تو میں آپ کو اپنا ہی سمجھتی ہوں۔ آپ جیسی تو کس قدر مہربان اور مشفق ہیں۔ کہنا چاہ رہی تھی کہ میرا اسفند کسی قسم کا مذاق ہی کر رہے تھے ورنہ بھائی اور بھابی جان ابھی اپنے ٹور سے واپس نہیں لوٹے ہیں۔ کیونکہ اگر وہ واپس ہی لوٹتے تو کم از کم اپنی آمد کی اطلاع تو دیتے اور یہاں سب سے مل کر ہی جاتے۔ اور اگر وہ واپس بھی آ گئے ہیں تو بھلا انہیں مہینوں بعد مبارکباد کا تار دینے کی کیا ضرورت تھی۔ جبکہ اس تار پر سے تاریخ بھی مٹا دی گئی ہے۔" اس کے دل میں کوئی کھوٹ کوئی آلودگی نہ تھی اس لیے اس نے پوری صداقت سے انہیں اصل بات بتا دی۔ سلمیٰ بیگم بھی اس کی بات کی صداقت پر یقین لے آئیں۔ اور تھوڑی دیر تک کچھ سوچنے کے بعد بولیں۔

"ہاں واقعی، یہ تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو۔ مگر —— اس نتیجے کو تم سے ہی ایسا مذاق کرنے کی آخر کیا سوجھی؟ جب کبھی یہ کوئی نیا چٹکلہ چھوڑ کر جاتا ہے اب کل رات تمہارے پیچھے پڑ رہا تھا کہ تم سروس کرنے کا خیال ترک کر دو۔ بھلا یہ بھی کوئی معقول بات ہے اور اسے کیا حق پہنچتا ہے کسی کی ذاتیات میں دخل دینے کا؟" اور جواب میں وہ بھلا کیا کہتی۔

اور انہیں کیسے بتاتی کہ وہ کس برتے پر اپنا حق جتانا چاہ رہا ہے۔

یا اس کے کانوں میں ایک ایسی فتنہ خیز بات پھونک کر گیا ہے کہ اس کے دل کی دنیا اتھل پتھل ہو کر رہ گئی ہے۔

"خیر اگر یہ اس کا مذاق بھی ہے تو بیٹی! تم اس کی باتوں کا برا نہ ماننا۔" سلطے بیگم بھی اسے خاموش دیکھ کر اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں کہہ سکیں۔

"نہیں برا ماننے کی بات نہیں اماں جان البتہ مجھے یہ بالکل پسند نہیں کہ کوئی میری ذاتیات میں دخل دے۔" وہ قدرے ناگواری کا اظہار کرتی ہوئی بولی تب بھی سلطے کے دل میں اک کھٹک سی باقی رہی۔

"ارے نہیں بھی کیا یہ بات تو کسی کو بھی پسند نہیں ہوتی کیونکہ سب اپنی اپنی مرضی کے مختار ہوتے ہیں۔ مجھے تو اس بات پر کافی تعجب ہو رہا ہے کہ تم سے ایسے مذاق کیوں کرتا ہے جبکہ گھر کی بہنوں اور کزنز تک کو منہ نہیں لگاتا۔" سلطے بیگم کسی خیال کے تحت بولیں ان کے لہجے میں طنز یا معنی خیزی نہیں تھی اس کے باوجود بھی سلوط کچھ سٹ پٹا سی گئی۔

"وہ۔ مجھے خود نہیں معلوم اماں جان۔ لیکن جہاں تک میرا خیال ہے اس کی وجہ شاید یہی ہے کہ اس روز ناشتے کا طشت اچانک میرے ہاتھ سے چھوٹ کر ان پر گر پڑا تھا ان کا نیا سوٹ خراب ہو گیا تھا۔" وہ سوچ سوچ کر بولی۔

"مگر وہ تو محض اتفاق تھا کہ سنا ہے تمہارا پیر رپٹ گیا تھا سیڑھی سے۔ کوئی تم نے جان بوجھ کر تو اس کے کپڑوں کو ایسے میں نہیں لتھیڑا ہے۔ ارے ہاں جبھی منہ اتنی باتیں۔ مجھے اصل بات بتاؤ کیا ہوا کیا تھا۔" سلطے بیگم بڑی چالاکی سے کام لے کر بولیں۔ تو وہ تھوک نگل کر بولی۔

"وہ۔ وہ دراصل یہ تیزی سے زینہ چڑھتے ایک دم ہی سامنے آ گئے تھے اور میں دونوں ہاتھوں میں طشت تھامے نیچے اتر رہی تھی۔ انہیں راستہ دینے کے لیے جلدی سے ایک طرف ہٹی تو بے دھیانی میں میرا پیر رپٹ گیا اور میں لڑھکتی ہوئی نیچے فرش پر آ گری۔" اس نے گول مول سے انداز میں بتایا۔

"ہاں یہی تو میں بھی کہہ رہی ہوں کہ وہ تو محض ایک اتفاق تھا۔ کوئی تم نے جان بوجھ کر تو اس پر ناشتہ نہیں گرایا تھا جو یہ تم سے گن گن کر بدلے لے رہا ہے اور وہ ایسی خصلت کا ہے بھی نہیں۔ میرے خیال میں تو از راہ ہمدردی اور مروت تم سے ہنسی بول لیتا ہے کہ ایک تو تم مہمان ہو دوسرے تم سے بہت نزدیکی سمدھیانہ بھی تو ہوتا ہے۔" سلطے بیگم نے اظہار خیال کے طور پر کہا تو جواب میں خاموش ہی رہی۔

"ہاں یقیناً یہی بات ہو گی ورنہ اس کے علاوہ اور کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ اور یہ تھا بھی ابھی آہستہ آہستہ —— جو تم سے کچھ کہہ رہا تھا اس کا بھی کچھ خیال نہ کرنا بلکہ موقع دیکھ کر خود اسے سمجھا دوں گی کہ تم سے مذاق نہیں کیا کرے۔ ویسے جہاں تک میرا خیال ہے اس نے تم سے کوئی ایسی بات تو نہیں کہی ہو گی جو تمہاری دل آزاری کا سبب بنی ہو۔ کیوں میرا خیال کچھ غلط تو نہیں؟" سلطے بیگم دوبارہ سے دل میں کھٹکتی بات کو آخر زبان پر لے ہی آئیں لہجہ جتانے والا نہ ہی مگر تھوڑا تھوڑا معنی خیز ضرور تھا جو ان آخری دو فقروں میں سمٹ آیا تھا۔

اف جیسے اقبالی مجرم کرانے کے لیے کسی سخت ترین کرائس انگیز مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے اس کی کیفیت بھی کچھ ایسی ہی ہو گئی۔

اسے یوں لگا جیسے انہوں نے اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہو۔

جبکہ دور دور تک اس کی کوئی خطا تھی نہ غلطی۔

پھر بھی وہ کچھ اتنی سراسیمہ ہو گئی کہ سردی کے موسم میں بھی اس کا سارا بدن پسینے میں ڈوب گیا۔ حتیٰ کہ سرد ہاتھوں میں بھی نمی کا احساس ہونے لگا۔

اب جواب میں ان سے کیا کہے۔؟

کیا اصل بات انہیں بتا دے؟

یا پھر انتہائی صفائی سے جھوٹ بول کر ان کی آنکھوں میں دھول جھونک دے۔ لیکن زندگی میں بعض مقام ایسے بھی آتے ہیں جہاں جھوٹ جو بڑی آسانی سے بولا جا سکتا ہے یا پھر انسان بولنے کا عادی ہوتا ہے۔ وہ بھی بولا نہیں جا سکتا۔ جبکہ سچ جو کہ ایک

عظیم وصف ہوتا ہے۔ آسانی سے بولا ہی نہیں جا سکتا کیونکہ اس کے بولنے میں ہمت اور حوصلہ درکار ہوتا ہے۔ مصلحتوں کو پس پشت ڈالنا اور مروت اور رواداری کو بالائے طاق رکھ دینا لازمی ہوتا ہے۔ تب کہیں جا کر سچ بولا جا سکتا ہے۔

گو اس پر کسی کا زور تھا۔

نہ مونس۔ نہ خوف ہی غالب تھا۔

اور نہ کوئی مصلحت ہی در پیش تھی۔

رواداری اور مروت کا بھی کوئی پاس نہ تھا۔

البتہ ہمت اور حوصلے کا فقدان ضرور تھا اس لیے وہ سچ بھی نہیں بول سکتی تھی۔ سوال کرنے کے بعد جواب دینے کا درمیانی وقفہ بڑھتا جا رہا تھا اور مزید تاخیر اس کے حق میں کوئی اچھی بات نہ تھی۔ لہٰذا اسے بحالت مجبوری جھوٹ کا سہارا ہی لینا پڑا۔

"اماں جان۔ اب میں آپ کو کیا بتاؤں کہ وہ کیا کہہ رہے تھے۔ بالکل بے تکی سی بات تھی جس پر افسوس کرنے کے سوا میں کیا کر سکتی ہوں۔" خاصے توقف کے بعد اس نے افسردگی سے کہا تو سلطانہ بیگم نے تھوڑا سا اچک کر پوچھا۔

"ا۔ چھا ایسا کیا کہا تھا اس نے؟" وہ حد درجہ تجسس و کمائی دے رہی تھیں۔

"یہی کہ اب تمہارے بھائی جان آ گئے ہیں تو تم ان کی دمونس میں آ کر کہیں سروس نہ کر بیٹھنا۔ وہ ٹھیک نہ ہوگا۔" اس نے پھنسی آواز میں بتایا۔

"اے واہ! کیا دیوانہ ہو گیا ہے وہ۔ یا تمہارا والی وارث ہے جو یوں دمونس جما رہا ہے۔ ٹھہرو اب کے آ لینے دو اسے پھر بتا میں اس کی کیسی خبر لیتی ہوں۔" سلطانہ بیگم کے دل سے اس کے جواب پر ایک بوجھ سا ہٹا تو وہ اسفند کو برا بھلا کہتی ہوئی بولیں۔

"نہیں اماں جان! خدارا ان سے کچھ نہ کہیے گا۔ ورنہ وہ مجھے چغلخور اور معلوم کن کن القابات سے نوازیں گے۔ دیکھیں نا میں یہاں ساری زندگی گزارنے کی غرض سے تو نہیں آئی۔ صرف ایک دو ماہ کی بات اور ہے۔ اور میں نہیں چاہتی کہ میں یہاں بلا وجہ بے وقعت ہو کر رہ جاؤں۔" اس کے لہجے میں کرب بھی تھا اور التجا بھی۔ سلطانہ بیگم بھی کسی حد تک اس کے دکھ سے واقف تھیں اس لیے انہوں نے بھی دکھی ہو کر کہا۔

"اچھا اچھا بیٹی۔ تم اطمینان رکھو میں اس سے کچھ نہیں کہوں گی۔ میرا تو پہلے ہی یہ تمہاری پیاری پیاری صورت دیکھ کر دل کٹتا ہے یہ قدرت کے کھیل بھی کیسے نیارے ہوتے ہیں۔ کسی کو صورت سیرت اور تمام تر خوبیوں سے نوازتی بھی ہے تو بہت سی نعمتوں سے محروم کر کے دکھ دیتی ہے۔ کاش اس نے تمہاری قسمت اچھی بنائی ہوتی تو آج تم شہزادیوں کی طرح راج کر رہی ہوتیں۔" اور جواب میں اس نے ایک سرد آہ بھری۔

جانے کیوں آنکھوں میں مرچیں سی لگ رہی تھیں۔

اور دل بھرا چلا آ رہا تھا۔

"مجھے تو کچھ ایسا ظاہر کرتی ہیں جیسے میں ان کی ساس نہیں بلکہ سوتیلی ماں ہوں وہ بھی ظالم اور جلاد قسم کی۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ میں نے ہی ان کی شادی شعیب سے کرائی تھی۔ کیونکہ ان کی ماں میرے بڑے اچھے واقف کاروں میں سے تھیں اور خدا گواہ ہے کہ آج تک میں نے خود ان بچوں کو کبھی سوتیلا نہیں سمجھا۔ خیر میرے بیٹے کو خدا ہزاروں عمر دے مجھے کسی سے کوئی گلہ نہیں۔ اب تمہیں دو تو ناعزہ کے متعلق مجھے کچھ پوچھنا مناسب نہیں لگا۔ کیا ناعزہ واقعی میاں کے ساتھ ورلڈ ٹور پر گئی ہیں یا نازو کی شادی میں شرکت نہ کرنے کا کوئی عذر تراشا گیا ہے۔ کیونکہ ملازمت چھوڑے تو عاقب کو عرصہ ہوا۔ اور کاروبار بھی سنا ہے کہ بالکل ٹھپ ہو کر رہ گیا تھا اتنا کا پھر کیا تاروں کا خزانہ ہاتھ لگ گیا تھا جو تمہیں دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر وہ دنیا کا دورہ کرنے کے لیے چل دیے ہیں۔" بڑی خوبصورتی اور ترکیب سے ناعزہ اور عاقب کے معاملات کو کرید! تو وہ دھیرے سے بولی۔

"آپ نے جو سنا تھا ٹھیک ہی سنا تھا۔ مگر آج کل تاروں کا خزانہ نہیں ناجائز کاروبار کا بازار گرم ہے اماں جان اور ہمارے بھائی جان بے چارے ایک معاملے میں بری طرح پھنس گئے تھے اس قدر کہ بحالت مجبوری انہیں ترک وطن کر کے بھابی جان کے ساتھ کسی بیرونی ملک میں پناہ لینی پڑی۔ اور میری عزت و جان خود خطرے میں تھی اس لیے بھابی جان نے مجھے یہاں بھیج دیا۔ اب آپ ہی بتائیے میں ان لوگوں پر بوجھ بن کر تو نہیں رہ سکتی۔ ظاہر ہے سروس ہی کروں گی۔ بھائی جان نے بھی مجھے سروس کرنے کی اجازت دے دی

تھی۔ بھلا سروس کیے بغیر میرا گزارہ کیسے ممکن ہو سکے گا۔ سروس مل گئی تو پھر میں کسی بورڈنگ یا ہوسٹل میں چلی جاؤں گی۔ لیکن یہاں رہنا کسی قیمت پر گوارا نہ کروں گی۔ کیونکہ ان لوگوں کا رویہ بہت معاندانہ ہے۔ زینت بھابی مجھے شروع دن سے ہی منحوس سمجھتی ہیں اور نیلوفر کی نگاہوں میں میرے لیے حقارت ہوتی ہے۔ اماں جان آپ ہی بتائیے میں یہاں سے نہ جاؤں تو پھر کیا کروں؟"

اور پھر وہ سلطانہ بیگم کی گود میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سلطانہ بیگم کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو گئے۔ ان کے دل میں ایک حسرت بھری خواہش ابھری۔ اے کاش میرا اپنا کوئی گھر کوئی ٹھکانہ ہوتا تو میں اس اتنی پیاری، دکھی، ہمدرد اور دردمند لڑکی کو اپنی بیٹی بنا کر اپنے پاس رکھ لیتی۔ مگر شوہر کے انتقال کے بعد تو وہ خود بھی بے ٹھکانے ہو گئی تھیں۔ ایک آسرا تھا تو خدا کا یا پھر اسفند کا مگر اسفند کا سہارا ابھی بہت بودا تھا۔ وہ اس کے ساتھ چپ چاپ آنسو بہاتی اس کے بالوں پر شفقت سے ہاتھ پھیرتی رہیں پھر ذرا سا دیر کو رک کر بولیں۔

"مجھے تو تمہارے خیالات سن کر بڑی خوشی ہوئی ہے بیٹی۔ کہ تم بہت غیور اور خوددار ہو۔ کسی کی دست نگر بن کر رہنا پسند نہیں کرتیں۔ تمہارا یہ جذبہ قابل ستائش ہے۔ سو چلو۔ جو کسی کا محتاج بن کر رہنا پسند نہیں کرتا۔ خدا خوش ہو کر اسے خود ہی سرفراز کر دیتا ہے۔ کیا کروں بڑی مجبور ہوں ورنہ میرا اپنا کوئی آشیانہ ٹھکانا ہوتا تو تم کو کبھی اپنے سے جدا نہ ہونے دیتی۔ چلو اٹھو اپنا دل سنبھالو۔ اور جا کر تھوڑا سا پانی پی لو۔ طبیعت بھی سنبھل جائے گی اور دل بھی ٹھہر جائے گا۔" مگر اس نے ان کی گود سے سر اٹھایا تو آنسو پونچھنے کے باوجود آنکھوں کے ساغر چھلکتے ہی رہے۔

"دیکھو بیٹی! یہ رونا دھونا بزدلوں اور کمزوروں کا کام ہوتا ہے جب کہ تم خاصی دلیری سے حالات کا مقابلہ کر رہی ہو۔ اگر اسی طرح حالات کے سامنے ڈٹی رہیں تو ان شاء اللہ اس پانی کا ہر قطرہ پھول بن جائے گا جو تمہاری آنکھوں سے بہہ رہا ہے۔ یاد رکھنا میری یہ بات اگر میں زندہ رہی تو پھر خود تم سے پوچھ لوں گی اور اگر مر گئی تو تمہاری یادداشت کے کسی کونے میں تو پڑی ہی رہے گی پھر تم اسے کھوج کر نکال لینا کہ حالات کے سامنے سینہ سپر ہو کر ڈٹے رہنے والے ہمیشہ کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہیں اور یہ پریشانیاں اور مصیبتیں تو ہر انسان کی قسمت میں لکھی ہوتی ہیں۔ جنہیں خوشیوں کی طرح وہ ان کو بھی اپنے اوپر سے گزار لیتا ہے۔ ارے بیٹی! یہ زندگی تو دھوپ چھاؤں کی طرح ہوتی ہے۔ اس کا تاریک پہلو سامنے آ گیا تو اندھیرا ہی اندھیرا اور روشن پہلو سامنے آ گیا تو اجالا ہی اجالا۔ کبھی ایک سی کیفیت تو نہیں رہتی اس کی۔ خدا نے اس میں بھی اپنے بندوں کے لیے ایک حکمت رکھی ہے۔ چلو شاباش۔ اب روک لو یہ آنسو اور اٹھ کر منہ دھو آؤ۔"

انہوں نے ایک بار پھر اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر پچکارتے ہوئے اسے سمجھایا تو وہ آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کے ساتھ اٹھ کر غسل خانے کا رخ کرنے لگی تو سوتی اور گلوگیر آواز میں اس نے سلطانہ بیگم سے کہا۔

"اماں جان۔ مان کھتے ہوئے میں نے آپ کو بھائی جان کے متعلق سب کچھ بتا دیا ہے۔ خدارا آپ اس بات کو کسی پر ظاہر نہ ہونے دیجیے گا۔"

اور سلطانہ بیگم جن کا دل اس سے اور بھی بہت کچھ پوچھنے کے لیے مچل رہا تھا۔ انہوں نے اسے اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں میرا سینہ تو ایک گہرے کنوئیں کے مانند ہے جس میں جھانک کر دیکھنے پر بھی کسی کو یہ نظر نہیں آ سکتا ہے کہ بہت گہرائی میں چمکتے پانی کی سطح پر کچھ تیر بھی رہا ہے۔ تم میری طرف سے تو بالکل اطمینان ہی رکھو۔"

اور تب وہ اپنے آنسو پونچھتی غسل خانے میں گھس گئی۔

دن کے چار بجے کا عمل تھا۔

دھوپ کی آب و تاب ابھی ماند نہیں پڑی تھی۔

"لگی ہمارے سناٹوں کی زد میں تھا۔ سب اپنے اپنے کمروں میں آرام کر رہے تھے۔ نیلما بند دروازے کو زور سے بجاتی ہوئی اندر آ گئی۔

"ممی۔ ممی۔" بھاگ کر آنے کی وجہ سے اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ زینت جو آنکھیں بند کیے اپنے بیڈ پر لیٹی تھیں اس کے ممی ممی چیخنے پر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔

"ہوں خیر تو ہے کیا ہوا؟" انہوں نے گہرا سانس لے کر پوچھا۔

"ممی! وہ ابھی ابھی احمد بھائی آئے ہیں۔" نیلما نے سرگوشی کے انداز میں بتایا۔

"تو کیا میری اماں زادہ آیا ہے۔ مگر یہ کیسے ممکن ہے؟" انہوں نے آگے سرک کر جوتی میں پیر ڈالتے ہوئے بے یقینی کے سے انداز

بیٹی کو دیکھا۔ اور پھر بولیں۔

"ابھی کل شام کو ہی تو میں نے لسریٰ سے فون پر بات کی تھی۔ انھوں نے تو مجھے کچھ بتایا ہی نہیں۔ پھر یہ دونوں کیسے اچانک آ گئے؟" وہ سنگھار میز کا رخ کرتی ہوئی بولیں۔

"اب یہ تو پتا نہیں مگر وہ دونوں آ گئے ہیں۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے انھیں کار سے اترتے دیکھا ہے۔ میں تو آپ کو فوراً اطلاع دینے چلی آئی۔" نیلما باہر جانے کی جلدی میں بولی۔

"تعجب ہے۔" زینت آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر کنگھے سے اپنے بال سنوارتی ہوئی بولیں۔ ان کے لہجے سے اب بھی بے یقینی سی عیاں تھی۔ لیکن نیلما انھیں وہیں چھوڑ کر جلدی سے باہر نکل گئی تھی۔ زینت بھی جلدی سے کنگھا ڈریسنگ ٹیبل پر ڈال کر تیزی سے باہر آئیں۔ ان کے باہر آتے ہی نازو جو اپنے شوہر کے ساتھ ان کے کمرے کی طرف ہی آ رہی تھی ان پر نظر پڑتے ہی لپک کر ان سے لپٹ گئی جبکہ اس کا شوہر کچھ پیچھے ہی رہ گیا تھا۔

ماں نے بیٹی کو خوب بھینچ بھینچ کر گلے سے لگانے کے بعد علیحدہ ہو کر بھرپور نظروں سے بیٹی کا جائزہ لیا۔

وہ شاکنگ پنک کلر کی ہلکے ہلکے کام کی ساڑھی اور نفیس سے جڑاؤ سیٹ میں اپنی قابلِ رشک صحت کے ساتھ بڑی نکھری نکھری لگ رہی تھی۔

"ماشاء اللہ چشمِ بد دور۔" انھوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کی بلائیں لے کر کہا اور پھر داماد کی طرف متوجہ ہو گئیں جو اس اثنا میں ان کے نزدیک آ گیا تھا۔

اس نے جھک کر انھیں سلام کیا تو انھوں نے اس کی پیشانی چوم کر اسے بہترین دعاؤں سے نوازا اور پھر بیٹی سے مخاطب ہو کر بولیں۔

"یہ اچانک تم کیسے آ گئیں جبکہ کل شام تک تو تمھارے آنے کا دور دور تک گمان نہ تھا۔"

"اصل میں ہم کل رات کی فلائٹ سے یہاں پہنچے تھے ممی!" نازو نے اپنے شوہر کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔ کل رات کی آئی ہوئی ہو اور مجھے بتایا تک نہیں۔" زینت کے لہجے میں تحیر سے زیادہ گلہ سا شامل تھا۔

"دراصل ممی یہ آپ کو سرپرائز دینا چاہ رہی تھیں۔ ورنہ میں نے تو ایئرپورٹ پر اترتے ہی آپ کو فون کرنا چاہا تھا مگر انھوں نے منع کر دیا۔" نازو کے بجائے احمد سروش نے وضاحت کی۔ مگر زینت کو یہ سرپرائز دینے والی بات اچھی نہ لگی۔ کہنا تو یہی چاہ رہی تھیں کہ کل رات کو نہ سہی صبح کو ہی مجھے مطلع کر دیا ہوتا یا صبح کو ہی آ جاتیں۔ مگر داماد کی موجودگی کے پیشِ نظر انھوں نے موضوع بدلتے ہوئے بیٹی سے پوچھا۔

"اچھا پھر یہ بتاؤ کہ تمھارا ٹرپ کیسا رہا؟ انجوائے تو خوب کیا ہوگا تم دونوں نے؟" تو نازو شوہر پر ایک شوخ سی نظر ڈال کر بولی۔

"اوہ ممی ایسا ویسا۔ اتنا زبردست کہ تین ماہ کا عرصہ یوں گزر گیا جیسے کل ہی کی بات ہو۔" نازو پر ایک سرشاری کا عالم طاری تھا۔ خوشی سے وہ کھلی پڑ رہی تھی۔

"جی ہاں ممی ہمارا تو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا واپس آنے کو مگر۔" احمد سروش نے مسکراتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"ہاں بیٹے یہ وقت یا عرصہ زندگی کی تمام تر مسرتوں اور لطافتوں سے ہمکنار ہونے کا ہی ہوتا ہے۔ خدا تم دونوں کو ہمیشہ اسی طرح خوش و خرم اور شاد و آباد رکھے۔ ماشاء اللہ تمھاری صحت بھی قابلِ رشک ہو رہی ہے۔ آؤ چلو لونگ روم میں چل کر بیٹھتے ہیں۔" زینت نے داماد کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ اور پھر بیٹی اور داماد کے ساتھ لونگ روم کا رخ کرتی ہوئی بولیں۔

"ہمارے یہاں ہم مشرقی لوگوں کے یہاں ہنی مون وغیرہ منانے کا کوئی تصور ہی نہیں۔ یہ تو مغرب کی ایک ریت ہے جسے ہم نے "اپنا" (اپنانا) کر لیا ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ ریت یا دستور کچھ اتنا برا نہیں بلکہ اس میں فائدہ ہی فائدہ ہے۔ یعنی ازدواجی زندگی کے ابتدائی دور کی خوشیاں لوٹنے کے ساتھ ساتھ صرف نئے شادی شدہ جوڑے کا تمام وقت سیاحت اور تفریح ہی میں نہیں گزرتا بلکہ اپنے خاندان والوں یا اپنے گرد و پیش میں رہنے والوں سے علیحدہ ہو کر انھیں کچھ عرصے میں ایک دوسرے کی عادات و مزاج کی نظر میں اور پسند ناپسند یعنی ایک دوسرے کو سمجھنے کا بہت اچھا موقع ملتا ہے۔ اور اس عرصے میں وہ ایک طرح آپس کی ناموافقت سے سمجھوتہ بھی کر لیتے ہیں۔ کہ بیوی کے اندر اگر کوئی خامی یا کمزوری ہے یا پھر خلافِ مزاج کوئی عادت، تو شوہر اس سے مطابقت رکھنے کا تہیہ کر لیتا ہے اور اگر شوہر میں کوئی خامی یا خرابی ہو تو بیوی اپنے خیالات اور مزاج کو اس کے مطابق ڈھال کر اس سے نباہ کرنے کی ٹھان لیتی ہے۔" انھوں نے بیٹی اور داماد کے ساتھ لونگ روم میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"اوہ گاڈ! معلوم ہوتا ہے کہ ممی نے باقاعدہ ہنی مون کے فوائد پر ریسرچ کی ہے بہت ہی ڈیپ معلومات رکھتی ہیں۔" احمد سروش نے نازو کے کان کے قریب منہ کر کے آہستہ سے کہا۔

"ہاں تو ممی کا تجربہ ہی نہیں مشاہدہ بھی بہت گہرا ہے۔" نازو برجستہ جواب میں قدرے فخر سے بولی۔

لونگ روم۔ گھریلو سسٹم کی بیٹھک ہوتی ہے یا دوسرے معنوں میں افرادِ خانہ کی نشست گاہ۔ اور یہ لونگ روم بہت آراستہ تھا۔ پورا فرش دبیز اور خوشنما قالین سے ڈھکا ہوا تھا۔

دائیں بائیں مقابل کی دیواروں کے آگے چوڑے چکلے دیوان رکھے تھے جن پر بچھے خوشنما قالینچوں پر گاؤ تکیے سجے تھے اور ملتے جلتے رنگ کے صوفے رکھے تھے۔ قالین اور فرنیچر کی مناسبت سے دروازے اور کھڑکیوں پر دبیز پردے پڑے رہتے تھے۔ نیلما بھی دوران میں اندر چلی گئی تھی جونہی یہ تینوں لونگ روم میں آ کر بیٹھے وہ بھی آ کر نازو سے لپٹ کر بیٹھ گئی۔

زینت نے نشست گاہ میں بیٹھتے ہی ملازم کو بلا کر چائے کے متعلق ہدایات دیں۔

"ہاں بھئی! اب سناؤ کہاں کہاں گھومیں اور کیا کیا دیکھا؟" نیلما نے بڑے شوق سے بہن سے پوچھا۔

"ارے بس کیا بتاؤں۔ بس یہ سمجھو کہ آدھا یورپ گھومے ہیں حتیٰ کہ لندن بھی۔ مگر زیادہ قیام سوئٹزرلینڈ میں کیا۔ سوئٹزرلینڈ تو بس جنت کا ایک ٹکڑا ہی معلوم ہوتا ہے۔ صناعیِ قدرت کی ہی نہیں بلکہ انسانی ہاتھوں سے سنواری ہوئی ایک ایسی دلفریب جگہ جس کی نظیر پورے یورپ میں بھی کہیں نہیں مل سکتی۔" پھر وہ ماں سے مخاطب ہو کر بولی۔

"سچ ممی! مجھے تو کراچی آنے کے خیال سے وحشت ہونے لگتی تھی۔ بھلا یہ بھی کوئی انسانوں کے رہنے کی جگہ ہے۔ ایک دم گھٹن اور بوریت۔ کوئی تفریح نہ ڈھنگ کی۔ نہ وہ آسانیاں اور مراعات جو یورپ والوں کو میسر ہیں۔ میرا بس چلے تو احمد سے کہوں کہ [illegible] سوئٹزرلینڈ ہی میں [illegible] کبھی نہیں آؤں گی۔"

"ہاں بیٹی! خود بھی پاکستان میں رہنے کا شروع سے ہی قائل نہیں ہوں۔ لیکن ممی گھر گھروالے اور بزنس تو سارا یہیں ہے۔ گو ہماری کمپنی کی ایک برانچ لندن اور ایک جاپان میں بھی قائم ہے لیکن موسم کی وجہ سے لندن انھیں پسند نہیں آیا ورنہ لندن میں رہائش کچھ مشکل نہ ہوتا۔" احمد سروش نے ساس سے مخاطب ہو کر کہا۔

"اونہہ! لندن کیا، سوئٹزرلینڈ کے مقابلے میں تو مجھے پیرس بھی پسند نہیں آیا کیونکہ دونوں ہی شہر بہت گنجان اور ہنگامہ خیز ہیں جبکہ سوئٹزرلینڈ کی سادگی لاثانی اور نیچرل بیوٹی پر تو میری جان جاتی ہے۔ اگر جاؤں گی تو سوئٹزرلینڈ ہی جاؤں گی۔ سمجھے احمد!" نازو بڑے ناز سے بولی۔

"ایسا کیوں نہ کریں دولہا بھائی کہ سوئٹزرلینڈ میں بھی اپنی کمپنی کی ایک برانچ کھول لیں اور پھر انکل سے کہہ کر وہاں کا چارج لے لیں۔" نیلما نے اپنی دانست میں نہایت مناسب مشورہ دیا۔

"ہوں! مشورہ تو بہت نیک ہے جو بیا بیگم آپ کا۔ لیکن پلیز آپ مجھے دولہا بھائی نہ کہا کریں۔ مجھے یہ دولہا بھائی کا لفظ بہت اولڈ سا لگتا ہے۔"

لیکن نیلما نے اس کی پوری بات نہ سنی اور بگڑ کر بولی۔

"واہ میں آپ کو جو بیا کدھر سے لگ رہی ہوں۔ آپ کی تو سسٹر ان لا اور (حکمت مند) ہوں۔"

"ہوگی لیکن مجھے تو تم بالکل ایک چھوٹی سی جو بیا ہی نظر آتی ہو۔" احمد نے مسکرا کر کہا۔

"پھر تو آپ کی آنکھوں میں یقیناً کوئی خرابی ہوگی۔ بہتر یہی ہے کہ فوراً اپنی بینائی چیک کرا لیں۔" احمد کے مسکرانے پر وہ کچھ زیادہ ہی بگڑ کر بولی۔

"ہائیں ہائیں نیلما! یہ کیا بدتمیزی ہے۔ تم یہ کیا بک رہی ہو۔" زینت نے داماد کے نازک رشتے کے خیال سے فوراً ہی اسے جھڑک دیا۔

"ارے نہیں ممی! یہ میرا اور ان کا معاملہ ہے آپ انھیں نہ ڈانٹئے۔" احمد ہنس کر بولا۔ جبکہ نازو محظوظ ہو کر میٹھی مسکراہٹ مسکرا رہی تھی۔

"ہاں تو کیا مشورہ دے رہی تھیں جو بیا بیگم آپ؟" احمد نے نیلما کو مخاطب کر کے پوچھا۔ جو ماں کے گھرکنے پر منہ پھلائے بیٹھی تھی۔

"دیکھیں پھر وہی جو بیا بیگم! مجھے تو آپ نے ڈانٹ دیا اور ان کو نہیں ڈانٹ سکتیں آپ ممی!" نیلما پھر بگڑ اٹھی۔

"ارے تو تم اسی قدر سیریس ہو رہی ہو۔ یہ تو تم سے مذاق کر رہے ہیں۔ آخر رشتہ بہنوئی کا ہے [illegible]" زینت نے ہنستے ہوئے

پروا تک نہ کی۔ خود احمد بھی ماں بہنوں کے سامنے مجھے بھلا جچتے ہیں۔"

"اصل میں تم دونوں اتنے دن بعد آئے تھے نا اس لیے ماں بہنوں نے سارے دنوں کی کسر پوری کر دی ہوگی۔ آخر تو اکلوتا بیٹا ہے ان کا۔" دل تھا ایسا بات پر پریشان ہی ہونے کے باوجود کہ غلط لوگوں میں پھنس گئی ہیں۔ زینت نے بظاہر اظہار خیال کے طور پر کہا۔

"اگر یہی بات تھی تو پھر انھیں اپنے اکلوتے بیٹے کو کسی ڈبے میں بند کر کے یا شو کیس میں سجا کر اپنی آنکھوں کے سامنے رکھنا چاہیے تھا۔ اس کی شادی کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔" نازو چمک کر بولی۔

"تعجب ہے میں ان لوگوں کو اس قدر گیا ہوا تو نہیں سمجھتی تھی۔" زینت دل ہی دل میں افسردہ ہو کر بولیں۔

"گرے ہوئے تو یہ لوگ ہیں ہی اپ اسٹارٹس (نو دولتیے) جو ہیں۔ باتیں ہی کیا کرتی ہیں بھی کتنی اوچھی ہوتی ہیں ان کی جیسے خود کو ملا ہی کہتے ہیں کہ ان سے بڑھ کر کوئی دولت مند ہی نہیں زمانے میں لیکن دوسروں کی دولت اور ثروت دیکھ کر جیسے تنگ ہو جاتے ہیں ان کے۔ فلاں کے پاس اتنی ساری گاڑیاں ہیں۔ اتنا زیادہ زیور ہے۔ فلاں نے اتنا زبردست ڈنر دیا تھا۔ ہزاروں مہمان بلائے تھے وہ بھی شیرٹن میں۔ اتنی ورائٹیز (ڈشیں) تھیں کھانوں کی کہ شاید ہی کسی کے یہاں ہوں گی۔ فلاں لڑکی کو اتنا بھاری جہیز ملا ہے اسے ہی سے لے کر وی سی آر اور بنگلہ تک لائی ہے اپنے ساتھ۔ داماد کو بھی مالا مال کر دیا ہے لڑکی والوں نے۔ ایک ہر بات میں ہم آتی ہیں۔ گھر کا ماحول بھی کچھ عجیب ہی سا ہے ممی۔ ایک تو بڑوں کا ادب نہ چھوٹوں کا لحاظ۔ ایسا یوں لگتا ہے جیسے سب ایک دوسرے سے لڑنے کے لیے تیار بیٹھے ہوں۔ خاص طور پر وہ احمد کی چھوٹی بہن شاہدہ ابھی پوری ٹوسٹر کوک (لڑاکا) ہے گالیوں میں الو کی ولدیت اور بڑی بہن اور بھائی یعنی ساس اور سالے۔ لڑکیاں تک میٹھے بول تک کر لڑا کرتی رہتی ہیں اور وہ ہمارے سسر صاحب تو لگتا ہے جیسے ابھی تک جلاد کے عہدے پر فائز رہے ہوں۔ مگر ان کے آتے ہی سب لوگوں کو کھڈروں میں دبک جاتے ہیں جیسے سر تن سے جدا کرنے کی غرض سے تلوار لہراتے چلے آ رہے ہوں۔ اور حد تو یہ ہے کہ ان کی بیوی بھی انھیں دیکھ کر کچھ ایسا امپریشن دیتی ہیں جیسے قربانی کی بکری قصاب کو دیکھ کر۔ اف ایک بات جو تو بتا دوں ممی۔" نازو کے کہنے کا انداز ہی کچھ ایسا تھا کہ زینت کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔

"ہنسنے کی بات نہیں ممی سچ مجھے تو اپنی قسمت پر رونا ہی آتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے اجڈ اور گنوار لوگوں میں پھنسی ہوں۔ انہیں ان کلچرڈ بھی۔ یہ لوگ کر کیا بتاؤں۔ کھانے کا بھی کوئی وقت مقرر نہیں۔ ہر وقت چرتے ہی نظر آتے ہیں۔ اس پر ایک تو کھانا چپڑ چپڑ کر کے کھاتے ہیں جیسے وار فیلڈ (میدان جنگ) میں بیٹھے کی جلدی ہو اور مزید خطرے کا سائرن بج رہا ہو۔ کھانے پر بڑوں کا انتظار کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی جاتی بس کھانا سامنے آیا اور پل پڑے۔ اتنی توفیق بھی نہیں ہوتی کہ کھانا ختم کر کے بڑوں کا انتظار ہی کر لیں یا پھر میز سے اٹھیں تو معذرت کر کے اٹھیں۔ اور خاص طور پر وہ ہمارے سسر صاحب کھانے کے بعد ڈھور ڈنگروں کی طرح کچھ اتنے زبردست طریقے سے ڈکار لیتے ہیں کہ بے چارہ بیٹھا انسان دہل کر اچھل ہی پڑے۔ اس پر موصوف ایک دو دن پہنے لنگی ہوئے کہ تہبند اور بنیان ہی میں میرے سامنے چلے آئے وہ تو احمد جلدی سے انھیں باہر لے گئے ورنہ ہمیشہ کے لیے فریج ہی ہو جاتے۔ بھلا آپ بتائیے ممی۔ ڈیڈی نے، بھائی جان یا ہمارے دادا ابا نے کبھی تہبند باندھا ہے یا اتنی فلک شگاف ڈکار بھی لی ہیں اور آپس میں تو تکار کر کے بھی کبھی بات کی ہے۔ ان لوگوں نے تو ڈیڑھ مہینے کے اندر اندر اپنی ساری اوقات دکھا دی آئندہ تو پتا نہیں اور کیا کیا دکھائیں گے۔" بات کے اختتام پر نازو دل گرفتہ سی ہو کر بولی۔

"ہاں بیٹی۔ یہ لڑکی کی شادی کا معاملہ بھی واقعی ایک جوا ہی ہوتا ہے۔ کہ پانسہ چت پڑ گیا تو جیت ہی جیت اور پٹ پڑ گیا تو مات ہی مات۔ خیر تم تو صرف اپنے شوہر سے واسطہ رکھو سسرال والوں کو زیادہ منہ ہی نہ لگاؤ۔ حالانکہ اصولاً تو ہر ماں بیٹی کو یہی نصیحت کرتی ہے کہ وہ سسرال والوں سے ادب و اخلاق سے پیش آئے لیکن جب تمھارے سسرال والے تمھارے اسٹینڈرڈ کے ہی نہیں تو میں اس کے سوا تمھیں اور کیا مشورہ دے سکتی ہوں۔" زینت نے دل ہی دل میں آزردہ ہو کر کہا۔

"اس سے بھی کچھ فرق نہیں پڑے گا ممی۔ کیونکہ ایک جگہ ایک ہی چھت کے نیچے رہ کر اگر میں ان سے کوئی واسطہ نہیں رکھوں گی تو بھی ان کا واسطہ تو مجھ سے برقرار ہی رہے گا۔ اسی لیے تو میں چاہتی ہوں کہ ان لوگوں سے الگ ہی ہو جاؤں۔" نازو بولی۔

"لیکن اتنے جلد یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے بیٹی۔ آخر وہ اپنی ماں کی گود میں پروان چڑھا ہے اپنی باپ کے سائے میں پروان پایا ہے جس سے تمھاری طبیعت میل نہیں کھاتی۔ وہ ایک دم اپنی ماں اپنے سگے ماں باپ والوں کو چھوڑ کر علیحدہ تو نہیں ہو سکتا۔ بس تم تو احمد کو اپنی گرفت میں رکھو۔ جہاں تک میں نے اندازہ لگایا ہے وہ ان لوگوں سے بہت مختلف ہے سو مائنڈ ہو کر بھی ہے اس لیے اپنی کلچرڈ (علم کلچس) سے بھی واقف ہے۔" زینت سمجھانے کے سے انداز میں بولیں۔

"جی ہاں ممی۔ واقعی ان سب میں احمد ہی تھے ہیں۔ بلکہ بہت ہی اچھے ہیں۔ شکر ہے باپ پر نہیں گئے۔ بلکہ باپ کی ضد ہی واقع ہوئے ہیں۔ سمپل (سادہ) بہت ہیں اور کچھ خیالات بھی ہیں الحمد للہ۔ ایک تو چونکہ کھانے کے معاملے میں یہ لوگ بہت ہی بے تکلف ہیں۔ بس ذرا سا اشارہ ہی کر دو تو فوراً ہی کھانے بیٹھ جاتے ہیں۔ یہی عادت احمد کی بھی ہے۔ آپ نے نوٹ نہیں کیا احمد کی بے تکلفی کو کیسے مزے سے آدھی چیزیں چٹ کر گئے۔"

"یہ چیزیں کھانے کے لیے ہی ہوتی ہیں اور وہ واقعی بہت سیدھا اور سادہ لوح ہے۔ اس نے جس اپنائیت اور بے تکلفی کا مظاہرہ کیا ہے مجھے اس سے بڑی مسرت ہوئی۔" زینت بولیں۔

"اب آپ تو داماد کی حیثیت سے انھیں کھلا کر خوش ہو رہی ہیں مگر میرا کیسے کے ساتھ تو یہ بے تکلفی ٹھیک نہیں نا۔ خیر میں ان کو جلد ہی سب کچھ سکھا دوں گی۔ پتا ہے ممی جب ہماری شادی ہوئی تھی تو ان کو کچھ بھی نہیں آتا تھا۔ یہ جو اب اتنے پولشڈ نظر آتے ہیں تو یہ میری ہی محنت کا نتیجہ ہے۔ اسی لیے تو مجھ سے بہت امپریس ہیں۔ ویسے بھی میری بہت عزت اور احترام کرتے ہیں اور میری ہر خواہش کو پورا کرنا اپنا ایمان سمجھتے ہیں۔" شوہر کے ذکر کے ساتھ ہی نازو پر ان کی محبت غالب ہونے لگی تھی اور وہ اس کے تصور میں ڈوبی ڈوبی کہہ رہی تھی۔

"بس پھر تو پھر فکر کس بات کی۔ شوہر اپنا ہو تو پھر کس کی مجال جو ٹیڑھی نگاہ سے تمھاری طرف دیکھ بھی لے۔" زینت کے دل سے ایک بوجھ سا ہٹا تو وہ چہک کر بولیں۔

"جی ہاں ممی۔ اصل میں اس تین ماہ کے عرصے میں ہماری انڈر اسٹینڈنگ بھی تو بہت اچھی ہو گئی ہے۔ اور ہمارے درمیان یہ طے پایا ہے کہ ہم اپنی اپنی آپس کی ناپسندیدہ باتیں یا عادتیں ترک کرنے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کی ناپسندیدہ عادتوں کو ٹالریٹ و برداشت کرنے کی کوشش بھی کریں گے۔ ایک دوسرے کی خواہشات کا احترام بھی کریں گے اور کسی اختلاف کو اپنے درمیان حائل نہیں ہونے دیں گے۔" نازو جو شاید اپنے ہنی مون کی رنگین دنیا میں کھوئی ہوئی تھی۔ جو بہت سوچ سوچ کر بول رہی تھی۔

"ہاں یہ آپس کا اتفاق اور التفات ہی تو نباہ کی کڑیوں کو مضبوطی سے جکڑتا ہے۔" زینت خوش ہو کر بولیں۔

"اس کے باوجود بھی ممی میں وہاں ایڈجسٹ نہیں کر سکوں گی۔ وہ لوگ ہی نہیں بلکہ وہاں کا ماحول بھی مجھے سوٹ نہیں کرتا۔ یوں بھی کراچی مجھے بالکل پسند نہیں۔" نازو بیزار کن سے لہجے میں بولی۔

"تو بھلا ایک کراچی ہی تو ہمارے ملک کا سب سے بڑا شہر ہے۔ تجارتی مرکز ہونے کے ساتھ ساتھ عروس البلاد بھی کہلاتا ہے اور پھر یہاں کی رہائش چھوڑ کر آخر رہو گی کہاں۔" زینت بیٹی کی باتوں پر چڑ کر بولیں۔

"خدا کی زمین بہت وسیع ہے ممی۔ کسی فورن کنٹری میں اپنا آشیانہ بنا لیں گے۔ پتا مجھے تو یہاں اپنا دم گھٹتا محسوس ہوتا ہے۔" نازو قدرے نخوت بھرے لہجے میں بولی۔

"کمال ہے بیٹی تم اپنے میاں کے سامنے بھی ایسی ہی باتیں کرتی ہو۔ خیر میں نے اس کے سامنے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ بھلا یہ کہاں ہو گی یہیں کا آب و دانہ کھا کر پروان چڑھی ہو۔ یہیں اپنے اسکولوں کی ہم راہی میں تم نے جینے کا قرینہ سیکھا اور اب صرف تین ماہ باہر گزار کر آئی ہو تو تمھارے دماغ ہی نہیں مل رہے۔ بیٹی یہ تو اوچھے اور بے خبر لوگوں کی باتیں ہیں جو تم کہہ رہی ہو۔ خود یہ یاد رکھو جس طرح بچہ باپ کی نسبت سے پہچانا جاتا ہے اسی طرح ایک انسان کی شناخت اس کے ملک اور قومیت سے ہی ہوتی ہے۔ اب یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں کہ تم اگر سوئٹزرلینڈ یا لندن میں رہائش اختیار کر لو تو برٹش یا سوئس کہلاؤ گی۔ جہاں بھی رہو گی پاکستانی ہی تو کہلاؤ گی نا اور اپنا ملک اور زبان کس کو عزیز نہیں ہوتی۔"

"تو ممی آپ سے یہ کس نے کہہ دیا کہ مجھے میرا ملک عزیز نہیں ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ترقی میں دوسرے ملکوں سے بہت پیچھے ہے۔ اور میں اپنی اس نئی زندگی کو کسی ایسی جگہ گزارنا چاہتی ہوں جہاں مجھے زندگی کی تمام آسائشیں اور خوشیاں مل سکیں۔" ماں کی گفتگو ناگوار سی گزرنے پر نازو قدرے جارحانہ سی ہو کر بولی۔

"زندگی کی بہت سی آسائشیں اور خوشیاں تمھیں یہاں رہ کر بھی نصیب ہو سکتی ہیں۔ بس اپنا ایک ملک بناؤ۔ کچھ اصول وضع کرو۔ شوہر کی محبت اور التفات تو تمھیں میسر ہی ہے۔ یوں بھی بیٹی ازدواجی زندگی بند کتاب کی مانند ہوتی ہے جسے کھولنے کے بعد ہی پتا چلتا ہے کہ اس میں کیا لکھا ہوا ہے سمجھ میں آنے والی عبارت درج ہے یا سر سے گزر جانے والی۔ یاد رکھو شوہر کا دل جیتنے کے لیے عورت کو اپنی بہت سی خواہشات کو قربان کرنا پڑتا ہے۔ تمھارے لیے یہی بہتر ہے کہ تم فی الحال انہی لوگوں کے ساتھ خود کو ایڈجسٹ کرو۔"

تو نازو کو اسے منگنی والوں کا اندیشہ ہونے لگا۔ پھر وہ ان سے علیحدہ ہوئی تو کچھ دیر تک وہ ان سے ان کے بوڑھے کے قریب کے بارے میں باتیں کرتی رہیں۔ وہ بہت داماد کے بارے میں بہت کچھ پوچھا۔ نازو اطمینان سے ان کے پاس بیٹھی ہر بات کا جواب دیتی رہی تھی۔ اس نے سلوط کو نظر انداز کر دیا تھا۔ دادی سے اجازت لے کر اٹھی تو انھوں نے ہی اسے اس کی موجودگی کا احساس دلایا۔

"اوہ آئی ایم ویری سوری سلوط۔ یہ اماں جان کی بیماری بیماری کی باتوں نے مجھے تمہاری احوال پرسی کرنے کی فرصت ہی نہیں دی" اس نے الٹا دادی کو ذمہ دار ٹھہرایا۔ تو وہ ہنسنے لگیں۔

"کوئی بات نہیں۔ میں نے بھی بالکل مائنڈ نہیں کیا۔" سلوط مسکرا کر بولی۔ تو نازو نے دوڑ کے اسے گلے سے لگا لیا۔

"بھئی، دادی جان سمیت سب کے لیے کوئی نہ کوئی سوغات لائی ہوں تمہارے لیے بھی اس میں سے کچھ نکال لوں گی۔ مگر ابھی تو تھکی ہوئی ہوں۔ صبح سے وہ بھی پک سسرالیوں کا ایک آنا سامان ہے بندھا تھا اس لیے اپنا سوٹ کیس کھولنے کا مجھے موقع ہی نہیں ملا۔" کہہ رہی تھی وہ بھی ساتھ ہے۔ سلمیٰ بیگم کے تعجب کی انتہا نہ رہی۔

"نہیں بس تم نے محبت سے بات کر لی، میرے لیے یہی بہت ہے۔ یہی سب سے قیمتی سوغات ہے۔" سلوط جواب میں بولی۔ تو نازو خوش ہو کر ملنے لگی۔

پھر دادی اور سلوط سے رخصت ہو کر جوں ہی باہر نکلی شعیب منصور سامنے سے آتے نظر آئے۔ شاید وہ اس سے ملنے کمرے کی طرف ہی آ رہے تھے۔ نازو بھاگ کر ان سے لپٹ گئی۔ وہ بڑی دیر تک اسے سینے سے لگائے کھڑے رہے۔ پھر زینت کے کہنے پر اسے لے کر اس کے کمرے میں آ گئے۔ زینت نے واقعی اس کے کمرے کی نہ صرف سیٹنگ بدل دی تھی بلکہ نئے پردے اور فرنیچر بھی نیا اور بہت قیمتی تھا اور اتنی خوبصورتی سے سجا ہوا تھا کہ کمرہ منہ سے بول رہا تھا۔ انھوں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی اے سی بھی آن کر دیا تھا مگر نازو باپ کو دیکھ کر سب کچھ بھول گئی تھی۔ گو اس نے ستائشی نظروں سے کمرے کو دیکھا تو ضرور تھا لیکن زیادہ تعریف نہیں کی تھی۔ بس ماں کا دل رکھنے کو واہ کا نعرہ لگا کر اتنا ہی کہا تھا کہ "ممی آپ نے تو میرے کمرے کو کچھ سے کچھ بنا دیا ہے۔"

بہرحال باپ سے باتیں کرنے میں اسے وقت کا خیال ہی نہ رہا۔ حتیٰ کہ کھانے کا بھی نہیں کہ اس دوران میں نیلوفر بھی آ گئی تھی اور اس سے لگی بیٹھی باپ کے ساتھ ساتھ اس سے طرح طرح کے سوالات کر رہی تھی۔ اور جب ملازمہ نے دوسری بار آ کر کھانا ٹھنڈا ہو جانے کا خدشہ ظاہر کیا تو یہ سب کے سب کھانے کے کمرے میں چلے آئے۔ لیکن ابھی کھانا ختم کر کے بیٹھے ہی تھے کہ احمد سروس آئے لینے۔ شعیب منصور اس سے بھی بہت شفقت اور محبت سے ملے اور بیٹھنے کو کہا اور اسے زبردستی آئس کریم بھی کھلوائی۔ پھر جب دونوں واپس کھانے سے اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آئے تو زینت نے کریم کو آواز دی۔ کچھ ہی دیر بعد کریم لدی پھندی ٹرالی دھکیلتا اندر داخل ہوا اور ٹرالی زینت کے آگے رکھ دی۔ زینت نے پہلے بیٹی داماد کو پاس بلا کر انھیں ہار پھول پہنائے پھر جھک کر ٹرالی میں رکھی ہوئی چیزیں نکال نکال کر بیٹی اور داماد کے سامنے رکھنی شروع کیں۔

"یہ سوٹ کا کپڑا، شرٹس، ٹائیاں اور کف لنکس تمہارے لیے ہیں اور یہ کنگن کی ساڑھی اور سیٹ میری نازو کا ہے۔" انھوں نے داماد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اور پھر کریم سے مخاطب ہو کر بولیں۔

"کریم تم مٹھائی اور پھلوں کے ٹوکرے بٹیا کی کار کی ڈکی میں رکھوا دو جا کر۔"

"ممی یہ اتنے تکلفات برتنے کی کیا ضرورت تھی آپ کو۔ ہم تو آپ کے ہی بچے ہیں۔ ہم تو ہر دوسرے تیسرے روز قدم رنجہ کرتے رہیں گے تو کیا آپ ہمیشہ..." تو زینت جو فخر و خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھیں اس کی بات کاٹ کر بڑے دلار سے بولیں۔

"ارے بیٹا، یہ تو بس ایک رسم ہے۔ تمہارا تو حق بنتا ہے۔ ہم پرانے ہوئے تو تم کیا روز روز آؤ گے۔"

"پھر تو یہاں سے تحفے لینے ضرور آیا کریں گے آپ احمد بھائی۔" نیلوفر ہنس کر بولی۔

"ہاں واقعی اس طرح کم از کم آپ دونوں کے کپڑے لینے کا مسئلہ تو حل ہو جائے گا۔" نیلوفر نے لقمہ دیا تو نازو اور احمد زور زور سے ہنسنے لگے۔ اور شعیب منصور نے بھی ہنسی میں ان کا ساتھ دیا۔

"اچھا اگر یہی بات ہے تو پھر ہم سیزنل وزٹ پر ہی آیا کریں گے۔ یعنی سال میں دو مرتبہ، ایک بار گرمیوں میں اور دوسری بار سردیوں میں۔ نازو ہر موسم کا ایک ایک جوڑا کافی ہوگا نا ہمارے لیے۔" احمد نے ہنسی لینے کے بعد نازو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں پھر تو آپ جلدی سے پولیس لائن جوائن کر لیں کیونکہ پولیس والوں کو سال میں کل دو وردیاں ہی ملتی ہیں وہ بھی موسم گزر جانے کے بعد۔" شوہر کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے نازو نے کچھ اتنی سنجیدگی سے یہ بات کہی کہ ایک قہقہہ پڑا پھر دونوں ہنستے مسکراتے سب سے رخصت ہو کر اپنے گھر روانہ ہوئے تو زینت نے ہاتھ اٹھا کر ان کے سدا یونہی خوش و خرم رہنے کی دعا کی۔

بیٹی اور داماد کے جانے کے بعد نہا دھو کر اور تازہ دم ہو کر جب شعیب منصور اپنا پائپ سلگا کر بیڈ پر بیٹھے تو زینت بھی رات کا لباس تبدیل کر کے آ چکی تھیں۔ وہ اپنے آپ میں بڑی مگن تھیں۔

بیٹی کا مسرور خوبصورت اور چمکتا ہوا چہرہ بار بار ان کی نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ اور وہ خود کو خوشیوں کے جھولے میں جھولتا محسوس کر رہی تھیں۔

عجب کھویا کھویا پن سا ان پر طاری تھا۔ جو بیٹی کی ساس نندوں کا خیال آتے ہی اچانک ٹوٹ ٹوٹ جاتا۔ کیونکہ بیٹی کی گفتگو سے ہی ان کی نظر میں وہ بہت شریر اور فسادی معلوم ہوتی تھیں۔ لیکن پھر فوراً ہی داماد کی نیک، سادہ فطرت، خوش مزاجی اور بیٹی سے اس کی محبت کا خیال آتا تو وہ پھر خوش کن خیالات میں گم ہو جاتیں۔ اور کھلی آنکھوں سے بیٹی کی مسرور اور شادمان زندگی کے خواب دیکھنے لگتیں۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" آخر شعیب منصور نے انھیں اس قدر گم صم سا دیکھ کر پوچھا۔

"ہائیں کچھ بھی نہیں۔" وہ اپنی محویت سے بری طرح چونک کر بولیں۔

"نہیں خیر کچھ تو سوچ رہی ہو۔" شعیب منصور نے ان کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"بس کیا، اپنی نازو کے بارے میں ہی سوچ رہی ہوں۔ اللہ اسے نظر بد سے بچائے شادی کے بعد کیسی نکھر آئی ہے۔ جسم پر تھوڑا سا پانی بھی پھر گیا۔ اور صحت تو ماشاءاللہ اتنی اچھی ہو رہی ہے کہ نظر لگ جانے کے ڈر سے میں نے نگاہ بھر کر اسے دیکھا بھی نہیں۔"

"کمال ہے تم نے تو اسے جنم دیا ہے اس کی ماں ہو پھر بھلا اسے تمہاری نظر لگ سکتی تھی۔" شعیب منصور ہنستے ہوئے لہجے میں بولے۔

"نہیں یہ تو نہ کہیے، نظر سب سے پہلے اپنوں کی ہی لگتی ہے۔ اور میری تو بیٹی ہے بھی ماشاءاللہ حسین۔"

"ہاں، خدا اسے ہمیشہ خوش ہی رکھے۔" شعیب منصور نے جمائی لے کر کہا۔

"آپ نے بھی تو آج حد ہی کر دی۔ اتنی دیر سے آئے کہ وہ انتظار کرتے کرتے تھک گئی۔"

"ہاں کچھ مصروفیت ہی اتنی رہی آج کہ پورا دن ہی گزر گیا۔ وہ تو میں نازو کی وجہ سے جلدی ہی اٹھ آیا ورنہ نامعلوم کب گھر آنے کی مہلت ملتی۔" شعیب منصور نے مزید ایک لمبی جمائی لے کر اپنی تھکن کا احساس دلاتے ہوئے کہا۔

"اچھا، مگر ایسی کیا مصروفیت تھی آج کچھ مجھے بھی تو معلوم ہو۔" زینت نے پوچھا۔ انداز چبھتا سا تھا۔ شعیب منصور کو برا تو لگا مگر وہ واقعی بہت تھک گئے تھے اور انہیں جمائیوں پر جمائیاں آ رہی تھیں ورنہ اس انداز میں کیے سوال کے جواب میں وہ جھڑک کر یہی کہتے کہ میں کلب گانا سننے تو نہیں گیا تھا یا سارا دن عیاشی تو نہیں کرتا رہا تھا مگر انہوں نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

"بس وہ کچھ کاروباری معاملات طے کرنے تھے۔ سہ پہر کو اسی سلسلے میں میٹنگ بھی تھی اسی میں الجھا رہا۔" زینت جواب میں کچھ نہیں بولیں تکیہ درست کر کے لیٹ گئیں۔ شعیب منصور نے بھی لیٹنے کے ارادے سے کمر کے پیچھے سے تکیہ نکالا ابھی کوئی خیال آیا تو لیٹتے لیٹتے رک کر انہوں نے کہا۔

"عجیب اتفاق ہے آج میں اماں جان کی احوال پرسی کرنا بھی بھول گیا۔ لیکن بیٹی داماد آئے تھے تو تم نے کم از کم انہیں کھانے پر تو بلوا لیا ہوتا۔ اب تو وہ چلنے پھرنے کے قابل بھی ہو گئی ہیں۔"

"ہاں، قابل تو ہو گئی ہیں مگر انہیں پلنگ پر بیٹھ کر کھانا کھانے کا ربط سا پڑ گیا ہے اور پھر وہ تو سر شام ہی اپنا بستر کا کھانا کھا لیتی ہیں۔" زینت نے بڑی بیزاری سے کہا۔

"اچھا تو کیا تم نے بیٹی داماد کو ان سے ملوایا بھی نہیں؟" شعیب منصور نے ان کی بیزاری کا نوٹس لیے بغیر پوچھا۔

"نہیں، نازو تو خود جا کر انہیں سلام کر آئی تھی البتہ احمد نہیں جا سکا ان کے پاس۔" زینت کھردرے سے لہجے میں بولیں۔

"کیوں؟"

"اسے موقع ہی کہاں ملا۔ بیوی کو چھوڑنے آیا تھا تو میٹنگ میں جانے کی عجلت سوار تھی۔ تو چل میں آیا کے انداز میں اسے منانے جانے کے ساتھ سینڈوچ کھائے تھے اور نازو کو لینے آیا تھا تو آپ کے سامنے ہی آیا تھا۔" زینت شوہر کے ایک ہی

بات کے پیچھے پڑ جانے پر چڑ کر بولیں۔
"میرے سامنے بھی آیا تھا تو تم پر یہ لازم تھا کہ تم اسے اماں جان کے پاس لے جاتیں۔" شعیب منصور نے کہا۔
"ہاں، لازم تو تھا مگر اس کی خاطر تواضع میں کچھ خیال ہی نہیں رہا۔" زینت نے موضوع سے جان چھڑانے کو نفرت کرنے کے سے انداز میں کہا۔
"لیکن یہ تو کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ تمہیں کم از کم اماں جان کے رشتے کی نزاکت کا تو خیال رکھنا چاہیے تھا۔" شعیب منصور آج پھر ایک ہی موضوع کے پیچھے پڑ گئے تھے۔
"اگر ایسی ہی بات تھی تو آپ ہی خیال رکھ لیتے۔ ساری باتوں کا ذمہ دار مجھے ہی کیوں ٹھہراتے ہیں آخر آپ کی بھی تو کچھ ذمہ داریاں ہیں۔" زینت جل کر بولیں۔
"نہیں، ہماری ذمہ داری تو صرف یہی ہے کہ ہم آپ کو کما کر دیں اور اس بات کا خیال رکھیں کہ ہمارے ہوتے ہوئے آپ کو کوئی تکلیف نہ ہونے پائے ورنہ باقی جملہ خاص طور پر گھریلو معاملات کی ذمہ دار تو آپ ہی ہیں۔ اصل میں سوتیلی کا معاملہ ہے نا اس لیے آپ اس قدر تیہا دکھا رہی ہیں ورنہ سگی ساس کا معاملہ ہوتا تو آپ بھی اس لب و لہجے میں بات کرنے کی جرأت نہ کرتیں۔" شعیب منصور درشت سے لہجے میں بولے۔
"شکر ہے آج اصل حقیقت آپ کی زبان پر آ ہی گئی۔ یوں بھی لاکھ انسان چھپائے حقیقت کسی نہ کسی طرح اپنا آپ منوا کر ہی رہتی ہے۔" زینت طنز بھرے انداز میں ہنس کر بولیں۔
"کیسی حقیقت؟" شعیب منصور نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔
"یہی سگے اور سوتیلے کے فرق کی۔" زینت نے ایک زہر خندہ سے کہا۔
"لا حول ولا۔ کیسی گری ہوئی بات کرتی ہو۔ سوتیلی تو وہ تمہارے لیے ہیں ورنہ میں تو انہیں اپنی سگی ماں ہی کہتا ہوں۔" شعیب منصور بگڑے بگڑے انداز میں بولے۔
"ہاں ضرور، تبھی تو سگی اور سوتیلی کا لفظ آپ کی زبان پر آ گیا لیکن پلیز اب اس ذکر کو ختم کر دیں۔ میں آج اپنی بچی کو اس قدر شاداں اور فرحاں دیکھ کر بہت خوش ہوں۔ آپ خواہ مخواہ ہی میری خوشی میں کھنڈت ڈالنے کی کوشش نہ کیجیے۔" زینت زچ سی ہو کر سخت بیزاری سے بولیں۔
"خوش تو میں بھی ہوں کہ وہ میرے جگر کا ٹکڑا بھی ہے۔ مگر خوش ہونے کا مطلب یہ تو نہیں کہ اپنی ذمہ داریاں بھول جاؤں۔ اماں جان کو نہیں تو کم از کم تم نے سلوطہ کو ہی کھانے پر بلوا لیا ہوتا۔ آخر وہ مہمان کی حیثیت سے ہی تو آیا ہوا ہے۔" شعیب منصور نے ترش لہجے میں کہا۔
"او ہو تو یہ کہیے کہ یہ سارا قضیہ آپ نے سلوطہ کی وجہ سے کھڑا کیا ہے، ورنہ بھلا میں بھی تو کہوں کہ یہ آج آپ کے احساسات اماں جان کے لیے اتنے رقیق کیوں ہو رہے ہیں۔" زینت نے طنز بھرے لہجے میں قدرے معنی خیز سے کہا۔
"تم اگر یہی کچھ رہی ہو تو چلو یہی سہی۔ لیکن تمہیں اس سے ایسی پرخاش نہیں رکھنی چاہیے۔ وہ اگر تمہاری نند بھی ہے تو بھی ایک محترم پرسن کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور کیسے معلوم کہ فاخرہ نے کلائی موڈ سلوک اس بے چاری کے ساتھ ہے مگر تم تو صرف اس بات پر اس سے خار کھاتی ہو کہ وہ فاخرہ بی بی کی نند ہے۔"
شعیب منصور تیوری پر بل ڈال کر بولے تو زینت تلملا کر بیٹھی ہوئی بولیں۔
"کمال ہے آپ تو اس وقت عین بہ عین بڑی ساس نندوں کے انداز میں بات کر رہے ہیں۔ وہ بہر حال شعیب کسی طرف سے بھی نہیں لگ رہے ورنہ آپ بھی سوچیے مجھے اس بے چاری سے خود وہ لڑکی ہے کیا پرخاش ہو سکتی ہے۔ کچھ اتنی سرد مہری فطرت کی مالک ہے کہ پانچ ماہ سے یہاں رہ رہی ہے مگر کسی سے کھل مل ہی نہیں۔"
"کھلی ملی نہیں تو اس کا سبب خود تمہارا استغنا ہے ورنہ ہمیں تو ہو سکتا ہے تم اس سے خلوص و اپنائیت سے [illegible]"
"ہو ہونہہ۔ جیسے ساری دنیا میں صرف میں ایک ہی فاختہ رہ گئی ہوں نا میرے غیروں پر خلوص اپنائیت کے خزانے لٹانے کے لیے جبکہ آپ کی نظر میں خود میری یہ حیثیت ہے کہ مجھے معتبر سمجھتے ہیں نہ کسی قابل ہی۔ بہن تو خیر بہت ہی بلند مرتبہ [illegible] ملیں لیکن بہن کی نند کی باتیں بھی مجھ سے چھپاتے ہیں جس سے آپ کی کوئی رشتہ داری ہے نہ تعلق۔ لیکن آپ لاکھ چھپائیں ۔۔۔ میں بھی بہت کچھ جانتی ہوں۔ سمجھے آپ۔" زینت ان کی بات کاٹ کر نہایت تیز و تند لہجے میں بولیں۔

"اچھا، تو خیر کیا جانتی ہیں آپ۔ کچھ مجھے بھی تو معلوم ہو۔" شعیب منصور نے ان کے تلملانے پر مسکرا کر پوچھا۔
"کیوں میں آپ کو کیوں بتاؤں جبکہ آپ تو ہر بات مجھ سے چھپاتے ہیں۔" زینت چمک کر بولیں۔
"تم اتنا طویل عرصہ میرے ساتھ گزار کر بھی میری فطرت اور مزاج کو نہیں سمجھ سکیں۔ ورنہ میری عادت ہے کہ میں کسی کی پرسنل سیکرٹ باتوں کو اچھالنے کا عادی ہوں نہ ڈھنڈورا پیٹنے کا، خاص طور پر ایسی بات جس کا میری یا تمہاری ذات سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ سنو زینت، اللہ تعالیٰ نے بندے کو نیکی اور بدی کی راہوں کا تعین کرنے کا اختیار دینے کے ساتھ ساتھ کچھ ذمہ داریاں بھی سونپی ہیں۔ جن میں سے ایک ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ دوسرے کے عیبوں اور رازوں پر پردہ ڈھکے رکھے اس میں جہاں قدرت کی ایک مصلحت پوشیدہ ہے وہاں خود انسان کے لیے بھی ایک بہتری اور بھلائی ہے۔ لیکن تم نے جو معلومات حاصل کی ہیں ظاہر ہے دوسروں سے ہی کی ہیں۔ اور دوسرے جو بات بھی کہتے ہیں رائی کا پہاڑ بنا کر ہی کہتے ہیں۔ اسی خیال سے میں معلوم کرنا چاہ رہا تھا کہ تم کو کیا بتایا گیا ہے ورنہ مجھے معلوم کرنے کی ایسی جستجو بھی نہیں ہے۔"
شعیب منصور نے بہت تدبر اور رسانیت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ زینت بھی ان کی فطرت اور مزاج سے بخوبی واقف تھیں کہ وہ غلط بیانی سے کام نہیں لیتے۔ کچھ دیر تک تو ایک گومگو سی کیفیت میں رہیں کہ کہیں یا نہ کہیں پھر کچھ دیر تک سوچنے کے بعد انہوں نے کہا۔
"خیر جستجو تو اس لیے نہیں ہے کہ آپ سب کچھ جانتے ہیں۔ مگر میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ جب خود اس نے سلوطہ کو دھکے دے کر گھر سے نکال دیا تھا تو پھر اسے اغوا کرانے کی کوشش کیوں کی؟"
"میں۔ کس نے دھکے دے کر گھر سے نکال دیا تھا اور کس نے اغوا کرانے کی کوشش کی؟ یہ تم کیا اوٹ پٹانگ بول رہی ہو؟" شعیب منصور بیوی کی بات پر اچھل سے پڑے۔
"اب اتنے بھولے بھی نہیں ہیں آپ۔ سب کچھ جانتے ہیں مگر ظاہر ایسا کر رہے ہیں جیسے [illegible]"
"نہیں، واللہ، مجھے تو تمہارے منہ سے ایسی خرافات سننے کا پہلی بار ہی اتفاق ہو رہا ہے۔" شعیب منصور نے جس انداز میں یقین دہانی کرائی زینت کو بھی ان کی فطرت کے بموجب یقین کرنا ہی پڑا۔
"اچھا تو واقعی آپ کو کچھ نہیں معلوم۔ تو پھر کسی بدخواہ نے یونہی بے پر کی اڑائی ہوگی۔" وہ بھی اسی خیال سے کہ ایک غلط بات پر خوامخواہ ان سے لڑنے بیٹھ جائیں بات کو ٹالتی ہوئی بولیں۔
"اگر بعد میں اڑائی ہے تو کس نے اڑائی؟ کون تھا ایسی لغو باتیں کہنے والا؟" شعیب منصور کے چہرے کے تاثرات یک لخت بدل سے گئے۔ انہوں نے قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔
"بھئی اسے چھوڑیے منہ آئی باتیں، خواہ غلط ہو یا صحیح، کہنے والے بلا سوچے سمجھے کہہ دیتے ہیں۔ کہنے والے کی زبان تو کوئی نہیں پکڑ سکتا۔ وہ تو بیٹھے بٹھائے بے پر کی ہوائی کو بھی پھیلا دیتے ہیں۔"
زینت اب ان سے یہ تو نہیں کہہ سکتی تھیں کہ آپ کی فرسٹ کزن عالیہ آپا نے مجھے معلومات بہم پہنچائی ہیں پھر صحیح ہو [illegible] سسرال والوں سے بری بنتیں۔ شعیب منصور بھی سمجھ گئے تھے کہ انہوں نے بات بنائی ہے۔ وہ خود بھی اس ذکر سے بچنا چاہ رہے تھے۔ بات ٹالنے کی غرض سے بولے۔
"خیر واقعی کہتی ہو، کسی کی زبان کو کوئی نہیں پکڑ سکتا۔ لیکن یہ جو خرافات بھی تم نے سنی ہیں سراسر بہتان ہی ہیں۔ اس بے چاری کا معاملہ بالکل دوسرا ہی ہے جس میں اس کی ذات دور تک ملوث نہیں ہے۔"
"اچھا تو وہ دوسرا معاملہ کیا تھا؟" زینت نے حد درجہ متجسس ہو کر پوچھا۔
"کس طرح تو معلوم نہیں شاید پرانی عداوت کا کوئی چکر تھا۔ اب وہ یہ تو کسی کو بتانے سے رہے تھے کہ ان کے بہنوئی نے ایک [illegible] کر لینے کے دشمن پیدا کر لیے تھے۔"
"کمال ہے ایمان سے آپ جیسا شوہر شاید ہی کوئی ہو۔ بیوی تو زندگی کی رفیق اور رازدان ہوتی ہے۔ مگر آپ نے مجھے بیوی کہا ہی کب۔ خیر [illegible] تو مجھے بھی معلوم ہے کہ کوئی مقدمہ چل رہا تھا جو وہ ہار گئے تھے اور لوگ کوٹھی بیچ کر بیوی کو لے کر [illegible] ملک سے باہر چلے گئے اور بے چاری اس بچی کو یہاں بھیج دیا۔ ورنہ بھلا میں بھی کہوں کہ عاقب اور [illegible] تنازل کر گئے [illegible] جبکہ آج تک یہ بے چارے پاکستان کے ٹور پر تو جا نہیں سکے۔"

"کوثر! ذرا میرے لیے ایک پان تو بنا لاؤ۔ سوپ پینے سے منہ کا مزا خراب ہو گیا ہے۔ بس تم پان پر کتھا اور چونا لگا دو،
چھالیہ اور زردہ تو میرے بٹوے میں موجود ہے۔ جاؤ بیٹی شاباش خدا تمہاری عمر دراز کرے۔" صاف ظاہر تھا کہ پان کا بہانہ کر کے
انہوں نے کوثر کو ٹالا تھا۔ کوثر کے جاتے ہی اس نے کہا۔
"اماں جان! یہ جو آپ بزرگوں کے پاس دعاؤں کی صورت میں ایک مسکہ پالش ہوتا ہے نا اس کا اگر غور سے تجزیہ کر کے
دیکھیں تو وہ فوراً ہی آپ کے سامنے گھٹنے ٹیک دے۔ جب کہ یہ بے چاری کوثر تو ہے ہی بہت بھولی اور معصوم۔"
"ہے اگر بھولی اور معصوم بھی ہے تو دیکھ لو آج کل کی رفتار زمانہ۔ فوراً ہی سمجھ گئی کہ تم کس کو اپنی کا تنگ سمجھ رہے ہو۔ میں
نے اسی لیے تو اسے یہاں سے ٹالا ہے کہ تم نے کچھ اور الٹی سیدھی ہانک دی تو سلوطی کی پوزیشن ان لوگوں کی نظروں میں کیا باقی
نہیں رہے گی۔" سلمیٰ بیگم نے کہا۔

"اور کوثر کی تو آپ لوگوں نے خود ہی نہیں رکھی۔ ہماری ممی صاحبہ انہیں حقیر اور کمتر سمجھتی ہیں تو آپ نے اپنی خدمتوں
کے انہیں بے داموں کی لونڈی بنا لیا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ چچی جان بھی نہیں، اسی مقصد سے یہاں لے کر آئی ہیں کہ خوب ان سے
کام لیں۔ تو پھر میرے کچھ کہنے سے ان کی رہی سہی عزت میں ایسا کون سا بٹہ لگ جائے گا۔" اس کے منہ سے ایسے ثقیل الفاظ سن کر
سلمیٰ بیگم نے پل بھر کو اسے تعجب سے دیکھا اور بولیں۔
"نہیں، نہیں جہاں تک چھوٹی دلہن کا تعلق ہے وہ بہت ہی نفیس اور مخلص طبیعت کی مالک ہیں۔ انہوں نے سلوطی سے
خود کوئی کام نہیں لیا بلکہ خود سلوطی نے زبردستی کر کر کے ان کا ہاتھ بٹایا ہے۔ رہ گئیں میری لخت جگر تو وہ گواہ ہے کہ انہوں نے بھی اسے کام کے
لیے کبھی مجبور نہیں کیا ہے اور ایمان کی بات تو یہ ہے کہ تمہاری ماں بھی اس سے کوئی کام نہیں لیتیں۔"
"ارے چھوڑیں اماں جان مجھی جان کے بارے میں تو نہیں کہہ سکتا لیکن ممی جس طرح ان سے پیش آتی ہیں سچ کہتا ہوں
اگر میں سلوطی کی جگہ ہوتا تو ایک دن بھی ان کے گھر میں نہ رہتا۔ پتا نہیں کیوں اتنی خوار ہو کر رہ رہی ہیں۔ چلی کیوں نہیں جاتیں۔"
وہ کڑوا سا منہ بنا کر بولا۔
"مگر جائے تو کہاں جائے وہ بے چاری۔ تمہاری پھپھو اور پھوپھا تو اسے یہاں بھیج کر بھول ہی گئے ہیں کہ ایک بڑی ذمہ داری
اور بھی ہے ان کے سر پر۔" سلمیٰ بیگم سلوطی کی ہمدردی سے لبریز دل کے ساتھ بولیں۔ دل تو چاہا کہ اس کی مجبوری اور قصور سے بھرے
حالات سے جن سے واقف نہیں ہو سکے تو آگاہ کر دیں لیکن سلوطی سے وعدہ کر چکی تھیں اور پھر کسی کا راز افشا کرنا ان کی عادت نہ
تھی۔ اس لیے یہی کہہ سکیں۔
"تو کیا اور سارے رشتے دم کھپ گئے ہیں ان کے؟" وہ تلخ لہجے میں بولا۔
"ارے جب اپنے سگے بھائی بھاوج کو ہی اس کی پروا نہیں تو دوسرے رشتے داروں کو کیا دکھ ہو گا اس کا۔ اور جہاں
تک مجھے معلوم ہے سگا رشتے دار تو کوئی ہے ہی نہیں۔ لیکن بیٹے، تم پر ایسا کون سا بوجھ ہے اس کا۔ اگر تمہارے دو روٹیاں کھاتی
بھی ہے تو بدلے میں ہاتھ پیر ہلاتی ہے مفت میں نہیں کھاتی۔ تمہارے گھر کے بہت سے کام بھی تو کر دیتی ہے۔" سلمیٰ بیگم نے کہا۔
"توبہ! یہی تو مجھے پسند نہیں۔ یہ ان کا خود کو اس قدر گرا کر رہنا۔ بلکہ میں تو چاہتا ہوں کہ وہ اپنی کوئی حیثیت بنا کر رہیں۔ وقت
دوسروں کی خدمت کر کے نہ گزاریں بلکہ اپنی تعلیم مکمل کر لیں۔" وہ اپنے دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر مار کر بولا تو سلمیٰ بیگم کچھ دیر تک
غور سے اس کی شکل دیکھتی رہیں۔ پھر بولیں۔
"ایک بات پوچھوں منے؟"
"ضرور پوچھیے۔"
"کہیں تم۔۔۔ کہیں تم۔۔۔؟"
"لیجیے یہ کیا بات ہوئی۔ کہیں تم کہیں تم۔ میں تو اصل میں اس وقت بڑے خوشگوار موڈ میں یہاں آیا تھا۔" وہ بھی سمجھ گیا
کہ وہ کیا پوچھنا چاہ رہی ہیں۔ اس نے نہایت خوبصورتی سے بات گھما دی۔
"کیوں خیر تو ہے؟" سلمیٰ بیگم بیچ میں وہ سوال بھول گئیں جو وہ اس سے کرنا چاہ رہی تھیں۔ انہوں نے متجسس انداز
میں اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔
"مجھے یہاں آتے ہی کسی سے اطلاع ملی کہ آپ یہاں مستقل طور پر ڈیرے خیمے ڈالنے کی غرض سے آئی ہیں تو میرا خون

کھول کر رہ گیا۔"
"ہائیں ہائیں منے۔ تمہارے منہ میں تو زبان نہیں تھی، پھر یہ مشین گن کی گولیوں کی بوچھاڑ کہاں سے ہونے لگی۔ کیا
تمہاری نظر میں اب اس بڑھیا دادی کی کوئی وقعت ہی نہیں رہی؟" سلمیٰ بیگم نے نرم لہجے میں ملامت کی تو وہ بولا۔
"اچھا تو پھر حضور اماں جان قبلہ بہت معتبر ذرائع سے یہ بات اس عاجز کے علم میں آئی ہے کہ آپ کی ذات بابرکات
گل بہار کو خیرباد کہہ کر انگور میں مستقل طور پر قدم رنجہ فرمانے کی غرض سے آئی ہے۔" اس نے بہت سوچ سوچ کر اور چبا چبا کر
یہ بات کہی تو اس کے قدم رنجہ فرمانا کہنے پر سلمیٰ بیگم کو ہنسی آ گئی۔
"واہ یوں نہیں تو یوں۔ ایسے میں کہتی ہوں تجھے اتنی باتیں بنانی کیسے آ گئیں؟"
"یہ میری بات کا جواب تو نہیں اماں جان؟" وہ ایک دم ہی سنجیدہ ہو کر بولا۔
"جواب کیا دوں۔ میاں بیوی اور دونوں بیٹیوں کی میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں کہ یہاں آ کر رہوں۔ چھوٹی دلہن کا کہنا ہے کہ
بزرگوں کے دم سے دل کو بڑی ڈھارس رہتی ہے۔ سہیل کہتے ہیں کہ انہیں بھی خدمت کا موقع دوں، اور بچیاں خدا انہیں عمر دے
جب سے یہاں آئی ہوں رات کو سوتی بھی میرے پاس ہی ہیں۔ کبھی سوپ لا رہی ہے، کبھی چائے اور کبھی دودھ۔ اب
سوچتی ہوں کہ اتنی ساری محبتوں کو کیسے ٹھکرا دوں۔ مگر دل نہیں مانتا تھا۔ تجھے چھوڑ کر کہیں رہنے کو۔ اب زندگی رہ ہی کتنی
گئی ہے جو تجھ سے دور رہ کر گزار دوں۔ تو اگر گھر میں نہیں رہتا تب بھی مجھے یہ انتظار تو رہتا ہے کہ تو کسی وقت بھی آ جائے گا۔
بیٹا۔ وہ جو کہتے ہیں نا کہ بیٹے سے زیادہ پوتا پیارا ہوتا ہے تو کچھ غلط نہیں کہتے۔" سلمیٰ بیگم نے سمجھانے کے سے انداز میں ضرور
کہا تھا مگر ان کا لہجہ آزردہ اور دلگیر تھا جو ذرا دیر کے لیے اس کے دل پر اثر انداز ہوا اور وہ کچھ دیر تک تو ہونٹ بھینچے خاموش
بیٹھا رہا پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔
"ہوں چچی جان خوش قسمت اور کھلے دل کی مالک ہیں جو بزرگوں کی اہمیت کا احساس رکھتی ہیں لیکن میری ماں
ذہنی پسماندگی کا شکار ہیں۔ پھر بھی دل کی بری نہیں ہیں اور آپ سے انہیں سوتیلے پن کی وجہ سے پرخاش نہیں ہے بلکہ میری
وجہ سے ہے۔"
"ہائیں تمہاری وجہ سے۔ وہ کیوں؟" سلمیٰ بیگم نے چونکتے ہوئے پوچھا۔
"وہ اس لیے کہ ممی کو اس کا بہت ملال ہے بلکہ وہ ڈیڈی سے سخت شاکی بھی رہتی ہیں کہ انہوں نے مجھے بچپن ہی میں آپ
کو کیوں سونپ دیا تھا۔ بھلا دیکھیے ان کا خیال ہے کہ میں انہیں اپنی ماں نہیں سمجھتا حالانکہ ان کا اکلوتا بیٹا ہو کر ان کے لیے
غیر کیا ہوا ہوں۔ کیونکہ ان کے خیال میں آپ نے مجھ پر اپنی مامتا نچھاور کر کے مجھے ان سے منحرف کر دیا ہے۔ سچ اماں جان
کبھی کبھی تو مجھے سخت کوفت ہوتی ہے اور کبھی ہنسی بھی آتی ہے ان کے ایسے بے بنیاد خیالات پر۔"
"مگر کوفت کھانے یا ہنسنے کی کیا بات ہے بیٹا۔ تم اپنے رویے اور سلوک سے ان کے یہ خیالات بدلنے کی کوشش کرو۔ یوں بھی ماں
کو ناخوش رکھنا گناہ ہے۔ دیکھو بیٹا میں نے گو کہ پالا پوسا ہے مگر جنم بھی تو اس نے ہی دیا تھا۔ اس کا تم پر بڑا حق ہے۔ میں تو اس کے مقابلے میں
کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتی۔ دو گھڑی ہوا کی زد پر رکھا ہوا چراغ ہوں۔ کسی وقت بھی ایک ہی جھونکے میں بجھ جاؤں گی تو پھر واسطہ تو
تمہیں اس سے ہی پڑے گا۔"
"وہ تو ٹھیک ہے اماں جان۔ مگر ممی کی طبیعت اور طور طریقے سے میری طبیعت میل ہی نہیں کھاتی۔ اس پر میرے اور ان کے
خیالات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ادھر ڈیڈی ہیں جو باپ کم، باپ کے دوست زیادہ لگتے ہیں کہ بات بھی کریں گے تو
اتنا ناپ تول کر جیسے کسی گہرے دوست یا برابر کے بیٹے سے مخاطب ہوں۔ ہمیشہ یہی آرزو کرتا رہا کہ مجھے سینے سے
لگائیں، چومیں، لپٹائیں۔ مگر ہمیشہ۔۔۔"
"کیسے ہو سکی!"
"یار غضب خدا کا ہمسری۔۔۔ ڈیڈی وہ ہیں آگے سے نہیں بڑھتے۔" اس نے باپ کی آواز بنا کر کہا۔
"ارے تو جب بیٹے جوان ہو جاتے ہیں منے تو برابر کی اولاد ہی سمجھے جاتے ہیں اور تم ان سے دور بھی تو رہتے ہو۔ قریب رہو گے
تو وہ بھی ٹھیک ہو جائیں گے۔" سلمیٰ بیگم دل ہی دل میں اس کی والدین کی طرف سے دی گئی محرومیوں پر کڑھ کر بولیں۔
"نہیں اماں جان۔ مجھے کسی کے ٹھیک ہونے کی تمنا نہیں۔ میں تو اب ان باتوں کا عادی ہو گیا ہوں۔ بہرحال

ایک دم ہی کھڑا ہو گیا۔

"معلوم ہے باتوں ہی باتوں میں ساڑھے سات بج گئے ہیں اماں جان۔ کیا آپ باہر نہیں چلیں گی؟" اُس نے دیوار پر آویزاں گھڑی میں وقت دیکھ کر کہا۔

"نہیں۔ بیکس پارٹی ہے۔ میں باہر جا کر کیا کروں گی۔ میں تو اب وضو کر کے عشا کی نماز پڑھوں گی۔ وقت ہو رہا ہے۔ البتہ تم ضرور چلے جاؤ ورنہ ابھی تھوڑی دیر میں تمہاری ڈھنڈیا مچ جائے گی۔" سلمیٰ بیگم نے کہا تو اُس نے "اچھا" کہنے کے بعد کہا۔

"میرے خیال میں تو نماز پڑھنے سے پہلے آپ کھانا کھا لیں۔ یوں بھی آپ سرِ شام ہی کھانے کی عادی ہیں۔"

"نہیں بیٹے۔ سہ پہر کو چائے کے ساتھ منہ جھٹال لیا تھا۔ اس پر سوپ پی لیا۔ ابھی تک سینے پر رکھا ہوا ہے سب کچھ۔" سلمیٰ بیگم آگے سرک کر چوکی سے پیر نیچے لٹکاتے ہوئے بولیں تو وہ چپ چاپ اُن کے کمرے سے نکل آیا۔

لیکن ابھی خواب گاہ کے آگے بنی آخری سیڑھی پر ہی آیا تھا کہ ڈبل پاٹ کی دُھلائی کی چادر پر آسمانی رنگ کا دوپٹہ سنبھالتی سلوطا ابھی کسی دُھن میں سیڑھیوں کی طرف بڑھی تو اُس پر نظر پڑتے ہی "اوہ" کی آواز کے ساتھ تین چار قدم پیچھے ہٹ گئی۔

وہ جو اُس کی تلاش میں سلمیٰ بیگم کے کمرے میں آیا تھا اور اُسے نہ پا کر بجھا بجھا سا دل لیے باہر نکلا تھا اُسے اچانک دیکھ کر خوشی سے بے قابو ہوتی دھڑکنوں کے ساتھ قدرے تیکھے لہجے میں بولا۔

"اب اس قدر بھی ہیبت ناک اور وحشت ناک نہیں ہوں کہ آپ مجھے دیکھ کر بے ہوش ہوتے ہوتے بچیں۔" مگر وہ بری طرح ڈر گئی تھی اور خوف سے اچھلتے دل کو قابو میں کرنے میں کوشاں تھی۔ اس سے جواب میں کچھ کہا بھی نہ جا سکا۔ بلکہ وہ بڑے ہنگامہ خیز انداز میں دانتوں میں ہونٹ بھینچے جب اُس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ وہ بھی سر سے پیر تک کچھ دیر اس پر نظر جمائے دیکھتا رہا۔ آسمانی رنگ کے تنگ پاجامہ سوٹ پر سفید نگینوں کا ہلکا سا آرٹیفیشل سیٹ پہنے۔ ہلکا ہلکا میک اپ کیے اپنے دلفریب وجود کے ساتھ آنکھوں کی راہ وہ اُسے دل میں اترتی لگی۔

"بہت تڑپایا ہے آپ نے مجھے پورے ڈیڑھ ماہ۔ ایک تو اپنا تقرر میرے ساتھ کر دیا اور خود مزے سے یہاں موج کرتی رہیں۔ بتائیے کیا سزا دوں میں اس کی آپ کو۔" وہ وہیں کھڑے ہو کر اپنی آنکھوں میں ایک وارفتہ سی چمک لیے بولا۔

وہ خود بھی تو اُس کے جانے سے کیسی بے چین اداس سی رہنے لگی تھی۔

کتنی ہی بار اُس کے دل نے مچل مچل کر تمنا کی تھی کہ کاش وہ واپس لوٹ آئے تاکہ ایک بار چپکے سے ہی اُسے دیکھ لے کہ وہ بھی اُسے کتنا اچھا اور اپنا اپنا سا لگنے لگا تھا۔ شاید اُسی کے ذریعے اس قدر عزیز ہو گیا تھا جس روز آنکھوں سے پٹی ہٹا کر اُس نے [illegible] غیض کے عالم میں پہلی بار اُسے دیکھا تھا۔

اور آج وہ اُس کے اتنے قریب کھڑا اُس سے کیا پوچھ رہا تھا؟

اُس کی آنکھوں میں یہ کیسی پُراسرار چمک تھی؟

کمزور لمحوں نے سلوطا جیسی ٹھوس طبیعت کی لڑکی کو بری طرح اپنی گرفت میں لے لیا۔

بس انہی کمزور لمحوں میں سے کوئی ایک لمحہ اُسے ڈگمگا ہی دینے والا تھا کہ غسل خانے میں سے آخ آخ کی آواز آئی۔ شاید سلمیٰ بیگم کھنکار کر گلا صاف کر رہی تھیں۔

تو وہ یوں چونکی جیسے بند پلکوں سے کوئی حسین خواب دیکھتے دیکھتے کسی شور شرابے یا دھمک سے یکلخت انسان کی آنکھ کھل جاتی ہے اور آنکھ کھلتے ہی وہ خوبصورت سپنا نقش بر آب کی طرح خیالات کی سرکش لہروں میں کہیں گُم ہو جاتا ہے۔

آنکھ کھل گئی تھی تو نزاکت کا احساس یک دم ہی جاگ اٹھا تھا۔

"مجھے ایسی باتیں بالکل پسند نہیں اسفند صاحب۔ پلیز آپ یہاں سے چلے جائیں۔ اگر اماں جان نے دیکھ لیا تو یہ آپ کے لیے نہیں لیکن میرے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہوگا۔" زبان سے تنبیہ کی اور چہرے سے جذبات کی [illegible]۔

اور ابھی ابھی اُس کی آنکھوں میں بھی تو وہ جذبے کی تصدیق کرنے والے سارے عکس دیکھ چکا تھا۔ پھر اس زبان پر کیسے یقین کر لیتا جو نزاکتوں اور احتیاطوں کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔ اور جو چچی کے گھر کا رخ کرتے ہوئے کترا رہی ہیں [illegible]

اگر وہ اپنے چچا کے پاس گئی ہوئی ہے اُس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اسپیڈ کے تمام سابقہ ریکارڈ توڑ کر کسی طرح اس تک پہنچ جائے۔ اسی وجہ سے تو وہ اس قدر گم صم سا نظر آ رہا تھا۔ ماں باپ کے مابین جو باتیں ہوئی تھیں اسی انبساط اور اشتیاق میں وہ بھی ڈھنگ سے نہ سُن سکا تھا۔ اس پر مستزاد چچا کے ہاں آ کر بھی کافی دیر تک انتظار کی سولی پر لٹکا رہا۔ اس پر وہ کہہ رہی تھی کہ چلے جاؤ۔

مگر کیسے اور کس دل سے جاتا وہ؟

جب کہ جی تو چاہ رہا تھا کہ اُسے کھینچ کر کسی ایسی جگہ لے جائے جہاں کسی کے آنے کا احتمال ہو نہ دیکھ لیے جانے کا دھڑکا۔

دل میں دبی تشنگی اور نگاہوں میں دبی وارفتگی تک، جو اُس کی نزاکتوں اور اندیشوں بلکہ رسوائی کے احساس سے متغیر ہوتے چہرے پر جمی تھیں۔ وہ خود بھی تو اپنے جذبے کی تشہیر نہیں چاہتا تھا۔ وہ اُس کی زبان جیسی نوکیلی [illegible] رفیق، ہمدرد اور ہمراز ہستی کے سامنے بھی نہیں۔

"ٹھیک ہے چلا تو جاتا ہوں مگر صرف ایک شرط پر۔" اُس کی آنکھوں کی وارفتہ سی چمک کچھ سوا ہو گئی۔ مگر اُس کی نگاہیں تو غسل خانے کے دروازے پر لگی تھیں۔

"کک۔ کیسی شرط؟" اُس نے بدستور دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے بوکھلاتے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"بشرطیکہ آپ ایمان داری سے کام لیں گی۔" اُس نے یہ کہہ کر گویا اُس کی بوکھلاہٹ میں مزید اضافہ کیا۔

"اچھا اچھا آپ بتائیے تو سہی۔ میں آپ کی ہر شرط ماننے کو تیار ہوں۔" اندر غسل خانے میں پانی گرنے کی آواز بند ہو گئی تھی اس لیے اُس نے بے چینی سی آواز میں کہا۔

"اچھا تو صرف اتنا بتا دیجیے کہ میں آپ کو کیسا لگتا ہوں لیکن پوری صداقت کے ساتھ۔"

اس سوال پر اتنی سراسیمگی کے عالم میں بھی اُس کے پھیکے پھیکے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔

"بہت اچھے — بے حد ڈیسنٹ!" اُس نے پست سی آواز میں کہا۔ یوں بھی سلمیٰ بیگم کے غسل خانے سے برآمد ہونے کا کسی لمحے بھی امکان تھا۔ اس خدشے کے پیشِ نظر بلا سوچے سمجھے وہ اُس کی ہر شرط ماننے پر تیار ہو گئی تھی۔

"بہت اچھے۔ بے حد ڈیسنٹ سے کیا مراد ہے آپ کی؟ اچھے اور ڈیسنٹ تو بڈھے اور چیچک زدہ بھی ہوں گے آپ کی نظر میں۔ اب اپنے سوال کی وضاحت کرنے بیٹھوں گا تو یقیناً اماں جان باہر آ جائیں گی۔" اُس نے چڑ کر اُسے اماں جان کا ذکر دیا۔ وہ جس کی نظریں برابر غسل خانے کے دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ اس نے اندر کا لاک کھلنے کی آواز بھی سُن لی تھی۔ انتہائی عجلت، گھبراہٹ اور بے چارگی کی ملی جلی کیفیت میں بولی۔

"وہ... وہ... فور گوڈ سیک۔ اسفند صاحب آپ پلیز چلے جائیے۔ میں اس وقت کچھ بھی بتانے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔"

"نہیں۔ میں اپنے سوال کا جواب لیے بغیر تو جانے کا نہیں۔ خواہ اماں جان کے علاوہ بھی کوئی یہاں آ جائے۔" وہ اُس کی بے چارگی سے فائدہ اٹھا کر مٹیلے سے لہجے میں بولا۔ مگر آواز اس کی دھیمی ہی تھی۔

"اچھا۔ اچھا۔ یو آر ویری ویری لولی۔ آئی سویر آن گاڈ۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ آپ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ بہت پیارے ہیں۔ دنیا بھر سے زیادہ عزیز۔" اُس نے اعتراف بھی کیا تو جیسے گن پوائنٹ پر کھڑے ہو کر۔ اُس کے دل نے بھی پورے یقین کے ساتھ تسلیم نہیں [illegible] وہ کمرے کے داخلی دروازے کی طرف کھسک کر بولا۔

"اور تھینک یو فور دا کمپلیمنٹ لیکن اگر اس قدر عزیز ہوں تو آج ڈیڑھ ماہ بعد موقع فراہم کر کے مجھ سے علیحدگی میں ملیے گا اب کبھی۔" اُف غسل خانے کے دروازے کا ہینڈل گھومنے لگا تھا۔ اُس کی جان جیسے سولی پر لٹک کر رہ گئی۔

"مل لوں گی، بلکہ وعدہ کرتی ہوں۔ للہ اب تو چلے جائیے۔" وہ رو دینے کے سے انداز میں بولی۔ تب کہیں جا کر وہ غسل خانے کا دروازہ کھلنے اور سلمیٰ بیگم کے کمرے میں قدم رکھنے سے پہلے [illegible]

وہ اُس کے جاتے ہی جلدی سے دروازے کے پاس سے ہٹ کر پس عجلت میں اُن کے بستر تک آ گئی تھی۔

"خیر تو ہے۔" پسینے سے تر پیشانی اور پریشان سی رنگت اڑی صورت لیے لڑکھڑاتے انداز اور ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ سلمیٰ بیگم کی جہاں دیدہ نظروں سے اُس کی یہ اتھل پتھل سی کیفیت چھپی نہ رہ سکی۔ کچھ دیر تک غسل خانے کے دروازے کے آگے ساکت سی کھڑی رہ کر انہوں نے پوچھا۔

"کیوں، خیر تو ہے سلوطہ!" ان کے لہجے میں تشویش نہیں کھنک سی تھی جیسے وہ اس حالت کے پیشِ نظر مسرور ہو رہی ہوں۔

"وہ بس اماں جان... نہ معلوم کیوں، ایک دم ہی تھکن کا احساس ہونے لگا۔ اس لیے یہاں آ گئی۔ آج کل گرمی بھی تو بہت پڑ رہی ہے۔" وہ ان کے بستر پر لیٹ کر ان کی نظروں سے اپنی منتشر سی کیفیت چھپانے کی غرض سے چہرہ اونچا کر کے دوپٹے کے آنچل سے اپنی گردن کو ہوا دینے لگی۔ حالانکہ چھت کا پنکھا فل اسپیڈ سے چل رہا تھا۔ سلمیٰ بیگم دوسرے کونے میں رکھی نماز کی چوکی کی طرف بڑھنے کے بجائے اس کے قریب آ گئیں۔

"مگر تم کس سے باتیں کر رہی تھیں بیٹی؟" اب اسے کیا معلوم تھا کہ اس کے لاکھ چھپانے اور احتیاط کرنے کے باوجود وہ اسفند کی ایک جھلک دیکھ چکی تھیں۔ اس نے اپنی دانست میں ان کی لاعلمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"کک کسی سے بھی نہیں اماں جان۔ وہ تو میں خود ہی گرمی کو برا بھلا کہہ رہی تھی۔" سلمیٰ بیگم چند ثانیے بڑی گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہیں۔ کیونکہ آنچل سے گردن اور چہرے کو ہوا دیتے ہاتھ ان کے اس سوال پر خود بخود رک گئے تھے اور چہرہ بھی ان کی طرف مڑ گیا تھا۔ مگر ان کے دیکھنے کے انداز پر اس نے پھر چہرہ اونچا کر کے گویا بڑے لطف سے ہوا لینا شروع کر دیا۔ سلمیٰ بیگم بھی پلٹیں اور گھوم کر نماز کی چوکی کی طرف بڑھ گئیں۔

"چھوٹی دلہن نے تمہیں کتنا منع بھی کیا تھا مگر تم مانتی ہی نہیں۔ بھلا اتنا کام کرنے کی کیا ضرورت تھی جو تھک گئیں۔ خیر تھوڑی دیر کے لیے میرے بستر پر لیٹ کر سستا لو۔ تھکن خود بخود دور ہو جائے گی۔" سلمیٰ بیگم نے چوکی پر بچھی جا نماز پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ مگر ان کا لہجہ خالی خالی سا تھا۔

"جی، اچھا اماں جان!" سلوطہ نہایت تابعداری سے بولی اور بیڈ کی پائنتی کی طرف آڑی ہو کر لیٹ گئی۔

اسفند نے کیا کہا تھا اور اس نے کیا جواب دیا تھا۔ اسے کچھ بھی یاد نہیں رہا تھا۔

کچھ سچویشن ہی ایسی تھی کہ اوسان خطا ہو گئے تھے۔

اب تک اپنے منتشر سے حواسوں کو یکجا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔

مگر تھوڑی دیر سے آنکھیں بند کرنے سے تھوڑا سا ذہنی سکون نصیب ہوا تو ہر بات یاد آ گئی۔

"اُف کس قدر ہٹ دھرم اور غیر محتاط سا انسان ہے یہ اسفند بھی کہ دوسرے کی عزت کا بھی خیال نہیں۔ یہ لڑکی خواہ مخواہ میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔ گویا زبردستی کا سودا ہوا یہ تو۔ ورنہ میں تو — میں تو —

"نہیں نہیں۔ میں غلط بیانی سے کبھی کام نہیں لوں گی اسفند۔ میں واقعی تمہیں دل سے پسند کرتی ہوں۔ مگر یہ میری اپنی مرضی اپنی خوشی کی بات ہے۔ بلکہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ مگر بہت عام سی بات بھی ہے کیونکہ عام طور پر لوگ ایک دوسرے کو پسند بھی ایک دوسرے کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہیں۔ یعنی ماں باپ، چچا، بہن بھائی، بیٹی بیٹا اور خالہ وغیرہ۔ سب رشتے رشتے داری ہوتے ہوئے بھی آپس کی پسندیدگی کے بل بوتے پر ہی استوار ہوتے ہیں اور کس قدر پاکیزہ اور مقدس ہو جاتے ہیں۔ مگر اپنی اور تمہاری پسندیدگی کو کیا نام دوں اسفند۔ تم نے مجھ سے اعتراف بھی کرا لیا تو بھلا کس طرح کہ میری مرضی نہیں مجبوری کو ڈھال بنا کر۔ اب تم اس انتظار اس امید میں ہو گے کہ میں اسی مجبوری کی حالت میں کیا اپنا وعدہ نبھاؤں گی۔ تم سے ڈنر کے بعد کسی علیحدہ گوشے میں ملوں گی۔

تو میرے نادان پرستار، میں مر کر بھی ایسا نہیں کروں گی۔

کیونکہ تمہاری آنکھیں تو تمہارے جنونی جذبے نے پٹ کر رکھی ہیں اور عقل ناکارہ۔ لیکن میری عقل کی آنکھیں بہت بینا سے بھی تیز ہیں۔"

اور پھر یہ حقیقی زندگی کا ایک لہولہان کر دینے والا اعتماد زار ہے۔

کوئی فلمی یا افسانوی سچویشن نہیں کہ ہیرو ایک شہر میں ہے اور ہیروئن کسی دوسرے شہر میں۔ رات کا پہر ہے۔ سارا جہاں محوِ خواب ہے۔

ادھر سے ہیرو صاحب کوئی فراقیہ گیت شروع کرتے ہیں تو دوسرے شہر سے کوسوں دور بیٹھی ہیروئن جواب کا رد دینے میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ پس منظر میں کانوں کے پردے پھاڑ دینے والا میوزک بھی بجتا ہے۔ پھر بھی محلے والوں کی بات تو درکنار گھر والوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ یوں لگتا ہے جیسے طبعی نہیں سب ابدی نیند سو رہے ہوں۔ اور بالا۔ دوران

عاشق و معشوق کا چھپ چھپ کر ملنا۔

کی تا، بکیوں میں عاشق دیوانوں اور سڑکوں پر لوٹ لہک کر بلکہ گلا پھاڑ کر موذیکی کے ساتھ گاتا، ناچتا اور تھرکتا۔

او بیار کوں اور سڑکوں پر...

تو کیا تم بھی کچھ ایسی ہی غیر حقیقی اور غیر معقول باتوں کی مجھ سے متوقع ہو سردار محمد اسفند۔

کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میں درد کے جلتے ہوئے صحرا کو عبور کرتے کرتے خود بھی صحرا کا ایک حصہ ایک جزو بن چکی ہوں۔

آبلہ پا ہی نہیں بلکہ سراپا آبلہ ہوں۔

میں نہیں اذیتوں سے گزر کر تلخ حقیقتوں کے پل صراط کو کس قدر جی جان سے کمر باندھ کر اپنے فگار پیروں سے عبور کرنا چاہ رہی ہوں۔

میرے پائے ثبات میں جنبش آ گئی تو وہ ڈگمگاؤں میں بہٹ کر انہی گہرائیوں میں جا گروں گی کہ کھیل کھیل ہو کر رہ جاؤں گی پھر کبھی باقی نہیں بچے گا۔ میری دھول بھی نہیں۔

نہیں نہیں اسفند۔ تم مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔

مجھ سے ایسی امیدیں اور توقعات وابستہ نہ کرو جو مجھے کہیں کا نہ رکھیں۔ میں بہت ہی دکھی ہوں۔ بے حد غم زدہ اور فگار ہوں۔

تم خدارا مجھ سے اپنی محبت واپس لے لو۔

خیالات کی رو میں جانے کہاں بہہ نکلی تھی وہ۔

بند آنکھوں کے باوجود آنسوؤں کا ریلا پلکوں کی رکاوٹیں توڑ کر بہہ نکلا تھا مگر اسے روکنا تو کجا پونچھنے کا خیال بھی نہ آیا۔

بس یوں ہی بیڈ کی پائنتی آڑی ترچھی بے دریغ یہ حزن و ملال کے موتی لٹاتی رہی۔

جانے کب تک اور کتنی دیر۔

سلمیٰ بیگم نوافل، نماز اور دعا سے فارغ ہوئیں تو اٹھ کر اس کے جاگ جانے کے خیال سے بہت آہستگی اور احتیاط سے بیڈ پر بیٹھیں تو بیڈ میں ہلکی سی لرزش پیدا ہونے کی وجہ سے اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اور سلمیٰ بیگم کو بیٹھا دیکھ کر جلدی سے خود بھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"اوہو، میں تو تمہارے خیال سے کہ تمہاری نیند ٹوٹ نہ جائے احتیاط سے بیٹھی تھی مگر بیدار ہی تھیں تم؟"

"نہیں، جی۔ سوئی تو نہیں تھی اماں جان۔ بس ذرا آنکھ لگ گئی تھی۔" وہ ان کی بات کاٹ کر بولی۔

"عام طور پر تو حشا کی نماز میں گیارہ رکعتیں ہی پڑھی جاتی ہیں۔ مگر بہت چند نماز پڑھتی ہوں۔ اور دو رکعتیں تحیۃ الوضو ان کے علاوہ پھر وظیفہ اور اس کے بعد دعا یعنی نماز، وظیفے اور دعا کا دورانیہ لگ بھگ سوا گھنٹے کا ہوتا ہے۔ اور اس دوران میں بھی تم نہیں سو سکیں۔ معلوم بھی ہے اس وقت کتنے بج رہے ہیں۔" تو سلمیٰ بیگم نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ عجیب سے انداز میں اسے وقت کا احساس دلایا تو اس نے چونک کر دیوار پر آویزاں وال کلاک کی طرف دیکھا۔ واقعی نو بج رہے تھے۔

"اوہو! واقعی کافی ٹائم گزر گیا اماں جان۔" اس نے متحیر سے انداز میں کہا۔

"ہاں اور اب تو تمہاری تھکن بھی دور ہو گئی ہو گی۔ جاؤ اب باہر چلی جاؤ۔ ورنہ تمہاری چھوٹی دلہن کیا سوچیں گی بھلا کہ تم وقت بے وقت کہاں غائب ہو گئیں۔" سلمیٰ بیگم نے گویا تو وہ بے دلی کا اظہار کرتی ہوئی بولی۔

"نہیں اماں جان! اب جانے سے کیا فائدہ۔ ڈنر تو کب کا ختم ہو چکا ہو گا۔ ویسے بھی میری ہمت نہیں ہو رہی کہیں جانے کی۔" تو اس نے ہمت کا لفظ کسی خاص وجہ سے نہیں بلکہ سلمندی کے اظہار کے طور پر استعمال کیا تھا مگر سلمیٰ بیگم نے اس کا کچھ اور ہی مطلب لیا۔

"ارے بیٹی! ہمت تو کبھی ہارنی ہی نہیں چاہیے۔ خواہ انسان پر کیسے سے کیسا کڑا وقت ہی کیوں نہ پڑ جائے۔ کیونکہ وقت تو دھوپ چھاؤں کی طرح ہوتا ہے۔ کبھی گرم اور کبھی نرم۔ ایک سا تو کبھی رہتا ہی نہیں۔ گویا یہ بھی زندگی کا ایک دائرہ کار ہے۔ برے وقت کا اچھا اور برا ہونا۔" سلمیٰ بیگم نے ہمت بندھانے کے انداز میں کہا۔

"لیکن اماں جان! میری تو شاید پیدائش ہی کسی بری ساعتوں میں ہوئی ہے۔ یوں بھی میرا ستارہ زحل ہے اور زحل تو عام طور پر نحس ہی خیال کیا جاتا ہے۔" وہ چہرہ موڑ کر دوپٹے کے آنچل میں اپنی آنکھوں کی نمی کو جذب کرتے ہوئے بولی۔

"ارے نہیں۔ یہ پڑھے لکھے جاہلوں کی باتیں ہیں بیٹی، ورنہ کوئی ستارہ بھی کسی کی قسمت میں رخنہ ڈالنے کا باعث نہیں بن سکتا۔" سلمیٰ بیگم نے گویا اس کے خیال کی تردید کی۔

"لیکن اماں جان — یہ نجومی وغیرہ جو ستاروں کا علم جانتے ہیں اور آپ کی ٹھیک ٹھیک باتیں بتاتے ہیں بلکہ جیسے زائچے وغیرہ دیتے ہیں کہ جن کے مطابق عمل کرنے سے ہر بات بالکل درست ثابت ہوتی ہے۔ یعنی کوئی نہ کوئی بات تو ہے اس علم میں۔"

"ہاں اگر ستاروں کے علم کے بارے میں پوچھتی ہو تو اس کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہے مگر صرف اس قدر کہ ہم نے چاند اور ستارے بنائے اور ان میں ایک علم رکھا سمجھنے والوں کے لیے۔ اور اگر کوئی ستارہ کسی کی زندگی پر اثر انداز بھی ہوتا ہے تو اس کی قسمت کو بدلنے اور بنانے کی قدرت بالکل نہیں رکھتا۔ یہ قدرت تو بس اس قادر مطلق ہی کو حاصل ہے جس کی ہم بندگی کرتے ہیں اور جو خالق کون و مکان ہے۔" سلمیٰ بیگم بولیں۔

"ہونہہ! خالق کون و مکان تو ہے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ مجھے پیدا کرنے کے بعد بالکل ہی بھول گیا یا پھر اس نے مجھے بالکل ہی ناکارہ اور بڑی بے سر و سامانی کی مٹی سے ڈھالا ہے۔"

"توبہ توبہ — نعوذ باللہ کیسی کفر کی باتیں کر رہی ہو تم — بیٹی خدا کی عظمت، وسعت اور قدرت کا کوئی شمار نہیں۔ انتہا۔ تم نے دیکھا نہیں بیٹی کہ کائنات کا قدرتی نظام کس قدر انضباط اور انصرام سے چل رہا ہے۔ ایک معمولی سی مثال لے لو کہ کبھی ایسا تو نہیں ہوا کہ سورج اپنی مرضی سے جب چاہے نکلا ہو اور چاند ستارے زمین پر آ گرے ہوں یا آپس میں ٹکرا گئے ہوں۔ چنانچہ وقت پر بھی اس قادر مطلق کی گرفت ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ یہ بھی ہے کہ وقت کو برا نہ کہو کیونکہ وقت بھی میری ذات اور حکم کے تابع ہے۔ اللہ معاف کرے مجھے حرف بہ حرف معنی تو یاد نہیں لیکن ان معنوں کا مطلب کچھ یہی ہے بیٹی۔ انسان جو ذرہ حقیر ہو کر بلا سوچے سمجھے اس ذات بزرگ و برتر کی شان میں اتنی بڑی بات کہہ کر اپنے گناہوں میں اضافہ ہی کرتا ہے۔ کا تو نعوذ باللہ کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ جیسے تم — اور یہ جو دو فرشتے کراماً کاتبین انسان کے پیدا ہوتے ہی اس کے دائیں بائیں تعینات کر دیے جاتے ہیں یہ انسان کی ایک ایک حرکت — ایک ایک بات — اس کی نیت — قول و فعل حتیٰ کہ عقائد اور خیالات تک کو ہمہ وقت رقم کرتے رہتے ہیں تاکہ بعد از رحلت انسان کی ہسٹری شیٹ کے طور پر اس کے سامنے پیش کریں۔ میرے تو اس تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ میری بھی ہر بات رقم کی جا رہی ہوگی۔ تو بیٹی نفس کی طرح زبان کو مار کر رکھنا چاہیے کیونکہ زبان انسان کی جتنی دشمن ہوتی ہے اتنا غنیم بھی نہیں ہوتا۔"

اُف ایک ذرا سی بات پر پورا لیکچر جھاڑ دیا تھا سلمیٰ بیگم نے کیونکہ وہ طویل پیرائے میں گفتگو کرنے کی عادی تھیں لیکن وہ ہمدرد اور نیک دل خاتون جو کچھ کہہ رہی تھیں اسے سمجھ کر کہہ رہی تھیں۔

"اللہ میری توبہ!" اس نے منہ ہی منہ میں اپنے معبود سے توبہ مانگی اور دل شکستہ سے لہجے میں بولی۔

"کیا کروں اماں جان۔ کچھ لوگوں کے ساتھ یہ ہوتا ہے کہ اگر ان کا ماضی تلخ اور تکلیف دہ ہوتا ہے تو وہ حال میں جی کر اس کا تصور سے بھی گریزاں رہتے ہیں۔ کبھی بھول کر بھی تلخ یادوں کو اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیتے۔ کیونکہ حال ان کی ماضی کی تمام تلخیوں اور کٹھنائیوں کی تلافی اور ازالہ کر دیتا ہے لیکن اماں جان میرا تو حال بھی ماضی ہی ہے اور شاید مستقبل بھی ہو۔ اگر آپ میری پیدائش سے لے کر اب تک کی بپتا سنیں نا تو — تو — خیر بیکار ہی ہوگا کچھ سنانا۔ کوئی ازالہ تو نہیں ہو سکے گا کسی بات کا۔"

"نہیں لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے بیٹی۔ اگر ازالے کی بات ہی کر رہی ہو تو — اور کچھ نہیں تو اپنے غم میں کسی کو شریک کر کے دل پر رکھا بوجھ بڑے سے بڑا بوجھ بھی ہلکا ہو جائے گا۔" سلمیٰ بیگم نے کچھ اور کہتے کہتے اتنی خوبصورتی سے بات بدلی تھی کہ اسے احساس تک نہ ہو سکا۔

"خیر کسی اور کا تو سوال ہی نہیں البتہ کبھی آپ کو ضرور سناؤں گی اپنی داستانِ رنج و الم۔ سچ آپ کے مشفق اور مہربان وجود سے کبھی کبھی مجھے ممتا کی مہک سی آنے لگتی ہے۔ تب دل میں ایک تمنا سی مچلتی ہے کہ اے کاش آپ میری سگی ماں ہوتیں۔"

"خیر سگی ماں تو بس نشے کی کیا اس کے باپ کی بھی نہیں ہوتی۔ مگر دیکھو نا تم مجھے اپنے بیٹے کی اولاد سے بھی زیادہ عزیز ہو اور وہ جو کہتے ہیں نا کہ بیٹے سے زیادہ پوتے کی ہوتی ہے تو سچ ہی کہتے ہیں۔ اصل میں ہر عورت ایک ماں کا دل اور اس میں ممتا کی تڑپ رکھتی ہے۔ اب مجھے ہی دیکھو۔ میری اپنی کوئی اولاد نہیں مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میرا دل بنجر زمین کی طرح سخت ہے اور اس میں ممتا کے جذبے کی کوئی رمق تک موجود نہیں۔ اب دیکھو میرا دل تو ممتا کے جذبے سے مالا مال ہے۔ جانے کیا مصلحت اور مرضی تھی اس ذات بے نیاز کی کہ اس نے مجھے بیٹے کی اولاد سے محروم ہی رکھا اور یہ لازوال دولت سینے میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔ وہ تو اگر میرا سہارا نہ ہوتا تو میں اسے اندر ہی اندر گھٹتے گھٹتے مر جاتی۔" اور سلمیٰ بیگم کے جواب پر اس کے دل کو جیسے دھچکا سا لگا۔

"ہاں تو آپ کی ممتا تو صرف آپ کے بیٹے کے بچوں ہی کے لیے وقف ہے نا اماں جان۔ اور میں بھی کتنی پاگل ہوں کہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی ایک انہونی کی تمنا کر بیٹھی۔"

"ارے نہیں میری بچی۔ میری ممتا میں بڑی وسعت ہے۔ تم بھی مجھے اولاد کی طرح ہی عزیز ہو مگر چونکہ ہمارا آپس میں کبھی ایک دوسرے سے واسطہ نہیں پڑا۔ نہ مجھے اپنی ممتا کو لٹانے کا موقع ملا اور نہ تمہیں اپنی اس منہ بولی ماں کو پرکھنے کی نوبت آئی۔ مگر تم بے شک مجھے اپنی سگی ماں ہی سمجھنا۔" سلمیٰ بیگم نے کہا۔ اور تبھی ان کا دل چاہا — اس سے ان آنسوؤں کا سبب پوچھیں جو وہ پونچھنے تک چھپکے چھپکے بہاتی رہی تھی اور جو پونچھنے کے باوجود اس کے رخساروں پر اپنا نشان چھوڑ گئے تھے۔ مگر وہ بے حد سلجھے ہوئے مزاج و طبیعت کی بڑی بردبار اور موقع شناس خاتون تھیں۔ خدا نے انہیں علم و ہنر کی دولت سے بھی مالا مال کر رکھا تھا۔ گو پرانے زمانے کی تھیں مگر اپنے علم اور ہنر والوں سے کی سادگی اختیار کرتی تھیں۔ پھر بھی پڑھی لکھی تو تھیں۔ جہاں دیدہ، تجربے کار اور دانشمند تھیں۔ بات بھی ایسی باوزن اور بے پناہ اثر کی کرتیں جو سیدھی دل میں اتر جاتی۔ اور یہ سب وہ اپنی علمیت اور قابلیت کے بل بوتے پر ہی تو کرتی تھیں۔ سلوطہ نے ایک ایسی بات کو جو ان کے علم میں آ چکی تھی۔ اپنی لاعلمی میں ان سے چھپایا تھا۔ اب وہ اس کی مجبوری یا بے ربط گفتگو سے ناجائز فائدہ تو اٹھانا نہیں چاہتی تھیں۔ فوراً ہی بات کو دوسری سمت موڑ کر بولیں۔

"ارے تو تو باقاعدہ باتیں ہی بنانے بیٹھ گئی۔ چلو اٹھو۔ اگر ڈنر ختم ہو گیا ہے تو کیا ہوا۔ گھر والے تو عموماً بعد میں ہی کھاتے ہیں۔ خوشی کے موقع پر کمرے میں بند ہو کر بیٹھنا کوئی مناسب بات تو نہیں۔ جاؤ شاباش۔" سلمیٰ بیگم نے آخری فقرہ اسے بچوں کی طرح پچکارتے ہوئے کہا تو بادل ناخواستہ اسے کہنا ہی پڑا۔

"جی بہتر ہے اماں جان!" اور پھر فوراً ہی اٹھ کر دوپٹہ قرینے سے اوڑھنے لگی۔

"دوپٹہ بعد میں ٹھیک کر لینا پہلے منہ پر دو چار چھپکے مار کر تھوڑا لپ اسٹک وغیرہ لگا لو۔ یہ اتری اتری صورت اور سوجی آنکھیں لے کر جاؤ گی تو سب کیا سوچیں گے۔ اصل میں زیادہ حساس انسان کو جذباتی بنا دیتا ہے۔ کہ ایک معمولی سی بات بھی دل کے آبگینوں کو ٹھیس لگا دیتی ہے اور وہ آنکھوں کی راہ چھلک پڑتے ہیں۔ ورنہ ایسا کیا کہہ دیا ہوگا کسی نے تمہیں؟"

"کک — کس نے اماں جان؟" اس نے فق ہوتی رنگت کے ساتھ ہچکی لینے کے سے انداز میں پوچھا۔ دل تو تھوڑا ہی ان کے ایک ذرا سے لفظ "کس نے" کہتے ہی کئی ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلنے لگا تھا۔ اس پر ان کے مشفق اور نورانی چہرے پر کھیلتی پُراسرار سی مسکراہٹ۔

"ہو۔ ہو۔ ہوتے تو کسی نے بھی کچھ نہیں کہا اور ابھی وہ اس قدر کہنے پائی تھی کہ تبھی شعیب، منصور، زینت اور شیلو فریت اندر آ گئے۔ تو اس نے موقع غنیمت جانا اور شعیب، منصور اور زینت کو سلام کر کے جلدی سے اس کمرے سے نکل آئی۔ حلیہ واقعی خراب ہو رہا تھا۔ حتیٰ کہ بال بھی بے ترتیب ہو گئے تھے اور وہ سب کے سامنے اس حلیے میں جا کر اپنا تماشہ نہیں بنوانا چاہتی تھی۔ اس لیے سیدھی کوثر کے کمرے میں چلی آئی جو بالائی منزل پر تھا۔

اتفاق سے کوثر اس وقت اپنے کمرے میں موجود تھی۔ اسے دیکھتے ہی بولی۔

"ارے اب کہاں غائب ہو گئی تھیں سلوطہ آپا۔ ممانی نے تو آپ کو ہر جگہ ڈھونڈ ڈالا ہے۔"

"لو بھئی کہاں غائب ہو سکتی تھی بھلا۔ اماں جان کے کمرے میں ہی تھی۔ شاید میری تلاش میں وہاں تک کسی نے جانے کی زحمت نہیں کی۔" اس نے جان کر اپنے لہجے کو شگفتہ بناتے ہوئے کہا۔

"اوہ۔ اچھا! اچھا سمجھ گئی۔ سمجھ گئی۔" کوثر نے ہنس کر معنی خیز سے انداز سے کہا۔

"بھئی کیا سمجھ گئیں تم۔ کچھ مجھے بھی تو سمجھاؤ۔" وہ اس کے ہنسنے پر قدرے الجھ کر بولی۔

"نہیں کچھ نہیں۔ وہ اماں جان کے کمرے میں آپ کے اس قدر جم کر بیٹھ جانے کو۔" کوثر نے بتا تو دیا مگر مقصد پھر بھی واضح نہ ہوا۔

"تم کچھ سمجھیں کیسا۔ تم کو تو معلوم ہی ہے کہ اماں جان جب بات کرنے پر آتی ہیں تو ان کا اسٹائل یہ ہے کہ بولے ہی چلی جاتی ہیں۔ مگر ان کی گفتگو بہت دلچسپ بلکہ کارآمد ہوتی ہے۔ بس میں بھی ان سے باتوں میں لگ گئی تھی۔" کوثر نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اپنی الماری کھول کر کوئی چیز تلاش کرنے لگی۔

"کیا میں تمہارا لپ اسٹک استعمال کر سکتی ہوں کوثر؟" اس نے پوچھا۔

"او یس۔" اور اجازت پاتے ہی وہ جلدی سے غسل خانے میں گھس گئی۔

جلد جلد ہی منہ کا تیل کھول کر منہ دھویا اور کنگھا بالوں پر پھیر کر باہر آئی تو کوثر کو اپنے انتظار میں کھڑا پایا۔

"بھئی وہ اصل میں اماں جان کے کمرے میں جو تمہارے آکا اور بھائی جان وغیرہ بیٹھے تھے اس لیے مجھے اپنا حلیہ درست کرنے یہاں آنا پڑا۔ یہ غالباً بلش آن ہے نا؟" وہ باتیں کرتے کرتے ڈریسنگ ٹیبل کے آگے جا کھڑی ہوئی تھی۔ اس پر بھی

ایک ڈبیا اُٹھاتے ہوئے اُس نے کوثر سے پوچھا۔
"غالباً کیا یقیناً ہے۔" کوثر بولی۔
"پھر تو آج ذرا میں بھی طرائی کروں۔ دیکھوں تو کیسا لگتا ہے۔ کیوں؟ اجازت ہے نا۔" اُس نے گویا بڑی ترکیب بتائی۔
"کمال ہے۔ چیز استعمال کے لیے ہوتی ہے۔ پھر اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے؟ مگر کیا واقعی آپ نے کبھی ٹرائی نہیں کیا؟" کوثر نے سر کو قدرے موڑ کر پوچھا۔
"نہیں۔"
"مگر کیوں؟"
"کیونکہ سوائے لپ اسٹک اور کریم کے میں کوئی میک اپ استعمال نہیں کرتی۔"
"مگر کیوں؟ کیا اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟" کوثر سمجھی کہ شاید وہ میک اپ کا سامان مینٹین نہیں کر سکتی۔
"نہیں۔ کوئی خاص وجہ تو نہیں۔ بس پسند نہیں کرتی تو پھر رکھ کر کیا کروں۔"
"ہاں بھئی! آپ کو میک اپ کی ضرورت ہی کیا ہے۔ خدا کی مار ہے آپ کا حسن تو۔" کوثر ستائشی انداز میں بولی۔
"ارے نہیں۔ اب اتنی بھی حسین نہیں ہوں۔ خیر تو۔ چلو خوش ہو جاؤ۔ آج میں میک اپ بھی کیے لیتی ہوں۔" اس نے بلش آن استعمال کرنے کے بعد آئی لائنر اُٹھاتے ہوئے کہا۔
"مہارت تو ایسی ہے آپ کو۔ جیسے آپ میک اپ کرنے کی عادی ہوں۔" کوثر نزدیک آ کر بولی۔ اور میک اپ کرنے میں مدد دینے لگی۔ اور پھر جونہی اس نے ہلکے شیڈ کی لپ اسٹک سے گداز ہونٹوں پر پھیری کوثر اُس کا میک اپ سے چمک اٹھنے والا حسن دیکھ کر بولی۔
"ہائے سچ۔ آپ تو اتنی خوبصورت لگ رہی ہیں کہ اگر بھائی جان نے ــــ" بے ساختگی میں ایک غلط بات منہ سے نکل جانے پر کوثر نے بقیہ فقرہ اپنی زبان کو دانتوں میں دبا کر روکا اور ادھر سلوطہ کا ہاتھ کچھ اس بری طرح کانپا کہ لپ اسٹک اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا گری۔ اس نے گھبرا کر کوثر کی طرف دیکھا تو زبان دانتوں میں دبائی کوثر شرمندگی سے بولی۔
"آئی ایم سوری سلوطہ آپا!" تو اُس نے فوراً ہی اپنی گھبراہٹ پر تھوڑا سا قابو پا کر پوچھا۔
"اس بات پر سوری کہہ رہی ہو۔ میں سمجھی نہیں کوثر۔"
"بھائی جان کے کہنے پر۔" کوثر دبی دبی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔
"اُف تو کیا کوثر نے بھی تاڑ لیا ہے یا پھر خود اسفند نے اُسے بتایا ہے۔" اُس نے دہل کر دل میں سوچا اور بظاہر لاپرواہی کا اظہار کرتی ہوئی بولی۔
"مگر یہ کوئی ایسی بُری بات تو نہیں۔ اگر تمہارے منہ سے غلطی سے بھائی جان نکل گیا تو۔"
"پتا نہیں غلط ہے یا صحیح لیکن آپ کے ہاتھ سے لپ اسٹک کیوں چھوٹ گئی تھی۔"
کوثر بھی ایک چیا لاک تھی اُس نے فوراً ہی اُس کی چوری پکڑ لی۔
"ارے نہیں۔ وہ تو محض اتفاق ہی تھا۔ اصل میں لپ اسٹک کا ڈھکنا سیٹ کر رہی تھی نا۔ اناڑی پن میں وہ ہاتھ سے پھسل گیا۔" اس نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔
"خدا بہتر جانتا ہے یا پھر آپ۔" کوثر شوخ سی نظروں سے اُس کی طرف دیکھ کر بولی۔
"ارے نہیں۔ کسی غلط خیال کو دل میں جگہ نہ دو کوثر۔ جو اصل بات تھی وہی میں نے تم سے کہہ دی۔" اس کا دل اندر لرزا جا رہا تھا۔
"کس سلسلے میں؟" کوثر اس کی گھبراہٹ سے حظ اُٹھا رہی تھی۔
"یہ ــ یہی ــ ہاتھ سے اچانک لپ اسٹک کا گر جانے پر۔" وہ اٹک اٹک کر بولی تو کوثر کچھ دیر خاموش کھڑی اُس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتی رہی۔ پھر بولی۔
"اگر مائنڈ نہ کریں تو ایک بات پوچھوں سلوطہ آپا؟"
"ارے ہاں ضرور۔ تم دس باتیں بھی پوچھ لو تو میں بُرا نہیں مانوں گی۔ ڈیئر ــــ" یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ وہ کیا پوچھنا چاہتی ہے اس نے لاپرواہی کا اظہار کیا۔

"بھائی جان آپ کو کیسے لگتے ہیں؟" اُف سوال تھا یا زہریلے کانٹے دار تیر جس نے یکبارگی آگے بڑھ کر رکھ دیا۔ اس نے بھی تو ابھی کچھ دیر پہلے یہی پوچھا تھا۔ اور اب یہی کوثر پوچھ رہی تھی۔ اس سے تو اس کا جواب شاید مر کر بھی نہیں بن سکتا تھا۔ مصنوعیت کا ایک تقاضا بن گیا تھا۔ کیونکہ اس کی خاموشی بہت سے معنی پیدا کر سکتی تھی۔ اس لیے اس نے ڈبا کیا مرا لوٹ کو جواب دینے سے لب کھلی تھی۔
"وہ بہت ہی ایسے ہی جیسے منجھلے آپا یا چھوٹے آپا لگتے ہیں یا پھر تم۔"
"مگر بھائی جان تو آپ کو کچھ اور ہی سمجھتے ہیں۔" کوثر بولی۔ کہ اس کا جواب گھما سا تھا اور اس کے پلے نہ پڑا تھا۔
"ہائیں کیا مطلب۔ کیا سمجھتے ہیں وہ مجھے؟" اس نے بے طرح دھک دھک کرتے دل کے ساتھ پوچھا۔
"وہ ــ وہ آپ کو بہت کچھ بھی سمجھتے ہیں آئی کین فیل اٹ بٹ کانٹ ایکسپلین اٹ۔ دراصل میں محسوس تو کر سکتی ہوں مگر بیان نہیں کر سکتی۔" کوثر شوخ سی مسکان کے ساتھ بولی۔
"اچھا۔ کمال ہے۔" اس نے پست سی آواز میں کہا۔
"کمال کی بات نہیں تعجب کی بات ہے کہ آپ کچھ سمجھتی ہی نہیں۔ ورنہ اگر آپ یہ سمجھتی کہ ــ ہمی لوز یوا ے لوٹ دراصل وہ آپ سے بہت محبت کرتے ہیں، تو پھر آپ یقیناً بُرا مان جاتیں۔" کوثر اس کے بٹنے پر صاف گوئی پر اتر آئی تو اس کی دھڑکنیں بے طرح اچھل ہی ہو کر رہ گئیں۔ ایک ایسی بات جو ایک سر بستہ راز کی طرح اس کے دل کی گہرائیوں میں کہیں دفن تھی۔ وہ ایک سترہ سالہ بڑی لڑکی کی زبانی افشا ہو رہی تھی۔ پریشان ہو اٹھنا کچھ عجب تو نہ تھا۔
"پھر بھی تم نے کہہ تو دیا ہے نا اور اب میں سچ مچ تم سے ناراض ہو گئی ہوں۔" وہ اپنی پریشانی سے اُبھر کر بولی۔
"ہائے کیوں؟ کیا سچ مچ آپ نے مائنڈ کیا ہے؟" کوثر نے پوچھا
"ہاں کیا ہے۔ کیونکہ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے تو میرے آس پاس تو کیا دور تک بھی کوئی ایسا خیال ہو کر نہیں گزرا۔ اور کچھ ذرا سوچو تو کوثر۔ یہ بات جو تم نے مذاق ہی مذاق میں اتنی آسانی سے کہہ دی ہے۔ اب مجھے معلوم نہیں کہ تمہارا یہ کوئی اندازہ ہے یا حقیقت۔ لیکن جب یہی بات دوسروں تک پہنچے گی تو پھر۔ دوسروں کی نظر میں میری کیا حیثیت رہے گی۔ جب کہ میں تم لوگوں کے پاس کچھ عرصہ گزارنے آئی ہوں۔ ساری زندگی نہیں۔ اور تم ابھی بہت چھوٹی ہو۔ تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکو گی جو اس اتنی سی بات کے پیچھے مجھے سہنی پڑیں گی۔ تو طنز میری کیفوں کی دوست۔ اگر تمہیں کچھ معلوم بھی ہو گیا ہے تو اس بات کا ذکر آئندہ کبھی زبان پر نہ لانا۔ یہ دھمکی یا تنبیہ نہیں بلکہ میری ایک پُرزور درخواست ہے تم سے۔ کیا تم اسے قبول کر لو گی؟"
"اُف توبہ۔ ایک ذرا سی بات۔ وہ بھی ایک خوشی کی بات کہہ دینے کے نتیجے میں کوثر کو کیا کیا سننا پڑا تھا۔ اسے تو احساس تک نہ تھا کہ ایک اتنی سی بات کے اتنے سنگین نتائج بھی ہو سکتے ہیں۔ اور وہ تو سچ مچ یہ خوشخبری نیلوفر اور نیلا کو بھی سنانے والی تھی کہ اس کے نزدیک تو یہ ایک بہت ہی دلچسپ کھیل تھا۔ بہت ہی لطیف سا مذاق۔ مگر اس دلچسپ کھیل اور لطیف مذاق کو سلوطہ نے جس قدر سیریس لیا تھا وہ کچھ گھبرا سی اٹھی تھی۔ پھر بھی نازش جیسی ذمہ دار اور فرض شناس ماں کی ــــ تربیت یافتہ تھی۔ جنہوں نے کینیڈا جیسے آزاد اور ترقی یافتہ ملک میں رہ کر بھی مشرقی اقدار کو اوّلیت دی تھی اور اکلوتی بیٹی کو بھی جسے ہر ریلیشن کے اندر رکھ کر پروان چڑھایا تھا۔ اپ بھی ــــ مرنجاں مرنج قسم کے انسان ثابت ہو رہے تھے۔ گویا ساری خصلتیں ماں کی ہی پائی تھیں۔ جس میں سب سے بڑی خوبی دوسرے کے دکھ درد کا احساس تھا۔ اور اسی احساس کے جذبے نے کوثر سے اطمینان دلا دیا۔
"اوہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ہم اتنی اچھی سی بات کو لوگ اتنا زیادہ سیریس لیں گے کہ آپ کے لیے مشکلات کھڑی ہو جائیں گی۔ پھر بھی میں وعدہ کرتی ہوں کہ آج کے بعد کبھی کسی کے بھی سامنے اس بات کو زبان پر نہیں لاؤں گی۔ حتیٰ کہ آپ کے سامنے بھی نہیں۔
کیا پکا؟" وہ خوش ہو کر تو بولی مگر اس کے لہجے سے بے یقینی صاف عیاں تھی۔
"کمال ہے میں کہ جب کوئی کسی سے وعدہ کرتا ہے تو وعدہ کرنے والے کا ہاتھ اس وقت خدا کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ یعنی وعدہ کرتے وقت دونوں بندوں کے درمیان خدا گواہ کی حیثیت سے موجود ہوتا ہے۔ اسی لیے تو پر وعدہ کرنا آسان نہیں

نہیں بلایا تھا بلکہ محض تبادلۂ خیالات کرنے کی غرض سے بلایا تھا۔

"پھر آپ اتنا ڈر کیوں گئیں کیا مجھ پر ذرا بھی اعتماد نہیں تھا؟" اس کی خاموشی پر وہ ایک دم ہی سنجیدہ ہو کر بولا۔ تو اس کا دل چاہا صاف صاف کہہ دے۔

"مجھے تم پر ذرا سا بھی اعتماد نہیں، کیونکہ میں تمہاری فطرت سے واقف ہوں، خصلت سے اور پھر تم پر اعتماد کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ میری اور تمہاری راہیں مختلف اور جداگانہ ہیں۔ پھر تم بہانے بہانے میرا راستہ کیوں روک رہے ہو؟ کیوں مجھے بھٹکا دینے کے در پے ہو، جب کہ میں تو ابھی تک اپنی زندگی کی منزل تک متعین نہیں کر سکی ہوں۔" مگر وہ یہ سب کس زبان اور کس طرح کہہ دیتی بھلا۔ اتنا کوتاہ دل اور کٹھور کیونکر بن جاتی کہ اپنے تیکھے الفاظ سے اس کے احساسات کا جگر پارہ پارہ کر دیتی۔ وہ تو اگر چاہتی بھی تو اس سے اس قدر غیر رواداری سے پیش نہیں آ سکتی تھی۔ کہ یہ اس کے اپنے دل کا معاملہ بھی تھا۔ اس لیے اس نے جواب گول کرتے ہوئے کہا۔

"اگر احتیاط اور نزاکتوں کے احساس کو آپ ڈر اور خوف پر ہی محمول کرتے ہیں تو پھر مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ ہاں واقعی میں ڈر گئی تھی، کیونکہ میرے پاس جو کچھ بھی ہے وہ میری عزت ہے اور عزت مجھے اپنی جان سے پیاری ہے اور مجھے ہرگز یہ گوارا نہیں کہ دوسروں کی انگشت نمائی کا نشانہ بنوں۔"

"اوہ تو کیا آپ سمجھتی ہیں کہ مجھے ان نزاکتوں کا بالکل احساس نہیں یا میں خود ہی اپنی محبت کو طشت از بام کرنے کا خواہاں ہوں۔" اس نے حد درجہ کبیدہ ہو کر کہا۔

"یہ تو مجھے معلوم نہیں مگر۔"

"اگر مگر کی بات نہیں ملیحہ، یہ پہلے آپ کی عزت کا معاملہ ہے بعد میں کچھ اور جو مجھے اماں جان پر بھی ظاہر کرنا گوارا نہیں۔ اس وجہ سے کہ چونکہ پچھلی مرتبہ اماں جان کچھ متجسس سی ہو گئی تھیں، میں اتنے دن سے ان کی احوال پرسی کو بھی نہیں گیا۔ کیونکہ آپ کو دیکھ کر مجھے خود پر اختیار نہیں رہتا۔ کسی کو کیا میں خود کو بھی بھول جاتا ہوں۔ اسے میری کمزوری سمجھ لیں یا جذبے کی شوریدہ سری مگر آپ کو دیکھ کر میں واقعی بالکل بے بس ہو جاتا ہوں۔" اف ایک طرف مصلحتوں و نزاکتوں کا پاس اور احساس اور دوسری طرف یہ دیوانگی اور جنوں خیزی۔ وہ تو پہلے ہی اس کی محبت میں سر تا پا غرق ہو چکی تھی۔

اور یہ سب کہہ کر تو اس نے گویا ملیحہ کے دل میں اعتماد کا سنگِ بنیاد رکھا تھا۔

پھر بھی وہ ناقابلِ یقین سی تھی۔

بڑی بے بس اور مضطرب سی نظر آ رہی تھی۔

وہ واقعی سیریس ہو گیا ہے۔ یہ احساس بڑا جان لیوا تھا۔

کیونکہ وہ تو اگر چاہتی بھی تو اس کی چاہت میں اس کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔

پھر بھلا اسے دھوکے میں رکھنے سے حاصل ہی کیا ہوگا۔

پہلے کی طرح ایک بار پھر کسی کمزور لمحے کی گرفت میں آتے آتے وہ بچ کر نکل آئی۔

وہ دل جو اس کی طرف جھکا چلا جا رہا تھا۔

اس کی باتوں کے سحر میں پھر کہیں کھو سا گیا تھا۔

اسے سختی سے سرزنش کر کے اس نے اپنی ساری امنگوں کا گلا گھونٹتے ہوئے کہا۔

"آپ — آپ اگر اس معاملے میں سیریس بھی ہیں تو خدارا میری ذات کو اس میں ملوث نہ کیجیے — میں —" مگر وہ اس کے ملتجیانہ سے لہجے میں کہی بات کو کاٹ کر یوں چمک کر بولا جیسے یکایک کسی نے اس کے چٹکی بھر لی ہو۔

"ہائیں کیا مطلب۔ کیوں نہ کروں آپ کی ذات کو ملوث۔ آخر کس وجہ سے نہ کروں؟" تب اس کا دل چاہا اپنے بارے میں سب کچھ اسے صاف صاف بتا کر اسے اپنی تمام مجبوریوں سے آگاہ کر دے۔

کہ اندھیرے میں رکھنے سے بہتر یہی تھا۔

مگر سب کچھ کہہ ڈالنے اور اپنی مجبوریوں سے آگاہ کرنے کے لیے بڑے دل گردے کی ضرورت تھی۔

کہ وہ اتنی سی بات تو نہ تھی کہ دو لفظوں میں تمام کر دی جاتی۔

اور پھر یہ اس کی انا اور وقار کا معاملہ تھا۔

یہ سب تو اتنی مہربان، مشفق اور اس کی پرورش در پردہ اپنی ممتا کو لٹانے والی سلمیٰ بیگم کو بھی نہیں بتا سکی تھی۔

"کیونکہ میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتی۔" بہت سوچ سمجھ کر اسے یہی کہنا مناسب لگا۔

"لیکن میں تو سمجھتا ہوں۔ قابل ہی نہیں بلکہ مستحق بھی۔" یہ کہہ کر تو اسفند نے اسے مزید کچھ کہنے کے قابل ہی نہ رکھا۔ پھر بھی وہ اپنی بات پر مُصر رہی۔

"آپ سمجھتے ہیں مگر — مگر — پلیز آپ میرا خیال چھوڑ ہی دیں۔"

"کیوں چھوڑ دوں۔ یہ کوئی بچوں کا کھیل تو نہیں۔ نہ ہی ٹائم پاس کرنے کی وجہ سے میں آپ کی محبت کا دم بھر رہا ہوں۔ یہ تو ایک اٹل حقیقت ہے۔ واہ یہ خوب کہا کہ میرا خیال چھوڑ دیں۔ جب کہ میں نے تو آپ کو لائف پارٹنر کے طور پر سلیکٹ کیا ہے۔" اس نے بڑے مجبور انداز میں اپنی بات کہہ کر اسے اپنے ارادوں کی پختگی سے آگاہ کیا۔ تو وہ اندر ہی اندر دہل اٹھی۔

اف تو معاملہ اس قدر آگے بڑھ کر اتنی گہرائی تک پہنچ چکا ہے۔ اس خیال سے ہراساں ہو کر اس نے کہا۔

"اف نہیں۔ نہیں۔ ایسی بات تو کبھی بھول کر بھی منہ سے نہ نکالیے گا۔"

"کیوں نہیں نکالوں۔ کیا میں کسی سے ڈرتا ہوں یا کسی کا دبیل ہوں؟ اور یہ تو میرا خالص نجی معاملہ ہے۔ کس کی مجال ہے جو اس میں دخل دے یا کوئی چون و چرا کرنے کی جرأت کر سکے۔ میں تو ببانگِ دہل سب سے کہوں گا کہ دیکھو میری چوائس کتنی اعلیٰ اور ارفع ہے بلکہ اماں کو تو یہ باور کرا دوں گا کہ ان کے منتخب کردہ میک اپ زدہ چہروں سے میری چوائس کا معیار کس قدر بلند ہے۔"

اف تو یہ اس کے ارادوں سے باخبر ہو کر اور خاص طور پر نیت کا نام سن کر اس کی جان ہی نکل گئی۔ اف اب کہے تو کیا کہے۔

کہ وہ تو اس کے کسی جواز کسی تاویل اور کسی بھی عذر معذرت کو سننے کا روادار ہی نہ تھا۔

اس کے ہر عذر کا جواب گویا اس کے پاس پہلے ہی سے موجود ہوتا تھا۔

اور اس ضمن میں مزید کچھ کہنے کے لیے ذخیرۂ الفاظ بھی ختم ہو گیا تھا۔

اور جب کسی شنوائی کا امکان ہی نہ تھا تو پھر مزید کچھ کہنے سے حاصل ہی کیا ہوتا۔

جب کہ وہ اس کی باتوں سے اخذ ہونے والے ہولناک نتائج کا تصور کر کے پوری جان سے کانپ رہی تھی۔

کہ ذلت و خواری گویا مقدر بننے والی تھی۔

کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مزید کیا کہے اور کیونکر اسے اس کے ارادوں سے باز رکھے۔ حالانکہ وہ اتنی ناسمجھ اور معصوم بھی نہیں تھی۔

بلکہ کم عمری ہی سے زندگی کے تلخ تجربات کے سلسلے میں ڈھل کر بہت پختہ اور سمجھدار ہو گئی تھی۔

حد درجہ باشعور اور زمانہ شناس —

مگر زندگی کے اس نازک ترین معاملے کو نمٹانے میں خود کو بالکل بے بس پا رہی تھی۔

کیوں کہ ایسے موقعوں پر تو کوئی کسی کو جھٹلانے کے قابل رہتا ہے۔ نہ سمجھانے اور باز رکھنے کے۔

اسے صرف رام ہو جانے کی ترکیب سمجھ میں آئی۔

خلافِ توقع اس کے سامنے منہ زور سوال دنیا بھی خود اس کی ذلت اور خواری کا پیش خیمہ تھا۔ مگر کر بھی کیا سکتی تھی کے مصداق اس نے معاملہ سمیٹ کر زندگی کی بساط لپیٹ دی۔ پھر چائے کے تازہ پرچے کو جو اب تک اس کے ہاتھ میں تھا میز پر رکھتے ہوئے بولی۔

"اوہ میں تو بھول ہی گئی۔ اماں جان کے لیے جو سوپ اسٹوو پر رکھ کر آئی تھی وہ تو اتنی دیر میں جل کر سوکھ بھی گیا ہوگا۔ پھر —" اسے کچھ کہنے کی مہلت دیے بغیر جھک کر میز کا اخبار اٹھاتے ہوئے اس نے شکست خوردہ سا لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"تو آپ اپنے ارادوں میں اٹل ہی ہیں تو کم از کم مجھے تو کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع دیں۔ دیکھیں نا آخر یہ تو پوری زندگی کا معاملہ ہے۔ آپس میں انڈرسٹینڈنگ نہ ہو تو ایسا طرزِ عمل بھی محض ریت کی دیوار ہی ثابت ہوتا ہے۔ اس لیے جلد بازی سے کام لینا تو کسی طرح بھی درست نہیں۔" یہ کہہ کر گویا اس نے اپنی محبت کا اعتراف ہی نہیں بلکہ زندگی بھر اس کا ساتھ دینے کا اقرار بھی کر لیا تھا۔

اسفند کے دل میں اتری طمانیت کے احساس نے اس کے رگ و پے میں مسرت کی لہریں دوڑا دیں۔

"ہاں ہاں، جلد بازی سے کام لینا عقلمندی بھی نہیں، ایک دوسرے کو سمجھے بغیر واقعی زندگی کی گاڑی چل نہیں سکتی اور آپ کے لیے تو میں برسوں تک انتظار کر سکتا ہوں۔" اُف وہ اس کی بہلا دینے کے طور پر کہی بات کو حقیقت سمجھ بیٹھا تھا۔
وہ اس کے ہاتھوں کس بری طرح سے اسیر ہو گئی تھی۔
ان ساری باتوں کا انجام کیا ہوگا۔ اس تکلیف دہ خیال نے اسے سرتاپا لرزا کر رکھ دیا۔
اندر ہونے والی اتھل پتھل سے اس کا چہرہ بھی دھواں دھواں سا ہو گیا تھا۔ وہ اب مزید اس کے سامنے ٹھہرنے کی پوزیشن میں نہیں رہی تھی۔
مبادا کہ اس کے چہرے سے ہویدا تاثرات اس کے جھوٹ یا غلط بیانی کا بھانڈا پھوڑ دیں۔ اس نے دل میں ہوتی ہائی وولٹیج سی دھڑکنوں کے شور سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔
"ہاں اس وقت تک تو سب کچھ حل کر لینا [illegible] ہو چکا ہوگا۔"
"اوہ ہاں! ذرا ادھر میرے کولیگ ڈاکٹر سب آنے ہی والے ہیں میرے ساتھ کام کرنے والے۔ دراصل ابھی اب تک میرے انتظار میں [illegible] پہنچ چکے ہوں گے۔"
"اوکے! ٹھیک ہے سوا آٹھ تک۔" اس نے بھی معذرت کے انداز میں کہا، ورنہ عام طور پر وہ اس وقت اپنی ڈیوٹی پر جا چکا ہوتا تھا اور اس کے سوا آٹھ بجنے پر سلویٰ کی بھی جان میں جان آئی۔ وہ جلدی سے خدا حافظ کہہ کر آگے بڑھنے لگی۔ وہ جاتے جاتے بولا۔
"خدا حافظ یوں [illegible] تو نہیں کہا کرتے۔" اپنی بات کہہ کر وہ ابھی کسی بے ساختگی کا مظاہرہ کرنے والا ہی تھا کہ اس نے گھبرا کر کہا۔
"ہر بات انسان آہستہ آہستہ ہی سیکھتا ہے جلد بازی سے کام لے کر نہیں۔" اور اس کے تیکھے سے جواب پر جھینپ کر وہ ہنستا ہوا لاؤنج سے باہر نکل گیا۔
وہ تو اپنے جذبوں اور خوشی میں سرشار ہنستا ہوا چلا گیا تھا۔
مگر وہ کسی کام کی بھی نہیں رہی تھی۔
وہ پورا دن اس نے اپنی حماقت پر ماتم کناں رہنے اور طرح طرح کے اندیشوں سے اپنا خون سکھانے میں گزارا تھا۔
میں نے اتنا بڑا جھوٹ کیسے بول دیا؟
کیوں اس کی آنکھوں پر بہلاوے اور فریب کی پٹی باندھ دی۔
وہ تو اپنے جذبوں کی تمام تر صداقتوں کے ساتھ خود بھی سچا ہے۔
میں اب اگر سچ بھی بولوں گی تو وہ میری کسی بات پر یقین نہیں کرے گا۔
بلکہ اس کے جذبوں میں مزید شدت آ جائے گی۔
ہو سکتا ہے مجبور ہو کر وہ میرے حصول کی تمنا کرے گا۔
بات کھلے گی تو پھر کیا ہوگا؟
سوائے دوسروں کی نظروں میں میری ذلت و خواری کے۔
اور اس کی نظروں میں میری تباہی کے سوا حاصل ہی کیا ہوگا۔
اس گھر سے بھی نکالا مل جائے گا۔
تو پھر میں کون سی جائے پناہ تلاش کروں گی؟
کس کا آسرا ڈھونڈوں گی؟
پھر تو دربدر کی ٹھوکریں ہی مقدر ہوں گی۔
اُف توبہ ایک جھوٹ کے کارن مجھے کیا کیا بھگتنا پڑے گا۔
کیسی کیسی اذیتیں جھیلنی ہوں گی۔
کیا تھا اگر میں سچ کا زہر پینے کی ہمت کر جاتی۔
ایک صرف اس کی نظروں میں ہی تو خوار ہوتی اور اس طرح کم از کم میرے ماتھے پر رسوائی کا داغ تو نہیں لگتا۔

اچھا ہی تو ہوتا اگر ایک سرکش سے جذبے کی ابھرنے سے پہلے ہی موت واقع ہو جاتی۔ یا وہ ابھرتے ہی مسل اور کچل جاتا۔
پھر میں نے اتنی بزدلی سے کیوں کام لیا؟
اتنی کمزوری کیوں دکھائی؟
نہیں... نہیں، اب بھی کچھ نہیں گیا میں اس سے ہر بات صاف صاف کہہ دوں گی، اسے بتا دوں گی کہ جسے وہ سمندر کی تہہ میں پڑی سیپ میں بند گوہرِ آبدار سمجھ رہا ہے، اس کی حیثیت کیچڑ میں اُگے کنول کے پھول سے زیادہ نہیں ہے۔ وہ تو اپنی اتنی زیادہ خودداری اور غیرت کے باوجود کچھ بھی نہیں ہے۔
بس حالات کا ستایا ایک عام سی لڑکی۔
مگر ایسی لڑکی جو اپنے حالات کی کم اور دوسروں کے حالات کی زیادہ ستائی رہی ہے۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ خواہ اسفند کے جذبات مجروح ہوں یا دل پر قیامت ٹوٹ پڑے۔ وہ اپنے بارے میں اسے سب کچھ بتا کر ہی رہے گی۔ اور خواہ کوئی اس کے بارے میں کیسی ہی رائے کیوں نہ قائم کرے وہ خود اس کے کمرے میں جا کر آج رات ہی کو بتا دے گی۔
ساری تاویلوں اور نتائج پر غور کرنے کے بعد آخر اس نے تہیہ ہی کر لیا کہ وہ اس کے مزید آگے بڑھنے سے پہلے ہی سب کچھ اسے بتا دے گی۔
اس روز شام کو جب سلمیٰ بیگم مغرب کی نماز ادا کرنے کے بعد نماز کی چوکی سے اٹھ رہی تھیں۔ وہ ہوا کے کسی تیز جھونکے کی طرح اندر آ گیا۔
"السلام علیکم اماں جان!" وہ ان کے بیڈ پر بیٹھتا ہوا بولا۔
"اوہ تو گویا [illegible] اتر گیا ہے۔ تمہارے سر سے [illegible] دنوں کیسے رہے؟" سلمیٰ بیگم بھی اس کے پاس بیڈ پر بیٹھتی ہوئی بولیں۔ وہ اپنے چھوٹوں سے شکوہ شکایت کرنے کی قائل نہیں تھیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں بزرگوں کو یہ بات زیب نہیں دیتی تھی۔
"بالکل ٹھیک ٹھاک، ایک دم بھلا چنگا۔" وہ بھی یوں بولا جیسے اسے اپنی اتنے دنوں کی غیر حاضری پر ذرا ندامت نہ ہو۔
"ہاں خدا بھلا چنگا ہی رکھے، ڈیوٹی تو تمہاری کافی سخت ہوتی ہے۔ صبح سے تین بجے تک ہسپتال میں رہتے ہو اور پھر کلینک کا کام دیکھنے چلے جاتے ہو۔ ہاں بیٹا یہ ٹھیک ہے مگر تو سب خود کو کچھ بنانے کی، وہی مثل ہے کہ جتنا گڑ ڈالو گے اتنا ہی میٹھا ہوگا۔ مگر تھوڑا سا آرام بھی کر لیا کرو۔ صحت کے لیے یہ بھی ضروری ہے۔" سلمیٰ بیگم کا یہی تو کمال تھا کہ وہ باتیں ایسی کرتیں جو سب کے دل میں اتر جاتی تھیں ورنہ وہ تو سمجھ رہا تھا کہ کمرے میں گھستے ہی اس کی خوب خبر لیں گی۔ خوب ناراض ہوں گی اور برا بھلا کہیں گی۔ مگر اس کی توقع کے برخلاف وہ اس پر اپنی ممتا نچھاور کر رہی تھیں۔ وہ ان کی باتوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔
"بس اماں جان اب تو میں نے عمل میں قدم رکھ ہی لیا ہے اب آرام کیسا۔ اب تو کچھ بننے کے بعد ہی آرام کریں گے۔" وہ ایک دم الٹا ہو کر تکیہ ان کے نیچے دبا کر وہیں ڈھیر ہوتا ہوا بولا۔
"اے لو تم تو ماشاء اللہ ماں کے پیٹ سے بنے بنائے پیدا ہوئے ہو۔ دولت، جائیداد، آسائشیں کس چیز کی کمی ہے تمہارے پاس۔ اگر ساری زندگی بیٹھ کر بھی کھاؤ تب بھی یہ ساری دولت تمہارے سر آئے گی اور پھیر جائے گی۔ البتہ بیٹھے بیٹھے تو خزانے بھی خالی ہو جاتے ہیں۔ اور حرکت میں ہی برکت ہوتی ہے۔ میں تو اسی خیال سے کہہ رہی تھی۔"
سلمیٰ بیگم سرہانے تپائی پر رکھا پاندان اپنے آگے کھینچتے ہوئے بولیں۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ ان کی محاوراتی زبان [illegible] کا مزہ ضرور لیتا۔ لیکن اس وقت وہ بہت سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ گمبھیر لہجے میں بولا۔
"خزانے خالی ہو جانے اور حرکت میں برکت کے علاوہ بھی [illegible] ایک شدید احساس میرے اندر پرورش پا رہا ہے اماں جان! بلکہ یہ احساس تو بچپن سے ہی ڈیڈی نے میرے دل میں پیدا کیا تھا کہ دوسرے پر ڈیپنڈ کر کے نہیں رہنا چاہیے۔ بلکہ انسان کو اپنی ضروریات اپنے زورِ بازو سے پوری کرنی چاہئیں۔ معلوم بھی ہے اماں جان! ڈیڈی میرے اخراجات [illegible] سے شکایت کی تھی۔ تب انہوں نے کہہ دیا تھا کہ یہاں تو میری آمدنی ہی استطاعت ہے تمہاری ضروریات اگر [illegible] نہیں ہوتیں تو خود محنت و مشقت کر کے پوری کرو۔ یوں بھی میں ایک دم ان ڈیپنڈنٹ دیکھنا چاہ رہا تھا

"اماں جان" نازو نے شرارت سے مسکراتی نظروں سے نیلما کی طرف دیکھا۔ لیکن نیلما نے تو اسے مسکراتے ہوئے اسفند نے دیکھ لیا۔ اسے اس کی اس دو غلے پن کی حرکت پر غصہ تو بہت آیا مگر اسے معلوم تھا کہ وہ ماں کے زیر اثر ہے۔ اس لیے اس نے بہت پر یہ ظاہر نہیں کیا کہ وہ اسے مسکراتا ہوا دیکھ چکا ہے۔ بلکہ بہت ہی سنجیدہ لہجے میں گویا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"اماں جان کے پاس کوئی بیٹھ جائے تو بوریت کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ ان کی شخصیت باغ و بہار ہے۔ اپنی ذات میں وہ داستان میر امن ضرور ثابت ہوتی ہیں۔" اور اس کے اس فقرے پر نازو نے اتنی دیر سے ضبط کی ہوئی ہنسی کو ایک قہقہے کی صورت میں چھوڑ دیا۔ مگر نیلما یا تو اس کی بات کو سمجھی نہیں تھی یا کسی اور خیال میں مگن تھی۔ وہ خاموش بیٹھی رہی۔ اسفند نے نازو کو قدرے فہمائشی انداز میں دیکھا تو وہ اپنی ہنسی روک کر بولی۔

"مجھے تو تعجب اس بات پر ہے کہ اتنے عرصے انگلینڈ میں رہ کر بھی آپ اتنی اچھی بلکہ با محاورہ اردو بولتے ہیں۔" نازو ظاہر تھا اس نے یہ بات اس تاثر کو زائل کرنے کے لیے کہی تھی جو اس کی ہنسی سے بھائی کے ذہن میں بن گیا تھا۔ وہ بھی سمجھ گیا تھا وہ تیوری چڑھا کر بولا۔

"کیوں کیا انگلینڈ میں رہ کر میرے سینگ نکل آئے تھے جو میں اپنی مادری زبان ہی بھول جاتا۔ بلکہ مجھے تو وہ لوگ بہت ہی چھچھورے اور کم ظرف لگتے ہیں جو یورپ کیا اور اسٹیٹس سے آ کر یہ ظاہر کرتے ہیں جیسے پیدائشی انگریز یا امریکن ہوں۔ جو کھانے پینے میں لباس کے معاملے اور بات چیت کرنے میں تصنع اور دکھاوے سے کام لیتے ہیں۔ ارے بھئی جس مٹی سے تمہارا خمیر اٹھا جس سرزمین پر تم پیدا ہوئے اور جس گود میں پروان چڑھے اسے بھول کر تم دوسروں کی ریس میں لگ گئے۔ دراصل یہ سارا قصور غلامانہ ذہنیت کا ہی ہوتا ہے۔"

"واو! واؤ بھائی جان لو آر ویری گریٹ۔ آپ بہت عظیم ہیں۔"

نیلما بھائی کے خیالات سن کر خوشی میں تالی پیٹ کر بولی۔

"خیر۔ گریٹ تو کیا البتہ چھچھورا نہیں ہوا ہوں۔" وہ انکسار سے کام لے کر بولا۔

"خدا نہ کرے آپ چھچھورے کیوں ہونے لگے۔ میں تو آپ کے خیالات سن کر ایک فخر سا محسوس کر رہی ہوں۔" نازو جو ذرا مختلف نظریات رکھتی تھی نیلما کے تعریف کرنے پر محض بھائی کو خوش کرنے کی غرض سے بولی۔

وہ بھی جانتا تھا وہ طبیعت مزاج حتیٰ کہ نظریات کے اعتبار سے اس سے بہت مختلف ہے۔ وہ گمبھیر سے لہجے میں بولا۔

"کسی کی برائی یا اچھائی پر صرف فخر کرنے سے کام نہیں چلتا۔ بات تو جب بنتی ہے جب انسان خود بھی ایسی خوبیاں اپنے اندر پیدا کرے۔ اب اگر میں یہ کہوں کہ میری تمام اچھائیوں کا کریڈٹ اماں جان کو جاتا ہے تو میں یہ کہنے میں اس لیے حق بجانب ہوں گا کہ میں نے ان کی تعلیمات کے مطابق خود کو ڈھالا ہے۔ اور تم نے بھی جو میری اس بات کا مذاق اڑایا کہ اماں جان اپنی ذات میں داستان میر امن ہیں تو یہ تو خیر میں نے محاورتاً ہی کہہ دیا تھا۔ لیکن حقیقتاً اماں جان اپنی ذات میں ایک ادارہ ہیں۔ ایک مکتب ہیں۔ ایک تو انہوں نے اس زمانے میں گریجویشن کیا تھا جب عام لوگوں کو سرے سے تعلیم نسواں کا تصور ہی نہ تھا۔ ٹیلیویژن، ٹانگوں اور سائیکلوں پر پھرنے کا زمانہ نہ تھا۔ اور خواتین کا گھروں سے باہر قدم نکالنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اور ایسی ہی بندشوں میں بندھے رہ کر انہوں نے بی اے بی ایڈ بھی کر لیا تھا۔ اور اس کے بعد تقریباً تیس برس تک علم کو مسلسل درس و تدریس کے ذریعے پھیلایا۔ ہزاروں طلبا اور طالبات کو انہوں نے پڑھایا ہے۔ ہماری والدہ بھی ان کی شاگرد رہی ہیں۔ اور کوئی نہیں تو کم از کم تم ہی نیلما تھوڑی دیر کے لیے ان کے پاس بیٹھ جایا کرو تو بہت کچھ سیکھ لو گی۔" اس نے نیلما کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی بات ختم کی تو نیلما جلدی سے بولی۔

"جی ہاں بھائی جان! جب کبھی بیٹھنے کا موقع ملتا ہے تو تھوڑی دیر کو میں تو اماں جان کے پاس جا بیٹھتی ہوں ویسے تو ان سے بہت محبت کرتی ہوں۔" نیلما کی بات پر خوش ہوتے ہوئے اسفند نے کہا۔

"ہاں کرنی بھی چاہیے کیونکہ انہوں نے بھی ہماری محبت میں اپنی زندگی تیاگ دی ہے۔ یہ ان کی محبت ہی تو ہے کہ اپنا حق بننے کے باوجود اپنا حصہ تک نہیں لیا اور ہمارے ابّا کے منافرانہ رویے کے باوجود ہم پر اس قدر شفقت چھوڑ گئی ہیں

تو نازو جو بڑی بیزار سی بیٹھی اس کی باتیں سن رہی تھی اس نے دل میں سوچا اب یہ بھائی جان تو اماں جان کے چنگل میں اس بری طرح پھنسے ہیں کہ شاید ہی کبھی نکل سکیں۔ وہ بھی تاڑ گیا تھا کہ نازو کو اس کی سلمیٰ بیگم کی شان میں قصیدہ خوانی بڑی ناگوار گزر رہی ہے۔ وہ اس سے مخاطب ہو کر بولا۔

"نیلما تو ابھی پھول سی ہے لیکن تم تو میری سب سے زیادہ با صلاحیت اور باشعور بہن ہو۔ اور اب تو ایک ذمہ دار ہستی بھی بن گئی ہو۔ ٹیکٹس وغیرہ سے تو شروع ہی سے واقف ہو لیکن اب تو تمہیں ہر قسم کے لوگوں سے ڈیل کرنا بھی پڑ گیا ہو گا۔ میرا مطلب ہے میں تم سے کم از کم ایسپیکٹ (توقع) ہی نہیں کر سکتا کہ تم اماں جان یا سلوطہ سے غیریت برتتی ہو کیونکہ اخلاق ہی ایک ایسا جوہر ہے جو انسانیت کی معراج کہلاتا ہے۔" وہ بھائی جو کبھی سیدھے منہ بات ہی نہ کرتا تھا آج اس قدر کھل مل کر باتیں کر رہا تھا۔ اس پر اس نے نازو کے اخلاق اور اوصاف کی تعریف بھی کر ڈالی تھی جس سے آن کی آن میں نازو کے دل میں سلمیٰ بیگم اور سلوطہ کی طرف سے بھرا ہوا غبار چھٹ گیا۔ یوں بھی انسان خواہ بردبار، باشعور، جہاندیدہ اور تجربہ کار ہو۔ اپنی تعریف بھی اس کی ایک کمزوری ہوتی ہے۔ جس سے لاکھ پیچھا چھڑانا چاہے۔ اس کمزوری کو دور کرنے کی کوشش کرے بلکہ اس کوشش میں کامیاب بھی ہو جائے اس کے باوجود بھی یہ کمزوری اس کے اندر ہی کسی تہہ میں چھپی رہتی ہے۔

اور نازو تو ایک شگفتہ پھول کی طرح تھی۔

مگر تعریف کے معاملے میں تو ایک عام سی لڑکی ہی ثابت ہوئی تھی۔ بھائی کی ناصحانہ گفتگو نے اس کو اتنا متاثر نہیں کیا جتنا کہ تعریف نے۔ یوں بھی نیک اور اچھی باتوں کا اثر لینے کی صلاحیت تو ہر انسان کے اندر موجود ہوتی ہے وہ اور بات ہے کہ وہ اس صلاحیت سے کام لینے کی کوشش نہ کرے۔

سو بھائی کی پُرستائش باتوں کی روشنی میں اس نے بھی سوچا کہ واقعی بھائی جان ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔ غلطی ہماری ہی ہے کہ ہم نے خود ہی اماں جان اور سلوطہ کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ ورنہ وہ تو ہمارے گھر مہمان کی حیثیت سے رہ رہی ہیں یہ فرض تو ہمارا ہے کہ ان سے اچھا سلوک روا رکھیں اور چونکہ بھائی نے اس کو ایک ذمہ دار اور با صلاحیت ہستی کہا اس لیے خود کو بہت اونچا اور مضبوط محسوس کر کے بولی۔

"نہیں بھائی جان! آپ مجھ سے تو کبھی ایسپیکٹ (توقع) کیجیے گا ہی نہیں کہ میں کسی کے ساتھ بد اخلاقی اور بد لحاظی سے پیش آؤں گی۔ دراصل میں چونکہ میں اماں جان کا بہت زیادہ ریگارڈ (احترام) کرتی ہوں اس لیے ان کے سامنے زیادہ بات نہیں کرتی۔ اور یہ تو محض اتفاق ہوا تھا جو آج میں صبح سے آ گئی ورنہ ہمیشہ گھنٹے دو گھنٹے کے لیے ہی آتی ہوں۔ نیلما اماں جان سے ملے بغیر تو نہیں جاتی۔ آخر کار وہ میری دادی ہی تو ہیں سگی دادی کو ہم نے دیکھا ہے نہ جانتے تھے۔"

"خیر میرے کہنے کا مقصد تو یہ تھا کہ اور کوئی نہیں کم از کم تم تو اپنے اندر ایسی صفات پیدا کرو جن پر میں فخر کر سکوں۔ گو اب تم پرائی ہو چکی ہو۔ لیکن اس گھر کی بڑی بیٹی اور ایک ذمہ دار ہستی تو ہو تم حسین اخلاق برتو گی تو تمہاری دیکھا دیکھی یہ دونوں بھی بہت کچھ سیکھ جائیں گی۔" وہ ایک نئی سی طمانیت لے کر گویا قصہ کوتاہ کرتا ہوا بولا۔

"لیکن ہاں ہاں بھائی جان یہ تو آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔" نازو کچھ زیادہ ہی فراخ دلی کا مظاہرہ کرتی ہوئی بولی۔ نیلما چپ چاپ اور گم سم سی بیٹھی تھی۔ وہ اس موضوع کو ختم کرنے کی غرض سے اس کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

"ہماری گڑیا یا تمہی سخت بوریت کا شکار معلوم ہوتی ہے ——— کیوں نہ آج اسے لے کر آؤٹنگ پر چلا جائے کیوں نازو؟"

"جیسے بھائی جان جیسا آپ کی مرضی۔ مگر میں تو شام کو گھر واپس چلی جاؤں گی۔" نازو بولی۔

"کیوں تمہارے میاں تو ڈنمارک گئے ہوئے ہیں پھر تمہیں اتنی عجلت کیا ہے گھر جانے کی۔" اس نے ذرا سنجیدہ ہو کر پوچھا۔

"دراصل مجھے گیارہ بجے رات کو احمد کی کال آنی ہے۔ اور میری ساس بھی آج کل پنجاب گئی ہوئی ہیں۔ وہ رات کو گھر کو تنہا چھوڑنا پسند نہیں کرتیں۔" نازو نے بتایا تو وہ کچھ سوچ کر نیلما سے مخاطب ہوا۔

"خیر تم بتاؤ گڑیا تم کہاں جانا پسند کرو گی۔ باکس ہے، سینڈز پٹ، کلفٹن یا پھر کیماڑی سے بوٹنگ پر۔" گو نیلما کا کہیں جانے

"دکھ — کچھ بھی نہیں۔"

"نہیں خیر کچھ تو —" وہ بڑی بے تکلفی سے اس کے قریب ہی گیلی گیلی ریت پر بیٹھ گیا۔ اور کہنی ریت پر ٹکا کر ایک ہاتھ کی ہتھیلی پر ٹھوڑی ٹکا کر مسکراتے ہوئے بولا۔

"جہاں تک میرا اندازہ ہے کسی سوچ میں گم تھیں آپ۔" تو اُس کا دل چاہا کہہ دے کہ تمہارے علاوہ اور کس کی سوچ میں گم ہو سکتی ہوں — مگر اس کی قربت سے پریشان ہو کر اس نے تھوڑا پیچھے سرک کر سمٹتے ہوئے اور پست سی آواز میں بولی۔

"نہیں تو —" مگر سمندر کی شوریدہ سر لہروں اور سیٹیاں بجاتی ہوئی ہواؤں کے شور میں شاید اُس نے سنا ہی نہیں یا دانستہ اسے تنہا دیکھ کر یہ موقع پا کر اس وقت اس کے پاس نہیں آیا تھا — بلکہ اس خیال سے آیا تھا کہ لڑکیاں پیچھے بیٹھی رہی ہوں گی۔ انہیں بھی گھومنے پھرنے کا موقع دینا چاہیے — اب یہ اس کے خیال میں اس کی خوش قسمتی ہی تھی کہ وہ تنہا اسے مل گئی تھی۔ یعنی جس بات کی وہ آتی دیر سے شدید خواہش یا تمنا کر رہا تھا وہ پوری ہو گئی تھی۔

"یہ دونوں کہاں ہیں —؟" اس نے اُس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"وہاں سامنے کھڑی ہیں زیادہ دور نہیں گئیں۔"

"اگر نہ بھی جاتیں تو کیا فرق پڑ جاتا۔" وہ اُس کی بات کے کچھ اور ہی معنی لے کر بولا۔ اور وہ جواب دینے کے بجائے اس پر ایک نظر ڈال کر رہ گئی۔

وہ اُس کی طرف دیکھ رہا تھا — نگاہوں میں کچھ ایسی تپش تھی کہ وہ اتنے ٹھنڈے ماحول میں بھی پسینے پسینے ہو رہی تھی۔

دھڑکنیں الگ بے طرح منتشر ہو گئی تھیں۔

اور وہ تھا کہ بالکل خاموش اور گنگ سا — شاید اُس پر سے نظریں ہٹانا بھول گیا تھا — اور گھٹنے اوپر کیے۔ دونوں ہاتھ گھٹنوں کے گرد لپیٹے بت بنی اپنی بے ترتیب دھڑکنوں کا تھماؤ کرنے میں کوشاں تھی۔

وہ اس قدر قریب تھا۔ اس لیے تشنہ جذبوں کی یورش نے اسے ایک عجیب سی بے کلی میں مبتلا کر دیا تھا۔

اور ادھر وہ بھی — اپنے جلتے سلگتے وجود کو ریت کی نم آلود ٹھنڈک سے آسودگی پہنچانے میں کوشاں تھا۔

دونوں کے لب سلے ہوئے تھے۔

مگر دل ایک ساتھ دھڑک رہے تھے۔

اور آنکھیں — جذبوں کی ترجمان بنی تھوڑے تھوڑے وقفے سے ایک دوسرے سے اُلجھ اُلجھ سی جاتیں۔

کہ — محبت میں کچھ مقام ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جہاں خاموشی زبان بن جاتی ہے اور آنکھیں جذبوں کی ترجمان۔ دل کی نامہ بر —

لیکن وہ اُس کی طرح جذبوں کی یورش سے پاگل نہیں ہو رہی تھی —

بلکہ نزاکتوں کا تھوڑا بہت احساس ضرور تھا۔ پھر بھی وقتی تاثر اور موقع کی رنگینی کی وجہ سے وہ اس کی نگاہوں سے چھلکتے جذبوں کی لپیٹ میں بے طرح آ چکی تھی۔

یہی وجہ تھی کہ جونہی ارادی یا غیر ارادی طور پر نظر اس کی طرف اٹھتی وہ یا تو فوراً پلکوں کی چلمن گرا لیتی یا پھر نگاہ کترا کر کسی اور طرف دیکھنے لگتی —

اور ادھر وہ تھا کہ —

نگاہوں ہی نگاہوں میں اسے اس کے پورے وجود سمیت اپنے اندر اتارنے کو بے تاب ہوا جا رہا تھا۔ اور جواب میں وہ نگاہوں کی زبان میں بات کرنے سے بھی گریز کر رہی تھی — اور نگاہیں جھکائے ریت پر اپنی سفید مخروطی انگلیاں پھیرے جا رہی تھی۔

"میں آپ کے اس گریز کو کیا معنی دوں — کیا سمجھوں سلوطہ — سب کچھ تو آپ کے سامنے کھول کر رکھ دیا ہے — اب کیا چیرے یا تو پھر اپنا سینہ چاک کر کے اپنا دل بھی دکھا دوں — جس میں خون کے بجائے آپ کی محبت دوڑ رہی ہے — آخر کچھ تو کہیں کچھ تو بولیں مجھے یہ خاموشی کی مار کیوں دے رکھی ہے —؟"

اف اس کے لہجے سے ایک کرب سا نمایاں تھا — مگر وہ جواب میں کیا کہتی — مجبوری کے شکنجے میں بری طرح جکڑی ہوئی تھی — اُس کی باتوں سے دل کی جو حالت ہو رہی تھی وہ تو وہی بخوبی جانتی تھی — لبوں پر خاموشی کی مہر لگائے ریت پر انگلیاں پھیر رہی کہ اگر لب کھولتی تو محبت کا سارا فسوں ہی ٹوٹ کر بکھر جاتا — البتہ نگاہوں میں ہزاروں شکوے مچلتے لیے وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس کی خاموشی اور گریز کو ہی مورد الزام ٹھہرا رہا ہے — تب اس نے ایک دم پکا ارادہ کرتے ہوئے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"دیکھیں بھیا کہ آپ کے بقول آپ اس معاملے کو مذاق پر محمول کر رہی ہیں تو یہ ہرگز ہرگز کوئی مذاق نہیں بلکہ حقیقت ہے جی اور خلوص — یہ میری زندگی کا معاملہ ہے — سویٹ ہارٹ! میں آپ کو پوری سنجیدگی اور ہوش و حواس کے ساتھ اپنانے کا تہیہ کر چکا ہوں — اور میں ایک بار جس بات کا تہیہ کر لیتا ہوں —" تب دل میں اٹھتی درد کی شدید لہر کو دبا کر اس نے کچھ کہنے سے پہلے وہ قدرے تیکھے اور شاکی سے انداز میں بولی۔

"تب سے آپ میری مجبوریوں سے اچھی طرح واقف ہیں! اس پر بھی آپ اُلٹا مجھے ہی مورد الزام ٹھہرا رہے ہیں۔" اپنی بات کہتے کہتے اس نے اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ بھی چھڑا لیا تھا۔

"اوہو — یہ مجبوریوں کا رونا آخر آپ کب تک روتی رہیں گی۔ دیکھیں انسان جتنا مجبوریوں کو اپنے اوپر حاوی کرتا جاتا ہے وہ اسی قدر ان کے شکنجے میں جکڑتا جاتا ہے۔ ساری بات ہمت اور حوصلے پر منحصر ہوتی ہے۔ آپ بہادر بنیے تو مجبوریوں کے شکنجے سے خود بخود ہی آزاد ہو جائیں گی۔" "اف تو کیا واقعی اسے کچھ بھی نہیں معلوم —" اُس کی باتوں کی روشنی میں اس نے اندر ہی اندر پریشان ہو کر سوچا — اور سوچ ہی رہی تھی کہ جواب میں کیا کہے کہ اس نے پھر کہا۔

"مگر آخر وہ ایسی کیا مجبوری یا مجبوریاں ہیں — بس یہی بات تو ہے نا کہ پھوپھا جان نے کوئی ناجائز کاروبار کیا تھا جسے ان کے ضمیر نے گوارا نہیں کیا اور یوں ان کے شریک کار ان کے خلاف ہو گئے۔ انہوں نے اپنے انتقام کا نشانہ آپ کو بنایا اور آپ کو اغوا کرنے کی کوشش کی — بلکہ اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہو گئے تھے — مگر پھوپھا جان نے اپنی جان پر کھیل کر آپ کو وقت کے وقت ان کے چنگل سے آزاد کرا لیا — یہی بات تھی — جسے میں محض آپ کی دل آزاری کے خیال سے آپ کے روبرو بیان کرنا نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر آپ نے آج مجھے کچھ مجبور ہی اتنا کر دیا ہے؟"

اف تو اسے واقعی کچھ بھی نہیں معلوم اور جو معلوم بھی ہے تو وہ محض جھوٹ ہے۔

کینہ پرور اور حاسد لوگوں کی بنائی ہوئی ایک من گھڑت داستان ہے۔

"خیر اب تو مہلت گلہ بھی معاف ہو چکی ہے — اب میں نہ آپ کی خاموشی کی پروا کروں گا — نہ شرم یا شرمندگی کا — بس جی کے آتے ہی ان سے آپ کو مانگ لوں گا — قسمیں آپ —"

اف یہ کہہ کر تو جیسے اس نے اُس کے سر پر ایک بھالا سا دے مارا تھا — اگر اُس نے واقعی اپنی ماں سے یہ کہہ دیا کہ میں سلوطہ سے شادی کرنے کا فیصلہ کر چکا ہوں — یا شادی کروں گا تو یقیناً ایک قیامت ہی آ جائے گی۔ جس سے اور کسی کا تو کچھ نہیں بگڑے گا — مگر میں تباہ و برباد ہو جاؤں گی — ایسی ذلیل و خوار ہوں گی کہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہوں گی — اور اس گھر سے تو نکالا ہی مل جائے گا — تو پھر میرا ٹھکانہ کہاں ہو گا۔ کہاں جا سکوں گی میں —

کیا اسفند کے بقول کو مجھے بہر —

اف نہیں نہیں — ایسی کوئی نوبت آنے سے تو بہتر یہی ہے کہ اپنی اس قدر شدت سے چاہنے والی محبوب ہستی کی نظروں میں ذلیل و خوار ہو جاؤں — اس طرح اتنا تو ہو گا کہ میں رسوائی سے بچ جاؤں گی اور کسی کی نظروں میں ذلیل و خوار نہیں بنوں گی — اتنا ہی تو ہو گا کہ یہ مجھ سے بدظن اور متنفر ہو جائے گا — اور ہمیشہ کے لیے میری محبت سے دستبردار بھی — اف اپنی محبت کو —

اپنی جان سے زیادہ عزیز شے کو کوئی اپنے ہاتھوں تو قتل نہیں کرتا —

مگر حالات کی زد سے گزرتی ہوئی سلوطہ اس سفاکی کے لیے بھی تیار ہو گئی تھی — سچ بات کہنا اور حقیقتوں کی نقاب کشائی کرنا بھی کوئی آسان کام نہیں ہوتا —

بلکہ سلوطہ کے جلنے کے عمل کی طرح ہی سخت دشوار گزار اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔ وہ بڑی پر امید اور اشتیاق بھری

نظروں سے اس کے جواب کا منتظر تھا ۔ اور وہ سوچ رہی تھی کہ کہاں سے شروع کرے ۔
کن الفاظ میں کہے ۔
اور کس زبان سے کہے ۔
مگر بھی کو ثمر نے کھنکھنا کر راضی اور شیلا کی آمد سے انہیں مطلع کیا ۔
اور ایک بار پھر سنسناتی شوخ ٹوپی کان کے قریب سے گزر جانے پر وہ اپنی قسمت کو کوستی رہ گئی ۔
مگر اس نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ خواہ اس پار یا اُس پار وہ ساری حقیقت اس پر عیاں کر کے رہے گی ۔
اس طرح اس کے اتنے شدید جذبے اور ظرف کا امتحان بھی ہو جائے گا ۔۔ اسی خیال اور تہیے کے تحت گھر آ کر بھی وہ اسے سنانے کے لیے اپنے حالات اور واقعات کے اُلجھے اور بکھرے سرے جوڑتی رہی ۔

دن کے پانچ بجے کا عمل ہے ۔

پرانی طرز تعمیر پر بنے ہوئے ایک حویلی نما مکان کے عقبی صحن میں چھڑکاؤ کیے جانے کی وجہ سے جگہ جگہ پانی چمک رہا ہے ۔ صحن بہت وسیع اور کشادہ ہے اور گرد و پیش بارہ فٹ اونچی دیوار جس کی منڈیر پر ٹوٹی ہوئی بوتلوں اور کانچ کے ٹکڑے لگے ہوئے دھوپ میں چمک رہے ہیں ۔ صحن کی عقبی سمت ایک بڑا سا لکڑی کا پھاٹک ہے جو عام طور پر بند ہی رہتا ہے ۔ پھاٹک کے بائیں رخ دیوار کے ساتھ ساتھ دور تک کیاریاں بنی ہوئی ہیں جن میں پھل دار درختوں کے ساتھ پھول دار پودے خوشنما بیل بھی اگی ہوئی ہیں ۔ اور دائیں سمت چند فٹ کا فاصلہ چھوڑ کر بالترتیب بیت الخلا ، غسل خانہ اور باورچی خانہ حسب دستور بنا ہوا ہے ۔ دروازے کے بالکل مقابل میں تین سیڑھیاں عبور کر کے چار ستونوں والا ایک طویل برآمدہ ہے ۔ ستونوں کے تینوں درمیانی حصوں پر سبز رنگ کی چقیں پڑی ہیں جو گرمی کی وجہ سے لپیٹ دی گئی ہیں ۔ ستونوں کے آگے مٹی کی سیڑھی تک پھولدار پودوں کے گملے رکھے ہیں ۔ اس برآمدے میں سامنے کی دیوار میں تین دروازے بنے ہوتے ہیں جو غالباً کمروں کے ہیں ۔

برآمدے کے انتہائی بائیں سمت تختوں کا بڑا سا چوکا پڑا ہے جس پر صاف ستھری چاندنی بچھی ہے اور بیچوں بیچ گاؤ تکیہ اور مسند پر گاؤ تکیے سے لگی مرحوم تعلقہ دار مقصود الحسن کی زوجہ شوکت جہاں اپنا تکیے کا غلاف بناتا ہوا بڑا سا پاندان کھولے پان پر کتھا لگا رہی ہیں ۔ انہوں نے انڈا بوسکی کے کرتے ڈی ون (D. ONE) کے لٹھے کا چوڑی دار پاجامہ اور جھینی ململ کا ڈبل پاٹ کا دوپٹہ جس کے کناروں پر مقیش کی سنہری چمک لگی ہے ، جھینی کی ململ بہت ملائم اور باریک ہوتی تھی ، پہن رکھا ہے ۔ کرتے کے گریبان میں پرانی وضع کے طلائی بھاری بٹن ، کانوں میں چھپے بالیاں اور ہاتھوں میں موٹے موٹے طلائی کڑے پہن رکھے ہیں ۔ یہ تو وہ ساٹھ کے پیٹے میں مگر عمدہ صحت اور آسودہ حالی کی وجہ سے اپنی عمر سے چار پانچ برس کم ہی نظر آتی ہیں ۔ ان کی دائیں طرف تھوڑے فاصلے پر ایک کونے میں ایک بہت ہی پرانا ٹیبل فین ہے جو شاید اپنے موجد کی سب سے پہلی ایجاد تھا ۔ گھڑ گھڑ اور کھڑ کھڑ کی ناخوشگوار سی آواز کے ساتھ پوری مستعدی سے چل رہا ہے ۔

تخت کے پاس ہی ایک بڑھیا شوکت جہاں کی ملازمہ مائی رشیدن کسی فکر میں غلطاں اور پیچاں سی بیٹھی ہے ۔ موسم کی

یہ کیسی محبت تھی۔ کیسی اطاعت تھی اور کیسا عشق جب کہ عشق میں تو فنائیت کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ اور عشق بھی ذات اقدس سے جس کی محبت پر اولاد، بہن بھائیوں اور بیوی سب کی محبتیں قربان ہوتی ہیں۔

شوکت جہاں خود کو بہت اللہ والی اور عبادت گزار سمجھتی تھیں۔ سجدے کر کر کے ان کی پیشانی پر گٹے پڑ گئے تھے۔ خدا ترس اور سخی مانی جاتی تھیں مگر کیا فائدہ تھا اس ساری عبادت اور ریاضت کا۔

جب کہ دماغ تو ہمہ وقت دوسروں کے دلوں میں نفاق ڈالنے اور دوسروں کو نیچا دکھانے کی تدبیروں میں مصروف رہتا۔ نیت ٹھیک تھی نہ ارادے نیک۔ وہ اپنی ہی صنف کی ایک کمزور سی لڑکی کا جو قسمت سے ان کی بہو بنی تھی گھر برباد کرنے پر تلی تھیں۔ وہ بھی صرف اس جرم کی پاداش میں کہ اس نے ایک عدد لڑکی کو جنم دیا تھا۔

جب کہ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ اللہ پاک کے نزدیک جس عورت کی پہلوٹھی کی اولاد لڑکی ہو اس کا مقام بلند ہوتا ہے۔ اس مسئلے پر تو بیٹیوں کے ہاں نرمی لڑکیاں ہی لڑکیاں پیدا ہونے پر بڑے ٹھوس دلائل کے ساتھ انہوں نے سسرال والوں کو قائل بھی کیا تھا۔ بلکہ قرآن اور حدیث کے حوالے دے کر سب کے منہ بھی بند کر دیے تھے۔

گو وہ پڑھی لکھی نہیں تھیں مگر قرآن اور ترجمہ پڑھنے کی وجہ سے تھوڑی شد بد ضرور رکھتی تھیں۔

اصل میں ان کے والد حافظ قرآن بھی تھے اور دینیات کے ایک مدرسے میں معلم بھی رہ چکے تھے۔ بس ان ہی کی زبانی مسئلے مسائل انہوں نے بھی سن رکھے تھے۔ ذہانت کے اعتبار سے کسی سے کم نہیں تھیں۔ اس پر فطرت بھی بہت شاطرانہ پائی تھی۔

اصل میں ان کی رنگت دبی ہوئی سانولی تھی اور ناک نقشہ بھی معمولی سے۔ جب کہ ان کے شوہر شکل و صورت کے لحاظ سے ان سے کہیں بہتر تھے مگر پرانے زمانے میں ایک تو اپنے ہی خاندان کی لڑکی اور لڑکے کو ترجیح دی جاتی تھی۔ صورت شکل کو نہیں شرافت کو دیکھا جاتا تھا۔ اور شوکت جہاں کی اپنے شوہر سے دور پرے کی رشتہ داری بھی تھی۔ اسی لیے یہ سمبندھ کروا دیا تھا اور شوکت جہاں کو اس بات پر بہت ناز تھا کہ انہوں نے اپنے شوہر کے دلی عہد کو حنیر کر دیا تھا۔ جب کی خواہش تھی کہ ایک دو لڑکے اور ہوں۔ اصل میں تو وہ حسن پرست بھی تھے اور شوقین مزاج بھی۔ ایک خاصے بڑے تعلقہ دار تھے۔ دولت اور جاہ و حشم سبھی کچھ تو میسر تھا۔

اس لیے انہوں نے ایک متوسط گھرانے کی خوبصورت لڑکی سے شادی کر کے گویا شوکت جہاں جیسی بے قصور اور باوفا کو نہ معلوم کس جرم کی سزا دی تھی۔ اور یہ خیال کہ مرد ایک دو نہیں دس شادیاں کرنے کا مجاز ہوتا ہے اور بلا قصور اور وجہ بیوی کے دم پر سوت بٹھا سکتا ہے کچھ اتنی مضبوطی سے ان کے تحت الشعور میں جم کر رہ گیا تھا کہ انہوں نے دیور کی دوسری شادی کرانے میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ اور اپنے شوہر کے اور بھی بھتیجے اور بھانجوں کی دوسری شادیاں کرا چکی تھیں۔

اب یہ کیسے معلوم تھا کہ یہ ان کا انتقامی جذبہ تھا یا اپنا کوئی نظریہ۔ بہرحال لباس تو ان کا معقول ہی تھا۔

مس رشیدن سے لوہے کی پیٹی سے سلکن چادر نکلوا کر انہوں نے اپنے شانوں پر پھیلا لی تھی۔ پاندان کی ذمہ داری بھی رشیدن کی تھی۔ چھپا چھب پان بنا کر چاندیوں کے بھاری بٹے اور چھالیہ زردے کے بٹوے سمیت ان کے ہر کار گزنے میں ڈال دی تھی۔

شام تیزی سے سر پر آ رہی تھی۔ اور راستہ بھی دور کا تھا وہ بھی ڈولی کے ذریعے۔ مگر ان کے خیال میں لوہا گرم ہو تو آسانی سے موڑا جا سکے۔ اسی لیے ڈولی میں سوار ہو کر انہوں نے منشی صاحب کی حویلی کا رخ کیا۔

زہرہ کی زچگی قریبی شہر کے واحد میٹرنٹی ہوم میں ہوئی تھی جو ایک پارسی لیڈی ڈاکٹر نے کھولا تھا کیونکہ اس زمانے میں زچگی کے لیے علیحدہ ہسپتال بنانے کا رواج نہ تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ عموماً عورت کی زچگی گھر پر ہی ہوتی تھی اور دائیوں کے ہاتھوں ہی ہوتی تھی۔ البتہ بعض صاحب ثروت لوگ لیڈی ڈاکٹر کے ہاتھوں بھی یہ تخلیقی مرحلہ انجام دلوا لیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں تقریباً سارے ہی کیس یا زچگیاں نارمل ہی ہوا کرتی تھیں۔ کیسا یورین ٹیسٹ اور کیسا بلڈ ٹیسٹ اور الٹراساؤنڈ پھر نشتر زنی یعنی انجکشن وغیرہ۔ تابکاری اثرات اور ملاوٹ سے پاک زمانہ تھا اس لیے زچگی کے کیس میں شاذ ہی پیچیدگی ہوتی تھی۔ البتہ احتیاط سخت کی جاتی تھی۔

ادھر بچے کی ولادت ہوئی اور ادھر کھانے پینے کی ہر چیز ماسوائے چائے یا دودھ کے یا پھر صبح و شام شربت والا جو اگر گسپر سے کہیں زیادہ پرتاثیر ہوتا ہے۔

پھر تیسرے روز صبح نہار منہ گرم دودھ کے ساتھ کیسٹر آئل یا گلیکو پیپرافین کا جلاب دے کر ہلکا پھلکا ناشتہ اور دوپہر کو

بڑی بڑی بھرتی۔ چھٹی کا نہان نہلانے کے بعد البتہ نورتن (نو ترکاریاں) کھلایا جاتا تھا اور کچھ مٹھاس اور پھل بھی کہ ماں کا دودھ پینے والا بچہ ان ساری چیزوں کا عادی ہو جائے۔ پیٹ اور کولھوں پر سوا مہینے تک کس کر پٹی باندھی جاتی تھی تاکہ پیٹ بڑھنے نہ پائے۔ مقوی غذائیں اور بس احتیاط ہی احتیاط۔

ٹھنڈی اور کھٹی کا پرہیز کر دی اور اچار کا تو زچہ کے لیے سوا مہینے تک زہر قاتل ہی ثابت ہوتا ہے۔

پھر زچہ پلنگ سے یوں نقاہت اٹھتی تھی جیسے موت کی وادی کو پھلانگ کر نہیں بلکہ آب حیات کا غسل لے کر آئی ہو۔ مگر زہرہ چونکہ شوہر کے مقابلے میں خاصی کم عمر تھی اور کچھ شروع ہی سے کمزور تھی اس لیے اس کے کیس میں کچھ پیچیدگی پیدا ہو گئی تھی۔ شوہر اس کا دیوانہ تھا۔ اس لیے اسے دائیوں اور بڑی بوڑھیوں کی دواؤں اور ٹوٹکوں پر نہیں چھوڑا تھا بلکہ شہر لے جا کر باقاعدہ لیڈی ڈاکٹر سے اس کا علاج کروا رہا تھا۔

اور اب تو سب سے بچی کی پیدائش ہوئی تھی۔

وضع حمل کے بعد بھی ڈاکٹر اس کی طرف سے مطمئن نہ تھی۔ اس نے مسعود الحسن سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ زچہ کی جان خطرے میں ہے۔ اس لیے مسعود الحسن جو زہرہ کو دل و جان سے چاہتے تھے اس وقت سخت پریشان تھے۔ اور منقل حال کی پریشانی کے خیال سے کہ گزشتہ دوپہر کو انہوں نے زہرہ کو میٹرنٹی ہوم میں داخل کرایا تھا اور بچی اگلی دوپہر کو تولد ہوئی تھی اتنی پریشانی میں بھی وقت نکال کر سہ پہر کو ماں کو اطلاع دینے چلے آئے تھے اور کچھ اس خیال سے بھی آئے تھے کہ اگر نہ آئے تو ماں یہی سمجھیں گی کہ چونکہ لڑکی پیدا ہوئی ہے اس لیے شرمندگی کی وجہ سے بیٹے نے منہ چھپا لیا ہے۔ اور اسی جذبے کے تحت وہ خود کو پہلے سے ہی ان سے بات کرنے کے لیے تیار کر کے آئے تھے۔ کہ انہوں نے عقد ثانی کا شوشا چھوڑ کر ان کی پریشانی میں مزید اضافہ کر دیا۔ کیونکہ وہ اپنی ماں کی فطرت اور رگ و ریشے سے اچھی طرح واقف تھے۔ جانتے تھے کہ وہ جس بات کی ضد کر بیٹھتی ہیں اسے پورا کر کے ہی دم لیتی ہیں اور اگر بات صرف عقد ثانی کے ذکر تک ہی ہوتی تو وہ کچھ عرصے تک اس ذکر کو ٹالتے بھی رہتے۔ حتیٰ کہ ان کا وہ ولولہ ٹھنڈا پڑ جاتا۔ مگر انہوں نے تو بذر انشاء کی صورت میں اپنے ارادے کی پختگی بلکہ اپنے ارادے پر جلد از جلد عمل درآمد کرنے کا اعلان کر دیا تھا۔ نہ صرف یہ کہ بلکہ دودھ نہ بخشنے کی دھمکی بھی دے ڈالی تھی۔

مسعود الحسن جاگیرداروں رئیسوں کی اولاد تھے۔

بہت زیادہ پڑھے لکھے تو نہ تھے مگر شعر و ادب سے شغف ضرور رکھتے تھے۔ گو اپنے آبا و اجداد کی سی آن بان ان میں نہیں تھی مگر بہت بردبار، خاموش طبع اور سادگی پسند تھے۔

بالکل ایسے مردوں کی طرح جو زیادہ سات پانچ کرنے کے عادی نہیں ہوتے لیکن دوسروں کی سات پانچ کے پھیر میں جلدی آ جاتے ہیں۔ اصل میں ایسے مردوں کی قوت فیصلہ کمزور ہوتی ہے۔ اسی لیے ان کی طبیعت میں ضعف ہوتا ہے اور بیٹے کی اس کمزوری سے شوکت جہاں بخوبی واقف تھیں۔ زہرہ شوکت جہاں کی ہی پسند تھی۔ صورت و سیرت بلکہ ہر لحاظ سے لاجواب۔ تین برس قبل وہ اسے بڑے چاؤ سے بیاہ کر لائی تھیں۔ ارمان کا بس نہیں چلتا تھا کہ نو مہینے ہی وہ ایک عدد پوتا ان کی گود میں ڈال دے۔ مگر شاید کسی اندرونی خرابی کی وجہ سے پورے ڈھائی برس تک تو امید ہی نہ ہوئی۔ اور وہ بہو کی طرف سے ناامید سی ہو گئیں۔ پھر ایک روز بڑے غیر متوقع طور پر یہ مژدۂ جانفزا سننے میں آیا کہ خیر سے بہو کا پیر بھاری ہو گیا ہے۔ ساس کے ارمانوں کی مرجھائی ہوئی کلی کھل اٹھی تھی۔ اب تو جوں جوں دن گزرتے جاتے، وہ بہو کو دیکھ دیکھ کر دیکھتیں کہ بہو کون سا پیر پہلے اٹھاتی ہے۔

کون کون سی چیز طبیعت قبول نہیں کرتی۔

کون سی چیز رغبت سے کھاتی ہے اور مزید بھی کئی بیٹا ہونے کی علامتیں۔

غرض ہر علامت کی تصدیق صد بیٹے کی نوید دے رہی تھی۔

مگر وقت آنے پر وہی مثل ہو گئی کہ کھودا پہاڑ اور نکلا چوہا۔

شوکت جہاں کے تو سارے اندازوں اور حساب پر پانی پھر گیا تھا۔

حالانکہ وہ زہرہ کو اگرچہ خود بیاہ کر لائی تھیں۔ مگر ان کا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا کہ ان کا اکلوتا اور لاڈلا بیٹا اس کے نام لکھ دیا جائے اور اس کا غلام بن کر رہ جائے۔ جب کہ زہرہ کو بہو بنانے میں بھی ان کی ایک مصلحت کارفرما تھی اور وہ یہ تھی کہ زہرہ کے گھر والے بہت شریف اور خاندانی لوگ تھے لیکن اوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور اوسط طبقہ بھی وہ جس کے منہ پر

"بس کچھ عادت سی پڑ گئی ہے اماں!" انہوں نے کسی سوچ میں ڈوبے ڈوبے کہا۔
"کہیں جانے کا ارادہ ہے؟" ماں نے دبی زبان سے پوچھا۔
"نہیں، ابھی تو نہیں۔ البتہ رات کو ضرور جاؤں گا۔" وہ بجھی بجھی سی آواز میں بولے۔
"کیا ہسپتال؟" ماں نے پوچھا۔
"جی ہاں۔ ظاہر ہے وہیں۔" وہ قدرے چونک کر بولے۔
"اے تو کیا وہاں رات کو ٹھہرنے کی اجازت ہے؟" شوکت جہاں کو بیٹے کا ہر بار اس قدر مائل ہونا خشمگیں رہا تھا۔
"اور کسی کو نہیں لیکن مجھے ضرور ہے۔ کیونکہ زہرہ کے کیس کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے۔"
"اے ہاں، کیا تکلیف ہے بے چاری کو؟" انہوں نے تجاہل سے کام لیتے ہوئے پوچھا۔
"واہ بہت جلد خیال آیا اس کی خیریت پوچھنے کا۔" بیٹے نے پھر طنز کا تیر چلایا۔
"اے تو کیسے پوچھتی کل تو تم بیٹی ہونے کے صدمے میں مبتلا تھے۔ اور پھر جاپے اور زچگیاں تو آئے دن ہوتی رہتی ہیں۔ کچھ خرابیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں تو ان پر بھی کسی نہ کسی طرح قابو پا لیا جاتا ہے۔" شوکت جہاں بیٹے کے طنز پر جل کر بولیں۔
"اچھا۔ اگر بیٹی کے بجائے بیٹا ہوتا تو کیا اس وقت بھی آپ یہی کہتیں؟" مسعود الحسن نے مسکرا کر پوچھا۔
"ہاں، تو اور کیا کہتی۔ اے کیا میرے یہاں اولاد نہیں ہوئی۔ تمہاری بہنوں کے یہاں اولادیں نہیں ہوئیں۔ یہ کوئی دنیا سے نرالی اور انوکھی بات تو نہیں ہے۔ یہ وقت تو ساری عورتوں پر آتا ہے۔"
"خیر آتا ہوگا مگر زہرہ پر تو مصیبت بن کر ہی آیا ہے۔ اور بیٹی ہونے کا مجھے تو ذرا سا بھی ملال نہیں۔ بلکہ میں تو بہت خوش ہوں اور اگر میری قسمت میں یہی ایک بیٹی بھی لکھی ہے تو میں اس کی بیٹوں کی طرح ہی پرورش کروں گا۔"
"اے خدا نہ کرے جو تمہاری قسمت میں یہی ایک بیٹی لکھی ہو۔ یہ تو تمہاری ہی مرضی اور اختیار پر موقوف ہے۔ تم چاہو تو تمہیں دوسری جگہ بھی بہتر مل سکتا ہے۔ اے اللہ رکھے تم تو مرد ہو۔ تمہیں نہ تو عورتوں کی کمی ہو سکتی ہے اور نہ ہی اولاد کی۔"
"اُفوہ! اماں — پھر وہی ذکر۔" وہ جھنجلا کر بولے۔
"ہاں تو اس ذکر کے سوا اور تم سے کہوں بھی کیا۔ عقل سے کام لے کر ٹھنڈے دل سے سوچو۔ چلو ایسا ہی ہے تو زہرہ کو طلاق نہیں دینا۔ تمہارے بابا بھی مجھ پر سوت لے آئے تھے اور تمہارے چچا نے بھی یہی کیا تھا۔ ہمارے یہاں تو کوئی معیوب بات نہیں ہے۔"
ماں کہتی رہیں اور وہ جانے کے گھونٹ لیتے خاموشی سے سنتے رہے کہ ماں کی عادت سے واقف تھے۔ وہ اب مؤقف پر ڈٹ جانے کی عادی تھیں۔ اور پھر کہاں تک ان کی بات کی نفی کرتے — اور ان کی خاموشی سے ماں سمجھیں کہ ان کا جادو چل گیا ہے۔ بڑی لجاجت سے بولیں۔
"ہاں ہاں اچھی طرح سوچ لو۔ لڑکی کی ایک جھلک تم نے دیکھ لی ہے اور نہیں بھی دیکھی تو میں تمہارے سامنے اسے ہی لا کھڑا کر دوں گی۔ ایمان سے لعل بدخشاں ہے وہ تو۔ ایسا نادر دانہ ڈھونڈے نہ ملے گا۔"
"لاحول ولا — اماں! کیسی باتیں کرتی ہیں آپ — آپ تو اس طرح کہہ رہی ہیں جیسے پرانے زمانے میں بردہ فروش بولیاں لگاتے تھے۔ ویسے ہوں گی تو وہ — اچھی ہی۔ کیونکہ سارا خاندان ہی خوبصورت ہے۔" بیٹے نے کچھ سوچ کر اور کچھ چڑ کر کہا۔ تو شوکت جہاں کی جیسے بن ہی آئی۔
"قمرو تو یکتا ہے اپنے خاندان میں۔ جا اگر اسے دیکھنا — چاہے تو میرے کمرے میں کسی کام کے بہانے چلا جا۔ تجھے مجبور تو نہیں کر رہی کہ صرف اسی سے شادی کر۔ مگر کم از کم اسے اچھی طرح دیکھ تو لے۔"
"نہیں نہیں۔ توبہ کریں اماں! اب میں ایک پردہ نشین کے تقدس کو یوں دھوکے سے پامال کرنے سے تو رہا۔ اب گھر آئی ہیں تو کبھی تو آمنا سامنا ہو ہی جائے گا۔" وہ گھبرا کر بولے۔
"اے کوئی ہمیشہ کے لیے تھوڑی یہیں ہو رہے گی اسے کی غرض سے تو نہیں آئی ہے بے چاری۔ بس زیادہ سے زیادہ کل شام تک۔"

رہ جائے گی۔ اتنی مشکلوں سے پھوپھی جان کو پٹا کر تو لائی ہوں اسے۔" مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔
"اچھا ٹھہرو۔ میں ابھی آتی ہوں۔" شوکت جہاں کسی خیال سے اٹھتی ہوئی بولیں۔ وہ فوراً ہی کمرے سے نکل گئیں۔ وہ حیران و ششدر بیٹھا رہ گیا۔ شاید وہ یہی سمجھا کہ ماں بدرالنساء کو لینے گئی ہیں۔ اور اسی خیال سے اس کے پسینے چھوٹنے لگے۔ مگر جب کچھ ہی دیر بعد ماں ہاتھ میں ایک پوٹلی سی لیے تنہا ہی کمرے میں واپس آئیں تو ان کی جان میں جان آئی۔
"یہ پوٹلی سنبھالو۔ اس میں بمبئی کے کاریگروں کے ہاتھ کے بنائے ہوئے طلائی کنگن ہیں۔ بڑی نادر چیز ہے یہ۔" اور انہوں نے بے یقینی کی طرح ان کے ہاتھ سے وہ پوٹلی لے کر ان کی طرف دیکھا۔
"اے — اس طرح منہ کھولے کیا دیکھ رہے ہو۔ ان کی کچھ خبر نہیں کب چلی جائے۔ اس سے یہ کہنا کہ چونکہ تم پہلی بار یہاں آئی ہو اس لیے ہماری یہ رسم ہے کہ ہم آنے والے کو خالی ہاتھ جانے نہیں دیتے اور میں —" مگر وہ تو اچھل کر کھڑے ہو گئے۔
"نہیں نہیں اماں، معاذ اللہ — میں ایسی جرأت کبھی نہیں کر سکتا۔ آپ کو دینے کا اتنا ہی شوق ہے تو خود ہی دے دیجیے۔"
"اے لو۔ ایک بیٹی کا باپ ہو گیا اور پھر بھی کم سن لڑکوں کی طرح بدکا جا رہا ہے۔ اے ہے! یہ تو تیرے خاندان کے وقار اور عزت کی بات ہے۔ خیر — چل، ایسا ہی ڈرپوک ہے تو لا مجھے دے یہ پوٹلی۔ اور میرے ساتھ چل۔" شوکت جہاں کے زرخیز دماغ نے وہیں کھڑے کھڑے کوئی اور ترکیب سوچ لی۔
"لیکن میرا آپ کے ساتھ جانا ایسا کیا فرض ہے — اور میں تو یہاں تھوڑی دیر آرام کرنے کی غرض سے آیا تھا۔ ساری رات پریشانی میں آنکھوں میں کاٹنی پڑی تھی۔" بیٹے نے گویا ان کے ساتھ نہ جانے کا عذر پیش کرتے ہوئے کہا۔
"اے تو آرام بھی کر لینا۔ کوئی میں تمہیں اس پر پہرہ دینے کی غرض سے تو نہیں لے جا رہی۔ اور میں تو اسے یہیں بلا لیتی لیکن یہ اخلاق سے گری ہوئی بات ہے اس لیے نہیں بلایا۔ آؤ — چلو تو کسی طرح۔" ماں نے یوں کہا جیسے سخت عاجز آ چکی ہوں۔
"اچھا اماں چلا بھی جاؤں گا مگر ابھی نہیں۔ پہلے ذرا خود کو تیار تو کر لوں۔ آپ نے تو خواہ مخواہ اس معاملے کو تماشا ہی بنا لیا۔" مسعود الحسن کو آخر گھٹنے ٹیکنے ہی پڑے مگر یہ وہ بھی جانتے تھے کہ ماں کو ٹالنے کا محض ایک بہانہ تھا۔ کیونکہ بیٹے کو رضامند دیکھ کر اب ان کی کلی کھل اٹھی تھی اور انہوں نے بیٹے سے مزید اصرار کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ بلکہ وہ پوٹلی لے کر واپس چلی گئی تھیں۔
ماں کے جانے کے بعد — وہ بستر پر اطمینان سے لیٹ کر ماں کی باتوں پر دیر تک غور کرتے رہے۔ وہ اگر کسی غلط اقدام کے لیے انہیں مجبور بھی کر رہی تھیں اور وہ اس پر بالکل تیار بھی نہ تھے۔ تب بھی سوچنے اور غور کرنے کے دوران وہ حسن ان کی آنکھوں میں بار بار جھلکیاں مار رہا تھا کہ حسن کا ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ وہ اگر صاف طور پر آنکھوں کے سامنے آ جائے تو انسان اسے بار بار دیکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور اگر ایک ہلکی سی جھلک دکھا کر غائب ہو جائے تو انسان کے احساسات و جذبات میں ایک تڑپ سی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن جونہی کوئی ایسا احساس ابھرتا مسعود الحسن فوراً ہی اپنے خیالات کا رخ زہرہ کی طرف موڑ دیتے۔ یوں بھی اتنی حسین بیوی کو جن کے حسن کی ہر بار کی سے وہ آشنا تھے کس طرح فراموش کر دیتے۔
مگر ہوا کچھ یوں کہ جب دو تین گھنٹے — دلیلنے کے بعد ڈھلتی ہوئی شام میں یا رات کے اولین پہر کے آغاز میں ان کی آنکھ کھلی تو دیوار پر آویزاں گھڑیال پر نظر پڑتے ہی وہ گھبرا کر جلدی سے اٹھ کھڑے ہوئے کہ سوئیاں آٹھ بج جانے کا اعلان کر رہی تھیں اور چونکہ بازار سے زہرہ کے لیے چند بہت ہی ضروری انجکشن اور ادویات خریدنی تھیں۔ اس لیے وہ جلد جلد تیار ہو کر برآمدے میں آئے تاکہ ممدو یا کسی ملازم سے کہہ کر گاڑی تیار کرائیں۔ وہ ممدو کو آواز دینے ہی والے تھے کہ سامنے ہی کچھ فاصلے پر انہیں وہ نظر آ گئی۔ برآمدہ ہری موی شمعوں سے روشن تھا اور اب — ہزار پردوں میں چھپا حسن ان کے سامنے بے نقاب ہو گیا تھا۔
گورا رنگ — سڈول جسم — چاندی کی طرح دمکتی ہوئی رنگت — محجوب اور سراسیمہ سا انداز۔ اُف وہ تو لعل بدخشاں تھی۔ انہیں اس سے پہلے کبھی کوئی ایسا طرحدار چہرہ نا بہت ہوئی تھی۔ چند ثانیوں کو تو وہ نظر جھپکانا ہی بھول گئے۔ مگر پھر ایک دم ہی کچھ

خاتون بھی قدم بڑھا کر عین دروازے کے آگے آکر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اور اس شخص سے کہتی ہے۔

"اچھا اب تم جاؤ دینو بابا!" خاتون نے گٹھڑی سینے سے لگا رکھی تھی۔

"ارے چلا جاؤں گا۔ بہو بیگم۔ پہلے آپ کو اندر تو پہنچا دوں۔" دینو کہتا ہے۔

"نہیں نہیں تم جاؤ اگر یہ تانگے والا چلا گیا تو پھر اس خراب موسم میں تمہیں صبح سے پہلے یہاں کوئی سواری نہیں ملے گی۔" خاتون کہتی ہے۔

"پر بہو بیگم پہلے یہ تو دیکھ لوں کہ اندر کوئی ہے بھی یا نہیں۔ سارا گھر تو اندھیرے میں ڈوبا پڑا ہے۔"

"خیر ہو لوگ تو سب ہی مگر سو رہے ہوں گے اور ممکن ہے بجلی فیل ہو گئی ہو یا بارش کی وجہ سے کٹی ہو۔" خاتون کہتی ہے تو تانگے والا جو اس اثنا میں لگام کھینچ کر تانگے کا رخ اسی سمت موڑ چکا ہے جدھر سے آیا تھا بہت کرخت لہجے میں دینو سے کہتا ہے۔

"ارے بابا جلدی کرو میرا تو یہ روزی کمانے کا وقت ہے اگر گاڑی نکل گئی تو؟"

"ارے اتنی تو افراتفری کیا پڑی ہے بھیا۔ جتنا قسمت میں لکھا ہوتا ہے انسان اتنا ہی کماتا ہے۔ اب بہو بی کو ایسے غیر وقت اکیلا چھوڑ کر بھی تو نہیں جا سکتا میں۔" دینو نے کہا۔

"اب یہ تیرا جھگڑا ذمہ ہے بابا میرا تو نہیں۔ بھلا اتنے خراب موسم اور رات کے وقت پورے تین گھنٹے کا کرایہ ایک روپیہ بھی کوئی دے گا۔ کوئی اسی (اشرفی) تو نہیں۔ چلتے ہو تو چلو ورنہ" تانگے والا ترش لہجے میں بولا۔

"ہاں ہاں بابا! تم چلے جاؤ۔ یہ میرا ہی گھر ہے۔ اپنی عمر کے چھ برس کے علاوہ سترہ برس میں نے یہیں رہ کر گزارے ہیں۔ تم میری فکر نہ کرو۔"

خاتون کی آواز سے کرب سا نمایاں تھا۔

"اچھا بیٹیا۔ خدا آپ کو سکھی رکھے۔" دینو نے تانگے کا رخ کرنے سے پہلے گلوگیر لہجے میں کہا۔ اور پھر سلام کر کے تانگے کی طرف مڑا تو خاتون نے ایک تھیلی سے ایک ایک روپے کے دس سکے نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"لو بابا۔ یہ تمہارے کرائے کے پیسے ہیں ان میں سے دو روپے اس تانگے والے کو دے دینا۔ بے چارہ اس خراب موسم میں بھی ہمیں یہاں تک لے کر آگیا۔"

"لے کر آگیا تو کیا مفت آگیا۔ ایک روپیہ لے گا کرائے کا جبکہ آٹھ آنے لگتے ہیں۔"

دینو نے خاتون کے ہاتھ کی طرف کوئی توجہ ہی نہیں دی تھی وہ تو دو روپے کرائے کا سن کر ہی چونک اٹھا تھا۔

"اچھا خیر میری یہی مرضی ہے تم اسے دو روپے ہی دینا۔ لو اب کسی طرح یہ پیسے تو سنبھالو۔" خاتون دینو کی ادا سے زچ سی ہو کر بولی۔

"لا بیٹی بسم اللہ۔" دینو نے پیسے اس کے ہاتھ سے لے کر گنے اور پھر ہتھیلی پر رکھ کر متعجب سے انداز میں بولا۔

"اتنے سارے روپے بہو بیگم۔ نہیں نہیں یہ میں نہیں لوں گا۔ بس دو روپے ہی کافی ہیں واپسی کا کرایہ تو پہلے ہی دے چکی ہیں۔"

"نہیں دینو بابا یہ تمہیں لینے ہی ہوں گے تم نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ مگر میں تمہیں یہ آٹھ روپے انعام دے رہی ہوں تمہارے احسان کا بدلہ نہیں اتار رہی۔"

خاتون نے کچھ اتنے اصرار سے کہا کہ دینو کے لیے مزید انکار کی کوئی گنجائش ہی نہ رہی۔

"ارے بابا اب چل بھی چکو کسی طرح۔" تانگے والا انتہائی بیزاری کا اظہار کرتا ہوا بولا۔ تو دینو خاتون کو ایک رخصتی سلام کر کے اور ڈھیروں ہزاروں دعائیں دیتا تانگے میں جا بیٹھا۔ خاتون ڈبڈباتی آنکھوں سے کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر دروازے کی طرف مڑ کر اس نے دستک دی۔ پہلے آہستہ اور پھر زور زور سے مگر اندر کا سناٹا اس کا منہ چڑاتا ہی نظر آتا۔

"افت کیا سب لوگ مردوں سے شرط باندھ کر سو رہے ہیں یا کہیں ایسا تو نہیں کہ سب کہیں گئے ہوئے ہوں۔" عاجز سی ہو کر سوچنے لگی۔

یوں بھی رات کا وقت اور ہو کا عالم۔ ادھر ہاتھوں میں اٹھائی وہ گٹھڑی جسے وہ کسی متاع عزیز کی طرح سینے سے لگائے کھڑی تھی اب سنبھالنی مشکل ہو رہی تھی۔

ادھر یہ خوف اور خطرہ بھی دامن گیر تھا کہ اگر کوئی ایسا ویسا اس طرف آنکلا تو اس سناٹے اور تنہائی میں کوئی ہانک پکار سننے والا ہوگا۔ آخر کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اس نے الٹے ہاتھ سے گٹھڑی کو سنبھالا اور سیدھے ہاتھ سے زمین پر پڑا ایک بڑا سا پتھر اٹھا کر تقریباً کواڑ توڑ دینے کے سے انداز میں دروازے پر مارنے لگی۔ تب کہیں جا کر اندر کہیں سے کچھ ایسی آواز آئی جیسے کوئی کنوئیں سے بول رہا ہو۔ کہ بات تو سمجھ میں نہ آئی مگر آواز ضرور سمجھ میں آگئی کہ اس کے لیے مانوس تھی۔ جسے سن کر اسے اتنا اطمینان ہوا کہ اندر جاگ ہو گئی ہے اس کے باوجود بھی وہ مسلسل دستک دیتی رہی۔

"ارے بھئی کون ہے۔ ذرا صبر سے کام لو۔" کچھ ہی دیر بعد وہی مانوس سی مردانہ آواز بتدریج دروازے کی دوسری سمت سے آئی۔ یہ اس کے والد مظفر حسین کی آواز تھی جو ایک ٹانگ سے معذور تھے اور بیساکھی کے سہارے چلتے تھے۔ بعد مدت باپ کی آواز سن کر آنسوؤں کا ایک گولا سا اس کے حلق میں پھنس گیا تھا اس لیے جواب میں وہ ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکال سکی۔

"کون ہے بھئی اتنی رات گئے۔ اپنا نام تو بتاؤ۔" باپ نے پھر پوچھا۔ تب اپنی ریزہ ریزہ سی ہوتی کیفیت پر بمشکل قابو پا کر خاتون نے پھنسی پھنسی سی آواز میں آہستہ سے کہا۔

"میں۔ میں ہوں ابا میاں۔ میں۔ زہرہ ہوں۔"

"ہائیں کیا کہا۔ زہرہ۔ زہرہ۔" ایک لمحہ ضائع کیے بغیر دروازہ کھٹ سے کھولتے ہوئے باپ نے گویا اضطراب میں غوطے کھاتے ہوئے پوچھا۔

"زہرہ تم۔" دروازہ کھولنے کے بعد بیٹی کو آنکھوں کے سامنے کھڑا دیکھ کر بھی مظفر حسین کے استعجاب میں کمی نہیں آئی بلکہ اس استعجاب میں تجسس بھی شامل ہو گیا۔ ادھر زہرہ جو اپنے آنسو پینے کی کوشش میں پوری لرز رہی تھی۔ ایک لفظ بھی منہ سے نہ کہہ سکی۔ حتیٰ کہ باپ کو سلام تک کرنا بھول گئی۔

اتنے ناوقت وہ بھی بالکل تنہا ایک کسمپرسی کے عالم میں جوان اور بیاہتا بیٹی کو دروازے پر کھڑا دیکھ کر مظفر حسین کا ماتھا ضرور ٹھنکا تھا مگر انہوں نے اپنی تشویش اور پریشانی کا اظہار اس پر نہیں کیا بلکہ گردن اونچی کر کے اس کے پیچھے باہر دیکھتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

"آؤ۔ آؤ اور کون آیا ہے تمہارے ساتھ۔؟"

اور اس سوال پر تو زہرہ کے دل کے زخموں کے گویا سارے ٹانکے کھل گئے۔ وہ تڑپ کر باپ کے سینے سے جا لگی۔ اور پھر ضبط کے سارے بند ٹوٹ گئے۔ ہچکیوں اور سسکیوں کے ساتھ اشکوں کا سیل سا بہاتی ہوئی بولی۔

"ابا میاں میرے ساتھ میری سیاہ بختی ہے اور کون آسکتا تھا۔ میں تو۔ میں تو۔" اشکوں کے ابلنے نے مزید کچھ کہنے کے قابل ہی نہ رکھا۔

مظفر حسین تو اسے دیکھتے ہی سمجھ گئے تھے کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ اب جو اس کی بات سنی تو اپنے لرزتے ہوئے ہاتھ سے آہستہ سے اس کے سر کو تھپک کر بولے۔

"صبر سے کام لو بیٹی اور اندر اپنی ماں کے پاس چلو۔ میں ابھی تمہارا یہ سامان بھی اندر رکھوائے دیتا ہوں۔"

یہ بات کہتے ہوئے ان کی آنکھوں کے گوشے نم سے ہو گئے تھے۔ زہرہ نے بھی خود کو بدقت تمام سنبھالا اور اپنے آنسو پونچھتی ہوئی ان کے سینے سے الگ ہی ہوئی تھی کہ ایک ادھیڑ عمر خاتون جو غالباً زہرہ کا بڑھاپا کھائی ہوئی تصویر تھیں ڈیوڑھی میں داخل ہوئیں۔

"ارے چیختے چیختے حلق چھل گیا۔ مگر آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آدھی رات گئے کون آیا ہے۔" تب بھی مظفر حسین نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خود ہی قدم بڑھا کر ان کے نزدیک آگئیں اور ڈیوڑھی میں جلتے ہلکی پاور کے بلب کی نیم روشنی میں زہرہ کی طرف غور سے دیکھا۔

"ارے یہ تو میری زہرہ ہے۔ ہے نا منے صاحب؟" اور جواب میں زہرہ بلکتی ہوئی ان کے سینے سے جا لگی۔

گویا ایک طرح سے وہ ٹیبل لگا رہی تھیں۔
اصل میں تو وہ اپنے شوہر کی منتظر تھیں۔
جن کی آمد — کسی لمحے بھی متوقع تھی۔
ان کے شوہر گذشتہ ڈھائی تین ماہ قبل اپنے قریب المرگ والد کی طلبی پر ہسپتال ہوکر انڈیا گئے ہوئے تھے۔
میں انہوں نے خط کے ذریعے اپنی بیوی کو اپنے والد کے رحلت کر جانے کی اطلاع دی تھی اور پھر فون پر اپنی آمد کی اطلاع۔ لکھا تھا کہ بس آج شام کی گاڑی سے دہلی روانہ ہو رہا ہوں۔ اور وہاں سے جہاز کی سیٹ بک کرا کے روانہ ہو جاؤں گا۔ اس حساب سے تو گذشتہ دو روز قبل ہی انہیں آجانا چاہیے تھا۔ اور وہ پچھلے دو روز سے ڈرائیور کو کار دے کر ایئرپورٹ بھیج رہی تھیں۔ بلکہ پہلے روز تو خود بھی ایئرپورٹ گئی تھیں۔ مگر بعد میں صرف ڈرائیور کو بھیجنے پر اکتفا کیا تھا۔ اور آثار آج بھی کہہ رہے تھے کہ ان کے آنے کا امکان باقی نہیں رہا ہے کیونکہ ان کے آنے کا وقت نکل چکا تھا۔ اور خاتونِ خانہ کا اضطراب خفگی اور کوفت میں بدل گیا تھا۔ کیونکہ وہ سخت بدگمانی کا شکار تھیں۔
گو فطرتاً وہ شکی مزاج نہیں تھیں۔ نہ ان کے شوہر ہی شوقین مزاج اور ادھر اُدھر تاک جھانک کرنے والے۔ بس ان کے حالات نے ہی انہیں کچھ شکی مزاج بنا دیا تھا۔
بچپن میں ہی جب ان پر چاروں طرف سے لاڈ پیار کی بارش ہو رہی تھی تو قدرت نے ماں جیسی نعمت کو ان سے چھین لیا تھا۔ تب باپ ہی سے انہوں نے اپنی ساری توقعات وابستہ کر لی تھیں۔ دوسرے معنوں میں لاڈ پیار، محبت اور توجہ کی متمنی تھیں۔ مگر وہ ماں کا کفن میلا ہونے سے قبل ہی دوسری شادی رچا بیٹھے تھے۔
تین بڑے بھائی تھے۔
جان چھڑکنے اور اپنی شفقتیں نچھاور کرنے والے۔
لیکن چونکہ ان سے کافی بڑے تھے اور پھر بچپن ہی سے باپ کی سخت گیری اور غفلت سے بھائیوں کا رعب بھی ان کے دل میں بیٹھ گیا تھا۔ اس لیے وہ کبھی ان سے کھل نہ سکی تھیں۔
انہیں دیکھ کر تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ان کا کچھ چھن گیا ہو۔
یا پھر وہ خود کہیں گم ہو گئی ہوں۔
پھر جب وہ سنِ بلوغت کی حدود۔ کو چھونے لگیں تو سب سے زیادہ جان چھڑکنے والے بڑے بھائی اس وقت کب کے بیرونِ ملک سدھار چکے تھے۔
منجھلے بھائی نے بھی شادی کر لی تھی اور چھوٹے بھائی جو کہ زیرِ تعلیم تھے تعلیم مکمل کرنے کی غرض سے اسٹیٹس چلے گئے اور اپنے غم پالنے کے لیے وہ خود ہی رہ گئی تھیں۔
پھر جوان ہوئیں تو متمول گھرانے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ہی شاید ادھر اُدھر سے ان کے پیغامات آنے شروع ہو گئے۔
والد چونکہ اس وقت تک حیات تھے۔
اس لیے انہوں نے ان کی شادی ایک ایسے شخص سے کر دی جو ایک اعلیٰ اور شریف خاندان سے تعلق رکھتا تھا لیکن رنڈوا تھا۔
دوست کا بیٹا تھا اور اس کے ساتھ یہ المیہ پیش آیا تھا کہ اس کی بیوی جو اس کی سگی چچا زاد اور منگیتر بھی تھی ایک حادثے کا شکار ہو کر شادی کے چھ سات ماہ بعد ہی چل بسی تھی۔ اور وہ شخص بھی اپنی محبوب بیوی کی یادوں اور محبت کے سہارے اپنے بقیہ زندگی گزارنے کا تہیہ کر چکا تھا۔ اور عقدِ ثانی پر کسی طرح آمادہ ہی نہیں ہوتا تھا۔
لیکن اس شخص کے والد کی خواہش تھی کہ ان کے بیٹے سے ان کا کوئی وارث پیدا ہو جس سے آیندہ ان کی نسل چلتی رہے۔ اور کچھ اس شخص کے المیے کے پیشِ نظر بھی کہ وہ دنیا کو تیاگ کر ہی نہ بیٹھ جائے باپ نے بالآخر پانچ برس بعد اسے عقدِ ثانی پر آمادہ کر لیا۔ لیکن وائے افسوس کہ دوسری بیوی اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت سے بے بہرہ

کی وجہ سے بیوی کا میڈیکل چیک اپ کیا گیا تھا۔ شوہر نے خود اپنا کرایا تھا۔ پھر بھی تہمت ہمیشہ بیوی نے اپنے ہی سر لی تھی۔ جبکہ وہ شخص علی گڑھ کالج سے بی اے کا سند یافتہ تھا۔ روشن خیال اور دینی اقدار کا حامل بھی۔ اس معاملے میں وہ بیوی کو ہی دوش دیتا تھا۔
پھر بھی بزرگوں اور دوستوں کے بہت کہنے سننے اور سمجھانے بجھانے کے باوجود اس نے تیسری شادی نہیں کی تھی۔
یوں بھی باپ کے پیہم اصرار اور پوتے کی خواہش کو پورا کرنے کی غرض سے ہی اس نے یہ دوسری بیوی کا جھنجٹ اپنے سر لیا تھا ورنہ اسے دوسری شادی کی خواہش تھی نہ بچے کی تمنا۔ بلکہ وہ تو دوسری شادی کرنے کی حماقت کر کے ہی پچھتا رہا تھا۔ اور زبان سے نہ سہی اپنے رویے اور انداز سے وہ بیوی پر ظاہر بھی کرتا تھا کہ اس سے شادی کر کے اس نے جیسے اس پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔
بیوی خود بھی اس کے احسان تلے پسی جا رہی تھی۔
شروع سے ہی دونوں کے ازدواجی تعلقات ناخوشگوار تھے۔
کیونکہ شروع دن سے دونوں کے درمیان ایک جھجک اور اجنبیت سی حائل ہو گئی تھی۔ یوں بھی وہ شخص کچھ تنہائی پسند تھا۔
اور بیوی پر ہمیشہ یہی جتانے کی کوشش کرتا کہ یہ زبردستی کا سودا ہے۔ اور ہمیشہ اپنی مرحومہ بیوی کا سوگ مناتا ہوا نظر آتا تھا۔
گو اس میں شک نہیں کہ اسے اپنی مرحومہ بیوی سے بہت محبت تھی۔
لیکن گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ پورے آٹھ برس کے طویل عرصے میں وہ اس کے لیے حکایتِ پارینہ بن چکی تھی۔ کہ یوں بھی وقت میں یہی تو ایک خوبی یا خرابی ہوتی ہے کہ ——————— معروضی دھارے کے ساتھ ساتھ حالات میں بھی تبدیلی پیدا کرتا چلا جاتا ہے۔ گزرے ہوئے کل میں جو گزر جاتا ہے وہ حال اور پھر مستقبل کی تیز دوڑ میں بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔
البتہ کچھ ایسی کچھ یادیں ایسی ہوتی ہیں جو پھانس کی طرح دل میں اتر جاتی ہیں اور بری طرح کھٹکتی رہتی ہیں۔
تو اس شخص کے دل میں بھی وہ کھٹک باقی تھی۔
کچھ اس وجہ سے بھی کہ جبریہ عقدِ ثانی کرنے کے بعد بھی وہ اپنا گوہرِ مقصود حاصل کرنے میں ناکام رہا تھا۔
اور کچھ اس لیے بھی کہ دوسری زبردستی سر پڑی بیوی صاحبہ ثروت تھی۔
جبکہ مالی اعتبار سے وہ شخص کم مائیگی کا شکار تھا۔ باپ کو دادا کی طرف سے کوئی معقول ورثہ نہیں ملا تھا کہ دادا کا مال دولت شاہ خرچی اور عیاشیوں کی نذر ہو گیا تھا۔ سوتیلی ماں یعنی باپ کی پہلی بیوی کی تعلقدار مقصود الحسن کی منجھلی بیٹی تھی کہ لیے اولاد نرینہ کے حصول کی خاطر اس کے باپ نے عقدِ ثانی کر لیا تھا۔ تب کہیں جا کر دوسری بیوی کے بطن سے یہ شخص پیدا ہوا تھا۔
پہلی بیوی یعنی مقصود الحسن کی منجھلی بیٹی تو جہیز کی صورت میں جو مال و متاع ساتھ لائی تھیں وہ ان کی بیٹیوں کی شادیوں پر اُٹھ گیا تھا۔ اور دوسری بیوی کا تعلق چونکہ اوسط طبقے سے تھا اس لیے وہ صرف ضرورت کی چیزیں ہی ساتھ لا سکی تھیں۔ ادھر باپ کی وہی مثال تھی کہ رسی جل گئی مگر بل نہ گیا۔ اندر سے کھوکھلے ہو چکے تھے مگر باہر سے اپنا بھرم قائم رکھنے کی خاطر ٹھسے دار زندگی گزارتے رہے۔ دفتر۔ کوئی کام کرنا بھی کسرِ شان سمجھتے تھے۔ چنانچہ جو بچا کھچا تھا وہ بھی ان کی فضول خرچی میں ختم ہو گیا تھا۔ لیکن انہیں حالات کے پیشِ نظر باپ کے بہت سمجھانے بجھانے پر وہ شخص عقدِ ثانی پر آمادہ ہوا تھا۔
کیونکہ ان کے دم سے ہی چار چاند لگے ہوئے تھے۔
لیکن ظاہر یہی کرتا تھا کہ اسے بیوی کے روپے پیسے کی کوئی طمع ہے نہ اس کی ذات میں کوئی دلچسپی ہی۔ اور اولاد

پیمانہ کر سکنے کی پاداش میں اسے بالکل ہی بے وقعت کر کے رکھ دیا تھا۔

بیوی بے چاری بھی اپنی اتنی بڑی محرومی کی وجہ سے احساس کمتری کی کچھ ایسی شکار ہو گئی تھی کہ ہر وقت افسردہ خاموش سی رہتی تھی۔ کہ اولاد کی وہ بھی دل سے خواہاں تھی۔

کتنا ارمان تھا اسے ماں بننے کا۔

مگر جب کاتب تقدیر نے اس کی قسمت میں اولاد ہی نہیں لکھی تھی تو صبر کرنے کے سوا چارہ ہی کیا رہ جاتا تو بس اسے ہر دم یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں اس کا شوہر اولاد کی خاطر ایک اور شادی نہ کر لے۔

فلاں جگہ گیا ہے تو کسی ملا ایسے ہی چکر میں نہ گیا ہو۔

یا پھر کہیں خفیہ طور پر کسی سے تعلقات استوار نہ کر رکھے ہوں۔

اور اس قسم کے بھی وہ کچھ ایسے ہی شکوک و شبہات میں مبتلا تھیں۔

آخر جب ٹہل ٹہل کر انتظار کرتے کرتے دن کا ایک بج گیا تو وہ شوہر کی طرف سے مایوس ہو کر ڈرائنگ روم میں آ گئیں۔

اصل میں ان کی بیچی ہوئی کار ابھی تک ایئرپورٹ سے واپس نہیں آئی تھی۔ اس لیے اس کی واپسی کے انتظار میں بھی ڈرائنگ روم میں ہی رکنا پڑا تھا ورنہ اتنی شدید سردی میں وہ سیدھی اپنی خواب گاہ میں جا کر لحاف میں دبک جاتیں۔

وہ جیسے ہی ڈرائنگ روم میں آئیں۔ گھر کی ادھیڑ عمر پرانی خادمہ امجدی لیوا نے اندر کہیں سے وارد ہو کر صدا دی۔

"دلہن بیگم کھانا کب کا تیار ہو چکا ہے۔ کیا میز پر لگوا دوں۔" مگر کوفت اور کسمساہٹ کے عالم میں ان کی بھوک بھی اڑ گئی تھی انہوں نے بیزار کن لہجے میں کہا۔

"نہیں میز پر لگوانے کی ضرورت نہیں بس تم کھا لو اور خانساماں کو بھی کھلوا دو۔" اس مختصر سے جواب سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کچھ بھی کھانے پینے کے موڈ میں نہ تھیں اور امجدی لیوا اس کا سبب بھی جانتی تھیں۔ انہوں نے پلٹ کر جاتے جاتے پیچھے دلی زبان سے کہا۔

"کھانے کا وقت نکل جاتا ہے دلہن بیگم تو بے وقت کھانے سے طبیعت پہ گرانی رہتی ہے۔ جانے سرکار کو آج ابھی تک آتے نہیں لگ رہے۔"

"وہ تو اب شاید ہی کبھی آئیں۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائیں اور پھر کرختگی سے لہجے میں بولیں۔

"جب میں بے وقت کچھ کھانے پینے کی عادی ہی نہیں تو پھر طبیعت پہ گرانی کا کیا سوال۔" امجدی لیوا نے پھر کوئی جواب نہ دیا جواب میں ایک ٹھنڈا سانس بھرتی واپس پلٹ گئیں۔ اور ابھی چند لمحے بعد ہی کار رکنے کی آواز آئی تو یہ جانتے ہوئے بھی کہ شوہر نہیں آئے ہیں ان کا دل بری طرح دھڑک اٹھا۔

مگر جانے غصے اور کوفت کی وجہ سے دھڑکا تھا یا تشویش کے باعث۔ حالانکہ وہ بہت مستقل مزاج اور ٹھوس طبیعت کی مالک تھیں۔ لیکن شوہر کے معاملے میں تقریباً ہر عورت کسی نہ کسی پہلو اپنی فطری کمزوری سے مات کھا جاتی ہے۔ سو وہ بھی ایک عورت ہی تھیں۔

ڈرائیور کے قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی تھی اس لیے اپنی بے کلی پہ قابو پاتے ہوئے وہ صوفے پہ مطمئن سی اس انداز میں بیٹھ گئیں جیسے ڈرائیور کی واپسی سے لاعلم ہوں۔

لیکن اگلے ہی لمحے جب ایک مخصوص اور مانوس سی خوشبو سارے ڈرائنگ روم کو معطر کر گئی تو بے اختیار بے یقینی کے عالم میں انہوں نے گردن موڑ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ تو سرمئی رنگ کے گرم سوٹ میں ملبوس انہیں اپنے شوہر سامنے ہی کھڑے نظر آئے۔ اور ان سے نظر ملتے ہی بڑے شگفتہ انداز میں مسکرا کر بولے۔

"السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔" وہ ان کے سلام کا جواب دیتی ہوئی اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ دل بھی عجب انداز میں دھڑکا۔

ان کی یہ غیر متوقع اچانک آمد اور یہ شگفتہ سا انداز اور یہ تپاک ان کے لیے سخت اچنبھے کا باعث بن جاری تھی۔ وہ آنکھوں میں جہاں بھر کی حیرت لیے ان کی طرف دیکھتی رہ گئیں۔

"اب آپ نے تو خود سلام کرنے میں پہل نہیں کی تو ہم نے سوچا کہ ہم ہی کر لیں۔" وہ ان کی ہر کیفیت کو نظر انداز کرتے ہوئے ان کے قریب آ کر بولے۔

"لیکن قاعدے کے مطابق تو آنے والے پر ہی سلام میں پہل کرنا واجب ہوتا ہے۔" انہوں نے اپنی حیرت پر قدرے قابو پا کر کہا۔

"ہاہاہا یہ بھی ٹھیک ہے۔ مگر خیر اپنی سنائیے اتنے عرصے کیسی رہیں آپ۔" انہوں نے ان کے جواب پر ہنس کر پوچھا۔

"بالکل ٹھیک ٹھاک۔ مگر آپ تو بڑا مہا جواب ملا۔"

"ظاہر ہے ظاہر ہے معلوم بھی کچھ ایسا ہی ہو رہا ہے۔" انہوں نے ان کی بات کو ہنسی میں اڑا دیا۔

جواب میں وہ انہیں شاکی سی نظروں سے دیکھ کر رہ گئیں۔

"شکوہ یہ خفگی یا کبیدگی جو کچھ بھی ہے سبھی جائز ہی ہے جان من آپ کو واقعی انتظار کی سخت زحمت اٹھانی پڑی ہوگی۔" وہ ان کے شانوں پہ ہاتھ رکھ کر انہیں منانے کے سے انداز میں بولے۔ جواب میں وہ نظریں جھکائے کھڑی رہیں۔ "ولیکن ہم اپنی غیر حاضری کی ساری کسر بھی ابھی پوری کر دیں گے کچھ معلوم بھی ہے ہم آپ کے لیے کیسی انمول سوغات لائے ہیں۔"

انہوں نے اپنے ہاتھوں میں ان کا چہرہ تھام کر بڑے پیار سے کہا۔ اور شوہر کی بات پر خوش ہونے کے بجائے وہ چونک سی گئیں۔ کیونکہ یہی شوہر کی مہربانیاں۔ یعنی ان کا اس قدر چونچال موڈ۔ نرم سا رویہ۔ اتنا التفات اور گرم جوشی ہی کم تعجب کا باعث تھی کہ یہ سوغات۔ وہ بھی بڑی انمول سی سوغات لے کر آنا۔ جبکہ وہ کسی خوشی وقتی میں نہ کسی تقریب میں نہ ہی کوئی معرکہ ہی مار کر آئے تھے بلکہ وہ تو اپنے والد کی نازک حالت کے پیش نظر بڑی پریشانی کے حالات میں دوڑے دوڑے انڈیا گئے تھے اور باپ کے آخری سفر میں انہیں الوداع کہہ کر آ رہے تھے۔ یوں بھی انڈیا اپنے والد کے پاس جانے کا یہ پہلا اتفاق تو نہ تھا۔

بلکہ جب وہ اپنی ملازمت کی وجہ سے دہلی میں مقیم تھے تب بھی سال میں دو مرتبہ باپ سے ملنے ضرور جاتے تھے اور ہر بار دس دن ڈیڑھ ماہ کا عرصہ گزار کر ہی آتے تھے۔ یہ ان کے لیے کوئی انوکھی بات تو نہ تھی اور نہ ہی وہ کبھی کوئی سوغات لاتے تھے۔

مگر اس مرتبہ چونکہ واپسی میں کچھ زیادہ ہی عرصہ لگ گیا تھا اور وہ گھر پر تنہا رہ گئی تھیں شاید اسی وجہ سے انہیں خوش کرنے کے لیے وہ کوئی سوغات لے آئے ہیں انہوں نے دل میں سوچا۔ مگر اس کے علاوہ تو سوغات لانے کا اور کوئی جواز ہی نظر نہیں آتا تھا۔

"بھئی واہ خوب۔ بہت اچھا تو ہم آپ کے لیے اتنی اچھی سوغات لائے ہیں اور آپ ہیں کہ پلٹ کر پوچھا تک نہیں کہ ہم آپ کے لیے کیا لائے ہیں۔" انہوں نے بیوی کو قدرے متعجب اور خاموش دیکھ کر کہا۔

"اچھا خیر بتائیے ہم خود ہی دکھائے دیتے ہیں کہ ہم آپ کے لیے کیا لائے ہیں۔"

وہ اپنی مسکراہٹ دبا کر بولے۔ تو بیوی نے بھی سوچا کہ یقیناً وہ کوئی خاص چیز ہوگی ورنہ وہ اس انداز میں کبھی کسی چیز کو بتانے کے عادی تو نہیں ہیں۔ اس اثنا میں وہ دروازے کی طرف بڑھ گئے تھے۔ پھر وہیں رک کر انہوں نے ڈرائیور کو آواز دی۔ پھر واپس پلٹ کر صوفے پہ آ بیٹھے۔

"بیٹھیے آپ بھی جانے پاس ہی بیٹھ جائیے۔" انہوں نے بیوی کو مخاطب کر کے کہا۔

وہ محض اس وجہ سے کہ اس لمحے وہ صورت حال جانے ہی کی متجسس ہو رہی تھیں۔ میاں کے آتے ہی ان کے قریب صوفے پر بیٹھ گئیں۔ پھر اگلے ہی لمحے انہوں نے ڈرائیور کو ایک کمبل میں لپٹی کوئی شے پکڑے احتیاط سے اٹھائے اندر آتے دیکھا۔ تو وہ اٹھتے ہوئے بے تابانہ سے

وہ اپنے لفظوں کے سامنے ہی کھڑی نظر آئی۔
وہ بھی سراپا قیامت بنی۔
کھلتے ہوئے اسمانی رنگ کے سوٹ میں ملبوس۔
بکھرے بکھرے بال اور میک اپ سے قدرے آراستہ۔
دوپٹے کی قید و بند سے آزاد۔
سانچے میں ڈھلا جسم۔
ایک دم حسن و رعنائی کے کسی زندہ مجسمے کی طرح۔
"وہ۔ [illegible] تو مو میری محبت اور دے کے آگے ہی [illegible]
وہ از خود رفتہ سا ہو کر بولا۔ اور وہ بھی۔ اس کی اچانک آمد پر گم سم کھڑی اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ [illegible]
[illegible] کے سوٹ پر [illegible] اور [illegible] انداز میں [illegible]
لگا کر دو پلک جھپکنا بھی بھول گئی۔ [illegible] دل کے سامنے [illegible]
[illegible] کے پاتال میں [illegible] مسرت و انبساط کی ایک [illegible]
[illegible] بے ترتیب ہو گئی تھیں [illegible] نہیں سنبھل [illegible]
حیا [illegible] وہ [illegible] رہی تھی۔
انتظار کا ایک ایک پل بھی گنتا تھا تو قیامت جیب کر ـــــ
خود سے مخفی رکھ کر ـــــ
کہ بائیس تئیس سالہ زندگی میں وہی تو تھا۔
پہلا مرد ـــ یعنی صنف جسے عورت نے چاہا، کر اس نے چاہا تھا، چاہتی آ رہی تھی۔
اب اسے دیکھتے ہی خود پر طاری افسردگی اور اکتاہٹ کا سبب بھی اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔
اس کے ہر اعتبار
ہر مصلحت اور نزاکت
حتیٰ کہ دیکھ لیے جانے کا ڈر تک
سب کچھ اس کے ذہن سے محو ہو چکا تھا۔
وہ یہ بھی بھول گئی تھی کہ وہ شادی شدہ ہے۔
پرائی امانت ہے۔
اور وہ اس کے لیے شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتی ہے۔
یا کیا غلط ہے کیا صحیح ہے۔
کیا جائز ہے کیا ناجائز ہے۔
کیا گناہ ہے کیا ثواب ہے۔
دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے کی نگاہوں میں پیوست سی ہو گئی تھیں۔
اور دونوں عجیب مسحور کن سی کیفیت میں ایک دوسرے کو دیکھے جا رہے تھے۔
لب خاموش تھے۔
اور جسم ساکت۔
البتہ دونوں کے قلوب ایک ہی لے پر دھڑک رہے تھے۔
آنکھیں بولتی ہوئی زبان بن کے ہی ایک دوسرے کے جذبات کی ترجمانی [illegible]
جب جذبے کی شدت نے اسفند کو بے قابو سا کر دیا تو وہ اسی از خود رفتگی کے عالم [illegible]
[illegible] بری طرح چونکی۔

سب سے پہلے دیکھ لیے جانے کا خیال آیا۔ اور پھر ـــ لپٹے اس حد تک بھٹک کر اس کے سامنے آ جانے کا۔
وہ کھلی آنکھوں سے بیداری کے عالم میں ایک حسین سپنا دیکھتے دیکھتے جاگ گئی تھی وہ ـــ اس لیے ایک دم ہی بپھر اٹھنے والے
جذبات ابھی معمول پر نہیں آئے تھے۔
دھڑکنیں بھی ابھی ترتیب میں نہیں آئی تھیں۔
اس کے باوجود بھی حواس قابو میں آ گئے تھے۔
وہ قریب آیا تو وہ چند قدم پیچھے سرک کر بولی۔
"آپ اب کیوں آئے ہیں؟" آواز مرتعش سی تھی لیکن لہجہ قدرے تیکھا ـــ یہ تو وہ ہی خوب جانتی تھی کہ اس نے کس طرح خود کو
سنبھال کر یہ لہجہ اختیار کیا ہے۔
مگر وہ مرد تھا۔
سر سے پیر تک اس کی چاہت میں غرق۔
اور پھر اس لیے اس کے جذبات انگیز تھے۔
ابھی چند لمحے قبل ہی اس کی آنکھوں کی راہ اس کے اندر اترتے ہوئے اس کے تشنہ جذبوں سے ٹکرا کر دو آتشہ ہو گئے تھے۔
اور پھر سب سے بڑھ کر ـــ آج ہی پہلی بار تو سلوطہ کی طرف سے اس کے یک طرفہ جذبے کو بڑھاوا اور حوصلہ افزائی ملی تھی۔
پھر بھلا وہ اس کی طرح اپنے شوریدہ سر جذبے پر ایک دم ہی کس طرح بند باندھ لیتا۔
کیونکر اور کس دل سے اسے اندر ہی اندر گھونٹ کر رکھ دیتا۔
اس نے تو اس کے رویے میں اچانک رونما ہونے والے تغیر کا کوئی نوٹس ہی نہیں لیا اور اپنے جذبے کی یورش میں بے محابہ بہا ہوا بولا
"ابھی آپ کو عید کی مبارکباد دینے بلکہ آپ سے عید ملنے کی غرض سے آیا ہوں۔ لیکن اگر آپ کے خیال میں اس کے علاوہ
بھی کوئی وجہ ہو سکتی ہے تو پھر ـــ"
اس نے شوخ سی معنی خیزی کے ساتھ جس انداز سے فقرہ ادھورا چھوڑا سلوطہ کا تیزی سے دھڑکتا ہوا دل دھک سے رہ گیا
کہ اس کی بے باک نظروں سے وہ بخوبی واقف تھی ـــ اس پر خود ہی تو آنکھوں ہی آنکھوں میں اس پر دل کا سارا راز عیاں کر کے اپنی
حماقت کا ثبوت دے چکی تھی۔ اب اگر وہ اس کے ساتھ فری ہو جاتا تو کر بھی کیا سکتی تھی۔ اس لیے اس نے بے رخی برتنے میں ہی
عافیت سمجھی۔
"لیکن عید تو کب کی گزر چکی ہے۔ اس وقت تو شام ہو رہی ہے۔" وہ سپاٹ سے لہجے میں بولی۔
"او نہوں ـــ ابھی تو کل سات ہی بجے ہیں۔ گویا عید کے گزرنے میں ابھی پانچ گھنٹے مزید باقی ہیں اور عید کے لفظی معنی خوشی
کے ہوتے ہیں اور یہ ضروری نہیں کہ خوشی کسی خاص موقع پر ہی منائی جائے۔ یعنی انسان کا دل اگر خوش اور آسودہ ہو تو عام سے دن
بھی اسے عید کی طرح ہی محسوس ہوں گے۔ وہ جو کہتے ہیں ناکہ ہر روز روز عید اور ہر رات شب برات تو اسی لیے تو کہتے ہیں البتہ
آج کے دن کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ہمارا سب سے بڑا تہوار ہے۔ سمجھیں آپ؟"
وہ بھلا کہیں قائل ہونے والا تھا۔ اپنی ہی کوئی منطق جھاڑتا ہوا بولا ـ مگر اس کی سمجھ میں تو خاک بھی نہیں آیا۔ البتہ اس سے
جلد جان چھڑانے کی خاطر جلدی سے بولی۔
"اچھا تو آپ کو عید مبارک ہو۔"
"واہ! اس طرح تو کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے عید کی مبارکباد نہیں بلکہ آپ بہت جبر سے مبارکباد کا جھنڈا گاڑ رہی ہیں۔
بھلا یوں بھی کہیں مبارکباد دی جاتی ہے؟" اس نے سر کو جھٹک کر مبارکباد دینے کے انداز پر نکتہ چینی کی۔
"تو پھر کس طرح دی جاتی ہے مبارکباد؟" وہ زچ ہو کر بولی تو اسفند نے جھٹ سے بڑھ کر اس کا دوپٹہ اٹھایا اور اس کے نزدیک
آ کر اس کے شانے پر ڈال کر کہا۔
"مسلمانوں میں اس طرح ـ یعنی پہلے مصافحہ کیا جاتا ہے اور پھر گلے ملا جاتا ہے۔"
"آپ ـــ آپ پلیز مجھ سے ایسی باتیں نہ کیا کریں۔"
"تو پھر کیسی باتیں کیا کروں؟" وہ بالکل ہی چکنا گھڑا ثابت ہوا۔

"کمال ہے۔ صبح سے تو یہ اسی بات کا چرچا ہو رہا تھا اور تمہیں کچھ خبر ہی نہیں۔ چلو خیر۔ آؤ اب" پھر زینت شعیب منصور کو کمرے کی جانب سے آتے دیکھا تو گویا قصہ مختصر کرتی ہوئی بولیں۔

"لیکن میرا وہاں جانا ایسا کوئی ضروری تو نہیں بھائی جان۔ یوں بھی گھر بالکل اکیلا رہ جائے گا۔" اس کا وہاں جانے کا موڈ نہیں ہو رہا تھا۔

"ہاں یہ تو تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو۔ مگر ــــ" زینت نے کہنا چاہا۔

"ارے بھئی! اگر مگر کیسی۔ سلوط تو گیسٹ آف آنر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ ضرور جائیں گی خواہ گھر میں ڈاکہ ہی پڑ جائے۔" شعیب منصور نے بیوی کو اسے ساتھ لے جانے میں پس و پیش سے کام لیتے دیکھا تو نزدیک آکر بولے۔ زینت کو ان کا گیسٹ آف آنر کہنے پر غصہ تو بہت آیا۔ مگر انہوں نے فہمائشی سا انداز اختیار کرتے ہوئے صرف اتنا ہی کہا۔

"اے ہے۔ کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔ خدا نہ کرے جو گھر میں ڈاکہ پڑے۔ مالی بھی لیٹ ہو گیا۔ بچوں کو سیر کرانے گیا ہے۔ اور چوکیدار بھی ایسا ہی ہے۔ گھر ہیں۔"

"چلیے خیر۔ اب جلدی سے چلیے ــــ ورنہ اگر وہ بابا صاحب کا نارئیل چٹخ گیا تو وہ کیسے وڑھے اٹکا کر" شعیب منصور نے بیوی کے آگے تر چھے موڈ کے پیش نظر جلدی سے چلنے کا زور دیا تو زینت باہر کا رخ کرتی ہوئی بولیں۔

"اوہو۔ ہاں ــــ میں تو بھول ہی گئی کہ بابا باہر کار میں ہمارے منتظر ہیں۔ آؤ بھئی سلوط اب آ بھی جاؤ ــــ اور بابا کو کہو باہر سے دروازہ لاک کر کے گیسٹ پر بیٹھ جاؤ۔ مگر دیکھو باہر کا بھی خیال رکھنا۔ ہم زیادہ سے زیادہ ڈھائی تین گھنٹے ہیں"

"ہاں بھئی اور ایک بندوق بھی ہاتھ میں لے لینا اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہوائی فائر کرتے رہنا تاکہ چور ڈکیت نزدیک آتے ہی بھاگ جائیں۔"

شعیب منصور نے بیوی کو اتنی ہدایات دیتے ہوئے دیکھ کر ہنستے ہوئے انداز میں گویا ایک لقمہ سا دیا تو وہ ان پر ایک تیکھی نظر ڈال کر رہ گئیں۔

"میں نے اس لیے تو نہیں کہا کہ سچ مچ کوئی ڈاکہ ہی پڑنے کا امکان ہے۔ بلکہ یہ نوکر لوگ مالکوں کی غیر موجودگی میں بے فکر ہی ہو جاتے ہیں اور خدا بری گھڑی سے بچائے محتاط رہنا تو اچھی بات ہی ہوتی ہے۔"

پھر سلوط سمیت دونوں میاں بیوی پورچ میں آئے تو اسفند کو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا دیکھ کر شعیب منصور نے دبی آواز میں زینت سے کہا۔

"شکر کر لیا بیگم۔ بیٹا کا خون ابھی جوش میں نہیں آیا۔"

"ارے چھوڑیں ــــ ایک تو بے چارے بابا اتنی شرافت سے بیٹھے ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ اور آپ ہیں کہ بس خواہ مخواہ چھیڑ ــــ" زینت فہمائشی سے انداز میں بولیں تو سلوط ان کے شرافت سے بیٹھے کہنے پر مسکرا نے بنا نہ رہ سکی۔

والدین کو دیکھ کر وہ از راہ ادب اور اخلاق دروازہ کھول کر باہر اترنے لگا تو شعیب منصور نے اسے منع کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں بیٹھے رہو ــــ تمہیں اترنے کی کوئی ضرورت نہیں ہم خود ہی بیٹھ جائیں گے۔"

"ہاں ہاں تو فوراً سٹارٹ کرو ــــ ہم پہلے ہی بہت لیٹ ہو چکے ہیں۔"

زینت نے بھی شوہر کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ مگر چونکہ وہ باہر نکل آیا تھا اس لیے اس نے ماں کے لیے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول ہی دیا۔ شعیب منصور اگلی سیٹ کا دروازہ خود ہی کھول چکے تھے۔

بہر کیف پھر چار نفوس پر مشتمل یہ چھوٹا سا قافلہ سہیل منصور کی رہائش کی جانب روانہ ہو گیا۔ راستے میں شعیب منصور، زینت ہی باتیں کرتے رہے۔ نہ معلوم وہ کیسے موڈ میں تھا جو ایک لفظ بھی نہیں بولا۔ البتہ وہ چونکہ عین اس کے پیچھے بیٹھی ہوئی تھی اس لیے بیک ویو مرر میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس پر ایک نگاہ ضرور ڈال لیتا اور زینت کی موجودگی کی وجہ سے اس کی اس حرکت سے بھی سخت ہراساں سی ہو رہی تھی۔ اس لیے زیادہ تر وہ کھڑکی کے رخ کیے باہر دیکھتی رہی تھی۔ مگر ایک دو بار ویو مرر میں دونوں کی نگاہیں آپس میں ٹکرائی بھی تھیں تو اس کی نگاہوں میں ایک عجیب برہم سا تاثر دیکھ کر وہ اندر ہی اندر مضطرب سی ہو گئی تھی۔

سہیل منصور کے خوبصورت ترین بنگلے الکوثر پر پہنچے تو روشنیوں کی جگمگاہٹوں سے وہاں دن کا سا سماں بندھا ہوا تھا ــــ وہ کچھ دیر بعد پہنچے تھے اس لیے اس پر رونق اور چہل پہل بھی بہت تھی۔ سینکڑوں نہ سہی مگر بیسیوں مہمان ضرور آئے ہوئے تھے۔ زرق برق ملبوسات میں لپٹی ہوئی خواتین کی نمائش بھی ایک بہار سی آئی ہوئی تھی۔ رنگ برنگے روپہلے اور سنہری آنچل بھی ہر سو لہراتے نظر آ رہے تھے۔ اس پر جگمگ کرتے زیورات کی نمائش اور حسیناؤں کی اسمبریڈ سی شوخی۔ ناز ــــ نیلوفر اور نیلما نے بھی بڑے ہی جاذب نظر اور خوبصورت بن رکھے تھے۔ اور حسن و امارت کی اس محفل میں جا کر وہ بری طرح احساس کمتری کا شکار ہو گئی تھی۔

بلکہ پہلے سہیل منصور۔ ناز یہ اور کوثر نے بڑی گرمجوشی اور خندہ پیشانی سے اس کا سواگت کیا تھا۔ مگر شعیب منصور کے کہنے کے مطابق وہ گیسٹ آف آنر کی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ ناز یہ اور کوثر وغیرہ جیسے دوسرے مہمانوں کا گرمجوشی سے سواگت کر رہے تھے۔ ویسے ہی ان کا بھی کیا تھا اور پھر اپنے کاموں اور دوسرے مہمانوں کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ نیلوفر تو اسے دیکھ کر دور ہی سے کٹ گئی تھی۔ نیلما نے البتہ ضرور اس کے پاس آ کر اس کی مزاج پرسی کی تھی۔ مگر وہ بھی کچھ دیر بعد اپنے شوہر کے ساتھ اندر ہال میں بیٹھی تھی۔ ناز یہ اپنی ہمنشینوں میں دل بہلا رہی تھی۔

کچھ دیر بعد سب ہی مہمانوں کی خاطر تواضع اور سہیلیوں سے باتوں میں مصروف تھی۔ زینت اور شعیب منصور اپنے دوست و احباب کے ساتھ محو گفتگو تھے۔ اور ایک وہ تنہا جن کے بارے میں اسے یہ خوش فہمی تھی کہ کم از کم وہ اسے کسی محرومی یا احساس کمتری کا شکار نہیں ہونے دے گا۔ تو وہ بھی اس کی موجودگی کو یکسر نظر انداز کیے مردوں اور خواتین کے جھرمٹ میں ہیرو بنا بڑے اسٹائل سے مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہا تھا۔

ویسے بھی عشائیہ میں تو پہلے ہی دیر ہو چکی تھی۔ اس لیے کچھ ہی دیر بعد دعوت طعام تناول فرمانے میں مصروف ہو گئے تو پھر وہی حالت ہو گئی ــــ یعنی ــــ بہت وسیع طعام خانے (ڈائننگ روم) میں ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک دیواروں کے ساتھ ساتھ طویل میز پر سجے ڈونگوں اور پلیٹوں پر مہمان فاقہ کشوں کی طرح ٹوٹ پڑے ــــ وہ بھی سب کی دیکھا دیکھی اپنی پلیٹ میں تھوڑی تھوڑی سی چیزیں ڈال کر ایک کونے میں کھڑی ہو کر کھانا کھانے لگی۔ تبھی وہ ایک بہت ہی حسین اسمارٹ اور ویل آف لڑکی سے باتیں کرتا ہوا اس کے آگے ہی آ کر کھڑا ہو گیا۔ سارے ہال میں ہی انگلش کچھ اتنے فراٹے سے بولی جا رہی تھی کہ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اردو کا کوئی وجود کوئی حیثیت ہی نہ ہو۔ اور بس انگلش سب کی مادری زبان ہو۔

بڑے تعجب کی بات ہے یہ بھی۔

انگریز خود تو برصغیر ہند و پاک سے اپنی حکومت کا بیڑہ اٹھا کر چلا گیا مگر ایک تنازعہ کی صورت میں اپنی مادری زبان انگریزی کا لنگر بڑی گہرائی سے زمین کی تہہ میں دبا چھوڑ گیا۔

اب جو انگریزی بولے یا لکھے تو مذمت کرنے کے ساتھ ساتھ اسے نکتہ چینی اور احساسات کا نشانہ بھی بنایا جاتا ہے"

اور اگر نہ جانتا ہو اسے چپڑاسی اور دربان سے اونچی ملازمت کا اہل ہی نہیں سمجھا جاتا۔

حد تو یہ ہے کہ اگر ایک عام اور لولی سا شخص بھی انگریزی زبان میں تھوڑی سی گٹ پٹ کرے تو لوگ بالک اس سے مرعوب ہو جاتے ہیں۔

اور پر نعرے لگائے جاتے ہیں کہ اردو سیکھو اردو بولو۔ اردو پڑھو کہ اردو ہماری قومی زبان ہے۔

[illegible] قومی زبان میں درخواست لکھ کر کسی دفتر یا محکمے میں بھیجی جاتی ہے تو اس کا یہ حشر ہوتا ہے کہ چالاک کر کے ردی کی ٹوکری کا نذر کر دی جاتی ہے کہ ہمارے ملک میں انگریزی کو تیم سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔

تو کیا تضاد ہے یہ بھی ــــ

اس نے چند بالشت کے فاصلے پر اپنے آگے کھڑے اسفند اور اس کی حسین ساتھی کو آپس میں انگریزی میں باتیں کرتے دیکھ کر نہایت کرب سے سوچا۔

گو انگریزی زبان اسے اچھی طرح بولنی نہیں آتی تھی۔ مگر وہ سمجھ ضرور لیتی تھی۔ لیکن کچھ تو اردگرد کھڑے مہمانوں کی باتوں کے شور میں اور کچھ اپنے اس بری طرح نظر انداز کیے جانے کے غم میں اس نے ان کی باتیں سننے کی کوشش نہیں کی۔ اور دل میں اٹھتی ہلکی ہلکی سی ٹیسوں کے ساتھ آہستہ آہستہ کھانا کھاتی رہی۔ پھر جب کچھ دیر بعد وہ لڑکی اسفند سے کچھ کہہ کر اپنی خالی پلیٹ لیے میز کی طرف بڑھی تو

اسفندیکایک اس کی طرف گھوما اور اس کے خالی گلے پر نظر ڈال کر بولا۔

"میں نے وہ نیکلس خاص طور پر اسی اوکیژن (موقع) پر پہننے کے لیے آپ کو دیا تھا کہ کم از کم زیور کے معاملے میں تو آپ کسی کمپلیکس کا شکار نہ ہوں مگر آپ شاید ان باریکیوں کو سمجھنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتیں سمجھی تو اسے کہیں پھینک آئی ہیں۔ اور آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں ایسی بے قاعدگیاں برداشت نہیں کر سکتا۔"

اتنا کہہ کر وہ اسی تیزی سے مڑا اور آگے بڑھ گیا۔ اُف کیسا کٹیلا اور دل شکن لہجہ تھا اور اس نے کیا کہا تھا [illegible] مزاج اور سخت سے سخت بات کو سہار جانے والی لڑکی کو جسے اول تو کبھی غصہ نہیں آتا تھا اور جو کبھی آتا بھی تھا تو وہ [illegible] کرنے اور رو دھو کر خود کو ہی سزا دے لیتی تھی کہ منہ سے کچھ کہنے یا کسی اور پر اپنا غصہ اتارنے کا اسے ڈھنگ نہیں آتا تھا [illegible] کو اس سمے کچھ اتنا غصہ آیا۔ اس کا جی چاہا ہر شے کو پھونک کر رکھ دے۔ فنا کر دے۔

سارے جسم میں آگ سی بھر گئی تھی اور وہاں کھڑا رہنا اسے دوبھر ہو رہا تھا۔ وہ پلیٹ کو میز پر پٹخنے کے بجائے [illegible] کی کیفیت میں ہاتھ میں لیے ڈائننگ ہال سے باہر آ گئی۔ کہ اب ایک منٹ بھی وہاں رکنا اس کی برداشت سے باہر ہو رہا تھا۔ ایک سٹیج نما آراستہ و پیراستہ سے کمرے میں بہت سے ملازم اور بیرے کھانے کی قابیں اور ڈونگے [illegible] آ جا رہے تھے اور انہیں میں اتفاق سے اسے سہیل منصور کا ڈرائیور مارشل کریٹ ہاتھوں پر اٹھائے آتا نظر آیا تو اس نے فوراً ہی اسے روک کر کہا۔

"سنو مارشل، یہ کریٹ کسی اور کو دے دو اور بھاگ کر تقدیر کو باہر سے بلا لاؤ۔ میری طبیعت سخت خراب ہو رہی ہے اور میں گھر جانا چاہتی ہوں۔" مارشل اس سے اچھی طرح واقف تھا کہ وہ شعیب منصور کے گھر کی ہی ایک فرد ہے۔ اس [illegible] لیے اپنی تکلیف کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا۔ اس نے بلا تامل جی اچھا کہہ کر قریب سے گزرتے ایک بیرے کے ہاتھ میں کریٹ تھمایا اور پھر فوراً ہی تقدیر کو بلانے چل دیا۔ اور وہ بھی سٹیج اور کوریڈور کو عبور کر کے پورچ کی سیڑھیوں پر آ کھڑی ہوئی۔ [illegible] لانا نہیں چاہتی تھی کہ وہ پارٹی چھوڑ کر اکیلی گھر جانے کا ارادہ کر بیٹھی ہے۔ یہ بھی بہت غنیمت ہوا تھا کہ اس لمحے سب کھانے میں مصروف تھے اس لیے کسی نے اسے باہر آتے نہیں دیکھا تھا۔

پھر تھوڑی ہی دیر بعد مارشل تقدیر کو ساتھ لیے واپس آ گیا۔ مگر تقدیر کار لے کر نہیں بلکہ پیدل چل کر آیا تھا کیونکہ رش اور رونق کی وجہ سے ساری کاروں کو گیسٹ سے باہر ہی پارک کرایا گیا تھا۔ اس نے تقدیر کے سامنے بھی وہی بات دہرائی جو مارشل سے کہی تھی۔ تو تقدیر بولا۔

"جی اچھا۔۔۔ میں آپ کو منٹوں میں گھر چھوڑ آؤں گا۔ بس ذرا صاحب بہادر سے اجازت لے لوں۔" تو وہ بگڑ کر بولی۔

"لو اب اتنی سی بات کے لیے اجازت لو گے۔ کیا مجھے جانتے نہیں تم۔"

اور مارشل نے بھی کہا کہ بس چند منٹ کی تو بات ہی ہے۔ اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے جا کر جلدی سے بی بی کو گھر چھوڑ آؤ۔ تب کہیں جا کر تقدیر نے اسے گھر لے جانے پر آمادگی کا اظہار کیا۔ اور اسے لے کر بنگلور ٹاؤن کی سمت روانہ ہو گیا۔

پھر اسے کچھ پتا نہ چلا کہ وہ کن کن راستوں سے گزرتی رہی۔ تقدیر نے ہوائی جہاز کی رفتار سے کار چلائی [illegible] تو اس وقت [illegible] آیا جب کار شعیب منصور کے گیٹ میں داخل ہوئی۔

کریما اس لمحے گیٹ کے نزدیک بچھی چارپائی پر بیٹھا دربان سے باتوں میں مصروف رہا تھا۔ گاڑی کو گیٹ پار کرتے دیکھ کر وہ بھاگتا ہوا آیا۔ اور جلدی سے گھر کا داخلی مقفل دروازہ کھول دیا۔ اصل میں وہ سمجھ رہا تھا کہ شاید گھر والے واپس آ گئے ہیں۔ مگر جب اس نے [illegible] کو کار سے برآمد ہوتے دیکھا تو اسے سخت اچنبھا ہوا۔

"سلوطانی بی آپ۔۔۔ آپ کیسے آ گئیں۔۔۔" وہ اپنے تجسس پر قابو نہ پا سکا تو اس نے پوچھا۔

"میری طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی اس لیے چلی آئی ہوں۔ اور سب تھوڑی دیر بعد آئیں گے۔ تم ایسا کرو کہ باہر سے دروازہ [illegible] طرح لاک کر دو۔" اس نے اپنی طبیعت کی خرابی کا اظہار اپنے لب و لہجے سے بھی کیا۔

"اوہو تو آپ کے لیے چائے یا کافی بنا دوں۔۔۔ یا پھر ٹھنڈی بوتل لا دوں۔" اس نے یہ کہہ کر گویا اخلاق نبھایا۔

"نہیں بس مہربانی۔۔۔ میری طبیعت بری طرح مالش کر رہی ہے۔ میں اب پڑ کر سو دوں گی۔ بس تم اتنا کرو کہ باہر سے دروازہ [illegible]

[illegible] اس سمے سخت کھلی۔۔۔ وہ تقدیر سے بیزار کن سے لہجے میں بولی اور پھر سیدھی اپنے کمرے میں چلی آئی۔

دماغ میں تناب تک سرخ آندھیاں سی چل رہی تھیں۔

اور بدن تن شعلے سے دہک رہے تھے۔

پورے راستے وہ کچھ ایسی ہی کیفیت میں تپتی آئی تھی۔

سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی مفقود ہو گئی تھی۔

مگر اپنے کمرے میں آ کر بستر پر ڈھیر ہوتے ہی ساری صلاحیتیں۔۔۔

ساری حسیات یکدم جاگ اٹھیں اور اس کے ساتھ ہی اسفند کا تحقیر آمیز رویہ اور اہانت آمیز الفاظ بھی۔

اس کی گفتگو تو یوں بھی سماعت میں مسلسل ٹیپ کی طرح بج رہی تھی۔

"میں نے وہ نیکلس خاص طور پر اسی اوکیژن پر پہننے کے لیے آپ کو دیا تھا کہ کم از کم زیور کے معاملے میں تو آپ کسی کمپلیکس کا شکار نہ ہوں۔ مگر آپ شاید ان باریکیوں کو سمجھنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتیں سمجھی تو اسے کہیں پھینک آئی ہیں۔ اور آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں ایسی بے قاعدگیوں کو برداشت نہیں کر سکتا۔"

آخر اس نے یہ سب کیوں کہا۔۔۔ کیوں کہا۔۔۔

کیا سمجھتا ہے وہ مجھے۔۔۔ کیا میں اتنی ہی گری پڑی ہوں یا اس کی محکوم ہوں۔

صاف ظاہر ہے وہ میری ذات میں اپنی دلبستگی کے سامان ڈھونڈ کر مجھ سے ایک جز وقتی کھیل کھیل رہا ہے۔

ورنہ اس کی نظر میں میری کوئی قدر و قیمت کوئی حیثیت نہیں۔۔۔

وہ صرف میری مجبوری اور جوانی سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔

تبھی تو اتنا خود مختار ہوتے ہوئے بھی اس نے آج تک مجھے کسی معاملے میں بھی کوئی اہمیت نہیں دی۔ اور یہی وجہ ہے کہ سب کے سامنے وہ مجھ سے اس قدر لاتعلق اور دور دور رہتا ہے۔ جیسے میرا اس سے کوئی واسطہ ہی نہ ہو۔

اور میں ایسی ہوں کہ زندگی کا ایک سنگین تجربہ اٹھا کر بھی اس کے دام محبت میں گرفتار ہو گئی۔

سب کچھ جانتے ہوئے بھی کھلی آنکھوں سے دھوکا کھا گئی۔

تف ہے مجھ پر۔۔۔ جو میں نے اس کے چند جذباتی فقروں سے متاثر ہو کر اس کا تحفہ قبول کر لیا۔

وہ بھی۔۔۔ کسی اور کی امانت ہوتے ہوئے ایک غیر محرم شخص سے صاف اور صریح گناہ ہی ہوا ہے تو۔۔۔

تبھی تو اس کی اتنی جلد سزا بھی مل گئی۔۔۔

اور سب سے بڑھ کر گناہ گاری کی بات تو یہ ہے کہ میں نے اس سے دل ہی کیوں لگایا؟

کیوں ایک غیر اور نامحرم شخص کی محبت میں گرفتار ہوئی۔

وہ بھی سب کچھ جانتے ہوئے۔

اتنے تلخ تجربات اٹھانے کے بعد۔۔۔

میری مت واقعی ماری گئی تھی۔

شاید میری اس جوان العمری کی شوریدہ سری نے اندھا ہی کر دیا تھا۔

ورنہ یہ سب کچھ جس کا وہ کھلے رنگ میں مظاہرہ کرتا رہا تھا۔ اسے سمجھ لینا کچھ اتنا مشکل تو نہ تھا۔

مگر میں سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی انجان بنی دھوکا کھاتی رہی۔

سارا قصور میرا اپنا ہے۔

وہ نجانے [illegible] بڑی دیر تک اپنے بستر پر بیٹھی یہی سب سوچتی رہی۔ پھر اس خیال سے کہ کہیں وہ لوگ واپس آ کر اسے یوں [illegible] ایکدم ہی وہاں سے چلنے کا ارادہ کر کے جلدی سے اٹھی۔ لباس تبدیل کیا اور اسفند کا دیا ہوا منحوس نیکلس الماری سے نکالا۔ جھٹکا کھول کر باہر آئی۔ اور یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ ان لوگوں میں سے ابھی تک کوئی بھی واپس نہیں پلٹا۔ اس نے سیدھا اسفند کے کمرے کا رخ کیا۔

"دروازے کا کھٹکا تو گمان ہوا سے بھابی جان۔ آپ اندر آجائیے۔" اس نے بستر پر بیٹھے بیٹھے [illegible] دروازے کے پٹ کھول کر اندر آگئیں۔ تیور تو اچھے نہیں تھے مگر اسے بستر پر لیٹا دیکھ کر [illegible]

"کیوں خیریت تو ہے سلوطہ...؟ رات کو بھی ایسے چپکے سے آگئیں کہ گھر بھر کو پریشان کر کے رکھ [illegible] ہی خراب ہو گئی تھی تو مجھ سے یا چھوٹی دلہن یا پھر بچیوں سے ہی کہہ دیا ہوتا۔" شکایتی ہونے کے باوجود [illegible] کچھ کہنے سے گریز کیا اور قریب آکر بولیں۔ لہجہ بھی گلہ آمیز نہیں خبر لینے کا سا تھا۔

"اچھا چلو۔ مگر پارٹی اور تقریب کو تو اچھی طرح معلوم تھا کہ طبیعت خراب ہو جانے کی وجہ سے میں گھر آگئی تھی [illegible] کے کہنے پر تقریب ہی مجھے یہاں چھوڑ کر گیا تھا۔ آپ لوگوں نے کم از کم ان دونوں سے تو پوچھ لیا ہوتا [illegible] وقت برباد کیا۔" سلوطہ بھی قدرے تیکھے لہجے میں بولی۔

"خیر وہ تو جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ مگر اب کیسی طبیعت ہے تمہاری جو خلافِ معمول ابھی تک لیٹی [illegible] اس کی مزاج پرسی بھی کی تو بھلا کس طرح۔

"طبیعت تو رات ہی خراب ہو گئی تھی میری۔ اب تو بالکل ٹھیک ہوں۔ بس تھوڑی سی کسلمندی محسوس [illegible] لیے اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ البتہ آپ کو مجھ سے کوئی کام لینا ہے تو اٹھ جاتی ہوں۔" سلوطہ نے کہا تو زینت [illegible] بولیں۔

"نہیں نہیں تم لیٹی رہو۔ کاموں کا کیا ہے وہ تو کبھی ختم ہونے میں ہی نہیں آتے۔ اچھا اگر تمہاری طبیعت خراب [illegible] میں تمہارا ناشتا یہیں کمرے میں بھجوا دیتی ہوں۔" اپنی بات کہہ کر وہ کریم کو آواز دیتی ہوئی اس کے کمرے سے نکل گئیں [illegible] نے ہر بات اپنے مطلب کی کی تھی۔ مگر بھولے سے بھی یہ نہیں پوچھا تھا کہ ایسی کیا طبیعت خراب ہو گئی تھی تمہاری [illegible] ہو؟ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ اس سے کام لینے کی غرض سے ہی اس کے کمرے میں آئی تھیں۔ اصل میں عید کا [illegible] دن تھا اور رات کو ناز پروین کے شوہر اور سسرال والوں کی دعوت تھی۔ اور زینت بھی چاہ رہی تھیں کہ وہ آکر خانساماں [illegible] بٹائے مگر اس پر بھی غصہ سوار تھا اور سب سے بڑھ کر ——— ان لوگوں کے ہاتھوں اپنی ناقدری پر وہ اس [illegible] دل برداشتہ ہو گئی تھی۔ اسی لیے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کیے سارا دن بستر میں ہی پڑی رہی تھی۔

مگر روز روز تو یہ بہانہ نہیں چل سکتا تھا۔ جبکہ وہ خود بھی اس قدر آرام کرنے کی عادی نہیں تھی۔ گزشتہ شب [illegible] بھی اس کی مزاج پرسی کو آئی تھی اور کوثر تو خاصی دیر تک اس کے پاس بیٹھی رہی تھی۔ کچھ اس لیے بھی اس کے دل [illegible] تکدر چھٹ گیا تھا۔ یوں بھی اسے اگر کسی بات کی فکر تھی تو وہ اسفند کو اس کا دیا ہوا نیکلس لوٹانے کی۔ جس کے لیے [illegible] ہزاروں نہ سہی تو سینکڑوں ترکیبیں ضرور سوچی تھیں۔ اور اسی سوچ و بچار میں مزید دو دن اور گزر گئے تھے تب کہیں [illegible] اسے یہی ترکیب بہت مناسب اور موزوں لگی کہ کسی طرح خود اس کے کمرے میں جا کر وہ نیکلس کہیں رکھ آئے۔ [illegible] یہ تھی کہ پہلے تو عید کی چھٹیوں کی وجہ سے وہ زیادہ تر گھر ہی میں رہتا تھا اور جو باہر بھی جاتا تو ہمیشہ اپنا کمرہ مقفل کر کے ہی جاتا تھا۔ پھر چھٹیاں ختم ہو گئیں تو وہ اپنی ڈیوٹی پر جانے لگا۔ گھر واپس لوٹتا تو بھی زیادہ تر اپنے کمرے میں ہی رہتا تھا۔ البتہ ناشتے اور کھانے کے وقت وہ اپنا کمرہ کھلا چھوڑ کر ہی نکلتا تھا۔ اور سلوطہ نے وہی وقت اور موقع تاکا تھا۔

اس روز اتفاق سے عام تعطیل کا دن تھا۔ عید کو گزرے کئی ہفتے ہو گئے تھے۔ مگر عید کی خوشیاں اب تک ماند [illegible] جا رہی تھیں۔ چھٹی کے دن زینت اسی وقت کریم اور جمعدار سے اس کے کمرے کی صفائی کراتی تھیں جب وہ ناشتا کرنے کی غرض سے کمرے سے باہر نکلتا تھا۔ اور چونکہ اس کا قاعدہ تھا کہ چھٹی کے دن ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد لاؤنج میں بیٹھ کر کچھ وقت اخبار بینی میں گزارتا تھا۔

گویا سلوطہ کے خیال میں نیکلس اس کے کمرے میں رکھ کر آنے کا اس سے بہتر کوئی موقع ہی میسر نہیں ہو سکتا تھا۔ جب سے وہ اس سے بدظن اور کبیدہ ہوئی تھی اس نے اس کے سامنے پڑنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ حتیٰ کہ اسی کی وجہ

[illegible] بھی علیحدہ بیٹھ کر کرتی تھی اور کھانا بھی کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے کھانے کا وقت ٹال کر کھاتی تھی۔ اور اس روز [illegible] وہ ناشتا کرنا ہی بھول گئی تھی۔

[illegible] نیکلس اتنی خوبصورتی سے بغل میں دبائے کہ کسی کی نظروں میں نہ آسکے وہ اسفند کے کمرے سے کریم اور جمعدار [illegible] کے نکلنے کا انتظار کر رہی تھی۔ کیونکہ اسفند کب کا ناشتا ختم کر کے لاؤنج میں جا چکا تھا۔ اور یہی موقع تھا سب سے بہتر۔

[illegible] انتظار کے بعد کسی طرح کریم اور جمعدار اس کے کمرے کی صفائی کر کے باہر نکلے تو وہ ان کے جاتے ہی جلدی [illegible] کمرے کی جانب لپکی۔ بھاگتی ہوئی اندر پہنچی اور بیڈ کے سرہانے رکھا تکیہ اٹھا کر نیکلس کیس وہاں رکھا اور پھر [illegible] باہر نکل آئی اور سیدھا اپنے کمرے کا رخ کیا۔ سانس ضرور پھول رہا تھا اور ہاتھ پاؤں بھی کانپ رہے تھے مگر [illegible] رہا تھا جیسے سر پر لدے منوں بوجھ ہلکا ہو گیا ہو۔ نیکلس واپس کر کے دل میں اترتی طمانیت کے باوجود طبیعت کچھ [illegible] بوجھل سی ہو رہی تھی۔

[illegible] گر کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ اس وقت تو نہیں مگر رات کو ضرور جب وہ سونے کی غرض سے [illegible] درست کرے گا تو نیکلس کو تکیے کے نیچے رکھا دیکھ کر حیران ہی نہیں ہو گا بلکہ شرمندہ بھی ہو گا۔ اور کچھ نہیں تو اتنا تو [illegible] جائے گا کہ جس چیز کو وہ اتنی اہمیت دے رہا تھا وہ میری نظر میں دو کوڑی کی بھی نہیں ہے۔ اتنا تو محسوس [illegible] اس کے جھوٹے اور کھوٹے جذبے کا پول کھل گیا ہے اور اب وہ مجھے مزید بے وقوف نہیں بنا سکتا۔

"ہونہہ پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔ ان آج کل کے مردوں کو۔ شرافت نام کی تو کوئی چیز ہی باقی نہیں رہی ان میں [illegible] اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتے ہیں۔ اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتے ہیں۔ [illegible] اپنی ذمہ دارانہ حیثیت اور اپنے وقار کا بھی احساس نہیں کرتے۔ اور زندگی کو ایک کھیل ایک مذاق سمجھ کر گزار دیتے [illegible] وہ بستر پر پڑے پڑے بڑے رنج و تاسف کے ساتھ یہی سوچ رہی تھی کہ تبھی پردہ زور سے سرکانے کی آواز [illegible] پلٹ کر دیکھا تو اسفند بگڑے ہوئے تیور لیے اور کیس ہاتھ میں تھامے پردے کے آگے کھڑا نظر آیا۔ اور نظر ملتے [illegible] بولا۔

"[illegible] یہ کیا حماقت تھی یہ نیکلس آپ میرے تکیے کے نیچے کیوں پھینک آئیں ایسا ہی دل سے اتر گیا تھا تو کسی گٹر میں پھینک دیا ہوتا ___ یہ میرے منہ پر کیوں مار آئیں آپ؟"

اور وہ جو اسے دیکھ کر غصے میں اٹھ کر بیٹھ گئی تھی بڑے برہم اور درشت لہجے میں بولی۔

"میں آپ کی کسی بات کا جواب دینا تو کیا آپ کی شکل دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی۔ آپ پلیز میرے کمرے سے چلے جائیں۔"

"ارے ارے خیریت تو ہے۔ یہ اتنا غصہ۔ اتنا عتاب۔ وہ بھی ایک ذرا سی بات پر۔ یہ مجھے معلوم ہے کہ آپ میری اس روز کی [illegible] پر مجھ سے خفا ہو گئی ہیں مگر یہ"

[illegible] کا دل چاہا کہ کہے کہ وہ ذرا سی بات تو نہ تھی تم نے تو مجھ پر میری اوقات جتائی تھی میری تذلیل کرتے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا تھا۔ مگر بات اتنی آگے بڑھ چکی تھی کہ وہ شکوے شکایت کی کوئی گنجائش ہی نہیں رکھتی تھی اس لیے اس کی بات کاٹ کر [illegible]

"[illegible] اسفند صاحب آپ ایک بہت معزز اور ذمہ دار ہستی ہیں آپ کو کسی طور پر بھی یہ زیب نہیں دیتا کہ آپ وقت بے وقت [illegible] بہانے سے میرے کمرے میں گھس کر مجھے اس بات کا احساس دلانے کی کوشش کریں کہ میں آپ کے گھر کے ایک کمرے پر [illegible] بیٹھی ہوں جس تو یوں بھی اپنی بے مائیگی کی وجہ سے کمپلیکس کا شکار ہوں۔ مگر صرف تھوڑے عرصے کے لیے اور [illegible] اطمینان رکھیے اور مجھے پریشان نہ کریں۔"

[illegible] تو جیسے پہلے ہی سوچ کر بلکہ تہیہ کر کے اس کے پاس آیا تھا کہ وہ جیسی میٹھی اور چاپلوسی کی باتیں کر کے [illegible] سے منا لے گا اور وہ تو اسے ایک دبی دبائی محرومیوں اور کمپلیکس کا شکار اور بے زبان لڑکی ہی سمجھتا رہا [illegible] بڑی تیز بھی اور زبان دراز لڑکی ثابت ہوئی تھی۔ اس کے خیال میں کیسی بے نقط سنا رہی تھی۔ کہ اس کی باتوں [illegible] کوئی جواب ہی نہیں بن رہا تھا۔ یوں بھی اپنی غلطی کا احساس اسے بہت پہلے ہی ہو گیا تھا۔ کچھ دیر ہونٹ کاٹتا اور

گناہ نہیں تھا، اور وہ سوچ رہی تھی کہ میں نے تو کبھی اعتراف تو بڑی چیز اپنے جذبے کا اس پر اظہار بھی نہیں کیا اور آئندہ کبھی بھی نہیں کرے گی۔

بس اسی طرح خاموشی سے اسے چاہتی رہے گی جیسے اب تک چاہتی آ رہی ہے۔ کچھ غم، غصہ تو اس کی نانا جان نے دھو ڈالا تھا اور کچھ ——— ان ساری باتوں نے ——— جو وہ صرف اپنے ضمیر اور دل کو اطمینان دلانے کے لیے کر رہی تھی کہ دوپہر کے کھانے کا وقت قریب آ گیا تھا۔ وہ بستر پر ایک زاویے ایک ہی پہلو ساکت سی بیٹھی تھی۔ دل ہی دل گواہی دے رہا تھا مگر زبان اس گواہی سے انحراف کر رہا تھا۔ وہ مخملیں کیس جو جانے کب سے اس کے قریب پڑا تھا اپنی محویت میں وہ اسے دیکھ بھی نہیں سکی تھی۔ وہ تو ایک دم ہی باہر سے جوتیوں کی کٹ کٹ کی آواز آئی تو اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔

اور پھر اس کی نظر کیس پر پڑی تو اس نے بلا سوچے سمجھے جلدی سے وہ کیس اٹھا کر تکیے کے نیچے رکھ دیا اور تبھی نیلما اندر داخل ہوئی۔

"اوہو سلوط آپا آپ یہاں چھپی بیٹھی ہیں اور وہاں کھانے پر آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔ چلیے نا جلدی سے میرا تو بھوک کے مارے برا حال ہو رہا ہے۔" نیلما دروازے ہی سے بولتی آئی تھی۔ کہنے کا انداز کچھ بیزار کن سا تھا جیسے محسوس کر کے سلوط نے کہا۔

"ارے ایسی سخت بھوک لگ رہی تھی تو تم نے کھا لیا ہوتا۔ مجھے کیوں بلانے آ گئیں۔ اور آج ایسی کیا خاص بات ہے جو مجھے بلانے آ گئیں ——— ورنہ میں تو بنا بلائے خود ہی پہنچ جاتی ہوں۔ اب بھی بس آ ہی رہی تھی۔" نیلما اس کے ساتھ باہر کا رخ کرتی ہوئی بولی۔

"یہ تو میں نے بھی کہا تھا کہ سلوط آپا بس آتی ہی ہوں گی۔ مگر بھائی جان انہیں بھلا کون سمجھا سکتا ہے۔ آپ کو نہ آتا دیکھ کر حکم صادر کیا کہ پہلے سلوط کو بلا کر لاؤ پھر کھانا شروع کرنا۔" نیلما بولی۔ اور اس کا دل آہستہ سے دھڑکا تھا کر پھر جانے کیوں ہو گیا۔

"ہش پگلی یہ تو بڑی زیادتی کی تم پر تمہارے بھائی جان نے ——— میری ساری ہمدردیاں تمہارے ساتھ ہیں۔" اس نے مذاق میں اڑا دیا۔

"اور بھائی جان کی تمام تر ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں۔" نیلما نے شوخ سی معنی خیزی سے کہا۔ تو اس کے دل میں ہلچل سی ہونے لگی۔

"ارے چلو بڑی شریر ہو گئی ہو تم ——— وہ بے چارے سب کے ساتھ ——— اخلاق برتتے ہیں میں نے ایسی خصوصیت کیا پائی ہے۔" اس نے ایسا منہ بنا لیا جیسے نیلما کا مذاق اسے گراں گزرا ہو۔

"اب یہ تو آپ ہی جانتی ہوں گی کہ آپ کی کیا خصوصیت ہے۔"

نیلما تب بھی فقرہ پھینکنے سے باز نہیں آئی۔ کھانا شروع ہو چکا تھا اس لیے دونوں چپ چاپ جا کر اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔ یعنی شعیب منصور، زینت اور نیلوفر تینوں ہی کھانا کھا رہے تھے۔ مگر اسفند نے سلوط کے آنے کے بعد ہی کھانا شروع کیا۔ اس پر طرہ یہ کہ اسے ڈشیں بھی پیش کرتا رہا۔ اور اس کے حلق سے نوالے پھنس پھنس کر اترتے رہے۔ زینت کی نظروں سے یہ بات پوشیدہ نہ رہ سکی۔ انہوں نے ہلکے سے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"بھئی اب اتنے عرصے سے یہاں رہ رہی ہو۔ گھر ہی کی ایک فرد بن گئی ہو۔ پھر بھی اس قدر تکلف سے کام لیتی ہو۔ جو چاہے چیز لے لیا کرو۔"

"اصل میں یہ شرماتی بہت ہیں ممی۔" نیلما بولی۔

"نہیں خیر یہ شرماتی ہیں نہ تکلف سے کام لیتی ہیں بلکہ بہت غیریت برتتی ہیں۔ آئی مین ——— یہ ہم میں مکس ہونا پسند نہیں کرتیں اس لیے اس قدر ریزرو سی رہتی ہیں۔" نیلوفر نے یوں کہا جیسے نکتہ چینی کر رہی ہو۔

"ہاں یہ تو کسی حد تک درست ہے۔ اس روز سہیل بھائی کے ہاں بھی یہ سب سے الگ تھلگ سی رہی تھیں۔ حالانکہ دلہن اور کوثر تو ان کی خاطر میں بچھ بچھ جاتی ہیں۔" زینت نے نیلوفر کے خیال کی تائید میں کہا۔

"نہیں خیر ——— نہ میں تکلف اور غیریت برتتی ہوں نہ ہی الگ تھلگ رہتی ہوں۔ بلکہ میری عادت اپنے کام سے کام رکھنے کی ہے اور کم بولنا بھی۔"

"... کام ہوتا خوش ذائقہ ڈنر اور کچن سنبھالنے کا ہوتا ہے۔ مگر بیٹی اس کام کے علاوہ کچھ کر لیا کرو۔ میرا مطلب ہے کوئی مشغلہ بھی زندہ رہنے کے لیے ضروری ہے۔" بات کے اختتام پر شعیب منصور ہنسنے لگے۔ اور جواب اسفند نے کہا۔

"مکس ہونا تو اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب آپ لوگ بھی ان سے مکس ہونے کی کوشش کریں۔ مگر آپ نے تو ان کو ریزرو اور مغرور کہہ کر رکھا ہے۔ اور ریڈ انڈر نوٹ فیر۔"

"بابا بات نہیں کرتے بلکہ ایک تیر سا چھوڑ دیتے ہیں۔" بیٹے کے طنز سے زیادہ اسے سلوط کی حمایت میں بولتا دیکھ کر وہ چڑ کر بولیں۔

"اب تیر چھوڑیں یا مندمہ برسائیں۔ لیکن یہ کچھ غلط نہیں کہہ رہے۔ مگر کچھ قصور خود ان کا بھی ہے کہ یہ کمپلیکس میں مبتلا ہو گئی ہیں۔ اس لیے اس قدر محتاط اور دبی دبی سی رہتی ہیں۔ اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ یہ آیا جایا کریں۔ بھئی آخر کو یہ میری اکلوتی بہن کی اکلوتی سند ہیں۔ موسٹ آنریبل کوئی معمولی ہستی نہیں۔" شعیب نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ تو زینت نے نیلوفر کی طرف دیکھا۔ اور بولیں۔

"اس سے کس کافر کو انکار ہے کہ یہ آپ کی اکلوتی بہن کی ثمر ہیں۔ ہم سے تو ان کے کسی معاملے میں کبھی کوئی کوتاہی نہیں ہوئی۔ ہم تو سب سے ہی اچھی طرح پیش آتے ہیں۔ ان کی تو بات ہی دوسری ہے۔" زینت کا لہجہ جلا کٹا تھا۔

"یہاں تو پاکستان میں اگر اخلاق بھی برتا جاتا ہے تو وہ بھی تصنع اور ظاہرداری میں لپٹا ——— حیثیتوں میں بٹا جس کی جتنی حیثیت ہو گی اسی قدر اخلاق بھی برتا جائے گا۔ سادگی تو نام کو نہیں۔" اسفند سویٹ ڈش سے اپنی پلیٹ میں نکالتا ہوا بولا۔

"اے ہے بابا کیسی باتیں کرنے لگے ہیں۔" زینت آہستہ سے بڑبڑائیں۔ مگر بیٹے کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

"بھائی جان سے تو بات کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔" نیلوفر آہستہ سے نیلما کی طرف جھک کر بولی۔

"اب آپ کیوں چپ ہیں۔ آپ بھی تو کچھ اظہار خیال کیجیے۔" زینت نے شعیب منصور سے کہا۔

"بھئی ہم کیا بولیں۔ یہ بابا تو ہمیشہ بات ہی کی یعنی سولہ آنے درست ہی کہتے ہیں۔ اب کچھ دیر ہمیں مٹھاس کے ذائقے سے لطف اٹھانے کا موقع دیجیے۔" شعیب منصور نے اس موضوع کو ——— ٹالنے کی غرض سے مٹھاس کا چمچ منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ تو پھر کوئی نہیں بولا۔ اسفند کو خود پر اس قدر مہربان دیکھ کر سلوط اندر ہی اندر کہیں غرور ہو رہی تھی۔ مگر اسے ایک خوشی ایک فخر محسوس ہو رہا تھا کہ اس گھر میں آخر کوئی تو اپنا اپنا سا موجود ہے جو اس کے لیے بڑے ہمدردانہ خیالات رکھتا ہے۔

دنیا میں ایک ہستی تو ایسی ہے جو دل کی گہرائیوں سے اسے چاہتی ہے۔ اس کا خیال رکھتی ہے۔ اس کا احترام کرتی ہے۔ اور ہستی بھی کون ——— جس سے بات کرتے ہوئے اس کے والدین بھی ہچکچاتے ہیں۔

زینت کے بگڑے ہوئے موڈ کی پروا ہوئی نہ نیلوفر کے پھولے ہوئے منہ کی۔

شعیب منصور بھی تو اس کا کتنا خیال رکھتے تھے۔

بیوی کی کوتاہیوں اور بے نیازی پر انہیں ٹوک تو دیتے تھے۔ اس لیے اس روز جب وہ کھانا ختم کر کے اٹھی ... گئی۔

عید کو گزرے آٹھ روز ہو گئے تھے۔ اس کے باوجود بھی عید ملن پارٹیز۔ ایک دوسرے کے گھر آ جا کر مبارکباد دینے اور
انہ انے کا سلسلہ ہنوز جاری تھا۔ کچھ لوگ عید کی خوشی میں سیر و تفریح کی غرض سے گھومتے پھر رہے تھے۔

شعیب منصور اور ان کے ایک گہرے یار نے بھی آپس میں مل کر پکنک پر جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ شعیب منصور اور ان کے
دوست صمد جلیل کی فیملیز بھی ان کے ساتھ ——— لاؤم پر جا رہی تھیں۔ رات کے کھانے کا وقت تھا۔ کھانے کے بعد سب
میز کے گرد بیٹھے۔ پکنک میں اپنے ساتھ لے جانے والی چیزوں کی فہرست تیار کر رہے تھے۔ زینت، شعیب منصور سے کہہ رہی تھیں
"میں نے قیمہ ——— شامی کباب ——— آلو کی ترکاری ——— اور روسٹ تیار کرا لیے ہیں۔ دو درجن انڈے بھی ابال کر
لیے دے آئی ہوں۔ آدھا پونڈ مکھن اور چار بڑی ڈبل روٹیاں بھی منگوا لی ہیں۔ کینو اور کیلے بھی دو درجنوں کی تعداد میں
مزید کیا رہ گیا ہے نیلوفر ——— ؟"

"ایک عدد کریٹ آئس باکس میں ڈالنے کے لیے برف کی سلی۔ چھ درجن لیچی سمر سے دہلا کھو سیب ...
اور بس ———" نیلوفر نے کاغذ پر لکھی ہوئی لسٹ میں سے پڑھ کر سنایا۔

"چلو یہ سب تو ٹھیک ہے مگر وہ مٹھاس میں تو نے کیا رکھا ہے بیگم؟" شعیب منصور نے پوری فہرست سن کر پوچھا۔

"اوہ ہاں مٹھاس ——— ہاں بھئی مٹھاس تو ضرور رکھنا ہے، تمہارے ڈیڈی تو مٹھاس کے بغیر ایک قدم نہیں چلتے۔"

"مٹھاس وٹھاس نہیں ممی۔ ہم جاتے وقت بہت ساری آئس کریم لیتے جائیں گے۔" نیلما بولی۔

"ہاں جیسے صبح کے چار بجے تمہارے لیے دکانیں تو کھلی ہوں گی آئس کریم کی۔" نیلوفر بولی۔

"تو پھر ایسا کرتے ہیں کہ ابھی سے منگا کر فریج میں رکھ لیتے ہیں۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔ مگر اس کے ساتھ پانچ چھ ٹن برف بھی منگا لینا۔" شعیب منصور نے مشورہ دیا۔

"چلیں یہ بھی ہو جائے گا۔ مگر وہ دریاں اور قالین بھی لے جانے ہوں گے۔ ورنہ بیٹھیں گے کہاں۔" زینت بولیں۔

"ممی ہم ریسٹ ہاؤس میں ٹھہریں گے۔ میں نے صبح ہی فون کر کے دو کمرے ریزرو کرا لیے ہیں۔ پھر وہاں ..." اسفند بولا۔

"... ریسٹ ہاؤس میں کیا ابھی تو نہیں گھسے رہیں گے بھائی جان۔ ظاہر ہے باہر بھی گھومے پھریں گے۔ ایک دو
... وقت ہم ... ساتھ ہیں۔" نیلوفر بولی۔

"... بھائی جان نہیں ساتھ ... ٹھیک ہے میری دو چوٹی کی بڑی دری اسٹور سے نکلوا کر کریم سے جھڑوا لو۔ ہاں بھئی جو کچھ کرنا ہے ابھی کر لو۔ صبح کو تو
جاؤ پھر ... ہونے سے رہا۔" زینت نے کہا تو نیلوفر سلوط سے بولی۔

"... مجھے تو ایک منٹ کی بھی فرصت نہیں۔ سلوط پلیز آپ جا کر ذرا کریم کے ساتھ اسٹور سے وہ دری نکلوا لیں۔"

"نہیں بھئی ریوا ... ہو گیا جو سلوط کو بھیج رہی ہو۔ کریم خود ہی نکال لے گا۔"

زینت اس خیال سے جلدی سے بولیں کہ کہیں شعیب منصور نیلوفر کو کچھ نہ کہہ دیں۔ اس وقت کھانا ختم ہو چکا تھا اور سلوط کو آلو
... بنانے تھے۔ وہ کھانا ختم ہوتے ہی اٹھنے لگی تو شعیب منصور کچھ کہہ کر وہ کریم کے ساتھ اسٹور سے دری نکلوانے
... اور شامی کباب ...
... انہوں نے کہا۔

"ارے میں تو ابھی سے کہاں چلیں، تم بھی کوئی مشورہ دو کہ اور کیا کیا لے جانا چاہیے۔ ہماری طرف سے تو کل سات آدمی
... مگر میرے دوست صمد کی فیملی بہت بڑی ہے اور پھر اس کی بہنیں اور سامی صاحب بھی ساتھ جا رہی ہیں۔ کم و بیش پندرہ آدمی
... ان کے۔ یہ کھانے کی چیزیں کم تو نہیں پڑیں گی اتنے لوگوں میں؟"

"مجھے کیوں پڑنے لگیں، آخر وہ لوگ سولہ آدمی ساتھ لے جا رہے ہیں تو انہوں نے بھی پکنک کی کچھ تیاری کی ہو گی۔" زینت بولیں۔
"... سولہ ——— سولہ اور سات تئیس۔ پھر تو پورا جلوس ہی جائے گا۔ بلکہ قافلہ۔" نیلما آنکھیں پٹپٹا کر اور ایک جھرجھری سی
... کر بولی۔

"ارے نہیں ڈیڈی سے کاؤنٹ کرنے میں غلطی ہو گئی ہے۔ ہم تو صرف چھ آدمی ہوں گے ———" نیلوفر بولی۔

"تب بھی زیادہ ہی کیا پڑے گا۔ بائیس تو ہوں گے نا۔" نیلما نے کہا۔

"مگر کیا تم کریم کو ساتھ نہیں لے جا رہیں؟" شعیب منصور نے پوچھا۔

"نہیں اگر وہ نہیں جائے گا تو پھر کام کون کرے گا۔" زینت بولیں۔

"تو پھر آپ سنی، نیلوفر، نیلما، سلوط اور کریم کل سات ہی ہوئے پھر آپ نے چھ کیسے بتا دیے۔ اس سے پتا چلتا ہے آپ کے
... حساب میں فاسٹ ہیں نکا۔" شعیب منصور نے ہنس کر کہا تو جواب میں کچھ دیر خاموشی چھائی اور زینت اور نیلوفر ایک
... گئیں۔ پھر زینت نے آہستہ سے کہا۔

"سلوط تو نہیں جا رہیں ہمارے ساتھ ——— اس لیے میں نے سوچا کہ انہیں سہیل بھائی کے یہاں بھیج دوں کیونکہ وہ لوگ بھی تو
... پکنک پر نہیں جا رہے اس لیے سلوط ان کے پاس رہ لیں گی۔"

"سلوط کیوں کیا ان کو چھوڑنے آنا کے یہاں بھیجنے کی کیا تک ہے بھلا یہ پکنک پر کیوں نہیں جائیں گی؟" اسفند نے تیوری پر
... پوچھا تو زینت پھر نیلوفر کی طرف دیکھ کر رہ گئیں۔

"... کوئی خاص نہیں سا ہے۔ ہم نے سوچا ان کے لیے وہ لوگ بالکل انجان اور اجنبی ہوں گے۔ اور ایسے ماحول میں خود
... نہ سکیں گی۔ اس لیے کل کا دن نازش کے یہاں گزار لیں گی اور بس۔"

"... کیا خوب ——— بھئی ان کو اپنے ساتھ لے جائیے۔ تاکہ یہ ذرا گھوم پھر لیں تو ان کے خیالات میں کچھ تبدیلی آ جائے۔
... انسان کے لیے تفریح ضروری ہوتا ہے۔ ایک ہی گھر ایک ہی جگہ بیٹھ کر انسان جمود اور بوریت کا شکار ہو جاتا ہے ———"
شعیب منصور نے کہا۔

"... بہت سے کام کرنے ہیں۔" سلوط کو مطالبے کاموں کا خیال آیا تو وہ اٹھتی ہوئی بولی۔ اور مزید کچھ کھانے کے
... نہ لگی۔

"... آپ تو وقت دیکھتے ہیں نا موقع اور ساری باتیں سلوط کے سامنے کر کے مجھے شرمندہ کر دیتے ہیں۔" زینت آنسو کے جانے
... بولیں۔

"... ایسا کیا کہہ دیا جو آپ مجھ سے یہ شکوہ کر رہی ہیں۔" شعیب منصور نے گردن کو ایک جھٹکا سا دے کر کہا۔

بہنوں نے اپنے اپنے شانوں پر کیری بے اور دوپٹے لٹکا رکھی تھیں۔ اور نیلما نے ایک ہاتھ میں ایک پھول بھی لے رکھا تھا۔ نیلما نے پیروں میں جوگرز پہن رکھے تھے اور نیلوفر نے کورٹ شوز۔ سر پر دونوں نے بہت سٹائلش اسکارف باندھ رکھے تھے۔

اسفند تیار ہو کر اس وقت کمرے سے باہر نکلا جب زینت، نیلوفر، نیلما اور سلوط سمیت لاؤنج میں موجود پکنک پر ساتھ لے جانے کا سامان کریم سے اٹھوا کر باہر بھجوا رہی تھیں۔

"السلام علیکم ممی۔" اس نے ماں کے نزدیک آ کر انہیں سلام کیا اور پھر بہنوں پر ایک نظر ڈال کر بولا۔

"ارے ممی یہ دونوں ینگ لیڈیز کون ہیں کہاں سے آئی ہیں ان سے تو آپ نے میرا تعارف کرایا ہی نہیں۔" زینت نے اس کے سلام کا جواب دینے کے بعد مسکرا کر کہا۔

"کمال ہے تم نے ان ینگ لیڈیز کو نہیں پہچانا۔ یہ دونوں تو مروار محمد اسفند کی بہنیں اور چھوٹی بہنیں ہیں۔" اس بات پر نیلوفر اور نیلما نے جو بھائی کے مذاق پر کھلکھلا اٹھی تھیں ہنستے ہوئے اسے سلام کیا تو اس نے دونوں کو ان کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر خود سے چمٹاتے ہوئے کہا۔

"کیا واقعی ممی۔ مگر میں تو انہیں پہچان ہی نہیں سکا کہ یہ میری بہنیں ہیں۔ یہ تو بالکل شہزادیاں لگ رہی ہیں۔" کیا دونوں بہنوں نے بھی کبھی اس کو اتنی لگاوٹ برتتے نہیں دیکھا تھا۔ تینوں ہی خوشی سے کھلے پڑ رہی تھیں۔

"او ہاں ممی۔ میں یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ یہ جو ہماری پھوپھو بیگم کی ڈپلیکیٹ ہیں کیا انہیں کسی نے دعا سلام کے آداب نہیں سکھائے۔" وہ بہنوں سے الگ ہو کر ایک دم ہی اس کی طرف متوجہ ہوا تو وہ جو تینوں بھائی بہنوں کا اخلاص و پیار دیکھ کر اپنے ایک بھائی کی محرومی کو بڑی شدت سے محسوس کر رہی تھی۔ اس کا چہرہ اتر سا گیا۔

"جہاں تک دعا کا تعلق ہے تو پہلے تم انہیں سلام تو کرو۔ یوں بھی پھوپھو کی قائم مقام ہونے کی حیثیت سے سلام تمہیں انہیں کرنا چاہیے تھا۔" زینت نے محض اس کی شرمندگی کو مٹانے کی غرض سے کہا۔

"او ہاں یہ بھی ٹھیک ہے مجھے کچھ خیال ہی نہ رہا تھا۔" اس نے بعجلت اچکا کر کہا اور پھر قدم بڑھا کر سلوط کے نزدیک اور ماتھے تک ہاتھ لے جاتے ہوئے بولا۔

"خادم آداب بجا لاتا ہے مس خوبصورت۔" مگر وہ اس کے سلام کا جواب دینے کے بجائے سراسیمہ سی ہو کر پیچھے ہٹی تو اس نے یونہی جھکے جھکے گردن موڑ کر ماں کی طرف دیکھا۔

"کیوں ممی۔ پھوپھو بیگم تو میرے سلام کے جواب میں جھٹ پٹ بلائیں لے کر میری پیشانی چوم لیتی ہیں۔ کیا ان کا سر پر ہاتھ پھیر دینا ہی کافی نہ ہوگا۔" اور اس کی اس بات پر جہاں سلوط اندر ہی اندر ہول کے رہ گئی وہاں دونوں بہنیں ہنستے ہنستے دوہری ہو گئیں۔ اور اس ہنسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے سیدھا ہوتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

"اتنی خوبصورت لگ رہی ہیں کہ کسی گستاخی کا مرتکب ہونے کو دل چاہ رہا ہے۔" مگر اس تعریف اور تحسین پر شرمانے کے بجائے وہ گھبرا سی اٹھی۔ مگر اسی دم باہر کار رکنے اور لوگوں کے باتیں کرنے کی آواز آئی تو زینت نے گھبرا کر کہا۔

"افوہ۔ وہ لوگ آ گئے۔ اب تم بھی جلدی سے باہر چلو۔ تمہارے ڈیڈی نے تاکید کی تھی کہ پہلے سے باہر موجود ہو جانا۔ یہ نہ ہو کر سب کو انتظار کی سولی پر لٹکانے کے بعد آؤ۔ مگر ہوا وہی اب دیکھ لینا اس بات پر کتنی خفگی کا اظہار کریں گے۔"

"او جناب اتنی سی بات پر ڈیڈی خفا کیوں ہو جائیں گے۔ ہم نے تو بالکل دیر نہیں کی۔ اب یہ تو نہیں ہو سکتا تھا ہم پہلے سے جا کر باہر کھڑے ہو جاتے۔" نیلوفر بولی۔

"ممی یہ آپ دونوں نے صمد انکل کے فارم پر پکنک منانے کا پروگرام کیوں بنایا ہے آخر ہمارا اپنا فارم بھی تو ہے۔ پکنک منانے کی بات ہی اور ہوتی۔" نیلما نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

"اصل میں صمد بھائی نے یہ فارم نیا نیا خریدا ہے۔ اور اس میں کچھ نئی اصطلاحات بھی کی ہیں۔ بس اسی خوشی میں انہوں نے ہمیں وہاں چلنے کے لیے انوائیٹ کیا ہے۔" زینت نے بتایا۔

"کیسی نئی اصطلاحات ممی؟" نیلوفر نے صنوبریں سکیڑ کر پوچھا۔

ہیں وہ انہوں نے جو نئے رائیڈنگ ہورس گھڑ سواری کے گھوڑے خریدے ہیں ان کے لیے جدید طرز کا اصطبل اور بطخوں کے لیے جو نہر نکالی ہے اس پر بڑا خوبصورت پل بنوایا ہے۔ اور ریسٹ ہاؤس کے علاوہ جو بہاری چھوٹے چھوٹے حصے ہیں آگے پیچھے بڑی خوبصورت بنچیں بھی بنوائی ہیں یعنی اتفاق سے چاروں فارم ایک ساتھ فروخت ہو رہے تھے جو سب کے سب انہوں نے خرید لیے تھے۔ معلوم بھی ہے پورے ہزار ایکڑ رقبے پر پھیلے ہوئے ہیں یہ فارم اور جدید طرز کے باغات۔ پولٹری فارم الگ بنا رکھا ہے۔ اور مویشی خانہ الگ۔ حتیٰ کہ کھیت بھی ہیں جن پر گنوں ترکاریوں وغیرہ کی کاشت ہوتی ہے۔"

"او واہ پھر تو واقعی صمد انکل کا فارم دیکھنے سے تعلق رکھتا ہوگا۔" نیلما بولی۔

"ظاہر ہے حقیقتاً دیکھ لو گے تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔ ہمارا فارم اول تو ڈھائی سو ایکڑ کا ہے۔ دوسرے ہم نے اس پر اتنی توجہ ہی نہیں دی۔ تمہارے ڈیڈی نے تو بس اس خیال سے خرید کر ڈال دیا تھا کہ وہ بھی کم از کم ایک فارم کے مالک تو کہلائیں۔"

زینت بولیں تو اسفند جواب تک نہایت خاموشی سے ان کے ساتھ باہر کار تک آ رہا تھا بولا۔

"چیز کیا کہ ہم ایک فارم کے مالک تو ہیں۔ اگر ضرورت محسوس کی تو قرب و جوار کی زمینیں خرید کر اسے توسیع دے دیں گے۔ مگر دوسرے کی کسی چیز سے اس قدر متاثر ہونا دل میں حسد اور حرص پیدا کرتا ہے اور یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔" اور اس کی بات پر تینوں ماں بیٹیاں چپ سی ہو گئیں۔

یوں بھی یہ سب باتیں کرتے ہوئے باہر آ گئے تھے۔

پورچ سے لے کر گیٹ کے باہر تک۔ کئی کاریں ایک قطار کی صورت میں کھڑی تھیں۔ جن میں کاروں کے علاوہ ایک اسٹیشن ویگن۔ ایک جیپ اور ایک سوزوکی وین بھی شامل تھی۔ اور زینت کی طرف کا سارا سامان وین میں رکھا جا رہا تھا۔ کاروں میں ایک کچھ ہو حال سی مچی ہوئی تھی۔ اور ایسا شور مچ رہا تھا کہ توبہ ہی بھلی۔ کچھ مرد اور خواتین کاروں سے اتر کر باہر بھی کھڑے ہو گئے تھے اور ان سے ملنے ملانے اور باتیں کرنے کا سلسلہ اب طول پکڑنے لگا تو اسفند نے اپنی کار میں بیٹھ کر دونوں بہنوں کو آواز دی۔ وہ تو فوراً ہی بھائی کی آواز پر لپکیں نیلما سلوط کا ہاتھ پکڑ کر اسے بھی اپنے ساتھ لے آئی تھی۔

"جلو آؤ جلدی سے بیٹھ جاؤ۔ بس مجھے یہی بے قاعدگی پسند نہیں۔ اگر ان لوگوں کو باتیں ہی کرنی ہیں تو پکنک اسپاٹ پر پہنچ کر بھی کر سکتی ہیں۔ مگر یہاں کی خواتین کو وقت ضائع ہو جانے کا کوئی احساس ہی نہیں۔" اسفند بولا۔ اسی اثناء میں نیلوفر بھائی کے ساتھ اگلی سیٹ پر اور نیلما اور سلوط پچھلی سیٹ پر بیٹھ چکی تھیں۔ اور چونکہ اسفند کی کار پورچ میں سب سے آگے کھڑی تھی اس لیے اس نے اپنی کار آگے بڑھائی اور دوسرے گیٹ سے باہر نکل گیا۔

"مگر بھائی جان اور سب تو ابھی یونہی کھڑے ہیں۔" نیلوفر نے کہنا چاہا تو وہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔

"یونہی کھڑے رہیں تو اب مجھے بیٹھ کر کو ئی تکلیف کرتے دیکھ کر خود ہی آ جائیں گے۔" اور ہوا بھی یہی۔ اسفند کی کار کو دوسرے گیٹ سے باہر نکلتا دیکھ کر سب جلد جلد اپنی کاروں میں بیٹھ گئے اور پھر کچھ ہی لمحوں بعد دیگرے کاروں کا یہ مختصر سا قافلہ سوئے منزل روانہ ہوا۔

شعیب منصور نے پکنک کے لیے نیلوفر کی کار کا انتخاب کیا تھا۔ اور وہ بیوی کے ساتھ اس میں آ رہے تھے۔ روانگی چونکہ چار بجے کے بجائے ساڑھے پانچ بجے ہوئی تھی اور صمد جلیل کا فارم طیر کے نواح میں کہیں واقع تھا اس لیے وہاں پہنچتے پہنچتے پو پھٹ گئی تھی۔ اور کچھ اتنا دلفریب اور سحر انگیز سا سماں تھا کہ جی چاہ رہا تھا کہ وقت صبح کے اسی لمحے میں تھم جائے۔

اگر یہ ممکن نہ ہوتا تو ان پر فسوں اور حسین تر ساعتوں کو لازوال بنا دے۔

مگر وہاں تو اس دلفریب سماں سے لطف اٹھانے کا بھی موقع نہیں ملا تھا۔ اپنی سوچ کو امر بنا لینا تو بڑی بات۔ کیونکہ تقریباً دوسری تمام کاریں بھی آ گئی تھیں اور ان کے رکتے ہی ان میں سے ڈھیروں لڑکے اور لڑکیاں، خواتین اور مرد بمعہ ملازمین ابل سے پڑے تھے۔ جبکہ زینت کے اندازے کے مطابق تو کل اکیس بائیس افراد ہی تھے جو پکنک پر جا رہے تھے۔ مگر وہاں تو پکنک منانے تقریباً تیس درجن افراد آئے تھے۔ چھ شادی شدہ جوڑے۔ چھ لڑکے بارہ

"کیوں۔ آپ نے ان سے کچھ پوچھا تھا کیا؟" نیلما نے پوچھا۔
"نہیں۔ میں کیوں پوچھنے لگی۔" نیلوفر نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔
"تو پھر کیا وہ خود تم کو آ کر آپ کو بتائیں۔ ویسے بھی ان کے ساتھ آپ کا ذہنی موڈ [illegible]" نیلما طنزاً سا کرتی ہوئی بولی تو نیلوفر فوراً جواباً سی ہو کر بولی۔
"اُف۔ بھئی تم تو ذرا ذرا سی بات میں بحث پر اُتر آتی ہو مگر یہ کچھ اچھی عادت نہیں۔ میں نے تو اکیلا [illegible] کہ مجھے سلوطہ کے رو رہے ہیں سے شرمندگی سی ہو رہی تھی۔ کہ کبھی جھینپ رہی ہیں، کبھی شرما رہی ہیں اور کبھی [illegible] رہی جیسے کسی کو خاطر میں ہی نہ لا رہی ہوں۔ ایٹی کیٹس سے تو ایک دم عاری ہی ہے یہ لڑکی۔" نیلوفر نے جیسے [illegible] توڑ سے۔
"ہاں۔ وہ مکس ہونے کی کوشش نہیں کرتیں۔ مگر۔" نیلما نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ عروج ان کے نزدیک [illegible] لیے نیلما کو چپ ہو جانا پڑا۔ شروع شروع میں تو سب آہستہ آہستہ چل رہے تھے مگر تھوڑا آگے جا کر سب [illegible] تیز کر دی تھی۔
"بھئی آخر کتنی دور اور جانا ہو گا؟" تمینہ کی ممانی کی بھابی طلعت نے راستے کی طوالت سے اکتا کر پوچھا۔
"بس تقریباً نصف فاصلہ طے ہو گیا ہے۔" سبینہ نے بتایا۔
"پھر تو ہمیں دوڑ لگا دینی چاہیے تاکہ یہ فاصلہ کسی طرح ختم تو ہو۔" طلعت کی بہن رفعت بولی۔
"نہیں بھئی یہاں چلنا مشکل ہو رہا ہے اور تم دوڑ لگانے کو کہہ رہی ہو۔ اگر ابھی سے تھک گئے تو پھر [illegible] گزار دیں گے۔" طلعت بیزاری سے بولی۔
"مگر کچھ زیادہ فاصلہ تو نہیں۔ مشکل سے تین فرلانگ رہا ہو گا اور ہم دونوں تو صبح جوگنگ کے لیے نکلیں تو دو دو میل تک بھاگتے چلے جاتے ہیں۔" تمینہ بولی۔
"ہاں بھئی۔ تمہارا کیا کہنے۔ تمہاری تو بات ہی اور ہے۔ مگر اور تو اتنی دور تک چلنے کے عادی نہیں ہیں۔" عروج بولی۔
"بھئی پکنک پر آئے ہیں۔ کوئی زبردستی تو نہیں لائے گئے نا۔ تھوڑی بہت اسپورٹس مین شپ تو ہمیں بھی ہونا چاہیے۔" ارم بولی۔
وہ سب کے سب تین میں تمینہ کے دو کزن بھی شامل تھے ایسی پگڈنڈی سے گزر رہے تھے جس کے دونوں [illegible] میں سبزہ ہی سبزہ اور درخت ہی درخت اُگے ہوئے تھے۔ آگے جا کر درختوں اور سبزے کا سلسلہ ختم ہوا۔ [illegible] میں گھوم کر کھیتوں کی طرف چلا گیا اور یہ لوگ ایک چٹانی سے علاقے میں داخل ہو گئے۔ مگر یہ علاقہ اتنا [illegible] درخت اور پودے یہاں بھی لہلہا رہے تھے۔ صبح کی روپہلی اور نرم سی حرارت میں ڈوبی دھوپ [illegible] تھی۔ ساری لڑکیاں آگے بڑھ گئی تھیں۔ صرف سلوطہ ہی پیچھے رہ گئی تھی۔
اصل میں اس کی ہیل والی چپل اسے بہت تنگ کر رہی تھی جسے پہن کر وہ سخت پچھتا رہی تھی۔ کیونکہ [illegible] اندازہ نہیں تھا کہ اتنا چلنا پڑے گا جب کہ چلنے پھرنے کی تو ابھی ابتدا ہی ہوئی تھی۔ کوئی معقول چپل [illegible] تھی سینڈلز ہی تھے اور صرف لباس سے میچ کرنے کی وجہ سے اس نے وہ کالا سینڈل پہن لیا تھا اور تیز [illegible] کے باوجود پیچھے رہ گئی تھی جب کہ اور لڑکیاں اپنے آپ ہی میں مگن تھیں۔ اس پر انتہائی تیز رفتار اور [illegible] نہیں تھی اور پکنکس وغیرہ کے موقعوں پر ان باتوں کا زیادہ دھیان نہیں رکھا جاتا کہ کسی کے [illegible] وقت [illegible] پالیسی کی وجہ سے اپنی آخر تک میں وقت ضائع کیا جائے اور پھر وہ پیچھے ہی تو آ رہی تھی۔ اسی لیے سب بہت آگے [illegible] اسفند بھی تمینہ کے کزن سے باتیں کرتا ہوا بہت آگے نکل گیا تھا۔ مگر اس کا سارا دھیان ساری توجہ سلوطہ کی طرف ہی [illegible] کر چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کا سلسلہ شروع ہوا تو اس نے مڑ کر دیکھا۔ سلوطہ اسے کہیں نظر نہیں آئی۔ وہ [illegible] کزن سے کٹ کر علیحدہ چلنے لگا اور جب وہ دونوں کافی آگے نکل گئے تو وہ اسے ڈھونڈتا ہوا پلٹ کر پیچھے آ گیا۔ وہ

[illegible] آہستہ چلتی آگے بڑھ رہی تھی۔
"[illegible] کیا ابھی سے تھک گئیں آپ؟" اس نے اس کے قریب آ کر پوچھا۔
"[illegible] نہیں بس ذرا یہ جوتی تکلیف دے رہی ہے۔" سلوطہ نے بتایا تو اسفند کی نظر اس کے پیروں پر پڑی۔
"[illegible] تو بالکل نہیں [illegible] نہیں دے گی تو اور کیا کرے گی۔ بھلا یہ چپل پہنی بھی کہیں پکنک پر پہنی جاتی ہے۔ تعجب ہے آپ کو اتنا بھی [illegible] ہے کبھی پکنک پر جانے کا اتفاق نہیں ہوا آپ کو؟" وہ صاف گو تھا اس لیے کوئی بات کہنے میں باک نہیں [illegible] پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اسی شرمندگی میں وہ اسے یہ بھی بتانے کے قابل نہیں رہی کہ ان کے پاس کوئی [illegible] نہیں تھی۔
"[illegible] کو معلوم نہیں تھا تو کم از کم کسی سے پوچھ ہی لیا ہوتا۔ مگر مجھے معلوم ہے آپ نے اپنے کمپلیکس میں نہیں پوچھا [illegible] سینڈل کی وجہ سے آپ تھوڑا سا انجوائے کرنے کے بھی قابل نہ رہیں گی۔ بہتر یہی ہے کہ اب اسے اتار کر اپنے [illegible] میں ڈال لیں۔"
[illegible] صاف گوئی میں تھوڑی سی ناگواری شامل کر کے بولا حالانکہ وہ بہت سادہ لہجے میں بات کر رہا تھا۔ مگر ایک [illegible] کمپلیکس کا نام دوسرے اس کی گفتگو کے ہر لفظ سے اسے طنز سا جھلکتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی باتوں سے وہ [illegible] محسوس کر رہی تھی۔ احساسات مجروح ہو کر رہ گئے تھے۔ دل کٹ کے رہ گیا تھا۔ اور دل تھا کہ بھرے چلا آ رہا تھا پھر [illegible] ضبط سے کام لے کر بولی۔
"[illegible] نہیں بہن کر ایک جہالت آمیز قدم اٹھا رہی ہوں تو اب انہیں اتاروں گی نہیں؟
خواہ میرے پیروں میں موچ آ جائے یا ٹخنے کی ہڈی ٹوٹ جائے۔" اس نے چڑتے ہوئے انداز میں پوچھا۔
"ہاں خواہ کچھ بھی ہو جائے مگر یہ میرا ہو کر تماشا نہیں بنوں گی۔" وہ بپھرے ہوئے انداز میں بولی۔
"عجیب ہے۔ آخر اس بچکانہ سی ضد سے حاصل کیا ہو گا۔ آخر آپ کس وجہ سے اتنے شدید کمپلیکس کا شکار ہیں [illegible] جب کہ اپنی ہم عمر لڑکیوں میں آپ ہمیشہ اور ہر جگہ ممتاز ہی لگتی رہی ہیں۔"
[illegible] سلی باتوں پر متعجب سا ہو کر بولا تو اس کا دل چاہا کہے۔ سب سے بڑی کمی تو یہ ہے کہ مالی اعتبار سے [illegible] حیثیت کچھ نہیں ہے۔ دوسرے آپ لوگوں سے میری کوئی رشتے داری بھی نہیں ہوتی۔ بس آپ کی پھپھو کے [illegible] پہچانی جاتی ہوں۔ اسی لیے آپ کے ہاں میری قدر کی جاتی ہے نہ وقعت۔ مگر بھلا کیسے کہہ دیتی یہ سب۔
[illegible] کہہ دیتی تو وہ اسے وہی کمپلیکس کا شکار ہونے کا طعنہ دیتا۔ کبھی کبھی حالات کی [illegible] [illegible] ہے جس اور بے دست و پا کر دیتے۔ کہہ دیتی ہیں کہ نہیں تمہیں اگر یہ سب کچھ پتا بھی ہے تو بھی خود اپنی نظروں [illegible] جواب دینے کے بجائے وہ آزردہ سی ہو کر اپنا ہونٹ کاٹنے لگی۔ وہ بھی سمجھ گیا کہ اس کی کوئی [illegible] اپنے لہجے میں نرمی پیدا کر کے اسے سمجھانے کے سے انداز میں بولا۔
"[illegible] نہیں چاہتا ہوں کہ آپ اپنے گرد چڑھائے ہوئے احساس کمتری کے اس خول سے باہر نکل آئیں جس نے [illegible] شخصیت پر ایک جمود سا طاری کر دیا ہے۔ وہ سب کے ساتھ مکس ہوں۔ آزادی سے ہنسیں بولیں۔ دوسروں کی [illegible] اپنی مرضی کو مقدم رکھیں۔ تھوڑا سا اس نئی تہذیب میں خود کو ڈھال کریں۔ میرا مطلب ہے زمانے [illegible] اور کچھ نہیں تو یہی سمجھ کر کہ آپ میری ملکیت بننے والی ہیں میری امانت ہیں۔"
"[illegible] نہیں۔ میں آپ کی امانت نہیں ہوں۔ میں کبھی آپ کی ملکیت نہیں بن سکتی۔ ایسا ہر خیال آپ اپنے دل [illegible]
[illegible] ہی میں جو گرم سا پانی بھر جانے کی وجہ سے اس نے رندھے ہوئے گلے کے ساتھ کہا کہ یوں بھی حالات [illegible] سلجھنے میں وہ بری طرح جکڑی ہوئی تھی اس کا بھی اسے پورا پورا احساس تھا۔
[illegible] بات۔ آخر ایسا کیا کمپلیکس ہے آپ کو۔ آخر کس وجہ سے آپ خود کو میرے قابل نہیں سمجھتیں۔ کچھ [illegible] مجھے بھی تو پتا چلے۔" وہ اس کی باتوں پر زچ سا ہو کر بولا۔
[illegible] رہا تھا اسے سب کچھ بتا دیتی۔ مگر بعض و قتی مصلحتوں کے بنا دے میں کچھ اس بری طرح بیٹھے ہوئے

جو احساسِ گناہ سے اور کچھ اسفند کے ساتھ دیکھ لیے جانے کی وجہ سے اتنی اکھڑی اکھڑی الگ رہی تھی کہ یوں
جیسے وہ سچ مچ روٹھی رہی ہو۔ تب زینت نے اس کے پاس گھاس پر ہی بیٹھتے ہوئے کہا۔

صمد جلیل نے واقعی غضب کا اہتمام کرایا تھا۔
سبزے کے باغ میں درختوں کے درمیان — ایک کھلے ہوئے وسیع قطعے کے سبزہ زار پر خوشنما اور دیدہ زیب بڑے بڑے قالین بچھائے گئے تھے جن پر بڑے قرینے سے سبز، سرخ، نیلے اور زرد رنگ کے گاؤ تکیے رکھے تھے۔ اور اوپر شامیانہ تنا ہوا تھا۔ ایک سرے پر شامیانے سے باہر چھوٹی چھوٹی میزوں پر جگ اور گلاس رکھے گئے تھے۔ اور ان میزوں سے فاصلے پر ایک طرف ٹھنڈے پانی کے دو فلاسک رکھے تھے اور دوسری طرف واش بیسن نلکی والی ٹنکیاں۔ اور وہیں۔ قالینوں کے آخری سرے پر چھوٹی چوکیوں کو باہم جوڑ کر دسترخوان بچھوائے گئے تھے جن پر پلیٹیں سجی تھیں اور یہ سب اس قدر خوبصورت اور نفیس سا لگ رہا تھا کہ سلوط تھوڑی دیر کے لیے سب کچھ بھول کر ٹکٹکی سی ان ساری چیزوں کو دیکھتی رہ گئی تھی۔
زینت اسے لے کر یہاں تک تو آ گئی تھیں مگر اس کے پاس بیٹھ کر اپنی تفریح کو خراب نہیں کر سکتی تھیں اور پھر صمد جلیل اپنی بیٹی، دوست قیصر اور مسز قیصر سمیت ان کے ساتھ ہی چلے آئے تھے۔ وہ سلوط کو ایک گاؤ تکیے کے سہارے آرام سے بٹھا کر وہیں بیٹھی نہیں تھیں بلکہ اپنے ساتھیوں سے وہیں کھڑے کھڑے کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد سلوط سے مخاطب ہو کر بولیں۔
"اچھا اب تم اطمینان سے یہاں بیٹھو۔ کریم تو کسی نہ کسی کام سے ادھر آئے گا ہی۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو اس سے منگوا لینا۔"
"لیکن میرے خیال میں بہتر یہی ہو گا کہ یہ گڑیا بجائے چلنے پھرنے کی کوشش کریں۔ پیر کو ہلائیں جلائیں نہیں۔ ورنہ اگر سوجن بڑھ گئی تو گھر جانے کے قابل بھی نہیں رہیں گی۔" مسز قیصر نے مشورہ دیا تو صمد جلیل فوراً بولے۔
"ہاں علیٰ ہذا القیاس بھابی۔ یوں بھی عموماً موچ پیر کی ہڈی کا جوائنٹ ہل جانے کی وجہ سے آتی ہے۔"
"ہاں لیکن تنہا کیسے چل پھر سکیں گی۔ جب تک کوئی سہارا دینے والا ان کے پاس نہ ہو یا پھر کم از کم کوئی چھڑی وغیرہ ہی ہو۔" فریحہ منصور نے کہا تو زینت جلدی سے بولیں۔

"خیر چھڑی کا دستیاب ہونا کچھ مشکل تو نہیں۔ کریم بار بار ادھر کے پھیرے لگا ہی رہا ہے۔ اس سے کہہ کر منگوا لیجئے اُٹھنا چاہئیں۔"

"نہیں نہیں۔ میں کوشش تو یہی کروں گی کہ بلا سہارے اُٹھ کر چل سکوں لیکن اگر چھڑی کی ضرورت پڑی تو ..."

سلوطہ نے گویا شعیب منصور کو اطمینان دلانے کی غرض سے کہا۔ اصل میں تو سے معلوم تھا کہ یہ سب ... تو اس سے ہیں۔ اور یوں بھی اس کی وجہ سے کوئی بندھ کر تو نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اور وہ تو خود بھی شرمندہ سی ہو رہی تھی کہ ان سب کے لیے ایک مسئلہ بن گئی ہے۔ وہ سب تو پہلے ہی جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ اس کے اطمینان دلانے پر دایت سمت روانہ ہو گئے۔ اور جب یہ سب نظروں سے اوجھل ہو گئے تو وہ فوراً ہی اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ... آئی تھی۔ وہ تو دونوں کو بچا دیکھ لینے جانے پر خاص طور پر اس کی پوزیشن صاف کرنے کی غرض سے اسفند نے محض بہانہ گھڑا تھا جسے مصلحتاً اسے بھی نبھانا پڑ رہا تھا۔

ارد گرد کے تقریباً سارے ہی پیڑ پکے پکے سنگتروں سے لدے ہوئے تھے۔ اسے یوں بھی الگ رہنا تھی مگر ... تھا اور ضمیر پر کچھ اتنا بوجھ آن پڑا تھا کہ اس نے نگاہ اٹھا کر پھلوں سے لدے درختوں کی طرف دیکھا ہی نہیں۔ ... سے تھی کہ سنگتروں کے باغ کی تھوڑی سی سیر ہی کر آئے گی۔ لیکن وہی شکل تھی کہ اکیلا نہ ہنستا بھلا نہ روتا بھلا۔ ... فرش پر ہی بجھا بجھا گران سارے واقعات پر غور کرتی رہی جو اب تک اسے پیش آتے رہے تھے۔ مگر احساسِ گناہ اس قدر غالب تھا کہ سوچ کے تانے بانے بار بار ٹوٹ ٹوٹ جاتے۔

جانے کہاں پہنچی ہوئی تھی وہ۔

یا خیالات کی کون سی جنگ لڑ رہی تھی وہ کہ وقت کے گزرنے کا احساس بھی نہ رہا تھا۔

جو بڑی سرعت سے گزر گیا تھا۔

دھوپ اس لمحے اپنی تمازت کے ساتھ پوری شدت سے چمک اُٹھی تھی۔

اور سورج نصف النہار کی حد پار کر گیا تھا۔

اور جیسا کہ زینت کا خیال تھا کہ کریم کسی نہ کسی کام سے اس طرف آتا جاتا رہے گا تو وہ اب نکل کے آیا تھا۔ وہ بھی چند دوسرے ملازمین کے ساتھ جو شاید کتوں کے جوکے پر کھانا چُھٹنے کی غرض سے آئے تھے۔

اسے وہاں خلافِ توقع اور گمان تنہا بیٹھا دیکھ کر کریم متعجب ہوئے بغیر نہ رہا اور اس کے پاس آ کر ہمدردانہ لہجے میں بولا۔

"مجھے تو پہلے ہی معلوم تھا بی بی کہ آپ کے ساتھ یہی سلوک کیا جائے گا۔ آپ ناحق ہی ان لوگوں کے ساتھ آئیں۔"

اوہ گویا ان لوگوں کے رویے نے کریم کو بھی میری اوقات جتا دی ہے۔ اس نے دکھ کے ساتھ دل میں سوچا اور پھر فوراً ہی کریم کے خیال کی تردید کرتی ہوئی بولی۔

"ارے نہیں یہ بات نہیں کریم۔ اصل میں میرے پیر میں موچ آ گئی تھی۔ بھابی جان بے چاری خود ہی سہارا دے کر مجھے یہاں لائی تھیں۔ اب میری وجہ سے بندھ کر تو نہیں بیٹھ سکتی تھیں اس لیے میں نے خود ہی بہت کہہ سن کر انہیں بھیج دیا ہے۔"

مگر اس کی وضاحت پر بھی کریم نے اس کی طرف کچھ ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو خیر آپ جو کچھ بھی کہیں مگر میں تو خوب جانتا ہوں۔

"کیا بجا ہوگا اس وقت کریم؟" اس نے کریم کا دھیان پلٹنے کی غرض سے پوچھا۔

"ایک بجنے والا ہے بی بی اور ادھر ابھی تک کسی کا پتا ہی نہیں۔ اور ادھر اس غلام قادر (صمد علی کا ملازم) کے بچے نے تو جلدی کر کر کے میرے ہاتھ پیر پھلا دیے یہ کہہ کر کہ اس کے صاحب نے ٹھیک بارہ بجے کھانا لگ جانے کا بولا تھا۔ لو بھلا۔ بارہ بجے کھانا لگا دیا جاتا تو اب تک ٹھنڈا ہو کر کسی کے کام کا بھی نہ رہتا۔"

کریم نے اتنے مختصر سے سوال کا اتنا طویل جواب دیا تھا۔ اور پھر مڑ کر فوراً ہی اس طرف چلا گیا تھا جہاں دوسرے ملازم کھڑے تھے۔ اور ابھی اس کی دوسرے ملازموں سے کچھ بحث و تکرار ہو ہی رہی تھی کہ مخالف سمت سے گھوڑوں پر سوار ثمینہ، سبینہ۔ عروج۔ ارم۔ ماریہ۔ طلعت۔ رفعت۔ نیلوفر۔ نیلما اور ثمینہ کے دونوں کزنز کا قافلہ آتا نظر آیا۔

ماریہ۔ ثمینہ۔ سبینہ۔ عروج۔ ارم۔ اور ثمینہ کے دونوں کزنز تو علیحدہ علیحدہ گھوڑوں پر سوار تھے جب کہ طلعت رفعت ایک گھوڑے پر اور نیلوفر نیلما دوسرے گھوڑے پر بیٹھی تھیں۔

سب شامیانے سے تھوڑی دور ہی رک کر گھوڑوں سے اتر گئے تھے اور ثمینہ کے دونوں کزنز گھوڑوں کے ساتھ رہ گئے اور ساری لڑکیاں آپس میں باتیں کرتی شامیانے میں آ گئی تھیں۔

"ارے آپ یہاں اکیلی بیٹھی ہیں اور وہ اسفند بھائی کہاں ہیں سلوطہ؟" سبینہ نے آتے ہی اس سے پوچھا۔

"مجھے کیا معلوم۔ وہ تو آپ کے ساتھ ہی گئے تھے۔" سبینہ کے سادگی سے کیے سوال میں بھی سلوطہ کو ایک معنی خیزی سی محسوس ہوئی۔ اس نے قدرے تیکھے سے لہجے میں جواب دیا۔

"ہاں گئے تو ہمارے ساتھ ہی تھے اور یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ آپ کے ساتھ کوئی چھوٹا سا حادثہ پیش آ گیا تھا۔ مگر وہ تو پہلے ہی چلے آئے تھے۔" نیلوفر چبھتے سے لہجے میں بولی۔

"آپ بھی پہلے ہی آ گئے تھے تو میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ مجھے تو منجھلے آغا اور بھائی جان یہاں چھوڑ کر گئے ہیں۔ میں آپ کے پیچھے رہ گئی تھی۔ تیز چلنے کی کوشش کی تو پیر مڑ گیا۔ ورنہ ایسا کوئی حادثہ تو پیش نہیں آیا مجھے۔" وہ تیوری پر بل ڈال کر بولی۔

"تو آپ نے بھی بے وقوفی کی حد کر دی۔ بھلا پکنک کے موقع پر چپل ہیل پہن کر آنے کی کیا ضرورت تھی۔ موچ ہی کیا فریکچر بھی ہو سکتا تھا آپ کے پیر میں۔"

نیلوفر نے جلے کٹے سے انداز میں یہ کہہ کر گویا دوسرے معنوں میں اس کی نااہلی اور جہالت کا پول کھولا۔ مارے شرمندگی کے اس سے کوئی جواب بھی نہ بن سکا۔

"اب چھوڑیں بھی نا۔ جو کچھ ہونا تھا سو ہو گیا۔ خواہ مخواہ سب کے سامنے انہیں شرمندہ کرنے سے فائدہ۔" نیلما نے جو نیلوفر کے قریب ہی کھڑی تھی آہستہ سے اس کا شانہ دباتے ہوئے کہا۔

"تو میں ہی شرمندہ کیوں کرنے لگی انہیں۔ شرمندہ تو اصل میں سب کے سامنے انہوں نے ہمیں کیا ہے۔ چپل ہیل پہن کر۔" نیلوفر نے بھی آہستہ سے انگریزی میں کہا۔

"لیکن بھائی جان نے تو یہ بتایا تھا کہ یہ عجلت اور بے دھیانی میں چپل ہیل پہن کر آ گئی تھیں اور انہیں اپنی اس غلطی کا احساس یہاں آنے کے بعد ہی ہوا تھا۔" نیلما جو اس معاملے کو دبانا چاہ رہی تھی آہستہ سے بولی۔

"ارے چھوڑو۔ بھائی جان سب کے سامنے کیا یہ کہتے کہ یہ اتنی ان پڑھ اور جاہل ہیں۔ ظاہر ہے انہوں نے اپنی حیثیت بنانے کو بات بنائی ہوگی۔" نیلوفر تنتناتے ہوئے لہجے میں بولی۔ اب اسے کیا معلوم تھا کہ سبینہ اس کے عین پیچھے کھڑی اس کی باتیں سن رہی ہے۔ وہ فوراً ہی بولی۔

"ہائے نہیں ایسا تو نہ کہیں نیلوفر۔ عجلت اور گھبراہٹ میں تو انسان اس سے بھی کہیں زیادہ بدحواس ہو جاتا ہے۔ پتا ہے ایک مرتبہ ہمیں اپنے کزن کی ویڈنگ پر جانا تھا۔ ممی کی عادت ہے بڑی دیر میں تیار ہوتی ہیں۔ ادھر ڈنر کا وقت نکلا جا رہا تھا۔ پاپا جلدی مچا رہے تھے۔ ممی مشتم پشتم تیار ہو کر ہم سب کے ساتھ شادی ہال پہنچیں تو پیروں پر نظر پڑتے ہی سر پکڑ کر بیٹھ گئیں کیونکہ جلدی میں وہ باتھ روم سلیپرز پہنے پہنے آ گئی تھیں۔"

"ارے ہاں اس وقت ممی کی شکل دیکھنے والی تھی۔ بس رونے کی کسر رہ گئی تھی۔ میرا تو ہنستے ہنستے بُرا حال ہو گیا تھا۔" ثمینہ اس واقعے کو یاد کر کے ہنستی ہوئی بولی۔

"اور ثمینہ! پاپا کی بات کرو جو ممی کی تو جلدی میں بلاؤز بدلنا بھی بھول گئی تھیں۔ گھر واپس جا کر بدلنے کا بھی وقت نہیں تھا۔ سارا وقت اپنی پرنٹڈ کی ساڑھی میں لپٹی سمٹی بیٹھی رہی تھیں۔" طلعت نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔

"ارے بابا نہیں۔ یہ خاص طور پر ممی لوگ کی جنریشن ... زیادہ واشتیں ... بھول جاتی ہیں۔ میری ممی تو ایک ایرنگ ... اور شوز کے معاملے میں تو کچھ یوں ہوتا ہے کہ ایک جوتی ایسی ایک جوتی ویسی۔"

... نے کہا تو ایک قہقہہ پڑا۔ اور یوں جہاں سلوطہ کو ان لوگوں کی گفتگو نے مزید شرمندگی سے بچا لیا وہاں بات کا رخ ... اور باتوں کا رخ ہواؤں کے رخ پر رکھے ہوئے کاغذ کی طرح ہوتا ہے جو ہواؤں کی زد میں آ کر اڑتا ہے تو

اور اگر مرضی کے خلاف کوئی بات ہو جائے تو اپنے آپے میں نہیں رہتا۔
اصل میں تو اب تک وہ اسے سمجھ ہی نہ سکی تھی۔
نہ اس کی عادات و مزاج کے بارے میں ہی کچھ جان سکی تھی۔
ماسوا اس کے کہ وہ بہت صاف گو۔
تند مزاج اور اپنی بات منوانے کا عادی ہے اور سلوط تو سلوط خود اسفند کی ماں بھی اس کے بارے میں کچھ ایسے ہی [illegible] رکھتی تھیں۔ سب سے بڑی بات جو اسے بُری لگی تھی وہ یہ تھی کہ اس نے اپنی پریشانی میں اسے شریک نہیں کیا تھا۔
ورنہ جب دل ایک ہوں اور جذبے لئے ہم آہنگ۔
تو خوشی، غمی اور پریشانی بھی مشترک ہونی چاہیے۔
صاف ظاہر تھا وہ سلوط کو اب تک کوئی حیثیت کوئی مقام نہیں دے سکا تھا اور بہن کی فکر اور پریشانی وہ تنہا جھیل رہا تھا۔ اور یہ بات سلوط کو ــــ سخت گراں گزری تھی۔
آخر کیا جذبہ ہے۔
کیسی محبت ہے۔
کیا اسفند صرف اپنے موڈ سے ہی ہر بات کرنے کے عادی ہیں۔
کیونکہ اس وقت اگر موڈ میں ہوتے تو ہزار گریز و احتراز سے کام لیتی وہ اپنی بے ساختگی کا کوئی نہ کوئی مظاہرہ کر کے [illegible] اس وقت ان کا موڈ بگڑا ہوا تھا۔ اس لیے پیچھے گردانا تک نہیں۔
ایسے دل گرفتہ سے خیالات میں گھری وہ اٹھ کر جیسے ہی پینٹری میں آئی تو کریم فرج کی صفائی کرتا نظر آیا۔
"کیا ولی محمد آ گئے۔" اس نے خانساماں کے بارے میں پوچھا۔
"نہیں بی بی دولت صاحب کا بچہ کبھی ساڑھے نو بجے سے پہلے نکل کر آتا ہے۔ گھر میں ہوگا تو لوٹوں پر قلعی پھیرتا ہوا۔" کریم فریزر سے ناکارہ برف کا بڑا سا ٹکڑا نکالتا ہوا بولا۔
"اچھا خیر میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔ خانساماں آئے تو اسے میرے پاس بھیج دینا۔" اتنا کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف [illegible]
پینٹری سے نکل کر لاؤنج میں آئی تو لاؤنج میں آتے ہی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے لپک کر ریسیور اٹھا لیا۔
"ہیلو کریم ــــ" یہ زینت کی آواز تھی۔ جسے سن کر اس کا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔
"بھابی جان کریم تو کچن میں ہے۔" اس نے کوئی بری خبر سننے کے لیے خود کو تیار کر کے کہا۔
"اچھا تو تم سلوط بول رہی ہو۔" زینت بولیں۔
"جی ــــ"
"کیا بابا گھر میں ہیں یا چلے گئے۔؟"
"معلوم نہیں ابھی کچھ دیر پہلے تو یہیں تھے۔"
"کیا انہوں نے ناشتا کر لیا ہے؟"
"نہیں صرف چائے پی ہے۔"
"او میرے پھر گئی۔ نازو کی طرف سے پریشان بھی تو بہت تھے وہ۔ اس لیے نہ کیا ہوگا۔ خیر اگر ابھی گھر میں موجود ہیں تو انہیں جا کر خوشخبری سنا دو کہ خدا نے انہیں ایک چاند سے بھانجے سے نوازا ہے۔ نازو کے یہاں ابھی دس منٹ قبل بارہ بجے [illegible] ہے۔" زینت یہ خوشخبری سناتے وقت اتنی مسرور تھیں کہ ان کی آواز کانپ رہی تھی۔
"او اچھا اچھا ــــ تو اسے مبارک ہو بھابی جان مگر نازو کی طبیعت کیسی ہے۔؟"
"بس ٹھیک ہی ہے۔ اتنی سخت تکلیف بھی تو اٹھائی ہے۔ ہوتے ہوتے ہی بحال ہوگی۔ خیر تم بابا کو تو کسی طرح بتا دو۔" زینت بولیں۔ شاید بہت زیادہ ایکسائیٹڈ ہو رہی تھیں جو انہوں نے اس کی مبارکباد کو بھی [illegible] تھا۔
"جی اچھا دیکھتی ہوں۔" سلوط نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

[illegible] اسفند کو اتنی بڑی خوشخبری سنانے اس کے کمرے کی طرف دوڑی تو وہ جو ڈیوٹی پر جانے کی جلدی میں تھا اسے راستے میں [illegible]
"[illegible] آپ کے لیے ایک زبردست خوشخبری ہے۔ نازو کے یہاں بیٹا پیدا ہوا ہے۔ ابھی ابھی بھابی نے فون پر اطلاع دی ہے۔"
"[illegible] مگر نازو کیسی ہے؟" خوشی کے ساتھ ساتھ اس نے بہن کی طرف سے تردد کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔
"بالکل ٹھیک ہیں۔ البتہ کمزوری تو ہو گی اتنی سخت تکلیف جو اٹھائی ہے۔"
"[illegible] تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔" اسفند نے دعائیہ انداز میں ہاتھ اٹھا کر شکرانہ ادا کیا۔ اور پھر ایکدم ہی بہت شوخ اور [illegible] ہو کر اس کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔
"[illegible] زبردست خوشخبری سنانے والے کا منہ تو موتیوں سے بھر دیا جاتا ہے مگر میں آپ کا منہ ــــ کس چیز سے بھروں!" اور [illegible] کا مطلب سمجھ کر ایسی شرمائی کہ بھاگتی ہوئی کچن میں چلی آئی۔ وہ بھی اس کے پیچھے کچن میں آ گیا۔ خانساماں اس وقت تک [illegible] آ چکا تھا اور کریم اپنی [illegible] وقت گزر جانے کا احساس دلا رہا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی دونوں خاموش ہو گئے۔
[illegible] آتے ہی کریم سے بولا۔
"[illegible] اب اپنی ساری منتیں پوری کرو۔ خدا نے تمہاری بڑی بیٹیا کو بیٹے سے نوازا ہے۔"
"مبارک ہو مبارک ہو بابا صاحب ــــ کیوں بی بی میں تو کہتا تھا کہ اللہ پاک کوئی بڑی خبر سنائے گا۔" کریم خوشی سے چیخ [illegible] اٹھا۔
"چھوٹے سرکار اتنی بڑی خبر آپ اتنے روکھے منہ سے دے رہے ہیں۔ ماموں بن گئے ہیں آپ تو کچھ صدقہ خیرات دیجیے مٹھائی کھلائیے۔" خانساماں پوری کھیسیں نکال کر بولے۔
"ارے جا تجھے تو بس ہر بات میں ہی پیسہ ٹھونسنے کی پڑی رہتی ہے۔ ارے اتنی بڑی خوشی کا موقع ہے یہی کیا کم ہے۔ ہو منہ [illegible] انعام دے دو۔" کریم خانساماں پر برسا۔
"نہیں کریم ــــ یہ انعام اور مٹھائی وغیرہ تو تم لوگوں کا حق ہے۔ چلو میرے ساتھ میں تمہیں صدر میں اتارتا جاؤں گا۔ تم فی الحال [illegible] ہسپتال جا رہا ہوں۔ واپسی میں تم کو لیتا آؤں گا۔" اسفند بولا۔ پھر اس نے جیب سے اپنا بٹوہ نکالا [illegible] روپے کا نوٹ خانساماں کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولا۔
"[illegible] پچاس تم لے لو اور پچاس کریم کو دے دو۔ میرے پاس اس وقت چینج نہیں ہے۔" اور خانساماں نے فوراً ہی [illegible] ان کے ہاتھ سے لے لیا۔ [illegible] خاموش کھڑی یہ سب دیکھ رہی تھی کہ اسفند ایکدم ہی اس سے مخاطب ہو کر بولا۔
"[illegible] آپ انعام میں کیا لیں گی۔؟ یہ اتنی بڑی خوشخبری سب سے پہلے آپ نے ہی سنائی ہے۔"
"[illegible] انعام ملنا چاہیے وہ لیں۔" کریم ہنس کر بولا۔ اور سلوط جیسے دونوں ملازموں کے سامنے انعام کے بارے میں [illegible] انعام و اکرام سے تو ملازموں کو نوازا جاتا ہے اور وہ اسے بھی شامل کر رہا تھا ان میں ــــ اس پر کریم نے [illegible] اس کا چہرہ غم و غصے سے سرخ پڑ گیا۔
"[illegible] کچھ نہیں چاہیے۔ آپ اپنا نوٹ یہ مروت! میں تمہاری نوکر نہیں ہوں، سمجھے آپ۔" وہ غصے سے بل کھا کر بولی۔
"[illegible] نہیں بی بی ورنہ یہ تو خوشی کا موقع ہے اور آپ کو تو انعام بھی بڑا تگڑا ملے گا۔" کریم اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے [illegible] بولا۔
"[illegible] میں اگر اپنی مروت اور رواداری میں یہاں کے کام کرتی ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ کسی کی زرخرید [illegible] گھر میں تو ایک دو نہیں آٹھ دس نوکر تھے۔ اور اتنا کر و فر کہ جس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔" وہ بولنے پر آئی تو [illegible] زیادہ بول گئی تھی۔
"[illegible] مذاق کا یہ مطلب لیا ہے۔ تم واقعی مریا احساس کمتری میں غرق ہو۔" ملازموں کے سامنے [illegible] اسفند کو سخت گراں گزرا۔ اسی لیے اس نے انگلش میں گویا اسے ملامت کی اور پھر کریم سے بولا۔
"[illegible] کریم مجھے واپسی میں آتا ہے۔" اور پھر تیزی سے چلتا ہوا کچن سے نکل گیا۔ اور سلوط جیسے اب تک احساس [illegible]

سی کر کے دیکھ لی۔ مگر یہ کسی طرح آمادہ ہی نہیں ہوتے یا انہیں کوئی لڑکی پسند نہیں آتی۔
یا پھر کوئی لڑکی ان کے معیار پر پوری ہی نہیں اترتی۔
مگر اس وقت چونکہ وہ بیٹے سے سخت کبیدہ اور شاکی تھیں اس لیے پھولے پھولے سے منہ کے ساتھ بولیں۔
"اب اس سلسلے میں، میں کیا کر سکتی ہوں جبکہ خود انہیں ہی پابند ہونا گوارا نہیں۔ میں نے ایک سے بڑھ کر لڑکیاں انہیں دکھا دیں۔"
"ارے نو ممی! اب ایسا بھی نہیں کہ کوئی لڑکی مجھے پسند ہی نہیں آئی۔ بلکہ آپ کی اطلاع کو میں ایک لڑکی پسند کر کے پابند ہونے کا ارادہ بھی رکھتا ہوں۔"
اس نے بتایا مگر کہنے کا انداز کچھ ایسا عجیب اور چیلنج کرتا ہوا سا تھا کہ ماں اور باپ دونوں ہی ٹکر ٹکر دیکھتے رہ گئے۔ اور جب شعیب منصور نے اچانک آ گھیرنے والی خوشی سے سرشار ہو کر اس خوش نصیب لڑکی سے استفسار کرنے کی غرض سے کچھ پوچھنا چاہا تو نگاہیں سارے استفسارات سمیت خالی ٹولی میں لوٹ آئیں کیونکہ وہ جا چکا تھا۔

اس روز تو چونکہ چھٹی کے سلسلے میں بات کو ڈر تھا اور نازش وغیرہ تو سہ پہر کو ہی آ گئی تھیں۔ ادھر کھانوں کی تیاری اور ادھر زینت کو سکون سے بیٹے سے بات کرنے کا موقع ملا تھا نہ شوہر سے کہ رات گئے تک مہمان گھر میں رہے تھے اور سب کو رخصت کرنے کے بعد ساری چیزوں کو قرینے سے لگوا کر وہ اپنی خواب گاہ میں آئی تھیں تو تھکن کے مارے ان سے اب تک بھی نہیں ہو رہی تھی۔
نیند بھی انہیں ٹوٹ کر آ رہی تھی کہ جلد جلد سے لباس تبدیل کر کے وہ بستر پر آ لیٹی تھیں۔ شعیب منصور تو سدا سے ہی نیند کے بے حد کچے واقع ہوتے تھے۔ گو وہ بھی بیوی سے ذرا پہلے ہی کمرے میں آئے تھے مگر بستر پر لیٹتے ہی خراٹے لینے لگے تھے۔ دونوں میاں بیوی بھول ہی گئے کہ ان کے ذہنوں میں کوئی سوال بری طرح کلبلا رہا تھا۔ کیونکہ اگلے شعیب منصور حسب معمول تیار ہو کر اپنے آفس چل دیے اور زینت بیٹی اور نواسے کے چاؤ چونچلوں میں لگ گئیں کا قاعدہ تھا کہ وہ آفس جاتے ہوئے کھڑے کھڑے بیوی اور بچے کو دیکھ کر جاتا تھا اور ساس اور سسر کے اصرار پر سسرال میں ہی کھانا تھا۔ اور اس کی وجہ سے زینت کھانے میں کچھ زیادہ ہی بول بھی وہ ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مصروف نظر آتی تھیں اور نواسے کے سارے کام خود اپنے ہاتھ سے بعد سب کے ہاتھ ایک ننھا منا کھلونا لگا تھا اس لیے سب کی توجہ کا مرکز بنا رہتا تھا اور ایک گود سے منتقل ہوتا رہتا تھا۔ ادھر احمد پرویش کے والدین بھی پوتے کے دم سے دیوانے تھے اور اس کی محبت میں تقریباً تھے۔ نسرین کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ کسی طرح بہو اور پوتے کو اٹھا کر گھر لے جائیں اور باتوں ہی باتوں خواہش کا اظہار کرتیں تو زینت یہ کہہ کر کہ بس تھوڑے دن کا تو معاملہ ہی ہے پھر تو آپ کی بہو اور پوتا ہمیشہ رہے گا ان کی اس خواہش کو رد کر دیتیں۔ ادھر سسرال والے بھی زچہ اور بچہ کو دیکھنے آتے اور میکے والے احباب بھی۔
سکون و یکسوئی سے بیٹھنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا جو وہ بیٹے کی بات پر غور کرتیں یا اس سے یہ پوچھتیں کہ تم

"ہائے کیا سچ ممی؟" نیلما نے خوشی سے کھلتے ہوئے چہرے کے ساتھ ماں سے تصدیق چاہی۔

"ہاں کہا تو انہوں نے یہی ہے۔" زینت نے گھمبیر سا جواب دیا۔

"اچھا۔ یعنی بھائی جان نے خود کہا ہے۔" نیلما نے متحیر سے انداز میں پوچھا۔

"ہاں بھئی تو کیا ہم اپنے دل سے گھڑ کر کہہ رہے ہیں۔ بھائی جان نے خود ممی اور ڈیڈی کو بتایا ہے۔ تو ... خوش ہو رہے ہیں۔" نیلوفر بہن کے بار بار پوچھنے پر قدرے چڑ کر بولی۔

"ارے نہیں بجو میں تو اس لیے پوچھ رہی تھی کہ کیا بھائی جان نے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ کس لڑکی سے شادی ..." نیلما نے گویا اپنے بار بار پوچھنے کی وجہ بیان کی۔

"نہیں، یہ تو نہیں بتایا۔" زینت بولیں۔

"کمال ہے ممی۔ اگر انہوں نے نہیں بتایا تو آپ کو خود ہی پوچھ لینا چاہیے تھا۔ کہ سب سے اہم ... یہی تھی۔" نازو نے کہا۔

"ہاں۔ مگر اس وقت کچھ موقع ہی ایسا تھا۔ شام کو جیٹھی کی دعوت تھی اور سر پر اتنے سارے کام ... جب بابا نے یہ خوشخبری سنائی تھی۔" زینت دل ہی دل میں اپنی اس چوک پر پشیمان سی ہو کر بولیں۔

"لیکن کیا سلو دا بابا کی منگیتر نہیں ہیں؟" نسرین سے رہا نہ گیا تو انہوں نے پوچھ ہی لیا۔

"اوئی لو جی۔ خدا نہ کرے۔" زینت کے منہ سے بڑی بے ساختگی میں نکلا۔

"کیوں، کیوں۔ کیا کوئی ایسی ویسی بات ہے؟" زینت کے خدا نہ کرے کہنے پر نسرین نے انتہائی تجسس سے پوچھا۔ زینت کو خدا نہ کرے کہتے ہی غلط بات منہ سے نکل جانے کا احساس ہوا تھا۔ انہوں نے جلدی سے بات بنائی۔

"نہیں خیر۔ وہ تو بہت نیک اور پیاری بچی ہے۔ مگر بچپن سے ہی کسی سے منسوب ہے۔"

"ہائے کیا سچ۔ مگر تم نے تو ہمیں کبھی نہیں بتایا نانا دو۔" نسرین کو اب بھی حیرت ہو رہی تھی۔ انہوں نے نازو سے شکوہ ...

"بس امی جان کبھی ایسا موضوع ہی نہیں نکلا اس لیے نہ بتا سکی ہوں گی۔" نازو نے اختصار سے کام لیتے ہوئے ان کے شکوے کا جواب دیا۔

"خیر اپنا اگر آپ لوگوں سے کسی کو نہیں معلوم تو میں ایک ذریعے سے ابھی ابھی یہاں کھڑے کھڑے معلوم ..." نیلما جو ان سب کی گفتگو سے بے نیاز سی کھڑی دماغ لڑا رہی تھی۔ اس نے کچھ سوچ کر کہا۔

"کیا۔ کیا معلوم کر سکتی ہو تم؟" نیلوفر نے بیزاری سے پوچھا۔

"بھائی جان کی پسند۔" نیلما نے یوں سینہ پھلا کر کہا جیسے امریکہ کو دریافت کرنے کا سہرا اسی کے سر ہو۔

"اچھا تو کیا تم پر الہام والہام بھی ہونے لگا ہے۔" نیلوفر نے اس کی بات کو اس کا بچپنا قرار دیتے ہوئے کہا۔

"بھئی یہ تم نے پھر نوک جھونک شروع کر دی۔ پہلے ان سے یہ تو معلوم کر لو کہ یہاں کھڑے کھڑے ... کیسے کچھ بتا سکتی ہیں۔" نازو نے نیلوفر کے طنزیہ انداز پر اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔ زینت جو بڑی دلچسپی اور توجہ سے ... گفتگو سن رہی تھیں انہوں نے مسکرا کر نسرین کی طرف دیکھتے ہوئے نیلما سے پوچھا۔ "ہاں بھئی، یہ ..."

"سنو کیسا ممی۔ میں ابھی ابھی کوثر کو فون کر کے پوچھے لیتی ہوں۔"

"کوثر کو فون کر کے۔" دونوں بڑی بہنوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"جی ہاں کوثر کو ہی ڈیئر سسٹرز۔" نیلما نے شوخ سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"مگر بھائی جان کی پسند کے بارے میں بھلا کوثر کو کیسے کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔" نازو نے بہن کی بات کو مذاق ... کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہ ناپ سیکرٹ ہے بھائی جان کی۔" نیلما شرارت بھرے انداز میں بولی۔

"چلو جھوٹ شرط کہیں کی۔ یہ کہو کہ ہمیں بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہی ہو۔" نازو نے دلار سے اسے ڈانٹتے ہوئے ...

"ارے نہیں توبہ توبہ۔ اب اتنی بھی گستاخ نہیں ہوں کہ اپنے بڑوں کو بے وقوف بناؤں۔ ٹھیک ہے اگر آپ ... بات کا یقین نہیں آرہا تو میں ابھی کوثر کو فون کر کے ان سے پوچھ لیتی ہوں۔" نیلما ایک دم ہی سنجیدہ ہو کر بولی۔

... ریسیور اور ... نمبر ڈائل۔ اب تھوڑی سی انگلیوں کو زحمت دے دیجیے۔" نیلوفر نے نازو کے ... پیچھے ... ٹیبل پر رکھا ہوا فون اٹھا کر نیلما کی گود میں رکھتے ہوئے ریسیور بھی اٹھا کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ نیلما ... چپ چاپ سہیل منصور کے گھر کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ مگر ہوا یوں کہ بیل تو پاس ہوتی رہی مگر ادھر سے ... باوجود کسی نے فون ریسیو نہیں کیا۔ نیلما نے دو تین بار پھر کوشش کی اور پھر ریسیور کریڈل پر رکھ کر بولی ... معلوم ہوتا ہے کہ گھر کے سارے فیملی ممبرز کہیں آؤٹنگ پر گئے ہوئے ہیں جو میرا فون کوئی ریسیو نہیں کر رہا۔"

"ایسا معلوم ہوتا ہے ... ہو ... بابا شرافت تو چوکیداری کے لیے ہر وقت موجود رہتے ہیں اور فون کے پاس اس طرح بیٹھے ... جیسے جھیلوں کی گھاٹ میں دریا کے کنارے کوئی آبی پرندہ۔" نیلوفر بولی۔

"... آبی پرندہ بھی اس وقت شاید گھر پر موجود نہیں ہے۔"

"... واہ واہ بھائی جان۔ آپ کی بیٹیاں تو اتنی دلچسپ گفتگو کرتی ہیں کہ میرا پیٹ تو ہنستے ہنستے دکھنے لگتا ہے۔" نسرین ... ہنستی ہوئی بولیں۔

"... جہاں ضرور بھابی۔ یہ جس قدر دلچسپ باتیں کرتی ہیں اسی قدر آپس میں لڑتی بھی ہیں۔" زینت چہرے پر ممتا بھری ... مسکراہٹ لا کر بولیں۔

"... کوئی لڑائی والی بات نہیں۔ اور پھر بچے کے بہن بھائی تو اس سے بھی زیادہ لڑتے ہیں۔ مگر ایک بھی تو فوراً ہو جاتے ہیں۔" ... نے کہا۔

"... بھئی نیلما ایک دفعہ تو اور ٹرائی کرو۔ لاؤ ریسیور مجھے دو میں خود نمبر ڈائل کرتی ہوں۔" نیلوفر درمیان میں نکل آنے والے ... کو ضبط سے اکتا کر بولی۔

"... کیوں آپ کے نمبر ڈائل کرنے سے کیا وہ تینوں دوڑے دوڑے گھر واپس چلے آئیں گے۔ ویسے اگر میری بات کا یقین نہیں آرہا ... تو آپ خود ہی نمبر ڈائل کر کے دیکھ لیجیے۔" نیلما بہن کی بات پر جل کر بولی۔ اور فون اپنی گود سے اٹھا کر نیلوفر کی گود میں رکھ دیا۔

"... بابا ... کیا ... ہے تم دونوں بات بے بات آپس میں لڑنے کیوں لگتی ہو۔" نسرین کی وجہ سے زینت نے آنکھوں ہی ... نیلوفر کو گھورتے ہوئے کہا۔ دونوں میں سے ایک بھی کچھ نہیں بولی۔

پھر نیلوفر نے بھی سہیل منصور کے گھر کا نمبر ملانے کی کوشش کی مگر اس کا فون بھی کسی نے ریسیو نہیں کیا۔

"... چھوڑو فون وون کو ... رات کو تو بھائی جان گھر واپس آ ہی جائیں گے میں خود ان سے پوچھ لوں گی۔ کیوں ٹھیک ہے ... ممی۔" نازو نے اپنی بات کہہ کر ماں سے اس کی تائید چاہی۔

"ہاں ٹھیک ہے۔" زینت نے نسرین کی وجہ سے کہنے کو تو کہہ دیا۔ مگر جب نسرین اپنے گھر چلی گئیں۔ اور نیلوفر اور نیلما بھی اپنے ... چلی گئیں تو زینت نے موقع دیکھ کر نازو سے کہا۔

"بھلا نسرین کو دیکھو کتنا کہا تھا کہ رات کا کھانا کھا کر جائیں۔ مگر وہ مانی ہی نہیں۔ مجھے تو بہت برا لگا ہے ان کا یوں بغیر کھائے ... چلے جانا۔"

"... ممی ... آج امی جان بالکل تنہا آئی تھیں نا۔ اور ادھر ابا جی کا یہ عالم ہے کہ ان کے بغیر ایک لقمہ بھی نہیں توڑتے ... انہیں فکر لگی ہوں گی۔" نازو نے جیسے ساس کے چلے جانے کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی۔

"... تم تو سویرے سے کھانا کھا لو۔ دیر سے کھاؤ گی تو ہضم بھی دیر سے ہوگا۔"

"... نہیں ممی ... خواہ کھانا ہضم ہو یا نہ ہو میں تو آج بھائی جان کے ساتھ ہی کھانا کھاؤں گی۔" نازو بولی۔

"... بابا ... ٹھیک نہیں معلوم کب واپس لوٹیں۔ تم کب تک انتظار کرو گی ان کا۔" زینت نے کہا۔

"... خواہ ... رات ہی کیوں نہ گزر جائے۔ میں بھائی جان کا انتظار کرتی رہوں گی۔ ہاں بھلا ایک ہی تو بھائی ہے میرا ... کتنی آرزو میں جانے کب سے مری جا رہی ہوں۔ اور وہاں یہ عالم ہے کہ یہ بھی نہیں معلوم کہ آخر بھائی جان کی شادی ہو ... رہی ہے۔" نازو جھنجھلائے سے انداز میں بولی۔

"... تو تم ابھی بابا سے کچھ نہیں پوچھو۔" زینت بولیں۔

"... کیوں ممی ... آخر میں ان کی شادی شدہ بہن ہوں۔ میرا بھی ان پر کچھ حق ہوتا ہے۔" نازو اپنے بہن ہونے کے

"ارے تو ایسی کیا نرالی بات ہے جو میری برداشت سے باہر ہو گی یا ملنے تو اگر کسی غریب گھرانے کی لڑکی پر بھی … کیا ہو گا تو ہماری مجال نہیں ہو گی کہ ان کی مخالفت کر سکیں۔"

"لیکن کاش انہوں نے کسی غریب گھرانے کی لڑکی کو ہی پسند کر لیا ہوتا ممی۔" نازو نے کہا تو زینت اس کی … کر بولیں۔

"آخر تم کہنا کیا چاہ رہی ہو نازو۔ یا پھر نیلا کی طرح تمہیں بھی سرپرائز دینا چاہ رہی ہو۔" زینت نے نازو کی شکل دیکھتے ہوئے کہا۔

"یقین کیجیے میں بھلا آپ سے مذاق کروں گی ممی۔ میں تو اس وقت اپنے اندر اتنی ہمت ہی نہیں پا رہی کہ اصل بات آپ کو بتا سکوں۔"

"مگر آخر ایسی کیا بات ہے۔ کچھ بتاؤ تو مجھے پتا تو چلے۔" زینت زچ ہو کر بولیں۔

"بات ساری یہ ہے کہ بھائی جان نے اپنی لائف پارٹنر کے طور پر سلوطہ کو پسند کیا ہے۔"

اور سلوطہ کا نام سن کر زینت کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی انہوں نے تعجب سے … حلق میں ہی کہیں اٹک گئی اور منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ مگر پھر انہوں نے جلد ہی اپنی اس شوکڈ زدہ سی کیفیت پر قابو پا کر کہا۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کوئٹہ نے یونہی اپنی فوقیت جتانے کو بڑ ہانکی ہو۔ یوں بھی وہ ابھی بچی ہی ہے۔ اس کی بات کا کیا اعتبار۔"

"وہ بچی نہیں آزاد فضاؤں کی پروردہ ہے وہ بڑی سمجھدار لڑکی ہے۔ اور پھر ممی اس نے کچھ دیکھا ہو گا تبھی تو کہہ رہی تھی کہ بھائی جان سلوطہ کو بہت زیادہ چاہتے ہیں۔ اور بھائی جان کے بارے میں وہ ایسی غیر ذمہ دارانہ بات … سکتی۔" نازو نے کہا تو زینت چپ ہو کر اس کی صورت دیکھنے لگیں۔ ان کی نظروں میں ماضی وہ سب کچھ گھوم گیا جسے … کرنے کے باوجود بھی وہ لاپروائی اور غفلت میں اڑاتی رہی تھیں۔

وہ اسفند کا سلوطہ پر اتنا مہربان ہونا۔

موقع پاتے ہی اس سے تنہائی میں کھڑے ہو کر باتیں کرنا۔ چاند رات کی شب کو بھی وہ بیٹے کو سلوطہ سے بے تکلفی سے باتیں کرتا دیکھ کر چونک سی گئی تھیں۔ مگر پھر انہوں نے یہ سوچ کر اس بات کی طرف کوئی توجہ نہیں دی کہ آخر وہ نادرہ کی نند ہے اور ان کے گھر کی مہمان۔ اس لیے بیٹا اگر اس سے اخلاق و مروت سے بات کر لیتا ہے تو اس میں ان کا کیا گھٹ جاتا ہے۔

وہ تو اور بھی بہت سی بری طرح دل پہ گراں گزرتی باتوں سے ہمیشہ چشم پوشی ہی سے کام لیتی رہی تھیں۔

مگر اب انہیں ایک ایک بات یاد آتی جا رہی تھی۔ خاص طور پر پکنک پر دونوں کا تنہائی میں یکجا ہونا۔ اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ۔ اور وہ جتنا یاد کرتی اور سوچتی جا رہی تھیں انہیں اتنی قدر سلوطہ پر غصہ بھی آ رہا تھا کہ ان کے خیال میں سارا قصور اور فطور اسی کا تھا۔

اسی نے اپنی خوبصورتی اور مسکینی بلکہ اپنی مظلومیت دکھا کر ان کے خوبصورت جوان کماؤ اور خاصی بڑی املاک کے مالک بیٹے کو پھنسانے کی کوشش کی تھی۔

کیونکہ اس نے بابا کو پرچایا ہو گا۔ ان کی حوصلہ افزائی کی ہو گی۔

بلکہ ان کی لاعلمی سے فائدہ اٹھانے کی بھرپور کوشش۔ تبھی تو بابا اتنی آسانی سے اس کے دام میں آ گئے۔ اور ایک طرف سے وہ بابا کو بے وقوف بھی بناتی رہی۔ اور اپنے بارے میں سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس نے بابا کو کچھ بھی نہیں بتایا۔ کیسی چلتر اور مکار لڑکی ہے۔ اور یہ جلیبا بھی تب ہی تو بابا کو اپنا دیوانہ بنا کر انہیں بھی گمراہی میں ڈال دینا چاہتی تھی۔ زینت پیچ و تاب کھاتی ہوئی سوچتی رہیں۔

سب سے زیادہ غصہ تو انہیں اس بات پر آ رہا تھا کہ جب اسے معلوم تھا کہ وہ کسی دوسرے مرد کی ملکیت ہے تو اس نے یہ بات اسفند سے کیوں چھپائی۔ واہ کیا خوب صلہ دیا تھا اس نے ان کے احسانات کا ان کے اپنے گھر میں …

… بنا کر رکھنے کا۔

… کا دل تو چاہ رہا تھا کہ اسے چوٹی سے پکڑ کر کچن سے باہر لائیں اور سب کے سامنے اسے خوب ذلیل و خوار کریں۔ … کسی بھی حالت میں اپنی اس خواہش کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتی تھیں یا پھر دوسرے معنوں میں عمل درآمد نہیں کر سکتی تھیں۔ … نند کی نند کا معاملہ سامنے آ جاتا تھا۔ اور وہ یہ بات اپنے شوہر کو بھی بتانا نہیں چاہتی تھیں۔ … خود اسفند کے سامنے سلوطہ کا کچا چٹھا کھول کر رکھ سکتی تھیں۔ کہ سلوطہ سے ان کا رشتہ ہی کچھ ایسا تھا۔ اور پھر …

… بتائیں کہ سلوطہ فریبی اور مکار ہے اور تمہیں دھوکا دے رہی ہے تو اس کے لیے بھی انہیں بڑی … اس لیے انہوں نے سوچا وہ یہ بات بہت ترکیب اور قاعدے سے بیٹے تک پہنچائیں گی اور … وقت پہنچائیں گی جب ان کے شوہر بھی وہاں موجود ہوں گے۔

پھر … دو روز … لیے … تھے انہوں نے بابا شرافت سے سلوطہ کے بارے میں معلومات بہم پہنچانے ہیں۔ اور … ایک اتفاق ہی تھا کہ دو تین روز بعد ہی ایک دن جب وہ رات کے کھانے پر موجود تھا تو کھانا کھانے کے … اشارے سے نیلوفر اور شیلا کو … میں بھیج کر تھوڑی دیر بعد نازو نے گویا بات کی ابتدا کی۔

"ممی اب تو بہت دن ہو گئے ہیں مجھے یہاں رہتے۔ احمد بھی سخت بور ہوتے ہیں میرے بغیر اور پھر امی جان اور باجی تو … کو ساتھ رکھنے کے لیے بے چین ہیں۔ اب آپ مجھے گھر جانے کی اجازت ہی دے دیجیے۔"

"… بیٹی تو چلی جاؤ۔ اتنی لمبی چوڑی تفصیل اور تمہید کی کیا ضرورت ہے۔ شادی کے بعد والدین کا گھر تو لڑکی کے لیے … خانہ ہی بن جاتا ہے۔ اور تمہارا قیام واقعی کچھ لمبا ہو گیا ہے۔" شعیب منصور نے ہنس کر کہا تو نازو نے ماں کی طرف … نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ دیکھیے یہ ڈیڈی بھلا کیا کہہ رہے ہیں۔ زینت فوراً ہی جلے کٹے انداز میں بولیں۔

"ان کی باتوں پر نہ جاؤ یہ تمہارے ڈیڈی تو ایسی ہی بے موقع بولتے ہیں اب تو تم بابا کی شادی کی تیاریاں کرو۔ … شادی کرنے پر رضامند ہو گئے ہیں۔"

"اچھا کیا واقعی بھائی جان۔ پھر تو ہماری پانچوں گھی میں اور سر کڑھائی میں ہی پڑا نظر آئے گا۔" نازو یوں خوش ہو کر بولی جیسے اس نے پہلی بار یہ خوش خبری سنی ہو۔

"ہاں میں خدا تمہیں بھائی کی شادی کی خوشیاں مبارک کرے بس ابھی سے تیاری شروع کر دیں اس نیک کام میں دیر … کرنا چاہتی۔" زینت بولیں۔

"لو بھئی خوب ہو گئی گرمی سست اور گواہ چست۔ جس کا معاملہ ہے وہ تو منہ میں گھنگنیاں بھرے بیٹھے ہیں۔" شعیب منصور نے نہایت … سے کھانا کھاتے ہوئے بیٹے پر ایک نظر ڈال کر کہا۔

"اب آپ بزرگوں کی موجودگی میں میں بھلا کیا کہہ سکتا ہوں۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"… ہاں ممی بھائی جان ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں ان کا کام تو اب خاموش بیٹھ کر ہماری کارکردگی کو دیکھنا ہو گا … دھوم دھام سے ہونی چاہیے بھائی جان کی شادی۔ … پوری زندگی کا یہی ایک واحد ارمان ہے۔" نازو … کے آخری فقرے پر شعیب منصور ہنسنے لگے۔ اسفند بھی مسکرانے لگا۔

"… کیوں نہیں کریں گے دھوم دھام سے اللہ میں کا ایک ہی تو بیٹا ہے ہمارا۔ خدا اس کی عمر دراز کرے۔ اب … تو ہو سکتی ہے اس کی شادی۔" زینت بولیں تو ان کے روز روز تو ہو گی نہیں اس کی شادی کہنے پر سب کو ہنسی آ گئی۔

"… ممی … مہمانوں کی لسٹ تیار کرتی ہوں۔ اور ہاں … پہلے پھپھو بیگم اور پھوپھا جان کا نام رکھوں گی۔ … تو چلے گئے لیکن میری شادی میں آنے کی انہیں توفیق نہیں ہوئی مگر اب پھپھو بیگم کے آئے بغیر شادی …" نازو نے کہا۔

"… ایسا نہ کہو۔ سب کی اپنی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں۔ ورنہ فاخرہ جی تو تمہاری شادی میں سب سے پہلے یہاں …" شعیب منصور بولے۔

"… مجبوریاں تو ہوتی ہیں مگر ان کی خواہ مخواہ کی مجبوریوں میں یہ بیچاری سلوطہ بلاوجہ ہی ماری گئی۔" زینت ہاتھ چلا کر …

اسفند نے ریوالور ہاتھ میں لیے اپنے کمرے سے باہر قدم رکھا ہی تھا کہ کریم جو خاصی تیز رفتاری سے اس کے کمرے کی طرف آ رہا تھا اسے دیکھتے ہی بولا۔

"بابا صاحب! ہسپتال سے ڈاکٹر قمر کا فون آیا تھا۔ انہوں نے ابھی آپ کو بلایا تھا۔ بول رہے تھے کہ بچے کی حالت خراب ہے۔ میں نے تو ان سے بولا تھا کہ ٹھہریں بابا صاحب کو بلا کر لاتا ہوں، پر وہ بہت جلدی میں تھے میری بات بھی نہیں سنی اور کھٹ سے فون بند کر دیا۔" اتنا کہہ کر کریم جہاں تک آیا تھا وہیں سے پلٹ گیا۔

ہرچند کہ اس سمے وہ انتہائی غضب اور اشتعال کے عالم میں تھا بلکہ اس کے سر پہ خون سوار تھا حتیٰ کہ ہر احساس سے عاری ہو گیا تھا۔ اور بس اس کے ذہن میں تو ایک ہی خیال گردش کر رہا تھا۔

اس کے سر پہ تو ایک ہی دھن سوار تھی۔

دھوکے باز، بے وفا اور ہرجائی سلوطہ کو فنا کر دینے کی دھن۔

اس کے سینے میں اپنے ریوالور کی ساری گولیاں اتار دینے کی خواہش۔

لیکن ایسے خطرناک موقع پر اس کے کمرے سے باہر نکلتے ہی کریم نے اندر کہیں سے وارد ہو کر اس سے جو کچھ کہا تھا، اس کہنے کی کیفیت کچھ یوں تھی جیسے کوئی شخص خدشات سے پُر کوئی مہم سر کرنے جا رہا ہو اور اسے خطرات میں گھرا دیکھ کر اس کا کوئی دوست یا کوئی بھی خیر خواہ اسے باآواز بلند یعنی چلا کر اس خطرے سے خبردار کر دے۔ تو وہ اپنے مقاصد کی تکمیل کی دھن میں اس کی آواز تو سن لیتا ہے مگر اس کی بات کا مفہوم بعد میں ہی سمجھ پاتا ہے۔ یہی کیفیت کچھ اسفند کی بھی ہوئی تھی کریم نے اچانک وارد ہو کر اسے فون کے آنے کی اطلاع دی تھی اور اطلاع دینے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر قمر کا پیغام بھی سنا دیا تھا۔ لیکن چونکہ غیظ و غضب نے اس کے ہوش و حواس گم کر رکھے تھے اس لیے وہ صرف کریم کی آواز ہی سن سکا تھا۔ حد تو یہ تھی کہ اس نے کریم کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا تک نہ تھا بلکہ سامنے ہی دیکھ رہا تھا۔

مگر جب اسے پیغام دے کر واپس چلا گیا تو۔۔۔ وہ جس کے بڑھتے ہوئے قدم کریم کے آ جانے کی وجہ سے رک گئے

[illegible] کہے گئے الفاظ تو اپنی معنویت ظاہر کیے بغیر اس کی سماعت میں گونج رہے تھے۔ کریم کے جانے کے بعد ایک دم ہی معنویت [illegible] واضح ہوتے چلے گئے اور سب کچھ اس کی سمجھ میں آ گیا۔

[illegible] سمجھ میں آ گیا تھا تو وہ یوں چونکا تھا جیسے بلندی سے گرتی ہوئی کوئی شے عین سر پر آ گری ہو تو انسان چونک کر پیچھے [illegible] بجائے وہ بھی باہر کا رخ کرنے کے بجائے الٹے پیروں اندر اپنے کمرے میں چلا آیا تھا۔

[illegible] اور اس کے ساتھ دوسرے ڈاکٹرز ایک جوان سال کالج اسٹوڈنٹ کی جو بس کے حادثے میں [illegible] مخدوش حالت میں ہسپتال لایا گیا تھا جان بچانے کی ان تھک کوششیں کر رہے تھے۔ اور اس کی [illegible] بھی تھا کہ وہ لڑکا اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا اور لڑکے کی ماں بیوہ اور مفلوک الحال تھی اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر ڈاکٹروں کی منتیں کر رہی تھی کہ وہ کسی طرح لڑکے کی جان بچا لیں۔ اس کی منتوں اور گریہ و زاری نے اسفند کے دل پر گہرا اثر [illegible] اس کو لڑکے پر اتنی زیادہ توجہ دیتے دیکھ کر اس کے دوسرے کولیگ بھی لڑکے کی جان بچانے کی کوشش میں لگ گئے تھے۔ لڑکے کی ماں غریب اور نادار تھی۔ اسی لیے لڑکے کو جو چار خون کی بوتلیں چڑھائی گئی تھیں ان کی قیمت بھی اسفند نے اپنی جیب سے ادا کی تھی اور شام کو گھر آتے وقت اپنے ایک کولیگ ڈاکٹر قمر کو تاکید کر کے آیا تھا کہ جونہی لڑکے کی حالت بگڑے فوراً فون کر کے مجھے گھر سے بلا لینا۔

اسی لیے وہ سب کچھ بھول کر یعنی سلوطہ کو شوٹ کرنے کے ارادے کو التوا میں کر کے اپنے کمرے میں چلا آیا تھا۔ گو اس [illegible] وہ اشتعال انگیزی باقی نہیں رہی تھی جو انسان کو ہر احساس سے بیگانہ اور اندھا کر دیتی ہے مگر غصہ جوں کا توں برقرار تھا۔ وہ جیب کے نزدیک کھڑا ہو کر تھوڑی دیر سوچتا رہا۔ پھر ریوالور کو جیب کی دراز میں رکھ کر الماری کھولی اور ہینگر پر لٹکا سفید اوور آل پہن کر ڈریسنگ ٹیبل [illegible] گاڑی کی چابی اٹھاتا ہوا تیر کی طرح اپنے کمرے سے نکل گیا۔

زینت اور نازو بابا شرافت سے سلوطہ کا سارا کچا چٹھا معلوم کرنے کے بعد کئی روز سے اس تاک میں تھیں کہ کسی طرح جلد از جلد شعیب منصور اور اسفند پر سلوطہ کی اصلیت ظاہر کرنے کا موقع ان کے ہاتھ آ جائے۔

گو بابا شرافت نے انہیں سلوطہ کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا اس میں مبالغہ آمیزی اور حاشیہ آرائی زیادہ تھی اور حقیقت تھوڑی تھی پھر بھی دونوں ماں بیٹیاں بابا شرافت کی زبانی سنی ہوئی باتوں کو حدیث کا لکھا سمجھ بیٹھی تھیں۔ اور اگر وہ یہ سمجھتیں تب بھی [illegible] ماں بہن اور بہی خواہ تھیں اور اسفند کو حقیقت سے آگاہ کرنا ان کا فرض بنتا تھا۔ اور وہ موقع ایک شب کو بالآخر ان کے ہاتھ آ گیا تھا اور انہوں نے جو آگ لگائی تھی اس کے ردعمل میں بیٹے کے کھانا چھوڑ کر غضبناک سی کیفیت میں اٹھ کر چلے جانے [illegible] سمجھ گئی تھیں کہ اب سلوطہ کی خیر نہیں۔ سلوطہ کا پول کھول کر وہ ہلکی پھلکی تو ہو گئی تھیں مگر ایک عجیب سی بے چینی نے انہیں آ گھیرا تھا۔

وہ شوہر کے کھانا ختم کر کے اٹھنے کا انتظار کر رہی تھیں جب کہ شعیب ان کے ارادوں سے قطعاً لاعلم تھے۔ خیر ایک تو کئی [illegible] کھانے کی میز پر [illegible] دوسرے بالکل لاتعلق اور گم صم سا بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ اس پر ایک دم ہی جو چلا کچھ کہے سنے اٹھ کر [illegible] انہوں نے متحیر سے لہجے میں بیوی سے پوچھا۔

"اسفند کا موڈ کبھی تو [illegible] نا جانے کیوں ہو رہا ہے آج کل۔ جب کہ ذکر تو سلوطہ کا ہو رہا تھا پھر وہ کیوں اٹھ کر چلے گئے ایک دم؟"

"سلوطہ کے ذکر سے ان کا کیا تعلق۔۔۔ وہ اصل میں آج کل ایک بہت ہی سیریس کیس آیا ہوا ہے ان کے پاس ایک نوجوان [illegible] کی حالت بہت مخدوش ہے بس اسی کی جان بچانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ اسی لیے تو سارا سارا وقت ہسپتال [illegible]"

فرخندہ بڑی خوبصورتی سے سلوطہ کے ذکر کو ٹالتی ہوئی بولیں۔

"اچھا [illegible] اسفند کا کوئی واقف کار ہے یا پھر کسی جان پہچان والے کی اولاد ہے جو اس پر اپنی جان مار رہے ہیں۔" شعیب منصور [illegible]

"[illegible] مجھے معلوم نہیں لیکن ہے شاید کچھ ایسی ہی بات۔"

"[illegible] غریب غربا بے چاروں کو تو آج کل کے ڈاکٹرز مہنگی دواؤں کی لمبی چوڑی فہرست اور بلز کی مار مار کر بلا علاج [illegible] دیتے ہیں۔" شعیب منصور طنزیہ انداز میں ہنس کر بولے۔

"نہیں خیر، کم از کم بابا ان لالچی اور خود غرض ڈاکٹروں میں سے نہیں ہیں۔" زینت نے بیزار کن لہجہ … آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کر کے بولیں۔

"تم نے اگر کھانا کھا لیا ہے تو جا کر بچے کو دیکھو، سلوطہ بھی تمہارے انتظار میں بیٹھی ہوں گی۔ اگر انہوں نے … لیا تھا پھر بھی کہاں تک بچے کو سنبھالیں گی۔"

تو نازو باپ سے معذرت کر کے فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے کمرے کا رخ کیا۔ زینت بھی … کچھ دیر بعد شعیب منصور کھانا ختم کر کے اٹھے تو وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئیں اور کریم سے برتن اٹھانے … سیدھی نازو کے کمرے میں آگئیں۔

"کیا سلوطہ چلی گئی؟" انہوں نے کمرے میں ادھر ادھر نظریں دوڑا کر نازو سے پوچھا جو بچے کے بچھونے … پر بیٹھی سوتے ہوئے بچے کو ممتا بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ماں کے سوال پر اس کی طرف سے توجہ ہٹا کر بولی۔

"جی ہاں۔ وہ تو اسی وقت چلی گئی تھیں۔"

"تب پھر آؤ ذرا چل کر دیکھتے ہیں کہ کہیں تمہارے بابا اس کی شامت بلانے تو نہیں گئے۔"

تو ماں کو سلوطہ کے معاملے میں اس قدر دلچسپی لیتے دیکھ کر نازو نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور بولی۔

"تو کیا کچھ ایسے بھی امکانات ہیں؟"

"ہاں۔ ہو تو سکتے ہیں۔ کیونکہ تم نے نوٹ نہیں کیا تھا کہ سلوطہ کی قلعی کھل جانے پر بابا کے تیور کتنے خطرناک ہو رہے تھے … نے ادب رکھا نہ لحاظ اور باپ کی موجودگی میں ہی بلا کیے ہتھے سے اکھڑ گئے۔"

"ہاں تو شاک بھی تو زبردست پہنچا ہوگا۔ سلوطہ کے بارے میں اپنی توقعات کے خلاف باتیں سن کر۔ مگر ہم بھی کیا کرتے … آنکھوں دیکھی مکھی تو اپنے بھائی کے حلق میں نہیں ڈال سکتے تھے۔"

"لے منہ میں ڈالنی کیسی ۔۔۔ وہاں تو کسی طور پر سلوطہ سے شادی ہی ممکن نہیں ہوتی۔ بھلا شادی شدہ عورت کی دوسری … بھی کہیں ہوتے سنی ہے۔" زینت بولیں۔

"جی ہاں۔ اگر یہ مسئلہ درمیان میں حائل نہ ہو جاتا تو پھر مجھے بھی اپنے بھائی کے انتخاب کے بارے میں …" نازو نے ہنس کر کہا اور ماں کے ساتھ ہو لی۔ پھر دونوں ماں بیٹیاں … نازو کے غسل خانے کے عقبی سمت … سے نکل کر چوروں کی طرح بے آواز قدموں سے چلتی سلوطہ کے کمرے کی اس کھڑکی کے نیچے آکر کھڑی ہو گئیں … ہی بنی ہوئی تھی۔

اس روز چونکہ اسفند سر شام ہی گھر لوٹ آیا تھا اور اس نے آتے ہی ماں سے کہہ دیا تھا کہ … پڑی ہیں اس لیے وہ نیند اور تھکن سے نڈھال ہو رہا ہے۔ آج ذرا جلدی کھانا لگ جانا چاہیے … بھی ہاسپٹل سے اس کا فون آئے تو اسے فوراً جگا دیا جائے۔ کیونکہ ایک بیوہ اور نادار عورت کے اکلوتے … کو جس کا حادثہ پیش آگیا ہے اور اس کی حالت بہت مخدوش ہے اور اس کے ساتھی ڈاکٹر اسے جان بچانے کی … کر رہے ہیں۔ وہاں بھی کہہ آیا ہے کہ کوئی خطرہ دیکھیں تو فوراً اسے بلا لیں۔ کیونکہ یہ کیس اس نے اپنے ہاتھوں میں لے … تو یہ سن کر ملازمات کا کھانا ان کے ساتھ ہی کھانے کا ان کی باچھیں ہی کھل گئی تھیں۔

مگر اب اصل مسئلہ تو سلوطہ کو کھانے کی میز سے غائب کر دینے کا تھا کیونکہ اس کی موجودگی میں تو بات بنتے … تھی۔ مگر قدرت جب انسان کے کسی ارادے کی تکمیل میں اس کا ساتھ دیتی ہے تو حالات خود بخود ایسی صورت … کامیابی سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔

حسن اتفاق سے اس وقت جب کریم میز پر کھانا لگ جانے کی اطلاع دینے آیا تھی سلوطہ بھی نازو کے کمرے … اور اتفاق سے اس وقت نازو کا بچہ بھی جاگ رہا تھا۔ حالانکہ یہ اس کے سونے کا وقت تھا۔ لیکن … کمرے میں پہنچنے کی جلدی پڑی تھی اس لیے وہ ڈھنگ سے سلا نہیں سکی تھی۔ اور اب اسے گود میں لے … تھپکے جا رہی تھی کہ وہ کسی طرح سو جائے۔ آخر جب بچہ کسی طرح سویا ہی نہیں اور روئے ہی گیا تو اس نے ماں سے کہا۔

"… آپ سلوطہ کو لے کر چلی جائیے۔ ڈیڈی اگر میز پر آگئے ہوں گے تو آپ کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ میں تھوڑی دیر … سلا کر آ جاؤں گی۔"

"نہیں۔ زینت میری گود میں دے دو۔ اور جا کر کھانا کھاؤ۔ آج اتنے دن بعد تو اسفند خیر سے ہمارے ساتھ کھانا کھا …"

زینت نے بچے کو گود میں لینے کے لیے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں بھابی جان اسے میری گود میں دے دیجیے۔ میں اسے ٹہلا ٹہلا کر ابھی سلا دوں گی۔ آپ بے فکر ہو کر چلی جائیے۔" … نازو سے مخاطب ہو کر بولی۔

"او نازو۔ بچے کو میری گود میں دے دو اور تم جا کر کھانا کھاؤ۔ تمہارا یہ ڈیلیوری کا پیریڈ ہے۔ تمہیں تو وقت پر کھانا کھا لینا چاہیے … آج یوں بھی دیر ہو گئی ہے۔" اس نے جھک کر بچے کو نازو کی گود سے اٹھا لیا اور بیٹی نے ماں کی طرف ایک منافقانہ سی مسکراہٹ … ظاہر کیا جیسے بچے کو گود میں دیتے ہوئے اب بھی ہچکچا رہی ہو۔

"… اچھا تو نہیں لگے گا کہ ہم وہاں ٹھاٹھ سے کھانا کھاتے رہیں اور یہاں تم اس ننھے سے شیطان کی ناز برداریوں میں لگی رہو۔ … کی وجہ سے ابھی سے بہت نخریلا ہو گیا ہے۔" نازو نے اسی منافقانہ مسکراہٹ سے کہا۔

"ہاں تو بچے بھی تو نخرہ کرنے کے لائق۔ ماشاءاللہ ابھی سے اتنا پیارا ہے اور میں کوئی مہمان تو نہیں ہوں … تمہارے ساتھ کھانا نہ کھانے کی وجہ سے برا مان جاؤں گی۔ مجھے تو ویسے بھی آج بالکل بھوک نہیں۔ سہ پہر کو … کے ساتھ جو تھوڑے سے سنیکس کھائے تھے وہ اب تک سینے پر رکھے ہیں۔ میرا تو آج کھانا کھانے کا ارادہ … نہیں ہے۔"

سلوطہ اپنی فطری رواداری اور انکساری سے کام لے کر بولی۔

"… سلوطہ بھی تو گھر کی ایک فرد ہی ہیں مگر مجھے بھی یہ مناسب نہیں لگ رہا کہ انہیں یہاں بچے کی چوکسی … چھوڑ کر چلی جاؤں لیکن اب یہ اتنی مصر ہی ہیں تو تم چلی ہی چلو۔ تمہارے ڈیڈی میرے بغیر نوالہ نہیں …" آخری فقرہ زینت نے عجلت دکھاتے ہوئے ہنس کر کہا۔ تو نازو اٹھ کر ماں کے ساتھ ہو لی۔

… سلوطہ دیر تک بچے کو گود میں لے کر ٹہلتی رہی۔ اور جب وہ گہری نیند سو گیا تو اسے پالنے میں لٹا کر آہستہ … پالنے کو جھولے دیتی اور نازو کے آنے کا انتظار کرتی رہی کہ بچے کو تنہا چھوڑ کر کیسے جا سکتی تھی۔

پھر جب کھانا کھانے کے ساتھ ساتھ بھائی کو ورغلانے اور بھڑکانے کے بعد نازو واپس آئی تو اس کے … سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔

وہ کھانا کھانے سے تو پہلے ہی انکار کر چکی تھی کہ واقعی سہ پہر کا کھانا اس کے سینے پر رکھا ہوا تھا جس … طبیعت پر گرانی سی محسوس ہو رہی تھی۔ اور وہ جلدی سے بستر پر پڑ کر سو جانا چاہتی تھی۔

اور اس سے پہلے کہ وہ بستر پر جھکی تو … لباس درست کرتے ہوئے دروازے پر ایک زبردست ٹھوکر پڑی اور دونوں پٹ دھماکے سے کھل گئے۔ …

… کی طرح ڈر کر اچھلی اور پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ تبھی وہ بپھری ہوئی حالت میں دندناتا اور پھنکارتا اندر آ گیا۔ … کے چہرے سے ایک غضبناک سی کیفیت مترشح تھی اور آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں سی پھوٹ رہی تھیں۔ اس کے … تیور دیکھ کر سلوطہ پوری جان سے لرز اٹھی۔

"مکار … تم نے میرے ارادوں میں خلل نہ ڈال دیا ہوتا تو اس وقت میرے ریوالور کی ساری گولیاں تمہارے … پیوست ہوتیں۔ مگر گولیوں سے زیادہ میں گالیوں کے ذریعے تمہیں روحانی موت تو مار سکتا ہوں تاکہ تم زندہ رہتے …"

… کرخت اور سخت لہجے میں زمانے بھر کی نفرت اور حقارت سمو کر بولا۔ اور وہ جو غیظ و غضب کے عالم میں … اگرچہ کچھ تو معاملے کی تہہ تک پہنچ گئی تھی۔ اندر ہی اندر لرزنے کے باوجود جی کڑا کر کے بولی۔

مجروح ہو جائیں۔ دونوں ماں بیٹیاں کھڑکی کی زیریں چوکھٹ سے کان لگائے بڑے غور سے ساری گفتگو سن رہی تھیں۔ انہیں احساس ہوا کہ اسفند اس کے کمرے سے باہر جا رہا ہے دونوں جلدی سے کھڑکی سے ہٹیں اور دبے پاؤں اپنے کمرے میں آگئیں۔

"لو دیکھا تم نے کس قدر مکار اور چلتر لڑکی ہے۔ کیسے بڑھ بڑھ کے بابا کو جواب دے رہی تھی۔ چلو یہ تو اچھا ہی ہوا جو بابا نے اسے گھر سے نکلنے کو کہہ دیا ورنہ ایسی بدچلن لڑکی کا کیا بھروسا تھا۔ اگر خدانخواستہ کوئی بات ہو جاتی تو۔"

زینت بستر پر بیٹھ کر آہستہ آہستہ ہانپتے ہوئے بولیں۔

"جی ممی! یہ تو ٹھیک ہے مگر اس کا یہاں سے نکلنا آسان تو نہیں۔ کیونکہ یہاں سے نکل کر وہ جائے گی کہاں۔ یہاں کوئی جان پہچان والا بھی نہیں ہے اور پھر اس کے جانے سے خصوصاً آپ کے لیے بہت سے پرابلم کھڑے ہوں گے۔ دنیا کہے گی کہ کھلائے کا نام نہیں ہوتا رلائے کا نام ہوتا ہے۔ سب لوگ آپ ہی کو الزام دیں گے کہ آپ نے اسے یہاں سے نکلنے پر مجبور کیا ہے اور ڈیڈی تو سچ مچ قیامت ہی کھڑی کر دیں گے۔ کیونکہ ان کے سامنے تو آپ نے سلوط کا ذکر نکالا تھا۔"

نازو نے کہا زینت دل ہی دل میں اس کی ذہانت کی قائل ہو گئیں۔ یوں بھی ان کی تینوں بیٹیوں میں نازو ہی سب سے زیادہ عقلمند اور معاملہ فہم تھی۔ زینت قائل سی ہو کر بولیں۔

"ہاں۔ اس طرف تو میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ مگر تم نے سنا نہیں بابا جس طرح اسے نکل جانے کو کہہ رہے تھے بس دھکے دینے کی کسر رہ گئی تھی۔"

"خیر اب وہ تو اتنی بھی غیرت مند نہیں ہے۔ اگر ہوتی تو اپنا شوہر اور اپنا گھر بار چھوڑ کر دوسروں کے ٹکڑوں پر کیوں جھانکتی پھرتی۔"

نازو بحث پر اتر آئی تھی۔ کیونکہ وہ اپنی بات پر اڑ جانے کی عادی تھی اور جب اپنی بات گرتے دیکھتی تو بحث بازی پر تیار ہو جاتی تھی۔

"خیر بابا نے تو اسے گھر سے نکل جانے کو نہیں کہا۔ بابا نے کہا ہے وہ خود ہی چلی جائے۔" بیٹی کی بحث کرنے کی عادت سے واقف زینت نے قصہ کوتاہ کرتے ہوئے کہا۔

"ویسے جا کر دیکھنا تو چاہیے تھی کہ آیا وہ چلی گئی یا ابھی یہیں دھرنا دیے بیٹھی ہے۔" نازو بولی۔

"لو کیا اب میں اسی کام کی رہ گئی ہوں کہ بار بار جا کر یہی دیکھتی رہوں کہ بابا نے کیا کیا اور وہ کیا کر رہی ہے اور پھر تم بتاؤ وہ جا بھی کہاں سکتی ہے۔ نا خرد نے اسی لیے تو اپنی بلا ہمارے سر منڈھی ہے کہ ہمارے سوا کوئی بھی اس کی ذمے داری لینے کو تیار نہ ہوا ہوگا۔"

زینت اٹھتی ہوئی بولیں۔ اور پھر پنگھوڑے میں سوئے ہوئے نواسے کو آہستہ سے گود میں اٹھا کر اسے نازو کے بستر پر لٹا دیا۔

"تمہیں کتنا منع کیا ہے کہ رات کے وقت بچے کو جھولے میں نہ لٹایا کرو۔ مگر تم تو اسے سلانے میں اتنی سست ہو۔ اتنی تو تمہیں سمجھ ہونی چاہیے۔ اسے اپنے پاس سلایا کرو۔ نو ماہ تک مسلسل ماں کے پیٹ میں رہنے کی وجہ سے بچہ ماں کے پیٹ کی گرمی کا عادی ہو جاتا ہے اور پیدا ہونے کے بعد بھی وہ گرمی چاہتا ہے جو ماں کے قرب سے ہی اسے حاصل ہوتی ہے۔ تبھی تو وہ اتنا بے چین رہتا ہے۔ جب تک چلنے نہ لگے تو تمہیں اسے اپنے پاس ہی سلانا چاہیے کہ بچے کا خون ہلکا ہوتا ہے۔ بزرگ خواتین بڑا وہم کرتی تھیں، علیحدہ سلانے کی بات۔ بچے کو اس ڈر سے تنہا بھی نہ چھوڑتی تھیں کہ کہیں خدانخواستہ اسے اوپری اثر نہ ہو جائے۔"

اور ماں کی لمبی چوڑی تقریر پر نازو کو ہنسی آگئی۔

"ممی وہ آپ کا زمانہ اور تھا اور یہ زمانہ اور ہے۔ یہ تو سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کا زمانہ ہے۔ آجکل تو پیدا ہوتے ہی بچے کی آنکھیں کھول کر اسے دنیا کا جائزہ دلوا دیتا ہے۔ ورنہ پرانے زمانے میں تو سنا ہے کہ بچے کی آنکھیں تین روز بعد کھلتی تھیں۔ پہلے حیرت ہوتی چہرے دیکھ کر پہچانتا تھا پھر رنگوں کو اور پھر چار پانچ ماہ بعد کہیں جا کر صورتوں کو پہچانتا تھا۔ مگر یہ اپنے شاہد صاحب تو ابھی سے آپ کو پہچان کر مسکرانے لگے ہیں۔"

کے واہموں کی تردید کرتے ہوئے انہیں ان واہموں سے نکالنا چاہا۔

"بچے کو ماں کے قریب سلانا نہیں سمجھا میں نے۔ یہ آجکل کے لوگ ہو۔ دنیا بوڑھی ہو کر تمہارے آگے آ رہی ہے اور آسمان پر جمع ہو تماشے دیکھتے ہیں۔ تمہاری سمجھ میں نہیں آتا۔ برسوں سالوں کی ادا ہمیں مادی زندگی میں داخل ہونے کے انتظار میں بیٹھے بیٹھے بوڑھی ہو جائیں اور جب ہوں اور گھر ہوں تیرے پرانے طور طریقوں پر آ گئی ہوں گی۔"

"یہ تو ظاہر ہے تیرے طور طریقے نہیں۔ تو ماں کی اس منطق پر نازو بھی زور زور سے ہنسنے لگی۔

زینت نے اسے کو پیار کر کے اور بیٹی کی پیشانی چوم کر اسے شب بخیر کہتی ہوئی اس کے کمرے سے نکل گئیں۔

پھر زینت نے جس تیزی سے سلوط کے کمرے کی دہلیز پار کی تھی۔ اسی تیزی سے سلوط بھی اس کے جاتے ہی الماری کی طرف بڑھی۔ اسفند نے جس تیزی سے سلوط کے کمرے کی دہلیز پار کی تھی۔ اسی تیزی سے سلوط بھی اس کے جاتے ہی الماری کی طرف بڑھی اور اسے کھول کر سب سے نچلے خانے میں رکھا ہوا اپنا سوٹ کیس نکالا کیونکہ اس کے پاس اتنا ہی سامان تھا کہ سوٹ کیس میں آسانی سے سما جاتا۔ لیکن اس نے صرف ضرورت کے چند جوڑے اور استعمال کی چیزیں ہی اور پہلے سوٹ کیس میں بھر لیں۔ اور پھر الماری میں استعمال سے رکھا ہوا سلمیٰ بیگم کا سلک کا چادر جو وہ اس کے گھر جانے کی خوشی میں اپنے ساتھ لے جانا بھول گئی تھیں۔ الماری کے بالائی خانے سے نکال کر اوڑھا اور سوٹ کیس اٹھا کر کمرے کو یونہی کھلا چھوڑ کر بنگلے کے عقبی گیٹ سے باہر نکل کر گلی عبور کرتی ہوئی مین روڈ پر آگئی۔

ابھی رات کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔ مگر شاہراہ فیصل پر بھاری ٹریفک معمول کے مطابق بڑی تیزی سے رواں دواں تھا۔ البتہ خاصی چوڑی پکی فٹ پاتھ چھوڑ کر سڑک کے دونوں اطراف میں بنے مکانات اور گلیاں سنسان نظر آ رہی تھیں اور وہ فٹ پاتھ پر سڑک کے کنارے کنارے چلنے کے بعد۔ بنگلوں کے آگے بنی باؤنڈری والز کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ سوٹ کیس بھی بھاری تھا۔ کم از کم عام حالات میں تو اسے اٹھا کر چلنا مشکل تھا۔ مگر اس کے تو وہ بری طرح شدید غم و غصے کی لپیٹ میں آئی ہوئی تھی۔

اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

دماغ میں آگ سی بھڑکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

تپش میں اس کا چہرہ بھی بری طرح تپ رہا تھا۔

ہونٹ پپڑیاں سی جم گئی تھیں۔

ہتھیلیوں میں ایک عجیب تکلیف دہ کھنچاؤ کا احساس ہو رہا تھا۔

تو مرجھی کر کہ ہی تھی کہ آنکھیں نہ رہتے تھے۔

اس کی کوئی منزل بھی نہ کوئی ایسا ٹھکانہ جس میں پناہ لے کر وہ محفوظ رہ سکتی۔ بلکہ یہاں تو سر سے سر چھپانے کا بھی کوئی آسرا نہ تھا۔

کوئی ہمدرد تھا نہ مددگار۔

ہمدرد تھا نہ غمگسار۔

نہ ہی کوئی شناسا یا واقف کار۔

اس نے تو یہ بھی نہ سوچا تھا کہ شعیب منصور کے گھر سے نکل کر آخر وہ جائے گی تو کہاں جائے گی۔ پھر کراچی جیسے پر ہنگام شہر میں جہاں ہر قدم قدم پر بری بھری ہوئی ہے۔

پر قسم کے ناقص اور سر مزاج کے لوگ رہتے ہیں۔ اور جہاں ایک بے یار و مددگار تنہا اور نوجوان لڑکی کے تحفظ کی کوئی ضمانت نہیں ہو سکتی ہے۔ نہ سلامتی کی ہی کوئی گنجائش ہوتی ہے۔

وہ تنہا سا کسی گمنام بحر زخار کی طرح چاروں طرف پھیلی آبادی میں ایک بھولا بھٹکا انسان خصوصاً ایک تنہا اور لاوارث لڑکی تو جیسے کسی سمندر پر نظر آئے والا کوئی بلبلہ۔ جسے سرکش لہروں کے تھپیڑے جلد ہی اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں۔ مگر سلوط ان نزاکت سے بے نیاز۔ اپنی ہی دھن میں آگے بڑھی چلی جا رہی تھی۔ البتہ اس کا رخ شہر کی طرف تھا۔ اور اسے معلوم نہ تھا۔ بنگلوں کے گیٹوں پر کھڑے اور بیٹھے چوکیدار اور ملازمین اور فٹ پاتھ پر چلتے راہ گیر، ایک عورت کو تنہا رات کے وقت کہیں جاتے ہوئے بڑی حیرت اور تجسس سے دیکھ رہے ہیں۔ وہ تو ہر احساس سے بے نیاز۔ آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ حتیٰ کہ دیکھنے والوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

بھی بیمار اور اپنے جھمیلوں میں اُلجھا ہوا۔"

اپنی بات کہتے کہتے ان کا گلا رندھ گیا تھا اور آنکھیں بھی ڈبڈبا آئی تھیں۔

"اچھا اچھا اماں جان میں جلد آنے کا وعدہ تو نہیں کرتا۔ البتہ آپ کو اتنا یقین ضرور دلائے دیتا ہوں کہ میں [illegible]"

وہ سلمٰی بیگم کی باتوں سے متاثر ہو کر بولا، اور پھر کاغذ میں لپٹے ہوئے کپڑے سوٹ کیس میں رکھنے لگا تو سلمٰی بیگم نے کہا۔

"ارے یہ لفافہ تو باہر ہی رہ گیا اسے بھی تو سوٹ کیس میں رکھ لو۔"

"اچھا ابھی رکھتا ہوں۔" اس نے کہا، اور پھر دیوار پر آویزاں چھوٹے سے آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر بالوں میں کنگھا کرنے لگا۔

"دیکھو میں یہ تو نہیں کہتی کہ تم نے سلوطہ کے بارے میں جو کچھ سنا غلط سنا۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ کسی کے منہ سے کوئی بات نکلتی ہے تو دوسرے کے کانوں میں جانے تک بہت مختلف ہو جاتی ہے۔ اب جیسے تم کسی سے یہ کہو کہ میاں فلاں جگہ جانے کا پلان ہے تو وہ اس بات میں تھوڑا سا اضافہ کر کے دوسرے سے یوں کہے گا کہ اسفند تو فلاں جگہ جا رہے ہیں جانے کا پلان مکمل کر لیا ہے اور کسی بھی وقت پرواز کر جائیں گے۔ اس کی وجہ پھر یہی ہے کہ جب کوئی بات منہ سے نکلتی ہے تو اپنی نہیں رہتی بلکہ پرائی ہو جاتی ہے۔"

"لیکن یہ سب کہنے سے آخر آپ کا مقصد کیا ہے۔ کیا آپ مجھے یہ باور کرانا چاہ رہی ہیں کہ میں نے سلوطہ پر بہتان باندھا ہے۔ یا اس کے خلاف مجھے بھڑکایا ہے۔ تو میں اسے آپ کی زیادتی ہی کہوں گا۔" وہ بالوں میں کنگھا پھیرتے پھیرتے ان کی طرف مڑ کر بولا۔

"نہیں۔ نہیں تمہاری ماں کا تو یہاں کوئی ذکر ہی نہیں ہے تو محض تمہاری یہ ادھڑتی بدلتی سی کیفیت دیکھ کر اپنی طرف سے تمہیں کچھ سمجھانا چاہ رہی تھی۔ کیونکہ اس میں شک نہیں کہ تمہیں سخت ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے لیکن اس کا انتقام تم اس بیچاری پر الٹے سیدھے الزامات لگا کر تو نہ لو۔ اگر اس سے ایسا ہی عشق ہے تو جاؤ اس کے بارے میں جا کر معلومات ہے۔"

"اوہ۔ اماں جان پلیز۔ اب اس کے بارے میں ایک لفظ نہ کہیں۔ بلکہ کوئی اور بات کریں۔"

وہ کچھ اس قدر جھنجلا کر بولا کہ سلمٰی بیگم نے پھر سے کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ یوں بھی اس کے اچانک آنے اور اچانک ہی جانے پر ان کو اتنا قلق ہو رہا تھا کہ بات کرنے کو جی کہاں چاہ رہا تھا۔ اس نے بھی خاموشی سے اپنا جیبی کنگھا نکال کر جیب میں ڈالا، اخبار میں لپٹے ہوئے کپڑے سوٹ کیس میں رکھے اور سوٹ کیس کو بند کر کے مسکراتا ہوا سلمٰی بیگم کی طرف پلٹا، جو ابھی تک کھڑی ہی تھیں۔

"اچھا اماں جان کہا سنا معاف۔ اب میں چلوں گا۔" اور پھر ان کے آگے جھک گیا۔

"اچھا جاؤ میرے بچے تمہیں خدا کو سونپا۔" ضبط کی ہزار کوشش کے باوجود سلمٰی بیگم کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ بہت سے آنسو چھلک پڑے۔ انہوں نے اس کے سر کو چومتے ہوئے کہا۔

"ہائیں ابھی سے۔" اس نے شرارت آمیز لہجے میں بھویں اچکا کر پوچھا۔

"ابھی سے یا جب کہیں کا۔ اب جاتے جاتے بھی میرے دل میں ہیولا اتار کر جا رہا ہے۔ خدا تجھے سدا سلامت رکھے میں نے تو تجھے اللہ کی حفظ و امان میں دیا ہے۔ اور تو ایسی بدفالی منہ سے نکال رہا ہے۔" انہوں نے اس کے جھکے ہوئے سر پر آہستہ سے ایک دھپ جماتے ہوئے بگڑ کر کہا۔

"اچھا۔ اچھا پھر تو ٹھیک ہے۔ اچھا السلام علیکم اور خدا حافظ۔" اس نے اپنا سوٹ کیس اٹھاتے ہوئے کہا۔

"فی امان اللہ۔ مگر تم جاؤ گے کیسے۔ ارشد سے کہہ دیا ہوتا تو وہ ٹیکسی ہی لے آتا۔" سلمٰی بیگم نے کہا۔

"نہیں ارشد کو کیوں زحمت دیتا۔ کیا میری ٹانگیں نہیں ہیں جو تھوڑی دور بھی چلنے کے قابل نہ ہوں۔" اس نے کہا تو سلمٰی بیگم کو بڑا اچنبھا ہوا کہ یا تو وہ کار کے بغیر گھر سے قدم ہی نہ نکالتا تھا اور یا یہ عالم کہ سوٹ کیس لادے اب سواری بھی ڈھونڈتا پھرے گا۔

وہ کمرے سے باہر نکلا تو سلمٰی بیگم بھی اس کے پیچھے باہر آ گئیں۔ اور جب وہ صالحہ بیگم سے رخصت ہو کر باہر نکل گیا تو وہ آنسو پونچھتی اپنے کمرے میں آ گئیں۔ آتے ہی ان کی نظر سب سے پہلے اس لفافے پر پڑی جو اب تک ان کے تکیے پر رکھا تھا۔ ایک بڑا سا لفافہ تھا جسے وہ اپنے سوٹ کیس میں رکھنا بھول گیا تھا۔ انہوں نے اپنے پلنگ کی طرف بڑھ کر جلدی سے لفافہ اٹھایا اور سوچا کہ ارشد کو جلدی سے دوڑا کر اس کے پاس پہنچوا دیں۔ لیکن لفافہ اٹھاتے ہی اس میں سے سو سو کے نوٹوں کی موٹی سی گڈی کھلا ہوا ہونے کی وجہ سے تکیے پر گری تو وہ سب کچھ سمجھ گئیں۔ انہوں نے لفافے کے اندر دیکھا تو اس میں ایک رقعہ بھی رکھا نظر آیا۔ اسی لفافے میں پڑا اپنی نظر کا چشمہ اٹھا کر انہوں نے اس رقعے کو کھول کر پڑھا صرف ایک ہی سطر اس پر درج تھی۔

"اپنی بہت ہی عزیز اماں جان کی خدمت میں حقیر سا نذرانہ جنہوں نے مجھے جوہر انسانیت سے متعارف کرایا۔"

سلمٰی بیگم نے بھیگی آنکھوں اور کانپتے ہاتھوں سے نوٹوں کی گڈی اٹھا کر گنی۔ پورے دس ہزار روپے کی گڈی تھی۔ ان کے دل اور روئیں روئیں سے نکلتی دعائیں۔ اس کی فصل زیست پر باران رحمت بن کر برس رہی تھیں۔ وہ ہمیشہ کچھ ایسے ہی طریقوں سے انہیں پیسے دیتا تھا۔ کبھی ان کے پرس میں چپکے سے رقم رکھ جاتا۔ کبھی ان کے تکیے کے نیچے۔ اور جب سے وہ ملتان گئی تھیں وہ ہر ماہ باقاعدہ طور پر ان کا اکاؤنٹ نمبر معلوم ہونے کی وجہ سے بالا ہی بالا پانچ صد روپے کی رقم ان کے بینک میں منتقل کرا دیتا تھا اور اس کی اطلاع سلمٰی بیگم کے بینک والے ہی انہیں دیتے تھے۔ کیونکہ ان کے بیٹوں نے باپ کے انتقال کے بعد ان کا پانچ صد روپے کا جو وظیفہ مقرر کر رکھا تھا وہ بھی اسی بینک میں جمع ہوتا تھا۔ اگر وہ چاہتیں تو کہہ سن کر اسے مزید دو تین روز کے لیے روک بھی سکتی تھیں لیکن ان دنوں وہ جس ذہنی اور قلبی اذیت سے گزر رہا تھا اس کا انہیں پورا پورا احساس تھا۔ اور پھر سب سے بڑھ کر وہ شہزادوں کی طرح عیش و آرام سے زندگی گزارنے والا بھلا ان کے مڈل کلاس بھلا کے بہت سی سہولتوں سے محروم گھر میں کیسے رہ سکتا تھا جب کہ کل تین رہائشی کمرے تھے۔ بلکہ ڈھائی کمرے۔ کیونکہ جس کمرے میں وہ رہ رہی تھیں۔ وہ کسی اسٹور یا گودام کا سا نقشہ پیش کرتا تھا۔ گو سلمٰی بیگم نے کبھی اچھے دن نہیں بلکہ بہت ہی اچھے دن دیکھے تھے۔ ایک ایسے مرد کے دل پر حکومت کی تھی جو بڑا ہی سخت گیر، تند مزاج اور غصیلا تھا اور جس کے پیروں کے نیچے ایک دنیا تھی۔

کیونکہ وہ دولت مند تھا، رئیس تھا۔

اور دولت ہی طاقت بھی ہوتی ہے اور کشش بھی۔

جس سے سب ہی زیر نظر آتے ہیں۔

مگر سلمٰی بیگم نے شوہر کے مقابل میں اپنی کم عمری، اپنی فطری صلاحیتوں، اور خوبیوں کے باعث نادار ہوتے ہوئے بھی اس پر حکومت کی تھی۔

بہت ہی اچھا وقت دیکھا تھا۔ مگر چونکہ زمانے کے سرد و گرم کا مزا چکھے ہوئے تھیں اس لیے اس عالم پیری میں بھی ہر رنگ کے ماحول کا خود کو عادی بنا لیا تھا۔ ورنہ عام طور پر ہوتا تو یہی ہے کہ جب انسان پستیوں سے اٹھ کر ایک دم بلندیوں کو پا لیتا ہے تو بعد میں خواہ حالات کیسا ہی رخ اختیار کر لیں وہ زمین پر پاؤں دھرنے کو تیار ہی نہ ہوتا۔

کہ ایسے لوگوں کا پیمانۂ ظرف بہت چھوٹا اور کچا ہوتا ہے۔

جبکہ سلمٰی بیگم کا ظرف ہی تو اعلیٰ تھا۔ وہ ہر قسم کے ماحول کا خود کو عادی کر لیتی تھیں اور اس کے دوسری دعاؤں کے ساتھ ساتھ سب سے اول اور خصوصی دعا یہی تھی۔

"یا الٰہی۔ تو ہی اپنے بندوں پر عنایات اور کرم کی بارش کرتا ہے۔ اور تو نے ہی اس عاجز اور گناہ گار بندی پر بھی بڑے بڑے کرم کیے ہیں۔ اب تو اتنا کرم اور کر دے کہ میرے بچے کو اس قابل بنا دے کہ وہ اپنے لیے ایک علیحدہ مکان بنا لے اور میں اپنی زندگی کے آخری ایام اسی کے گھر میں کاٹ سکوں۔"

ادھر سلمٰی بیگم کا روان روان اس کے لیے دعا گو تھا۔ اور ادھر وہ باہر نکل کر کسی سواری کی تلاش میں کھڑا یہ سوچ رہا تھا کہ اب جانے تو کیسے جائے۔ جائے تو ریل کے ذریعے جائے یا ہوائی جہاز سے۔

یہاں آیا تو بڑے ذوق و شوق سے تھا۔ اماں جان کی محبت اور پیار اور سب سے بڑھ کر ان کی بھولوں کا احساس اور خیال ہی اسے یہاں کھینچ کر لایا تھا۔ مگر آتے ہی گھر کے ماحول میں رچی بوریت سے اسے کچھ ایسی وحشت ہوئی کہ یہاں ایک لمحہ بھی رکنا اسے گوارا نہ ہوا۔ اور وہ اماں جان کو دل برداشتہ کر کے وہاں سے نکل آیا۔

اسے اپنے ذہن کے گوشوں پر اپنی جان چھڑکنے والی فرشتہ صفت اماں جان کی اتنی کمی محسوس ہو رہی تھیں۔ اور اس بات کا بھی احساس تھا کہ ماں اور بہنیں حتیٰ کہ باپ بھی اس کے اچانک پردومری پریشانی میں مبتلا ہوں گے۔ مگر وہ کرتا بھی کیا۔ باپ نے تو گویا یہ کہہ کر اسے چیلنج کیا تھا کہ سلوطا کو اسے پھر اس کے گھر میں لے آئیں گے۔ جبکہ اسے سلوطا کا نام تو کیا تصور بھی گوارا نہ تھا۔ اسی لیے وہ گھر سے چلا آیا تھا۔ اور اگلے ہی دن اس نے اپنا استعفیٰ بعد درخواست بھی پیش کر دیا تھا جس کی منظوری تک وہ یہی سوچتا رہا کہ اب کرے تو کیا کرے۔

کراچی سے واقعی اس کا دل اچاٹ ہو گیا تھا۔

یہ بھی حقیقت تھی کہ وہ زیادہ پابندیوں سے گھبراتا تھا۔

بلکہ کسی بھی بات میں اس قدر پابند ہونے کا عادی نہ تھا جو اس کی آزادانہ فطرت پر بار بن جائے۔

یوں بھی اگر کراچی میں اس کا دل لگا رہا تھا تو وہ بھی صرف سلوطا کی وجہ سے جس نے اس کے خیال میں اس کے اور سچے جذبے کو محض ایک جنونی کھیل ہی سمجھا تھا۔ تبھی تو وہ کئی آنکھوں اسے دھوکا دیتی رہی۔ اور جب اس کا یہ جذبہ چاک ہوا تو چپکے سے فرار ہو گئی۔ وہ یہ ماننے پر تو تیار ہی نہ تھا کہ وہ اس کی لعنت ملامت کی وجہ سے گھر سے بھاگ گئی ہے۔ اس معاملے میں تو وہ خود کو حق بجانب سمجھتا تھا اور پھر سب سے بڑھ کر اسے اتنا غیرت مند بھی تو کرتا تھا۔

اسفند بزار تعلیم یافتہ بلکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ باشعور اور ایک اہم عہدے پر فائز انسان سہی مگر ناتجربہ کار تھا۔ وہ لاابالی سا تھا اور والدین کی بے توجہی کا شکار رہی۔

اس پر اسے اپنی اہمیت اور انفرادیت کا بھی شدت سے احساس تھا۔

اور یہ بھی معلوم تھا کہ وہ اپنے والدین کی اکلوتی نرینہ اولاد ہے۔

شروع ہی سے بڑے رعب داب والے دادا کا منظور نظر اور دادی کی آنکھوں کا نور بن کر رہا ہے۔ اور دادا نے اسے بیٹے کی حیثیت دے کر اپنی زندگی میں ہی اسے اپنی جائیداد کے ایک وسیع حصے کا مالک بنا دیا تھا۔

اسے یہ بھی احساس تھا کہ اس کے والدین اس کی جا اور بے جا پوری کر کے دوسرے معنوں میں اپنی کوتاہیوں کا ازالہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

وہ اس کا موڈ اور تیور دیکھ کر چلتے ہیں۔ اور باپ سے زیادہ ماں اس سے تھوڑی تھوڑی خائف رہتی ہیں۔ بہنیں بھی ڈر ڈر کر بات کرتی ہیں اور اس کے سامنے سہمی سہمی رہتی ہیں۔ اور یہ بھی وہ جو کچھ چاہتا ہے وہی ہوتا ہے جو کہتا ہے اسے ہی پورا کیا جاتا ہے۔ وہ ہنستا ہے تو سب ہنستے ہیں۔ وہ سنجیدہ ہوتا ہے تو سب کے لب ساکت ہو جاتے ہیں۔ گویا سب اس کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔

مگر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ آخر کس وجہ سے ہوتا ہے؟ جبکہ میں بھی ان اپنوں میں سے ایک ہوں۔ انہی کا خون ہوں۔ گوشت پوست ہوں۔ انہی کی اولاد ہوں۔ اور اسی واسطے اور رشتے سے ابا جان (دادا) نے مجھے اپنی جائیداد کے آدھے حصے کا مالک بنا دیا۔

ڈیڈی سے بجائے اگر کسی غیر کا بیٹا ہوتا تو پھر یہ اتنی مراعات کیوں دی جاتیں۔

مجھ پر اس قدر انعام و اکرام کی بارش ہی کیوں کی جاتی۔ آخر ممی کیوں مجھ پر حکم نہیں چلاتیں۔ کیوں مجھے نہیں ڈانٹتیں۔ ڈیڈی کس وجہ سے مجھے نہیں روکتے ٹوکتے۔ کیوں مجھ سے باز پرس نہیں کرتے۔ بہنیں کیوں مجھ سے بے تکلف نہیں ہوتیں۔ کیوں اٹھلا اترا کر نہیں کہتیں کہ بھائی جان ہمیں یہ لا دیجیے وہ لا دیجیے۔ یا ہمیں فلاں جگہ لے چلیے۔ تھوڑی کتابیں ہی دلا دیجیے۔

آف! اپنے گھر میں رہتا ہوں اور اپنے سگوں سے کس قدر اجنبیت محسوس کرتا ہوں۔

کیا یہ مجھ پر ظلم نہیں ہے؟

ناہے تو کوئی بڑی اچھی ہے۔ جو مجھ سے خائف بھی نہیں رہتی۔ اور ہنس بول بھی لیتی ہے چھیڑتی بھی ہے مذاق بھی کرتی ہے۔

...بھی کہہ رہی تھی کہ بھائی جان آپ کبھی تو ہمیں بھی ٹریٹ دے دیا کیجیے۔

...سلوطا کا نام لے لے کر چھیڑتی ہی رہتی ہے۔

...میری ماں جائی بھی نہیں ہے ہاں چچا زاد ضرور ہے۔ مگر سگا بھائی سمجھتی ہے نا۔ پھر یہ میری بہنیں کیوں... وہ اکثر و بیشتر ایسے ہی خیالوں میں الجھا رہتا تھا۔

...بار اس نے اپنے اچھے موڈ اور شگفتگی کا مظاہرہ کر کے خود بھی اپنے اور بہنوں کے درمیان حائل تکلفات کو ختم کرنے کی کوشش کی تھی مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات ہی رہا تھا۔

...ہنس بول رہی تھیں تو اس طرح جیسے باتوں کے درمیان کوئی لطیفہ یا چٹکلہ سن کر انسان اس سے لطف اٹھا لیتا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ وہ سلوطا کی ذات سے اپنی ان ساری محرومیوں کا صلہ چاہتا تھا۔

وہ اس کی خاموشی۔ حجاب اور گریز کو محض شرم اور احساس کمتری پر محمول کرتا تھا۔ اور اس کی شرم جھجک اور احساس کو توڑ دینا چاہتا تھا۔

وہ انجانے میں ہی بڑے غیر محسوس طریقے سے اس کو اس قدر چاہنے لگا تھا کہ اسے دیکھے بغیر چین سے نہ رہتا تھا۔ جہاں بھی ہوتا۔ سلوطا کا تصور دل پر احاطہ کیے رہتا۔

...کسی مریضہ کو دیکھتا یا راؤنڈ پر جاتا اور کسی بیڈ پر کوئی نئی مریضہ نظر آتی تو اس کے چہرے میں سلوطا کے نقوش ڈھونڈتا۔

وہ سلوطا کو اس قدر چاہنے لگا تھا کہ سلوطا اس کی اس چاہت کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

یوں بھی وہ اپنی اتنی زیادہ چاہت کو سلوطا پر ظاہر نہیں کر سکا۔

جس کی وجہ کچھ تو اس کی اس معاملے میں ناتجربے کاری تھی۔

اور کچھ اسے ظاہر کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

بلکہ خود سلوطا ہی نے اسے اظہار کا موقع نہیں دیا تھا۔ کہ اس پر ہمیشہ اندیشوں اور رسوائی کا ہوا سوار رہتا تھا۔

اور پھر سب سے بڑھ کر اسے اپنے جذبے کو خوبصورت الفاظ میں ڈھالنا بالکل نہ آتا تھا۔

بس وہ تو فطرت۔ فطری تقاضوں میں جو بے ساختگی اور بے باکی ہوتی ہے اسے ہی اظہار کا ذریعہ سمجھتا تھا۔

تو پھر ظاہر تھا کہ جب اس پر یہ بھید کھلا کہ سلوطا شادی شدہ ہے اور اپنے شوہر کو اس جرم میں چھوڑے بیٹھی ہے کہ وہ بوڑھا ہے اور اس کی جوانی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے قابل نہیں ہے۔ اور محض وقت گزاری کی غرض سے اس سے محبت کا کھیل کھیلتی رہی ہے۔ دوسرے معنوں میں اسے فریب دیتی رہی ہے۔ اسے بیوقوف بناتی رہی ہے تو اس کا پیمانہ لبریز ہو جانا ایک لازمی امر تھا۔ جس کے نتیجے میں وہ اتنا آتش زیر پا ہوا تھا کہ اسے گھر بدر کر دیا تھا۔

...اب بھی ایک پھانس تھی جو بری طرح دل میں کھٹک رہی تھی۔

...تھی جو اپنے نوکیلے دندانوں سے اس کا قلب و جگر کاٹے دیتی تھی۔

...تھی جو کسی کل اسے چین نہیں لینے دے رہی تھی۔

...اس شہر سے دور بھاگ جانا چاہتا تھا۔ جہاں اس کے انتہائی پاک اور سچے جذبے کا اس بری طرح خون ہوا ہو... نہیں ملازمت بھی چھوڑ کر ملتان آ گیا تھا۔ اور اب یہاں سے ایک نامعلوم منزل کی سمت جا رہا تھا۔

...کہا جاتا ہے کہ محبت اندھی ہوتی ہے۔ دیوانگی پر محمول ایک لچر سا جذبہ ہوتی ہے۔ یا پھر بے وقوفی اور بے خیالی کا دوسرا نام... نہیں بلکہ انسان کی صلاحیتوں کو ناکارہ کر دینے والی ہوتی ہے۔ ایک ایسا روگ ہوتی ہے جو کسی کو لگ جائے... کھا کر چھوڑتی ہے۔

پھر بھی اس نے سوچ لیا تھا کہ خواہ کہیں بھی جانا ہو مگر وہ ہر حالت میں لاہور سے ضرور نکل جائے گا جیسے وہاں اس کا دم گھٹنے لگا ہو۔ اس نے اپنی اگلی منزل کا تعین بھی کر لیا۔

اسلام آباد کا تعین۔

اگلے دن علی الصبح ہی وہ بیدار ہو گیا تھا۔ اس روز بھی وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔

کچھ اس لیے بھی کہ وہ جلد از جلد لاہور چھوڑ دینا چاہتا تھا۔

بہرحال کسی نہ کسی طرح دن نکلا تو وہ بھی جہاز سے اپنی سیٹ بُک کروانے کی غرض سے نیچے منیجر سے کھڑا باتیں کر رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے آ کر اس کے دونوں شانوں پر آہستہ سے ہاتھ رکھ دیے۔ اس نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ اس کا منہ پھٹا ہوا تھا۔ جگری دوست آفتاب انصاری اس کے پیچھے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"آفتاب تم؟" اس نے جذباتی سے انداز میں نعرہ مارنے کے سے انداز میں کہا اور پھر دونوں دوست ایک دوسرے سے گلے ملنے لگے۔

آفتاب پانچ فٹ کا تھا جبکہ اس کے مقابلے میں اسفند کا قد چھ فٹ ایک انچ تھا۔ اور اس سے گلے ملنے کے لیے اسے جھکنا پڑا تھا۔ وہ دونوں کاؤنٹر کے آگے ہی ایک دوسرے سے بغلگیر ہو گئے تھے اور وہاں موجود لوگ بڑی دلچسپی سے دونوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"یار ایکسرسائز کر کے ہی تھوڑا سا قد بڑھا لیا ہوتا تو مجھے اس قدر جھکنا تو نہیں پڑتا۔" اس نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر آفتاب سے علیحدہ ہوتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"یار یہی تو کمال ہے میری چھوٹے قد کا کہ وہ بڑے بڑوں کو میرے سامنے جھکوا دیتا ہے۔" آفتاب نے اکڑ کر جواب دیا تو اسفند ہنسنے لگا۔

"چلو یہ اچھا ہی ہوا جو تم اس وقت آ گئے ورنہ بعد میں آتے تو میں یہاں سے فلائی ۔۔۔۔ کر چکا تھا۔" اسفند نے ہنس کر کہا۔

"یہ کہاں کس طرف فلائی کرنے کا ارادہ تھا تمہارا؟" آفتاب نے پوچھا۔

"بس یونہی کچھ دن کے لیے اسلام آباد ہی جانے کا تھا۔" اسفند نے بتایا۔

"تو کیا اسلام آباد کسی خاص مقصد سے جا رہے تھے؟" آفتاب نے پھر پوچھا۔

"نہیں کسی مقصد سے تو کیا بس ذرا اسلام آباد کو بھی گھوم پھر کر دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"پھر تو اگر بستر بوریا بھی باندھ لیا ہے تو اسے بھی کھول دو کیونکہ اب میں آ گیا ہوں۔ اور تمہیں جانے کی اجازت نہ دوں گا۔" آفتاب نے کہا۔

"ارے بھئی نہیں۔ اب ارادہ کر لیا ہے تو جا کر ہی رہوں گا۔ ہاں اگر ایسا ہی ہے تو واپسی میں ضرور تمہارے ساتھ کچھ وقت گزاروں گا۔ اس کا ضرور وعدہ کرتا ہوں۔" اسفند نے گویا اس کی بات کو رد کرتے ہوئے کہا۔

"ابھی واپسی کی بھی خوب رہی۔ تمہارے وعدے وعید کی۔ خیر اس بات کا فیصلہ تو بعد میں ہوگا۔ لیکن کیا تم ڈاکٹر بن کر تہذیب و اخلاق سے بھی عاری ہو گئے ہو۔ جو اتنا بھی نہ ہوا کہ مجھے اپنے روم میں ہی لے چلتے۔ کیا یہیں سے مجھے چلتا کرنے کا ارادہ ہے؟" آفتاب نے شکوہ کیا۔ تو اسفند قدرے جھینپ کر بولا۔

"ارے نہیں تجھے تو خود یہاں کھڑے ہو کر یا تمہیں کرنا کوئی کوفت ورک سا لگ رہا ہے۔ بس ذرا یہ ریزرویشن آفس میں فون کر کے جہاز کی سیٹ بُک کرا دوں پھر تمہیں اپنے روم میں لے چلتا ہوں۔"

"ارے چھوڑو سیٹ ویٹ کو اس وقت میں آن ڈیوٹی ہوں۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے جو تمہارے انتظار میں ضائع کروں۔ چلو سیدھی طرح سے مجھے اپنے روم میں لے چلو۔ ورنہ پھر یہیں سے خدا حافظ۔"

"ارے نہیں یار تم اتنے نازک مزاج کب سے ہو گئے۔ آؤ چلو میرے روم میں چلو۔" اسفند نے اسے برا مانتے دیکھ کر سب کچھ چھوڑ کر اسے اپنے کمرے میں ۔۔۔ لے جانے لگا۔

"تم تو کہہ رہے تھے کہ ڈیوٹی پہ ہو پھر یہ تم نے سویلین ڈریس کیوں پہن رکھا ہے؟" اسفند نے اس کے ساتھ اپنے کمرے کا رخ کرتے ہوئے پوچھا۔

"ارے بس۔ تم سے ملنے یہاں آ رہا تھا۔ اس لیے وردی پہن کر آنا کچھ اچھا نہیں لگا۔" آفتاب نے گول مول سا جواب دیا۔ اسفند کو اس سے ملنے کی خوشی میں احساس بھی نہیں ہوا کہ اس نے جھوٹ بولا ہے یا اس کا آج آف ڈے ہے۔ اور یہ جھوٹ بھی محض اسے اسلام آباد جانے کے ارادے سے باز رکھنے کی غرض سے بولا ہے۔

ہوٹل کے کمرے میں داخل ہوتے ہی آفتاب نے "او ۔۔۔ واؤ" کہتے ہوئے نظریں گھما کر کمرے کا ایک بھرپور جائزہ لے کر کہا۔

"ہوں تو یہ ٹھاٹھ ہیں۔ مگر اس کمرے کا یومیہ کرایہ کیا ہو گا؟"

"پانچ سو روپے۔" اسفند نے قدرے لاپروائی سے بتایا۔

"پانچ سو روپے ۔۔۔ مائی گاڈ ۔۔۔ تم کب سے یہاں ٹھہرے ہوئے ہو؟"

"آج تیسرا روز ہے۔" اس نے بتایا۔

"یعنی پورے پندرہ سو ۔۔۔ یار اتنی فضول خرچی کی کیا ضرورت تھی بھلا۔ کسی ہوسٹل ٹائپ کے ہوٹل میں کمرہ لے لیتے۔" آفتاب نکتہ چینی کرنے کے انداز میں بولا۔

"بس تم اپنی نیوی والی ذہنیت میں مجھے تو نہ پیٹو۔ ارے یار پیسہ خرچ کرنے کے لیے ہی ہوتا ہے۔ تم جیسے کنجوسوں کی طرح جوڑ جوڑ کر رکھنے کے لیے نہیں۔" اسفند کو اس کا نکتہ چینی کرنے کا انداز اچھا نہ لگا تو قدرے چڑ کر بولا۔

"تمہیں شاید اندازہ نہیں ہے۔ اس لیے ایسی باتیں کر رہے ہو۔ ورنہ اور کسی کو نہ سہی مجھے دیکھ لو کتنی محنت اور جانفشانی سے اپنی تنخواہ کما رہا ہوں۔" آفتاب بولا۔

"کمال ہے تم تو یوں کہہ رہے ہو۔ جیسے تمہیں پتھر ڈھونے پڑتے ہوں۔ جب کہ تم فوج میں ملازم ہو اور مجھے معلوم ہے فوجیوں کو عام لوگوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ مراعات اور سہولتیں حاصل ہوتی ہیں۔" اسفند نے کہا۔

"ہاں اس میں شک نہیں کہ مراعات بھی حاصل ہوتی ہیں اور سہولتیں بھی۔ مگر ایک لمٹ (حد) تک ہی ہوتی ہیں … طرح ایک دنیا تو نہیں خرید سکتے۔" آفتاب اُسے قائل کرنے کی غرض سے بولا۔

"خیر۔ خیر۔ یہ محض تمہارا خیال ہی ہے ورنہ دنیا تو ہم بھی نہیں خرید سکتے۔ اچھا چھوڑو اس ذکر کو یہ بتاؤ کہ … شادی بھی کی یا یونہی تن تنہا ایک سا بچے سے زندگی کی گاڑی کھینچ رہے ہو۔"

"نہیں یار۔ ابھی تو صرف دو بہنوں کے فرائض سے ہی سبکدوش ہو سکا ہوں جبکہ دو چھوٹی بہنیں … ابھی بیٹھی ہیں۔ والدین کی بڑی اولاد ہوں اور والد صاحب کو ریٹائرمنٹ مل گئی ہے۔" آفتاب نے اپنی شادی نہ کرنے کی وجہ بیان کی۔

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ شادی کے بعد دونوں بہنوں کے فرض سے سبکدوش ہو جاؤ۔" اسفند بولا۔

"نہیں۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ ایک تو بیوی آ جاتی ہے تو اخراجات مزید بڑھ جاتے ہیں۔ دوسرے … کوئی گوارا نہیں کرتی کہ اس کے شوہر کی کمائی کسی دوسرے پر خرچ ہو۔ خواہ وہ شوہر کی بہنیں ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ بڑی الجھنیں اور تلخیاں پیدا ہو … اسی طرح روپیہ میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ تیسری بہن کی شادی کے بعد ہی اپنی شادی کروں گا۔ کیونکہ سب سے چھوٹی … کی ہے اور جب تک اس کی شادی کا وقت آیا دونوں چھوٹے بھائی بھی اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں گے۔ تو اس عرصے میں … بھی اس کے لیے کچھ نہ کچھ جمع کرتا رہوں گا۔"

آفتاب نے مزید بتایا پھر کہا۔

"ارے چھوڑو یار اس فضول ٹاپک کو۔ اور یہ بتاؤ کہ تمہیں یہ کیونکر معلوم ہوا کہ میں آج کل یہاں لاہور میں تعینات ہوں؟"

"بس الہام ہوا تھا۔" اسفند نے روکھا سا منہ بنا کر کہا۔

"اب زیادہ اسمارٹ بننے کی کوشش نہ کرو یار اور سیدھی سیدھی طرح بتا دو۔" آفتاب قدرے چمک کر بولا۔

"اوہو بھئی، یہ ایسی کوئی پُراسرار بات تو نہیں ہے۔ تمہیں یاد تو ہوگا وہ ایف ایس سی میں شبیر نامی ایک لڑکا ہمارے ساتھ پڑھا کرتا تھا۔"

"ہاں ہاں وہی نا جسے ہم سب چڑیا کی دم پھڑکی کا نک نیم کہہ کر چھیڑا کرتے تھے۔" آفتاب اس کے مزید کچھ کہنے سے قبل ہی بولا۔

"خیر۔ میں نے تو اسے کبھی نہیں چھیڑا تھا۔ تم لوگ ہی چھیڑتے تھے۔" اسفند بولا۔

"ہاں ہاں تم تو ہو ہی سدا سے کوئی آسمانی مخلوق۔ مگر یہاں شبیر کا کیا ذکر ہے؟" آفتاب خاصا متجسس سا نظر آ رہا تھا۔

"بھئی وہی تو کوئی تین ہفتے قبل بڑے اتفاقی طور پر جب میں راؤنڈ پر تھا میری اس سے مڈبھیڑ ہو گئی تھی۔"

"اچھا مڈبھیڑ۔" آفتاب نے کہا۔

"ہاں کیونکہ میں تو اسے بالکل نہیں پہچانا تھا۔"

"مگر وہ زبردستی تمہارے متھے پڑ گیا تھا۔" آفتاب اس کے چبا چبا کر بات کہنے پر چڑ کر بولا۔

"نہیں خیر متھے وتھے تو نہیں پڑا تھا۔ بلکہ وہ اپنے والد کے گردے کے آپریشن کے سلسلے میں ہسپتال آیا تھا۔ اتفاق سے مجھ سے سامنا ہو گیا تو وہ مجھے فوراً ہی پہچان گیا۔ اور اسی کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ تم آج کل لاہور میں تعینات ہو۔" اسفند نے بتایا تو آفتاب اپنے حافظے پر زور ڈالنے کے سے انداز میں تعجب کا اظہار کرتا ہوا بولا۔

"کمال ہے۔ اسے تو میں نے اس روز کے بعد سے جس روز کالج چھوڑا تھا کبھی دیکھا ہی نہیں۔ پھر اس نے میرے متعلق کہاں سے اتنی معلومات فراہم کر لیں؟"

"اب یہ تو خدا ہی جانے۔ مگر یہ ضرور ہوا کہ اس کی معلومات بڑی کارآمد ثابت ہوئیں۔ ورنہ لاہور کا رخ کرتے ہوئے تمہاری طرف سے میں ایک مخمصے میں مبتلا تھا کہ نہ معلوم تم ملو بھی یا نہیں۔" اسفند نے کہا۔

"چلو خیر۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھے یاد تو رکھا۔ ورنہ آج کے اس بے ثبات دور میں تو اپنے سے کمتر … قابل اعتنا نہیں سمجھے جاتے۔" آفتاب نے اظہار ممنونیت کے طور پر کہا۔

"اب یہ جمپو ہیئے کی باتیں مجھ سے تو نہ کرو۔ ورنہ … ایک ایسا ہاتھ دوں گا کہ ساری کیمسٹری نکل جائے گی تمہاری۔" اسفند نے ہاتھ اٹھا کر اسے دھمکایا تو وہ ہنسنے لگا۔

"ویسے یار ذرا وہ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تمہارے لاہور آنے کا مقصد کیا صرف مجھ سے ملاقات کرنا ہی تھا۔" آفتاب نے

… سی کیفیت میں مبتلا تھا بہت گھما پھرا کر یہ فقرہ ادا کیا۔

"کسی حد تک تو یہی مقصد تھا۔" اسفند بولا۔

"کیا مطلب؟" آفتاب نے پوچھا۔

"اصل میں میں اپنی دادی کی عیادت کو ملتان گیا تھا۔ وہاں سے واپسی پر ایک دم ہی لاہور آنے کو دل چاہا تو یہاں چلا آیا۔ یہ معلوم تھا کہ تم بھی یہیں ہو اور لگے ہاتھوں تم سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔" اسفند نے کچھ توقف کے بعد بتایا۔

"چلو خیر وہ مثل ہے کہ تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے۔ لاہور آنے کا اتفاق ہوا تو لگے ہاتھوں ہم سے بھی مل لیے۔"

"نہیں خیر لاہور تو مجھے تمہاری کشش ہی کھینچ کر لائی ہے۔" اسفند بولا۔

"اچھا تو کیا تم کراچی میں اپنا کوئی اسسٹنٹ چھوڑ کر آئے ہو جو تمہاری غیر موجودگی میں تمہارے قائم مقام کے فرائض انجام دیتا ہے۔" آفتاب کی یہ عادت اس سے ڈھکی چھپی نہیں تھی کہ بال کی کھال کھینچنے کا عادی تھا۔

"کیا اسسٹنٹ اور قائم مقام۔ میں سمجھا نہیں۔" اسفند نے سادگی سے پوچھا۔

"بھئی جہاں تک میرا خیال ہے تم نے کراچی میں اپنا پرائیویٹ کلینک تو کھول رکھا ہوگا۔ بس اسی کے متعلق پوچھ رہا ہوں کہ کلینک کس کے سپرد چھوڑ آئے ہو؟" آفتاب نے اپنی بات کی وضاحت کی۔

"لیکن میں نے تو ابھی اپنا پرائیویٹ کلینک نہیں کھولا۔ البتہ مستقبل قریب میں کھولنے کا ارادہ ضرور رکھتا تھا۔" اسفند بولا۔

"مگر ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ شبیر سے تمہاری ملاقات ہاسپٹل میں ہوئی تھی۔" آفتاب نے پوچھا۔

"ہاں وہ تو کراچی کے سول ہسپتال میں ہوئی تھی۔ میں نے وہاں سروس کر رکھی تھی۔"

"سروس کر رکھی تھی۔ مگر تمہیں سروس کرنے کی بھلا کیا ضرورت تھی؟" آفتاب نے پوچھا۔

"بس یونہی تھوڑا تجربہ گین کرنے کی غرض سے۔ بلکہ اصل میں تو ٹائم پاس کرنے کے لیے۔" اسفند بولا۔

"… یہ بھی خوب رہی۔ جب کہ میں تو سمجھ رہا تھا کہ اتنی بڑی ڈگریاں لے کر آئے ہو تو اپنا ذاتی کلینک کھول کر دونوں ہاتھوں سے خوب لوگوں کی جیبیں چھڑوا رہے ہوگے۔"

"نہیں نہیں میرے دل میں تو شروع ہی سے خدمت خلق کا جذبہ اور دیانتداری سے کام کرنے کی لگن ہے اور پھر میرے پاس بھلا کس چیز کی کمی ہے جو میں لوگوں کی جیبیں چھڑواتا یا انہیں دونوں ہاتھوں سے لوٹتا۔" اسفند تھوڑا سا چمک کر بولا۔

"بھئی برا ماننے کی بات نہیں۔ عموماً ہوتا کچھ یہی ہے کہ جن لوگوں کے پاس دولت کی بہتات ہوتی ہے انہیں پیسے کی ہوس … بڑھ جاتی ہے کہ بس ھل من مزید کے خواہاں ہی نظر آتے ہیں۔" آفتاب نے کہا۔

"… ہوں گے لالچی، حریص یا ایسے لوگ بھوکے ہوں گے جنہوں نے کبھی پیسہ نہ دیکھا ہوگا اور ایسے ہی لوگ عموماً کم ظرف اور … جاتے ہیں۔ ورنہ میرا اپنا نظریہ تو یہ ہے کہ انسان جو کچھ بھی بنتا ہے یا بنتا ہے خود اپنی محنت، لگن اور قسمت سے ہی بنتا ہے۔ … سمجھتے ہو کہ میں اپنے آبا و اجداد کی دولت کے بل بوتے پر بیٹھا ہوں گا۔ اگر ایسا ہی خیال ہوتا تو مجھے اتنے عرصے تک تعلیم میں سر کھپانے … اور بڑی بڑی ڈگریاں کیوں لیتا۔ یقین جانو۔ میں نے آج تک جو کچھ بھی خرچ کیا ہے اپنی جیب سے ہی کیا ہے۔ اصل میں … خیالات اس معاملے میں بہت مختلف ہیں۔ میں اپنی جائیداد اور والد کی کمائی کے ذریعے سے زندگی نہیں گزارنا چاہتا بلکہ … اپنا بنانا چاہتا ہوں۔" اسفند نے پر عزم لہجے میں آخری فقرہ کہا۔

"… پھر کلینک کیوں نہیں۔ تم نے تو ابھی تک کلینک کھولا ہی نہیں … چلو مانے لیتا ہوں کہ تجربہ گین کرنے کے لیے ہی سروس کی تھی مگر پھر … کیوں … آئے ہو؟" آفتاب نے پوچھا تو اسفند تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔

"اصل میں میری طبیعت میں کچھ تلون سا پیدا ہو گیا ہے۔ یعنی ایک جگہ جم کر نہ بیٹھ سکتا ہوں نہ کوئی کام ہی کر سکتا ہوں اور … سے بڑھ کر کسی پابندی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے مجھے کسی ایسے کام کی تلاش ہے جس میں آزادی سے گھوم پھر سکوں۔"

"… کام کا ڈاکٹری کے پیشے میں تو کہیں گزر نہیں ہو سکتا۔ البتہ خانہ بدوشی کے پیشے میں آسانی سے مل سکتا ہے۔" آفتاب … عجیب و غریب منطق پر جل کر بولا۔

"… مذاق تم سمجھے نہیں۔ در اصل میں چاہتا ہوں کہ کسی ایسی گشتی پارٹی میں شامل ہو جاؤں جو پسماندہ علاقوں کا دورہ

پھر حاضری دینے والے فرشتوں کے آنے کا وقت ہوتا ہے اسی لیے تمام فرشتے یکجا ہو کر اپنے معبودِ حقیقی اور مالک کے سامنے سربسجود ہوتے ہیں۔ اور انسان تو خدا کی ساری مخلوق میں اشرف ہے۔

اسے فرشتوں سے پہلے ہی بارگاہِ ایزدی میں سربسجود ہونا چاہیے۔

کہ اتنی ساری مخلوق میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ نے انسان پر ہی اپنے انعام و اکرام کی بارش کی ہے۔

اب اس بات سے اندازہ لگالو کہ جس روز تمہیں اسکول پہنچنے میں دیر ہو جاتی ہے تو تمہارے مینیجر صاحب ... ہیں۔ تم پر کس قدر غصے ہوتے ہیں بلکہ تمہیں سزا بھی دے دیتے ہیں۔ کیونکہ تم وقت پر اسکول نہیں پہنچتے جب کہ اسکول کے قواعد و ضوابط اور اصول ہوتے ہیں۔

اسکول وقت سے کھلتا ہے اور وقت پر چھوٹتا ہے تمام اسکول کے اوقات میں سے کوئی پیریڈ گول کرو تو تمہیں سزا ملتی ہے۔ تو اللہ پاک تو سب سے بڑا منتظم — سب سے بڑا حاکم ہے۔

جو اصول اس نے بندوں کے لیے وضع کیے ہیں ان میں وہ بھی اپنے بندوں کو پورا اترتے دیکھنا پسند فرماتا ہے۔ کہ دونوں جہانوں میں اسی کی بادشاہت ہے اور اسی کے قبضۂ قدرت میں دونوں جہانوں کا نظام ہے۔ اور فجر کا وقت دعاؤں کی قبولیت کا وقت ہوتا ہے کیونکہ منادی کرنے والا فرشتہ اس کے بندوں کے لبوں سے نکلی ہوئی دعاؤں اور حاجتوں کو اس کی بارگاہ تک پہنچاتا ہے۔ لہٰذا تم فجر کی اذان سنتے ہی اٹھ جایا کرو۔

جو فجر کے وقت اٹھنے میں کسل سے کام لیتے ہیں یا نماز ادا کرنے سے جی چراتے ہیں انہیں شیطان لوری دے کر سلا دیتا ہے اور فرشتے اس شخص پر لعنت کرتے ہیں۔

اور عمر کے اس کچے دور میں سلمیٰ بیگم کی ان ساری باتوں میں سے جس بات نے اس کے دل میں ایک خوف سا پیدا کر دیا وہ فرشتوں کے لعنت بھیجنے کی بات تھی۔

کہ فرشتے جو اتنے پاک و صاف اور اچھے ہوتے ہیں اور سب سے بڑھ کر رحم دل بھی۔ جن کی پر لگی رنگین اور خوبصورت چھوٹے چھوٹے بچوں کی صورت میں وہ تصویریں بھی دیکھ چکا تھا۔ وہ کسی پر لعنت بھیجیں۔ توبہ توبہ — وہ بچہ تو پھر بہت ہی خراب ہوگا۔ ایک دم خوفناک (شیطان) جیسا بالکل ڈریکولا کی شکل۔ وہ دل ہی دل میں سوچ سوچ کر ایک جھرجھری لیتا۔ اور اسی ڈر اور خوف کے تحت صبح تاروں کی چھاؤں میں اٹھ کر بیٹھ جاتا۔ سلمیٰ بیگم نے تو اس کے سامنے دوسری چاروں نمازوں کے بھی فضائل بیان کیے تھے خصوصیت سے عصر کی نماز۔ اور وہ شروع شروع میں تو بڑی پابندی سے پنجگانہ نماز ادا کرتا تھا مگر بعد میں اپنی ... کی وجہ سے اگرچہ اس کی دوسری نمازیں قضا ہونے لگی تھیں لیکن فجر کی نماز اور جمعے کی نماز کبھی قضا نہیں ہوئی تھی۔

گو اب شعور و آگہی کی منزل میں قدم رکھنے کے بعد بچپنے کے ... وہ فرشتوں کے تصوراتی پیکر کے بجائے فہم و ادراک کے دروازے اس پر کھل گئے تھے۔ اور اپنے اشرف بنا دیے جانے کا احساس آپ ہی آپ اسے بارگاہِ الٰہیہ میں ... کر دیتا تھا۔

بہرحال — اگلے روز آفتاب ٹھیک نو بجے اسے لینے آگیا اور ہوٹل کا حساب چکا کر وہ اس کے ساتھ جیپ ... احمال احمد کے گھر پہنچ گیا۔ آفتاب کے کہنے کے مطابق مزنگ کا علاقہ بالکل ویسا ہی علاقہ تھا جیسے کہ شہر کے ... گنجان اور آباد علاقے ہوتے ہیں جن میں زیادہ تر اوسط اور نچلے طبقے کے لوگ ہی رہتے ہیں۔ ویسی ہی دوکانیں، بازار اور گلیاں۔ وہی شور شرابا اور مکانات بھی بالکل ... جیسے پاس پاس جڑ کر بنے ہوئے۔ انہی میں کچھ کوٹھیاں بھی تھیں اور نو تعمیر بنگلے بھی۔ احمال احمد کا بھی نو تعمیر بنگلہ بھی ان ہی بنگلوں میں شامل تھا۔ مگر اندر سے قدرے پُرسکون تھا اور وہ کمرہ بھی جو نہایت آرام دہ اور سجا سنورا تھا جو اسے دیا گیا تھا۔ لیکن چونکہ احمال احمد ان دنوں بیمار پڑا ہوا تھا۔ دوسرے آفتاب دو دن کی چھٹی پر تھا اس لیے اسفند کو اس گھر میں صرف رات گزارنے کا ہی موقع مل سکا تھا۔ کیونکہ دونوں دوست صبح کو گھر سے نکلتے تو رات کو ہی گھر لوٹتے تھے۔ اور آفتاب اسے گردا گرد کر کے اپنے ساتھ لیے ... مزنگ کے علاقے میں آیا تھا۔ اس پر عمل درآمد کرنے کی اسے مہلت ہی نہیں ملی تھی۔

پیر کے روز چونکہ آفتاب کی چھٹی ختم ہو گئی تھی اس لیے گزشتہ شب ہی اسفند نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ وہ پیر کو شام ... بلا جائے گا۔

اتوار کی شب جب آفتاب کے ساتھ وہ شہر نوردی کر کے واپس آیا تو احمال احمد کو گھر میں موجود پایا۔ آفتاب نے اس کا تعارف کرایا۔ احمال احمد بڑے تپاک سے اس سے ملا۔ اور جب آفتاب کی زبانی اسے معلوم ہوا کہ وہ اگلے روز ... جا رہا ہے تو اس کے سر ہی ہو گیا کہ مزید دو تین دن ٹھہر کر اسے میزبانی کا شرف بخشے۔ آفتاب تو خود بھی اس کے ... جانے کے حق میں نہ تھا۔ وہ بھی اس کا ہم زبان ہو گیا۔ اور اسفند کو مجبوراً بلکہ صحیح معنوں میں طوعاً و کرہاً ایک دو روز ... رکنا ہی پڑا۔

احمال احمد بے حد خلیق ہی نہیں بلکہ شکل و صورت کے اعتبار سے بھی بہت خوش شکل اور ہنس مکھ سا انسان تھا۔ اس نے ... اور آفتاب کی غیر موجودگی میں اپنی دلچسپ باتوں سے اس کا دل بھی بہلاتا رہا تھا۔ اس کے باوجود بھی چونکہ اسفند ... ہو گیا تھا اس لیے وہ جلد از جلد وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا اور اس نے سوچ لیا تھا کہ بہر صورت وہ بدھ ... اسلام آباد روانہ ہو جائے گا۔ اور بدھ کے روز اسی ارادے سے گھر سے نکلا تھا کہ خاموشی سے جا کر جہاز سے اپنی سیٹ بک کرا لے گا۔

گھر سے نکلا تو دور تک چلنے کے باوجود اسے کوئی ٹیکسی نظر نہیں آئی۔ البتہ تانگے اور موٹر رکشا ادھر ادھر تیزی سے آتے جاتے نظر آئے۔

تانگے میں بیٹھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ تقریباً سب ہی لوگ جانتے ہیں کہ کراچی والے تانگے کی سواری کو ... سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ وہ بھی بڑے طبقے کے لوگ موٹر رکشا اور ٹیکسیوں کو بھی ہیچ سمجھتے ہیں۔ کیونکہ کراچی میں تو ... پرائیویٹ کاروں کا ایک سیل سا بہتا نظر آتا ہے۔ کراچی کے تو عوام الناس بھی تانگے کی سواری پر بس کی سواری کو ترجیح ... رہی موٹر رکشا تو بعض لوگ اسے خطرناک اور جان لیوا سواری قرار دیتے ہوئے پیدل یا بس سے سفر کرنا ہی بہتر سمجھتے ہیں۔ مگر اس کا تعلق بعض لوگوں میں سے نہیں بلکہ اعلیٰ طبقے سے تھا۔

وہ ... انتیس سالہ زندگی میں کبھی رکشہ میں نہیں بیٹھا تھا لیکن اس روز چونکہ وہ چپکے سے احمال احمد کے گھر سے ... تھا اور کوئی دوسری سواری مل ہی نہیں رہی تھی اس لیے ایک موٹر رکشہ روک کر اس میں بیٹھ گیا۔

"کدھر جانا ہے باؤ جی؟" رکشہ والے نے پوچھا۔ اب اسے کسی علاقے کا نام معلوم ہوتا تو بتاتا بھی۔ بس اسی ہوٹل کا نام بتایا ... میں ٹھہرا تھا۔ اصل میں تو اس ہوٹل کے منیجر نے ہی اس روز جس روز آفتاب اچانک ہی اس سے ملنے پہنچ گیا تھا اس سے کہا تھا ... بُک کرانے کے سلسلے میں کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ وہ فون پر ہی ایک فضائی کمپنی سے اس کی بات کروا دے گا اور اس ... ٹکٹ بھی آسانی سے ہو جائے گی۔

مگر اب یہ بھی اتفاق کی بات ہی تھی کہ رکشہ والا بھی لاہور میں نووارد تھا۔

... معلوم کون کون سے راستے ناپتا اسے ایک دوسرے ہوٹل کے سامنے اتار گیا تھا۔ یہ کہہ کر کہ اس علاقے میں کئی ہوٹل ہیں۔ ... ہوٹل بھی یہیں کہیں ہوگا۔ بہرکیف وہ بھی خاموشی سے رکشہ سے اتر گیا تھا۔ کیونکہ رکشہ میں بیٹھنے کا یہ پہلا موقع تھا اور جھٹکے ... کے انجر پنجر ڈھیلے ہو گئے تھے۔ اور وہ خود بھی اس تکلیف دہ سواری سے جلد سے جلد چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اور اس ... تھا کہ خود پیدل چل کر ہی اس ہوٹل کو کسی نہ کسی طرح تلاش کرے گا۔ جہاں وہ اترا تھا وہ بھی بڑا گنجان علاقہ تھا۔ ... اور بھیڑ بھی بہت زیادہ — اور گرمی بھی بہت سخت پڑ رہی تھی جس ہوٹل کے آگے وہ اترا تھا وہ ایک نچلے ... تھا۔ وہ پہلے ہوٹل کے قرب و جوار میں اپنا مطلوبہ ہوٹل تلاش کرتا رہا۔ پھر اس نے سوچا کیوں نہ سڑک پار کر کے دوسری ... یا پھر کسی سے پوچھ لے۔

سڑک پر بھاری ٹریفک رواں دواں تھا۔ اور وہ پیدل تھا۔ ٹریفک سگنل کے سامنے سڑک کے کنارے چند راہگیروں کے ساتھ ... راستہ کھلنے کا انتظار کر رہا تھا کہ تبھی — فٹ پاتھ سے کوئی دو بالشت کے فاصلے پر عین اس کے سامنے ... کی وجہ سے ایک رکشہ آکر رکی۔ حالانکہ اسی وقت پیدل سڑک پار کرنے والوں کے لیے راستہ کھل گیا تھا۔ لیکن رکشہ ... پر نظر پڑتے ہی اس کا اٹھتا ہوا قدم وہیں جم کر رہ گیا۔

... اس شخص نے سفاری سوٹ پہن رکھا تھا اور اس کا شیو بھی تھوڑا تھوڑا بڑھا ہوا تھا۔ پھر بھی اس کی تعجب سے پھیلتی آنکھوں ... پہچان لیا تھا کہ وہ اس کے پھوپھا ہیں۔

ان تیزی سے گزرتے ہوئے لمحوں میں اس شخص نے بھی اس کی طرف بڑے تعجب بھری نظروں سے دیکھا اور اس کی نظروں میں پہچان کے سائے سے بھی لہرائے تھے بلکہ اسفند سے اس کی نظریں بھی چار ہوئی تھیں۔ مگر اسفند جوں ہی پھوپھا کی طرف بڑھا۔ اس نے نظریں ہی نہیں چرائیں بلکہ منہ بھی دوسری طرف پھیر لیا۔ پھر جونہی اسفند قدم بڑھا کر رکشہ کی طرف بڑھا شومئی قسمت سے سبز بتی روشن ہو گئی اور رکشہ والا تیزی سے رکشہ کو بھگاتا ہوا آگے لے گیا۔ بس اسفند کا پیر رکشہ کے … جانے میں ذرا سی کسر رہ گئی۔ اسفند جلدی سے ہٹ کر فٹ پاتھ پر چڑھ گیا۔ اور تھوڑی دیر وہاں کھڑا یہی سوچتا رہا کہ یہ … اور شخص تو نہیں تھا جو پھوپھا سے اتنی زیادہ مشابہت رکھتا تھا۔

یوں بھی پھوپھا سے ملے اسے چھ سات سال کا عرصہ ہوا تھا۔ اور اس عرصے میں ظاہر ہے پھوپھا کی عمر میں اضافہ ہی ہوا ہو گا۔ اور اگرچہ ان کی ہیئت نہ بدلی ہو گی تو بھی ان کے اندر بہت سی تبدیلیاں آ گئی ہوں گی۔

وہی تبدیلیاں جو عمر کے طولانی دور کے ڈھلنے کے بعد انسان کے اندر رونما ہوتی رہتی ہیں۔ جبکہ رکشہ میں بیٹھا ہوا شخص … قبل والے پھوپھا کی بعینہ کاپی تھا۔ مگر نہیں یہ صد فی صد پھوپھا جان ہی تھے۔ کیونکہ وہ اگر ان سے مشابہت رکھنے والے کوئی شخص ہوتے تو مجھے یوں اچانک دیکھ کر ان کی نگاہوں میں حیرت نہ امنڈتی۔ یوں پہچان لینے کا تاثر پیدا نہ ہوتا۔ اور میرے … بڑھنے پر وہ ہرگز اس طرح نظریں نہ چراتے۔ جیسے دانستہ چشم پوشی سے کام لے رہے ہوں۔ یوں منہ نہ پھیرتے جیسے … چاہ رہے ہوں۔ نہیں نہیں وہ یقیناً پھوپھا جان ہی تھے۔

پھر جونہی اسے خیال آیا کہ وہ بڑی دیر سے فٹ پاتھ کے کنارے پر کھڑا ہوا ہے تو اس نے قریب ہی سے گزرتی ایک ٹیکسی روکی اور اس میں بیٹھ کر ٹیکسی والے سے مزنگ چلنے کو کہا۔ کہ وہ ٹیکسی ڈرائیور کو راستہ تو بتا سکتا تھا۔ مگر اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ اجمال احمد کا گھر مزنگ کے کس علاقے میں ہے۔ کون سی جگہ ہے یا پھر اس کا نمبر کیا ہے۔

بہرحال مزنگ تک کا علاقہ بھی اس نے یہی سوچنے میں طے کیا کہ کیا پھوپھا نے سلوطہ کو اس کے یہاں بھیجنے کے بعد لاہور میں ہی اقامت اختیار کر رکھی ہے۔ کیا وہ ملک سے باہر گئے ہی نہیں۔ جو لاہور ہی میں نظر آ رہے ہیں یا وہ کیا اب تک مزنگ والے مکان ہی میں رہائش پذیر ہیں۔ اور اگر ان کا کہیں جانے کا پروگرام نہیں تھا تو انہوں نے سلوطہ کو کس وجہ سے آخر اس کے گھر بھیج دیا نہ صرف بھیج دیا تھا بلکہ ڈیڑھ برس کے عرصے میں پلٹ کر اس کی خبر تک نہیں لی تھی۔ ان باتوں سے ظاہر تو یہی ہوتا ہے کہ ساری … سلوطہ کی وجہ سے ہی تھی۔ اچھے بھلے شوہر کو چھوڑ کر بیٹھی تھی۔ اس لیے سیدھی انگلیوں گھی نہ نکلا ہو گا تو اس کے شوہر نے ٹیڑھی انگلی سے نکالنے کی کوشش کی ہو گی۔ پھوپھا کو اس کے شوہر کی طرف سے کوئی خطرہ لاحق ہو گیا ہو گا اسی لیے انہوں نے سلوطہ کو ہمارے گھر بھیج دیا ہو گا۔ یقیناً کچھ ایسی ہی بات ہو گی۔ اور بہانہ یہ کر دیا کہ ورلڈ ٹور پر جا رہے ہیں۔ ہونہہ بقول مجی۔ ایک دم فراڈ … ہیں ہے اور ثاقب بھائی فاخرہ کو لے کر ورلڈ ٹور پر گئے ہیں۔ بھلا … جھوٹ بولنے کی۔

واقعی میری عقل پر بھی پتھر ہی پڑ گئے تھے۔ ورنہ میں نے اتنا تو سوچا ہوتا کہ پھوپھا جان کی اتنی تو حیثیت نہیں کہ کراچی تک … بیگم کے ساتھ سفر کر سکیں۔ پھر بھلا وہ ورلڈ ٹور پر کیسے جا سکتے ہیں۔ اس وقت بھی رکشہ میں ایسا ڈھیلا ڈھالا اور ملگجا سا لباس پہنے بیٹھے تھے جیسے کسی کی اتنی تنگ دستی ہو۔ نہ معلوم کس حال میں ہیں اور کہاں رہ رہے ہیں۔ اور بے چاری پھوپھو بیگم ان کے ساتھ … ان کے کس گناہ کی سزا بھگت رہی ہیں۔ جبکہ وہ تو بڑے ناز و نعم میں پلی بڑھی ہیں۔ اپنے انہی منتشر خیالوں میں گم … وہ یہ بھی بھول گیا تھا۔ اپنی پرائیویٹ کار میں نہیں ٹیکسی میں بیٹھا ہے۔ یا اسے کہیں اترنا بھی ہے۔ وہ تو ٹیکسی ڈرائیور نے خود ہی اس سے پوچھا۔

"مزنگ تو پیچھے رہ گیا باؤ جی۔ آخر آپ کو جانا کہاں ہے۔" تب وہ اپنی محویت سے بری طرح چونکا۔ اور ڈرائیور سے بولا۔

"مجھے مزنگ ہی جانا ہے۔ اصل میں، میں یہاں نیا نیا آیا ہوں اسی لیے مجھے یہاں کے راستوں کا بالکل علم نہیں۔" …

اور تب ٹیکسی ڈرائیور نے چپ چاپ گاڑی موڑ لی۔

"مزنگ تو کافی بڑا علاقہ ہے آپ کو کون سی جگہ اترنا ہے۔" ڈرائیور نے گاڑی موڑ کر پوچھا۔ اور اس نے سوچا کہ جگہ کا نام … تو اسے معلوم ہی نہیں پھر بھلا ڈرائیور کو کیا بتائے۔ کیوں نہ خود ہی اتر کر ڈھونڈ لے۔ بس یہ خیال آتے ہی اس نے ڈرائیور سے کہا۔

"بس وہ جو آگے جا کر ایک چوراہا سا بنا ہوا ہے۔ وہیں مجھے اتار دینا۔" ڈرائیور نے پلٹ کر عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا اور تھوڑا سا فاصلہ طے کرنے کے بعد اسے اسی چوراہے پر اتار دیا۔ اس نے اتر کر میٹر دیکھے بغیر ہی ٹیکسی والے کے ہاتھ پر …

… تمہارے اور اسے حیران اور متعجب سا چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ اصل میں وہ چوراہا جس پر وہ اترا تھا جاتے وقت بھی اس کے … تھا۔ اور رکشہ والا ٹیکسی کی سڑکوں سے موڑ کاٹتا ہوا اس طرف سے نکلا تھا۔ اور چونکہ رکشہ کا سفر اس کے لیے ایک نیا تجربہ تھا اسی لیے اس نے بالکل دھیان ہی نہیں دیا تھا کہ وہ اسے کن کن راستوں سے نکال کر لے گیا تھا۔ وہ تو کچھ آگے جا کر قسمت … اجمال احمد کے ملازم نے اسے دیکھ لیا تھا اور بھاگ کر اس کے پاس آ گیا تھا۔ تو اس کے ساتھ ہی بڑی آسانی سے گھر پہنچ گیا تھا۔ … نہ معلوم اسے کتنی دیر بھٹکنا پڑتا۔

… کمرے میں آ کر ہی اسے یاد آیا تھا کہ وہ کس مقصد سے گھر سے نکلا تھا۔ ورنہ پھوپھا کو اس قدر غیر متوقع اور اتفاقی … دیکھ کر تو وہ سب کچھ ہی بھول گیا تھا۔ مگر اب کمرے میں واپس آنے کے بعد اسلام آباد جانے کا خیال آیا تو پھوپھی اور پھوپھا کی … اس نے اس خیال کو سختی سے جھٹک دیا۔ وہ تو بس یہی سوچے جا رہا تھا کہ کس طرح اور کیوں کر پھوپھا تک رسائی حاصل کی جائے … ان کے بارے میں کس سے پوچھے اور کیا کہے۔؟

… نمبر اگر یاد بھی آیا تو بیکار ہی تھا۔ کیونکہ صرف پہلا ہندسہ ہی دماغ پر بہت زور دینے پر یاد آ سکا تھا۔ اور وہ ایک کا ہندسہ تھا … اور اسی وقت اسے اپنی اس غفلت کا احساس بھی ہوا تھا کہ اس نے ان تین چار دنوں میں آتے اور جاتے … اجمال احمد کا نمبر پڑھنے یا معلوم کرنے کی بھی کوشش نہیں کی تھی۔ اصل میں تو جتنی دیر وہ یہاں رہا جیپ میں سوار ہو کر باہر نکلتا تھا۔ … جیپ میں بیٹھ کر اندر آتا تھا۔ اتنا موقع ہی کہاں ہوتا تھا۔ کہ باہر گیٹ کے پہلو میں نیم پلیٹ کے عین نیچے درج مکان کے نمبر … سکتا مگر اب جونہی اپنی اس کوتاہی کا خیال آیا۔ اس نے اجمال احمد کے ملازم کو بلا کر اجمال احمد کے مکان کا نمبر پوچھا۔

"جی … D" ملازم نے بتایا تو وہ اچھل پڑا۔

"ہاں کچھ یہی نمبر تو تھا۔ یا پھر کچھ اس سے ملتا جلتا۔ کیونکہ اس میں D وغیرہ کی تخصیص نہیں تھی مگر ایک سو کچھ ضرور تھا۔ ممکن ہے … قریب ہی کہیں ہو وہ گھر۔" وہ ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ دروازے کو آہستہ سے بجا کر اجمال نے اندر آنے کی اجازت چاہی۔ اور پھر اس کے … ہونے سے پہلے ہی اندر آ گیا۔

"… کہاں گھوم پھر آئے آپ۔" اس نے آتے ہی پوچھا۔

"… ذرا لاہور ہی گھومنے پھرنے گیا تھا۔ آپ تشریف رکھیے۔" وہ تھوڑا سا اپنی جگہ سے اٹھ کر بولا۔

"ارے نہیں آپ بیٹھے رہیں۔" اجمال احمد نے کہا اور پھر دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ٹیکسی کا تکلف کیوں برتا آپ نے۔ کیا ہمیں کسی خدمت کا موقع دینا آپ گوارا نہیں کرتے۔" اجمال نے بیٹھنے کے بعد گلہ سا کیا۔

"ارے نہیں۔ وہ اصل میں سیٹ بک کرانے کی غرض سے نکلا تھا۔ مگر۔" اسفند نے کہنا چاہا تو اجمال اس کی بات کاٹ کر بولا۔

"… تو ہو چکی ہوں گی۔ اسی میں چلے جاتے۔ ویسے کیا سیٹ بک کرا لی آپ نے۔" اجمال احمد نے اپنی بات کہہ کر پوچھا۔

"نہیں۔ وہ ٹیکسی والا بھی اتفاق سے میری طرح لاہور میں نووارد تھا۔ اس نے مجھے کسی اور جگہ اتار دیا تھا۔ میں بس یونہی گھوم … کر واپس آ گیا۔" اس نے اختصار سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"لو ہونہہ آپ نے مجھ سے کیوں نہ کہہ دیا۔ میں گھر بیٹھے بیٹھے ہی آپ کی سیٹ بک کروا دیتا۔ خیر یہ اچھا ہی ہوا۔ اس بہانے آپ … اور دو چار روز رک جائیں گے۔ اصل میں مجھے آپ کی خاطر تواضع کرنے کا ڈھنگ سے موقع ہی کہاں ملا۔ سچ تو یہ ہے کہ ایک وقت … آپ کو … نہیں کھلا سکا۔" اجمال احمد نے بڑے خلوص کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"ارے نہیں اجمال صاحب آپ تو کچھ بہت ہی انکساری سے کام لے رہے ہیں۔ ورنہ۔ ورنہ میں اتنے دنوں سے آپ کے یہاں ہی ٹھہرا ہوا … کھانا بھی یہیں کرتا ہوں اور چائے پانی وغیرہ بھی یہیں کا پیتا ہوں۔ اب اس سے بڑھ کر اور میری تواضع کیا ہو سکتی ہے۔؟" وہ … بہت ممنون لہجے میں بولا۔

"… تو آپ تکلف سے نہیں غنیمت سے کام لے رہے ہیں۔ مگر یہ تو بتائیے کہ یہاں رہ کر آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔؟"

"… کیسی تکلیف۔؟" اس نے پوچھا۔

"… یہاں کے شور شرابے کی۔ اصل میں یہ علاقہ ایک تو شہر کے وسط میں ہے دوسرے بہت پرانا ہے۔ یہ بنگلے اور فلیٹس جو آپ … دیکھ رہے ہیں یہ تو حال ہی میں تعمیر ہوئے ہیں۔ ورنہ جیسے مکانات اندر … میں بنے ہوئے ہیں۔ اسی وضع قطع کا کبھی یہ بنگلہ بھی تھا۔ جس

"کمال ہے اسفند صاحب —! آپ اس قدر تکلف سے کام لے رہے ہیں ورنہ وہ آپ کا دوست … اتنی — میرا فرسٹ کزن ہی نہیں بلکہ لنگوٹیا بھی ہے اور اگر آپ اس کے یار ہیں تو ہم یاروں کے یار ہیں … غیریت سے کام لیتے ہیں آپ — یا آپ اگر بہت مقوی اور مرغن غذائیں کھانے کے عادی ہیں تو حکم کیجیے دو گھنٹوں میں تیار کروا لیں گے۔"

"ارے کیوں شرمندہ کرتے ہیں آپ — اب میں کوئی آسمان سے تو نہیں اُترا سیدھا سادا بندہ ہوں … نے خود کو عمدہ خوراک کا کبھی خوگر نہیں بنایا بلکہ دال اور چٹنی بھی مل جائے تو صبر و شکر کر کے کھا لیتا ہوں۔" اجمال کے … بھرے شکوے پر اسفند جھینپ کر بولا۔

"ہا ہا ہا — دال اور چٹنی — یعنی کچھ زیادہ ہی کسر نفسی سے کام لینے کے عادی ہیں آپ۔ تو چلیے … جلد اس غربت کدے پر کھانا نہ کھانے کی قسم تو توڑ ہی دیجیے آپ۔" اجمال اس کی بات پر ایک قہقہہ لگا کر بولا اور … آتا ہوں کہہ کر اس کے رہائشی کمرے سے نکل گیا۔

اور اس کے جاتے ہی اسفند پھر اس کی زبانی سنی — باتوں پر غور کرنے لگا — اپنی پھوپھو کی اتنا زیادہ وہ غلط … ہر ان کے لیے اس کے دل میں جو ایک خاص مقام تھا وہ بھی اس کی نظروں سے گر گیا۔ اور پھوپھو سے خفا … باتیں سچ نظر آنے لگیں جو اکثر و بیشتر وہ اس کے سامنے دُہراتی رہتی تھیں۔ اس کا دل چاہا کہ ابھی پھوپھو کے پاس … اور ان کی اس قدر گری ہوئی باتوں یا بہتان در دیگر الزام تراشی پر انہیں خوب ملامت کرے — مگر پھوپھو کے پاس جانا آسان نہ تھا۔ اور اجمال نے تو پھوپھو اور پھوپھا کے بارے میں — یہی خیال ظاہر کیا تھا کہ وہ اس کے گھر سے کہیں نہیں لاہور سے … چلے گئے ہیں لیکن یہ بات وہ کیسے مان لیتا جب چند گھنٹے پیشتر اس نے اپنی آنکھوں سے پھوپھا کو بہت قریب سے رکشے میں بیٹھا ہوا دیکھا تھا اور یہ سوچنا تو اس کی حماقت تھی کہ وہ شخص پھوپھا کا ہمشکل تھا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ پھوپھو بھی لاہور میں ہی موجود ہیں — مگر کہاں؟ اس سوال کا جواب دینا … ممکن نہ تھا۔

وہ ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ ملازم اسے کھانے پر بلانے آگیا۔

اور اسے بادلِ نخواستہ اجمال کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانا ہی پڑا۔

جب کہ وہ اس پر زیادہ بوجھ ڈالنے کے بالکل حق میں نہ تھا کہ اس کے یہاں قیام کرنا ہی کیا کم تھا۔

بہرحال، کھانے سے فارغ ہو کر وہ اپنے رہائشی کمرے میں آیا تو تھوڑی دیر آرام کرنے کے بجائے تمام وقت پھوپھا کا اتا پتا معلوم کرنے کے بارے میں ہی سوچتا رہا کیونکہ اس کے ذہن میں یہ خیال بھی کونجتے اور ڈرتا کہ کہیں سلوٹ … انہی کے پاس نہ آگئی ہو ورنہ وہ جا کہاں سکتی ہے اور جہاں تک ڈیڈی کے اسے تلاش کرنے کا سوال تھا تو وہ ابھی … میں اب تک کامیاب ہی نہ ہو سکے ہوں گے۔ ہاں بھلا اتنے بڑے اور پُرہجوم کراچی شہر میں کسی کو ڈھونڈ نکالنا ممکن ہی کہاں ہے۔ وہ تو اگر خدانخواستہ پھوپھا کے پاس نہیں پہنچی ہوگی — تو پھر یقیناً بہت غلط ہاتھوں میں پہنچ گئی ہوگی کہ … ایک جوان … خوبصورت بلکہ بے یار و مددگار لڑکی جب گھر سے قدم نکالتی ہے تو لوگ اُجلی پوشاکوں کے اندر چھپے بھیڑیے … خوراک بنا لیتے ہیں اور اگر وہ پھوپھا کے پاس واپس نہیں پہنچی ہوگی تو یقیناً کسی حریص اور اوباش شخص کی ہوس کا شکار بن گئی ہوگی … اسے بے آبرو کرنے کا ذمہ دار تو میں ہوں گا۔ میں —

نہیں نہیں — خدا نہ کرے …

لاہور میں میرے قیام کی مدت چاہے کتنی ہی بڑھ جائے — میں پھوپھی اور پھوپھا کو کھوج کر ہی رہوں گا۔

یہی سب سوچتے اور تہیہ کرتے اسے پتا تک نہیں چلا کہ کتنا وقت گزر چکا ہے۔ اس کی محویت تو اس وقت ٹوٹی جب اجمال احمد کا ملازم چائے کی ٹرے ہاتھوں میں اٹھائے اس کے کمرے میں داخل ہوا۔

اس نے چائے کی ٹرے سینٹر ٹیبل پر رکھی تو اسفند نے اپنی محویت سے چونک کر کہا۔

"یہ تم میری چائے یہاں کیوں لے آئے۔ مجھ سے کہہ دیتے تو میں اندر آکر تمہارے صاحب کے ساتھ ہی پی لیتا۔"

"پر جی چھوٹے میاں تو گھنٹہ ہوا کہیں باہر چلے گئے ہیں اور جی آپ تو ہمارے مہمان ہیں۔ آپ کو اندر بلانے کا … دیکھی تھی۔" ملازم نے جس کا نام شیر محمد عرف شیرا تھا جواب میں کہا اور پھر جھک کر اس کے لیے پیالی میں چائے انڈیلنے لگا۔

"شکر کتنی پاؤں جی۔" اس نے پوچھا۔

"دو بڑے چمچ۔" اسفند بولا۔ تو اس نے پیالی میں دودھ اور چینی ڈال کر سینٹر ٹیبل کو تھوڑا سا آگے کر کے چائے کی پیالی اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"آپ یہ کھائیں وی صاحب جی۔ یہ بسکٹ اور شامی کباب۔ کچھ تو لیں ناں جی —"

"نہیں بس یہ چائے ہی کافی ہے۔" وہ ترش بیٹھے سے انداز میں بولا کہ ایک تو سہ پہر کو چائے پر کچھ کھانے کا عادی نہ تھا۔ دوسرے اس کا ذہن اس کے سخت الجھا ہوا تھا۔ ملازم نے جو کچھ نہیں کہا۔ اور ہتھیلیوں کو باہم جوڑ کر تھوڑا سا سرک کر کھڑا ہو … سروس کرنا ہوتا اسفند کو بہت کھلا —— وہ چائے کے چند گھونٹ حلق سے اتارنے کے بعد شیرا کی طرف دیکھ کر بولا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ تم یہاں کے پرانے ملازم ہو۔" بہت ہی سیدھا سا سوال تھا پھر بھی شیرا ایک دم پھڑک ہی اٹھا اور فخریہ انداز میں بولا۔

"ہاں صاحب جی! یہ اتنا ملازم کیسا؟ میں تو کیا میرا ابا بھی اسی گھر کا ہے پیدا ہویا سی۔ اسے میرا چھوٹے میاں جی نے … نے گود کھلایا ہے۔" اس نے آدھی اردو آدھی پنجابی میں بتایا۔ گو اس کی بات اچھی طرح اسفند کے پلے نہیں پڑی مگر … اس کے تحت اسفند کے ذہن میں ایک خیال کوندا۔ بات تو اس نے محض اسے سیدھے ملانے کی غرض سے … کی تھی مگر جب ملازم کی زبانی اسے یہ معلوم ہوا کہ وہ اجمال احمد کے گھر کا پروردہ ہے تو اس نے اس خیال کے تحت … اس کی ذات میں دلچسپی لیتے ہوئے تھوڑا سا مسکرا کر کہا۔

"اچھا اچھا گویا تم اس گھر کے پشتینی نمک خوار ہو۔" اب بات خواہ شیرا کے پلے پڑی یا نہ پڑی مگر اس نے اپنی ساری … نکال کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ اسفند کچھ دیر تک تو یہی سوچتا رہا کہ جو بات وہ پوچھنا چاہتا ہے اس کی ابتدا کیسے کرے۔ … اتنے میں چائے کی پیالی بھی خالی ہو چکی تھی۔ جس کی کچھ وجہ یہ تھی کہ شیرا نے اس کی پیالی میں فریج کا ٹھنڈا دودھ ڈالا تھا۔ جس … چائے کچھ ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ جیسے اسفند حسب عادت آہستہ آہستہ پینے کے بجائے جلد ہی پی گیا تھا۔ اس نے پیالی خالی … رکھی تو شیرا نے جلدی سے پوچھا۔

"جی ایک کپ اور بنا دوں؟" حالانکہ اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا مگر اسی بہانے شیرا کو باتوں میں الجھانے … کی غرض سے اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ شیرا نے اس پیالی کے بجائے دوسری صاف ستھری پیالی میں جلدی جلدی … اس کے لیے چائے انڈیلی اور پھر بڑے ادب سے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ میں چائے کا کپ تھما دیا۔

"یہ بنگلہ تو ابھی نیا نیا ہی بنا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں جی نوال نوال ہی بنا ہے۔ پر پہلے تے ایک مکان ہی سی۔" شیرا نے بتایا۔

"اچھا اچھا۔ تو گویا مکان کو توڑ کر یہ بنگلہ تعمیر کیا گیا ہے اور میں یہ سمجھ رہا تھا کہ پلاٹ وغیرہ پر بنایا گیا ہوگا۔" اسفند بولا۔

"نا جی۔ بلکہ رائٹ کہیا اسنے ستے چھوٹے میاں جی کے دادا کا گھر سی۔ پر ادھر آگے والے پورشن میں چھوٹے میاں جی … سے پہلے دو کمرے اور … کرائے پر چڑھائے ہوئے تھے۔ جی ڈاڈا … ویلا ہیا سی مکان کا کبجہ (قبضہ) … چھوٹے میاں جی نے عدالت میں پورے ایک سال۔ تب جا کر مکان کا کبجہ (قبضہ) ملا سی چھوٹے میاں جی … بنگلہ بنا سکے۔"

"تمہارا مطلب ہے کرایہ دار نے بھی بڑی مشکل سے گھر خالی کیا ہوگا؟" اسفند اب اصل مقصد کی طرف آتا ہوا بولا۔

"ہاں جی — وہ تو ویرا شریف … بندہ سی — بالکل بکری جیسا — اسی نے کیسا جھگڑا فساد کرنا تھا۔ اول … چھوٹے میاں جی نے ذرا دھمکا کے پہلوں ہی بھگا دیا سی۔"

"پھر تو اجمال صاحب نے برا اچھا ہی کیا کیونکہ وہ ان کا گھر بھی تو تھا۔ اور ایسے لوگوں کو گھر میں رکھنے سے انسان بہت سی مشکل … میں پڑ سکتا ہے۔ مگر کیا وہ تنہا ہی رہتا تھا۔" اسفند نے شیرا سے مزید باتیں اگلوانے کی غرض سے بڑی چالاکی سے کام لیتے ہوئے … کے بارے میں پوچھا۔

"… جی وہ … ان کے ساتھ … ایک اس کی درانی (بیوی) اسی ستے ہیک کھانے — ہاں جی وڈی شریف …

کہتا کہ مجھے اپنے اس کرائے وار سے ملوانے لے چلو تو یہ بات کسی طور بھی مناسب نہ ہوتی۔ شیراں سوچے بغیر رہتا کہ صاحب لوگوں کو آخر ایسی کیا سوجھی ہے اس انتہائی غیر واسطہ شخص سے۔ آخر بہت سوچ بچار کے بعد اسفند نے اس سمت کہا۔

”تم نے تو یہاں کا چپہ چپہ دیکھ رکھا ہوگا۔ تم ایسا کرو کہ اگر تمہارا دل چاہے تو اس آگلے سے جا کر مل آؤ۔ اتنے میں ذرا میں بھی شہر دیکھ لوں گا۔“

”ہم جی۔“ شیراں شاید اس کی پیشکش پہ ایک دم عمل درآمد کرنے پہ تیار نہیں ہوا تھا یا پھر ایسی کسی بات کا متوقع نہ تھا۔ اس قدر سے اچک کر کہا۔

”ہاں بھئی۔ اب بار بار تو تمہیں یہاں آنے کا موقع نہیں مل سکتا۔ تم اگر جانا ہو تو چلے جاؤ۔ میں تھوڑی دیر بعد تمہیں پک کر لوں گا۔ میرا مطلب ہے کار میں بٹھا لوں گا۔“ اسفند نے ایک مقام پہ سڑک کے کنارے کار روک کر کہا۔ شیراں دروازہ کھول کر اترتا ہوا بولا۔

”چنگا جی۔ وڈی مہربانی آپ کی۔ دس یا پانچ منٹ بعد اسی جگہ پہ آ جاواں گا۔“

”خیر خیر۔ تم اطمینان رکھو۔ اگر واپسی میں تمہیں پانچ کے بجائے دس منٹ بھی لگ گئے تو میں تمہارا انتظار کر لوں گا۔“ اس نے مسکرا کر کہا اور کار آگے بڑھا دی۔ آگے کچھ فاصلے پہ جا کر اس نے کار پھر روکی اور کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔

شیراں سڑک کراس کر کے مخالف سمت میں بنی ایک گلی میں داخل ہو رہا تھا۔ وہ بھی جلدی سے کار کو ریورس کر کے وہیں آیا اور جب اس نیم سی گلی کے ایک سرے پہ جا کر شیراں نظروں سے اوجھل ہو گیا تو وہ کار سے اتر کر بڑے بڑے قدم اٹھاتا اسی جانب بڑھا جدھر شیراں مڑا تھا۔ وہ بھی ایک تنگ سی گلی تھی۔ جس میں اوپر تلے بڑے بے ڈھب انداز میں کچے پکے مکانات بنے ہوئے تھے اور اسی گلی کے آخری سرے پہ بنے ایک مکان کے دروازے پہ کھڑا شیراں دستک دے رہا تھا۔ اور بس اسفند کے لیے اتنا ہی جاننا کافی تھا۔ پھوپھا کے مکان کی نشاندہی اس نے کر ہی دی تھی۔ اسی لیے وہ آہستہ سے واپس چل کر کار میں آ بیٹھا اور اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگا کہ اس وقت شیراں کی موجودگی میں پھوپھا کے ہاں جانے کا موقع ہی نہ تھا۔ تو یہ بھی اس کے لیے ایک عجیب و غریب تجربہ ہی ثابت ہوا۔ یہ نہایت غیر معقول تھی۔ کار سے اتر کر جاسوسوں کی طرح شیر محمد کے پیچھے آنے کی حرکت۔ کہ وہ تو کبھی خواب و خیال میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ ایسی کسی صورت حال کا بھی سامنا کرنا پڑے گا۔ یا پھر اتنی زندگی میں اسے اتنے پیچیدہ طریقے سے سراغ رسانی کے تجربے سے بھی گزرنا پڑے گا۔ گویا ہر بات ہی اس کے لیے نرالی اور انوکھی ثابت ہو رہی تھی۔

بہر حال شیر محمد حسب وعدہ پانچ منٹ بعد ہی واپس آ گیا اور اس کا شکریہ ادا کرتا ہوا جلدی سے کار میں بیٹھ گیا اور پھر وہ گھر چلے آئے۔ اس کا ارادہ تو یہی تھا کہ شیر محمد کو واپس کر کے وہ پھر مغل پورہ چلا جائے گا۔ لیکن اجمال احمد اس کے انتظار میں باہر ہی ٹہل رہا تھا۔ اسی لیے اسے اپنا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔

مگر اگلے روز ناشتے سے فارغ ہوتے ہی وہ جلد جلد تیار ہوا۔ اجمال کی کار کو تصرف میں لانا اسے گوارا نہ ہوا۔ یوں بھی وہ جگہ تو دیکھ آیا تھا اس لیے چپ چاپ گھر سے نکل کر باہر آ گیا۔ قریب سے گزرتی ہوئی ایک ٹیکسی روکی اور اس میں بیٹھ کر مغل پورہ کا رخ کیا اور پھر اس جگہ جہاں کار کو روک کر شیراں کو اتارا تھا ٹیکسی رکوائی اور کرایہ ادا کر کے پیادہ پا چلتا ہوا اسی لمبی سی گلی میں داخل ہو گیا۔

پھوپھا کے گھر کا رخ کرتے ہوئے اس کے ذہن میں کوئی خیال تھا تو یہی کہ اتنے اس قدر اچانک اور غیر متوقع اپنی آنکھوں کے سامنے کھڑا دیکھ کر پھوپھی اور پھوپھا کس قدر متعجب ہوں گے۔ ممکن ہے پریشان اور شرمندہ بھی ہو جائیں یا پھر میرا اچانک نزول انہیں ناگوار گزرے۔ خیر جو بھی سہی۔ لیکن کم از کم مجھے اصل واقعات کا علم تو ہو جائے گا۔

یہ تو معلوم ہو جائے گا کہ اصل حقیقت کیا ہے۔

بس وہ پھوپھا کے گھر پہنچنے تک یہی سوچتا رہا۔

پھر اس نے دروازے پہ پہنچ کر آہستہ سے دستک دی۔

مگر جب دو تین دستکوں کے بعد بھی اندر سے کوئی جواب نہ ملا تو اس نے دروازے کو بری طرح دھڑ دھڑا ڈالا۔ تب کہیں جا کر دروازے کی دوسری طرف سے پھوپھو کی لرزتی ہوئی سی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

”بھئی۔ کون ہے؟“ لہجے سے بیزاری بھی مترشح تھی اور تندی بھی۔

میں اسفند ہوں پھوپھو بیگم۔“ اس نے یوں کہا جیسے کسی کو سرپرائز دیتے وقت بہت لہک کر کہا جاتا ہے۔

”نہیں۔ سچ کہو۔“ اندر سے دروازہ کھولے بغیر ہی فاخرہ نے بے یقینی کا اظہار کرتی ہوئی بولیں۔

”سچ ہی کہہ رہا ہوں۔ بلکہ اپنے زندہ وجود میں یہاں موجود ہوں۔ مگر پہلے آپ دروازہ کھولیے تو یقین بھی دلاؤں۔“ اسفند تو بڑے انداز میں بولا اور اگلے ہی لمحے فاخرہ نے دروازہ کھول دیا اور اپنے لاڈلے بھتیجے کو اپنے جیتے جاگتے وجود میں مسکراتا ہوا اپنی نظروں کے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ شادی مرگ کی سی کیفیت میں مبتلا ہو گئیں۔

زرد رو سے چہرے پر ایک دم ہی خوشیوں کے گلال سے بکھر اٹھے۔

بے نور آنکھیں ستاروں کی مانند چمک اٹھیں اور ان آنکھوں کی جوت میں اچانک یورش کرنے والے مسرتوں کے ہجوم نے نمی پیدا کر دی۔

دل بھی بڑی مدت بعد انبساط کی لہروں کی زد میں آ کر زور زور سے دھڑکنے لگا۔ جس سے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔

سینے میں مچل مچاتے الفاظ زبان تک تو آئے لیکن لبوں سے ادا نہ ہو سکے۔

لب صرف تھرتھرا کر ہی رہ گئے۔

اور وہ جیسے تنون کی کشش نے اس سمے بڑا جذباتی سا کر دیا تھا۔ انہیں سلام کر کے مسکراتا ہوا بولا۔

”ہاں ہاں۔ اچھی طرح پہچان لیجیے۔ میں اسفند ہی ہوں پھوپھو بیگم اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں اسی سائز میں آپ سے جدا ہوا تھا جتنا کہ اس وقت ہوں۔“

تب بھی اچانک ملنے والی اتنی بڑی خوشی کو ان کی گویائی شاید سنبھال نہ سکی۔ وہ پھر بھی کچھ نہ بولیں البتہ اپنے دونوں ہاتھ وا کر دیے اور اسفند بھاگ کر ان کی بانہوں میں سما گیا۔ انہوں نے اسے اپنے سینے سے لگا کر اس کا سر چوما اور پھر اس بے طرح رو دیں کہ اسفند گھبرا اٹھا۔ گویا یہ تھا کہ یہ گریہ و زاری اچانک ملنے والی بے پایاں خوشی اور اتنی مدت تک بچھڑے رہنے کا غم۔ اور دوسرے بھی بہت سے ان کہے دکھ اور جدائیوں کی یک لخت دل پر ٹوٹ پڑنے والی یورش کے نتیجے میں تھی۔ اس کے دل میں بھی ہلکی ہلکی سی کسک جو ہی تھی اور اس کی آنکھوں کے گوشے بھی بھیگ گئے تھے۔

لیکن پھوپھو کی بگڑتی ہوئی طبیعت کو سنبھالنا بھی ضروری تھا۔

اس نے اپنے دل میں ہوتی کسک کو دبا کر بڑے جوشیلے لہجے میں کہا۔

”پھوپھو بیگم تعجب ہے۔ ورنہ میٹرولوجیکل والوں نے تو پیشن گوئی کی تھی کہ صوبہ پنجاب میں دور دور تک مطلع اس قدر صاف ہے کہ بارش تو کیا بادل ہونے کا بھی امکان نہیں ہے۔ اور ہوا میں خشکی کا تناسب اتنا زیادہ ہے کہ ندی نالوں کے خشک ہو جانے کا خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ اس کے باوجود بھی آپ موسمیاتی نظام میں گڑبڑ پیدا کرنے کے درپے نظر آ رہی ہیں۔“

یہ باتیں کہہ کر وہ یوں ہنسا جیسے خود اپنے اس مذاق سے محظوظ ہو رہا ہو۔ لیکن فاخرہ پہ اس کے پرمزاح فقروں نے الٹا ہی اثر کیا۔ وہ پہلے سے زیادہ ہی بلک اٹھیں اور اسفند کی سمجھ میں نہ آیا کہ مزید کیا کہے۔ کیا ترکیب کرے جو ان کی آنکھوں سے بہتا آنسوؤں کا سیلاب رک جائے۔ بند ہو جائے۔

”پھوپھو بیگم پلیز۔ اب اتنا بھی مت روئیں۔ آپ تو بڑی صابر اور شاکر سی ہستی ہیں۔ کیوں خواہ مخواہ بیش قیمت آنسوؤں کا خزانہ خالی کر رہی ہیں۔ آپ نے برسوں کی ریاضت کو کھونے پر تلی ہوئی ہیں۔ مجھے آپ کے دلی جذبات اور احساسات کا پورا پورا احساس ہے۔ جانتا ہوں کہ اس وقت آپ کے دل کا کیا عالم ہو رہا ہے۔ کیونکہ میرے اپنے دل کی حالت بھی کچھ ایسی ہی ہو رہی ہے لیکن دیکھیے میرے آنسوؤں کے سوتے تو بالکل خشک ہیں۔ میری ان آنکھوں میں نمی کی رمق تک نہیں ہے۔ اچھا آئیے۔ تھوڑا سا پانی پی لیجیے کہ طبیعت بحال ہو جائے۔ اور پھر کیا مجھے یہیں سے رخصت کر دینے کا ارادہ ہے جو اندر آنے کے لیے بھی نہیں کہہ رہیں۔ اگر ایسا ہی ہے تو کہہ دیجیے میں واپس چلا جاتا ہوں۔ ویسے بھی پھوپھا جان نے مجھے بہلانے کے باوجود نظریں کترا لی تھیں۔ شاید آپ کو بھی میرا آنا ناگوار گزرا ہے۔“

اسفند کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا اس لیے الٹا سیدھا جو دماغ میں آیا بولتا رہا کہ اس کی کوئی بات تو ان کی اشک انگیزی ختم کر دینے اور بند باندھنے کا سبب بن سکے۔ اور اس کا آخری فقرہ واقعی کارگر ثابت ہوا۔ سسکیوں اور ہچکیوں سے روتی ہوئی فاخرہ نے تھوڑی دیر بعد اپنے آنچل سے آنسو پونچھ کر رندھی ہوئی گلوگیر آواز میں پوچھا۔

”کو بھلا۔ تمہارا آنا مجھے ناگوار گزر سکتا ہے۔ ارے بچے کیسے! اور بیٹے میں بھی کوئی فرق ہوتا ہے۔ بس میں تو تمہیں اتنے عرصے بعد

"جی ہاں وہ تو ہے ہی لیکن پھپھو بیگم آخر یہ سب کیا ہے۔ یہ جو میں دیکھ رہا ہوں۔ آخر آپ اور پھوپھا جان ایسی گمنامی کی زندگی کیوں بسر کر رہے ہیں۔۔؟ کیوں ایسی۔۔۔ کسمپرسی کے عالم میں نظر آ رہے ہیں۔ کہ میرے دل کو دھچکا سا لگا آپ کو اس عالم میں دیکھ کر۔"

اسفند مزید اپنے تجسس پر قابو نہ پا سکا تو اس نے پوچھ لیا۔ جواب میں فاخرہ نے پاندان کھول کر صافی میں سے پان نکالنے کے بعد کہا۔

"ہاں ضرور دھچکا لگا ہو گا۔ مگر اب تو یوں سمجھو کہ سارے جسم کی سوئیاں نکل گئی ہیں اب صرف آنکھوں کی سوئیاں نکالنی باقی ہیں۔ اس کے بعد خدا نے چاہا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

"جی۔ میں سمجھا نہیں۔ پھپھو بیگم۔" ان کا محاورہ اسفند کے پلے نہ پڑا تو اس نے قدرے اچک کر پوچھا۔

"نہ ہی سمجھو تو بہتر ہے بیٹے کیونکہ جب سمجھنے کا وقت آئے گا تو خود ہی ساری باتیں سمجھ میں آ جائیں گی۔"

فاخرہ بیگم پان پر کتھا اور چونا لگاتے ہوئے ایک پژمردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولیں جبکہ اسفند کو ان کا یہ پہیلیاں بجھوانے کا انداز بالکل نہ بھایا وہ قدرے جھنک کر بولا۔

"کمال ہے پھپھو بیگم آپ نے خود ہی تو جسم اور آنکھوں کی سوئیوں کا ذکر چھیڑا اور اب خود ہی اس کی وضاحت سے گریز کر رہی ہیں لیکن آپ کی اطلاع کو اتنا بتا دوں کہ میں بھی آپ کے حالات سے کسی حد تک باخبر ہو چکا ہوں۔ بابا شرافت نے مجھے بہت کچھ بتا دیا ہے۔"

"اچھا، بابا شرافت نے تمہیں ایسا کیا بتایا ہے جبکہ میری تو ان سے کوئی گفتگو ہی نہیں ہوئی تھی ماسوا اس کے کہ ہم لوگ پاکستان سے باہر جا رہے تھے اس لیے سلوطہ کو کچھ عرصے کے لیے مجھلے ابا کے پاس کراچی بھیج رہے تھے اور بس میں نے مجھلے ابا کے نام ایک خط دے کر بھیج دیا تھا۔ بلکہ انہیں لاہور بلایا ہی اسی مقصد سے تھا کہ وہ سلوطہ کو اپنے ساتھ کراچی لے جائیں اور تم جانتے ہی ہو کہ تمہارے پھوپھا جان کسی سے بھی زیادہ بات کرنے کے عادی نہیں ہیں اور ان دنوں تو وہ کچھ نفسیاتی مریض سے ہو رہے تھے پھر بھلا بابا شرافت نے کیسے۔" وہ بات کرتے کرتے ایک دم ہی خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگیں۔

انہوں نے تقریباً سبھی کی خیریت پوچھی تھی۔ مگر اب تک اشارتاً بھی سلوطہ کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اور اسی بات پر اسے حیرت بھی ہو رہی تھی۔ اب جو اتنی دیر بعد ان کے منہ سے ایک دم ہی سلوطہ کا نام نکلا تو وہ پہلو بدل کر رہ گیا۔ پوچھنا تو بہت کچھ چاہتا تھا۔

کہ آخر اس بیگانگی اور بے ثباتی کی وجہ کیا ہے۔

اور یہ شوہر کی بہن سے جلاپے کا سبب کیا ہو سکتا ہے کہ خود اس نے بھی تو اپنی ماں کو پھپھو کے خلاف زہر اگلتے دیکھا تھا۔ مگر وہ کچھ بھی نہیں پوچھ سکا۔

بلکہ فاخرہ نے اسے موقع ہی نہیں دیا۔

کیونکہ انہوں نے اپنی سوچ سے نکل کر اس کی سوچ پر ایک زقند سی ماری۔

"اچھا اب سمجھی۔ اس کلموہے بگو نے بابا شرافت سے الٹی سیدھی لگائی ہو گی۔ ورنہ میں بھی تو کہوں کہ بابا شرافت کو کیا سوجھی۔" وہ یوں اچھل کر زور سے بولیں جیسے کسی بہت ہی گہرے راز پر سے پردہ اٹھا لیا ہو۔

"یہ بگو کون ہے پھپھو بیگم۔" اسفند نے پوچھا۔

"ارے بابا شرافت کا بھتیجا ہے نامراد۔ وہیں لاہور میں ہی رہتا تھا۔ موا کاہل الوجود ایک نمبر کا۔ بابا شرافت نے ہی خط لکھ لکھ کر اسے ہمارے گھر ملازم رکھوایا تھا۔ ورنہ سارا وقت ماں باپ کے سر پر بوجھ بنا اینڈتا ہی رہتا تھا کمبخت۔ اب ضرور اسی نے الٹی سیدھی لگائی ہو بابا شرافت سے اور انہوں نے اس میں نمک مرچ لگا کر تم لوگوں سے کیا کہا ہو۔"

فاخرہ نے اتنی دیر بعد پان کا بیڑہ منہ میں رکھتے ہوئے کہا جو اب تک وہ ہاتھ میں ہی لیے بیٹھی تھیں۔

"ویسے بابا شرافت نے تم لوگوں کو کیا بتایا ہے۔" انہوں نے پان چبانے کے بعد اسے ایک طرف کلے میں دبا کر پوچھا۔

"یہی کہ سلوطہ اپنے مالدار شوہر کو صرف اس وجہ سے چھوڑ کر بیٹھی ہیں کہ وہ بوڑھے ہیں اور شاید انہوں نے کوئی اور چکر چلا رکھا تھا جس کی وجہ سے انہیں اغوا بھی کیا گیا تھا۔" اسفند نے بتایا۔ جبکہ چکر چلانے کی بات اس نے خود [illegible]

"[illegible] توبہ توبہ۔ استغفار کہاں ہیں یہ بابا شرافت۔" فاخرہ نے کلیجہ پیٹتے ہوئے کہا۔

"[illegible] تو وہ کراچی ہی میں آئے ہوئے ہیں پھپھو بیگم۔" اسفند نے استہزائی سے انداز میں کہا۔

"[illegible] تو مجھے بھی معلوم ہے۔ لیکن کبھی مل گئے تو میں ان کی گدی سے زبان کھینچے بغیر نہ رہوں گی۔ لو بھلا اتنا بڑا اتہام [illegible] بلو تو تاعمر رہتا ہے نہ کھینچی ہو اس کی کھال تو میرا نام بھی فاخرہ نہیں۔" فاخرہ جیسے بچوں کی سی کیفیت میں آ گئیں۔

"[illegible] لیکن اس سے حاصل ہی کیا ہو گا پھپھو بیگم۔ الفاظ تو ترکش میں پڑے تیروں کی طرح ہوتے ہیں جو کمان سے نکل جائیں تو [illegible] جا سکتا ہے نہ واپس ترکش میں ہی ڈالا جا سکتا ہے۔" اسفند انتہائی سنجیدگی سے بولا۔

"[illegible] تو تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ مگر اتنی بے بنیاد باتیں کر کے کسی کو بدنام کرنا وہ بھی ایک نیک اور شریف لڑکی کو [illegible] بھی جانتے نہیں اور اب معلوم نہیں اکا وغیرہ نے بھی بابا شرافت سے کیا کہا ہو گا۔ واقعی بڑی غلطی ہو گئی سلوطہ کو [illegible] کے ساتھ کراچی بھیج کر۔ اس سے تو اچھا تھا ہم اسے اپنے ساتھ ہی لے جاتے۔" فاخرہ بیگم بیتے دنوں کی باتوں پر قائل ہو کر [illegible]

"کیا ورلڈ ٹور پہ پھپھو بیگم۔" اس نے [illegible] سے کہا۔

"ارے نہیں بیٹے۔ کیسا ورلڈ ٹور اور کس کے ورلڈ ٹور۔ وہاں تو اللہ یاد آ جاتا ہے وہ بھی بھولا ہوا تھا۔" فاخرہ بیگم بولیں۔

"اچھا تو آپ لوگ اللہ یاد کرنے گئے تھے۔" اسفند نے یوں کہا جیسے اسے یقین نہ آیا ہو۔

"ہاں۔ مگر تمہارے پھوپھا تو بیکار ہی سمجھا تھا وہاں جانا ہے۔ وہ جو کہتے ہیں نا کہ قسمت میں جو لکھا ہوتا ہے وہ ہر جگہ ساتھ آتی ہے کن دقتوں سے سفر کی صعوبتیں اٹھاتے الہ آباد پہنچے تو وہاں جا کر معلوم ہوا کہ صاحب معاملہ نے تو بڑے بیٹے کے یہاں رہائش اختیار کر لی ہے۔ لہٰذا واپسی کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں تھا کہ پاسپورٹ میں [illegible] ناکام اور نامراد لوٹ رہے تھے کہ قدرت کو خود ہی ہماری حالت زار پر رحم آ گیا۔ گھر کے پرانے ملازم نے [illegible] پریشانی بھانپ کر درانی صاحب کو تار دے دیا تھا۔ جس روز ہم واپسی کے لیے پر تول رہے تھے اسی روز درانی صاحب [illegible] آ گئے۔" اپنی روئیداد کہتے کہتے فاخرہ کو کوئی خیال آیا تو وہ اٹھتی ہوئی بولیں۔

"ارے شاید ہنڈیا لگ گئی ہے۔ میں ایک منٹ میں جا کر چولہا بجھا آؤں۔"

اتنا کہہ کر وہ اس کو متحیر سا کر کے کمرے سے باہر نکل گئیں۔ "اُف۔ یہ پھپھو بیگم تو میرے ضبط کا امتحان لینے پر تلی ہوئی ہیں۔ [illegible] گفتگو میں اتنی طوالت اس پہ چولہا بجھانا باقی رہ گیا تھا۔" اسفند نے ان کے جانے کے بعد سخت ناگواری سے سوچا۔

[illegible] وہ چولہا بجھا کر جلد ہی واپس لوٹ آئیں اور آتے ہی بولیں۔

"ہائے ہاں مجھے باورچی خانے میں جاتے جاتے خیال آیا کہ تم بھلا درانی صاحب کو کیا جانو۔"

"ظاہر ہے میں جان بھی کیسے سکتا ہوں۔" اسفند بولا۔

"ہاں ٹھیک ہی تو میں بھی کہہ رہی ہوں۔ اصل میں درانی صاحب ہی سے تو سلوطہ کا نکاح ہوا تھا یعنی سلوطہ کے شوہر ہیں۔" فاخرہ بیگم نے یہ کہہ کر گویا درانی صاحب کا اس سے تعارف کرایا۔

"مگر ان سے کیا مطلب ہے آپ کا۔ کیا میں سمجھا نہیں۔" اسفند نے یوں کہا جیسے ان کی بات کی تصحیح کرنا چاہ رہا ہو۔

"[illegible] بیٹا سمجھا ہی نہیں۔" فاخرہ بیگم نے کہا اور پھر اسے شروع سے لے کر آخر تک۔ حتیٰ کہ مسعود الحسن کا زہرہ کو طلاق دینا اور [illegible] کی حیثیت سے بپھرے ہوئے انتقام لینے کی قسم کھانا۔ اور پھر اس کے بعد کے سارے واقعات سب کچھ ہی اسفند [illegible] کر دینے کے بعد انہوں نے کہا۔

"پھر جب درانی صاحب کو یہ معلوم ہوا کہ ان کی انتقامانہ کارروائی مغالطے کی بنا پر ہوئی تھی یعنی سلوطہ کا مسعود الحسن [illegible] سے دور کا بھی تعلق نہ تھا بلکہ وہ مسعود الحسن کی چھوٹی بہن کی سوتیلی بیٹی تھی تو انہیں بہت افسوس ہوا۔ [illegible] منت کرتے رہے۔ جب ملے تھے تو بڑے آڑے ترچھے انداز میں ہی ملے تھے مگر اصل حالات سے باخبر ہونے [illegible] انہوں نے اتنی خاطر مدارات کی کہ ہم شرمندہ ہو ہو گئے۔"

دونوں ہاتھوں میں پھلوں اور گھر کی چند استعمال چیزوں کے پیکٹ تھام رکھے تھے۔ آتے ہی سب سے پہلے ان کی نظر اسفند پر پڑی۔ تو انہوں نے تیز تیز ڈگ بھر کر دونوں پیکٹ چارپائی پہ ڈالے اور وہ جو انہیں دیکھتے ہی احتراماً اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا، سے بغلگیر ہوتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"آہاہ بھئی آج یہ عید کا چاند رجب کے مہینے میں کیسے نکل آیا۔ ٹھیک ٹھاک تو ہو تم؟"

"جی۔ بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں مگر۔" وہ ان سے علیحدہ ہو کر مسکراتا ہوا بولا تو انہوں نے فوراً ہی اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"دیکھو بھئی اب شکوے شکایات کا دفتر کھول کر نہ بیٹھ جانا۔ ہم نے تمہیں اس روز روڈ کراس کرتے ہوئے بہت دور سے دیکھا ضرور تھا لیکن ہم تو کیا ہمارے تو فرشتوں کے بھی وہم و گمان میں... نہ تھا کہ تم یوں [illegible] نظر پڑ جاؤ گے۔ ہم تو یہی سمجھے کہ ہمیں کسی اور پہ تمہارا دھوکا ہوا ہے۔ ویسے بھی تم پہلے کی نسبت خاصے تنومند اور [illegible] ہو گئے ہو۔"

"جی ہاں یہی میں بھی انہیں بتا رہی تھی کہ آپ ان کو پہچان ہی نہیں سکے تھے۔" فاخرہ نے فوراً ان کی بات کی تائید میں کہا۔

"جی ہاں مجھے بھی آپ کے یوں چشم پوشی سے کام لینے پر تعجب ہی نہیں ملال بھی ہوا تھا۔ بہرحال اب تو آپ نے پہچان لیا نا۔" اسفند نے کھڑے کھڑے ہی کہا۔ ثاقب حسن بھی اب تک کھڑے تھے۔ دونوں پیکٹ پیچھے کر کے چارپائی پہ بیٹھتے ہوئے بولے۔

"جوڑوں کے درد کی وجہ سے ہمیں فرش پر بیٹھنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ تم بھی ہمارے پاس یہیں پلنگ پر بیٹھ جاؤ۔"

"جی نہیں میں یہیں ٹھیک ہوں۔" اسفند جلدی سے فرش پر بیٹھتا ہوا بولا۔ پھر ثاقب حسن بھی اسی سے سب کی خیریت پوچھنے لگے اور وہ انہیں بتاتا رہا۔

"چلو شکر ہے خدا کا کہ سب خیر و عافیت سے ہنسی خوشی زندگی گزار رہے ہیں لیکن وہ ہماری چھوٹی سی [illegible] کیسی ہیں؟ ان کے بارے میں تو تم نے کچھ بتایا ہی نہیں۔"

پھوپھا کے لہجے میں بہن کی خیریت معلوم کرنے کا اشتیاق نمایاں نہیں تھا۔ بلکہ کچھ ایسا تاثر تھا جیسے وہ طنز سا کر رہے ہوں۔ اسفند کی سٹی ایک مرتبہ پھر گم ہو گئی۔

"وہ پھوپھو بیگم نے بھی کچھ ایسا ہی سوال کیا تھا اور میں بتانا ہی چاہ رہا تھا کہ دفعتاً آپ آ گئے۔" اس نے ایک بار پھر [illegible] نگلتے ہوئے کہا۔

"لو بھلا اتنی باتیں کر رہے ہو اور اصل بات بتا کر ہی نہیں دے رہے تمہارے اندر سے ابھی بچپنا نہیں گیا۔" فاخرہ مسکرا کر بولیں۔ ثاقب اس کی شکل غور سے دیکھ رہے تھے۔ اسے آخر اصل بات بتانی ہی پڑی۔

"ویسے اب تک وہ ہمارے یہاں بڑے آرام سے رہیں لیکن۔ میرے کراچی چھوڑنے سے چار پانچ روز قبل ہی کسی کو بتائے بغیر گھر سے چلی گئی تھیں۔ اب بھلا بتایئے۔"

"ہائیں یہ کیا کہہ رہے ہو، کہیں مذاق تو نہیں کر رہے۔ لو بھلا سوچنے کی بات ہے وہ بے چاری تنہا کسی کو بتائے بغیر کہیں جا سکتی ہے؟"

"ارے یہ آپ کو کیا بتائیں گے ہم بتاتے ہیں۔" ثاقب حسن نے نہایت ناگوارانہ سے لہجے میں اپنی کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہائیں آپ بتائیں گے۔ میں سمجھی نہیں۔" فاخرہ نے تیوری پر بل ڈال کر پوچھا۔

"ہاں ہم ہی بتائیں گے۔ یہ بھی ایک اتفاق ہی تھا یا ہماری خوش بختی جو قدرت نے خود بخود ہمیں تمام حقیقت سے آگاہ کر دیا۔" ثاقب حسن نے جیب سے ڈاک کا ایک لفافہ نکالتے ہوئے کہا۔

پھوپھا نے جیب میں ہاتھ ڈال کر لفافہ نکالتے ہوئے جو طرز تخاطب اختیار کیا تھا اس نے اس کے تجسس اور تعجب کو انتہا تک پہنچا رکھا تھا۔

پھوپھا کی خصلت اور طرز تکلم میں وہ جو ایک زبردست تبدیلی دیکھ رہا تھا وہ اس کے لیے نہایت غیر متوقع ہی نہیں بلکہ [illegible] خیز بھی تھی۔ کہ کہاں وہ اصل کھرے اور کم گو سے انسان جو بات کرتے میں کچھ ایسے تحمل سے کام لیتے تھے جیسے انہیں اپنے الفاظ کو [illegible] ختم ہو جانے کا خدشہ لاحق ہو۔

اور بات بھی کرتے تھے تو ایسے دھیمے انداز میں کہ مخاطب کے حلق کے نیچے تک ذیبت ہی ریت بھر جاتی تھی۔ اس پہ تنہائی [illegible] اور بیگانہ سا لہجہ۔

مگر آج تو وہ بالکل ہی نئے انداز میں۔ دوسرے معنوں میں بڑے تپاک سے ملے تھے۔ بڑی یگانگت کا اظہار کرتے ہوئے فرداً فرداً سب کی خیریت پوچھی تھی۔ گویا گفتگو کرنے میں بڑی دریا دلی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اب اسے سلوطہ کے ذکر سے پہلو بچاتے دیکھ کر۔ اس پہ طنز بھی کر بیٹھے تھے۔

اور اس کے اس کی تمام تر توجہ ان کی طرف ہی تھی۔ کیا پھوپھا کو سلوطہ کی گمشدگی کی اطلاع مل چکی ہے؟ اگر مل چکی ہے تو پھر انہیں اس کے گھر چھوڑ کر چلے جانے کی وجوہات بھی معلوم ہو گئی ہوں گی۔ بلکہ یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ سلوطہ کو کس لیے گھر سے نکل جانے پر مجبور کیا تھا اف یہ تو کچھ اچھی بات نہیں ہو گی۔

چہرے پہ سراسیمگی کا تاثر لیے اس نے لمحے کی چوتھائی میں سوچا۔

اس اثنا میں ثاقب حسن لفافے میں سے خط نکال چکے تھے۔

"ہوں تو بیگم اس خط کا ہم تک پہنچ جانا بھی کسی معجزے سے کم نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ہمارے پرانے پتے پر بھیجا گیا تھا۔ وہ تو بہت غنیمت ہوا کہ شبیر محمد نے دوسری ڈاک کے ساتھ یہ خط بھی وصول کر لیا تھا۔ پڑھا لکھا بھی نہیں ہے پھر بھی معلوم کیسے سمجھ گیا کہ یہ خط ہمارے نام آیا ہے۔" پھوپھا نے خط کھولتے ہوئے کہا۔

فاخرہ ان کی باتوں سے زچ سی ہو کر بولیں۔

"افوہ آپ خواہ مخواہ ہی بات کو اتنا طول کیوں دے رہے ہیں۔ آخر یہ کس کا خط ہے اور آپ پڑھ کر کیوں نہیں سناتے؟"

"ذرا تھمو صبر۔ خط پڑھ کر سنانے کی غرض سے ہی نکالا ہے۔" انہوں نے ترش سے لہجے میں کہا اور پھر خط کی عبارت پر نظریں [illegible] کر دیں اور پھر چند لمحے توقف کے بعد انہوں نے پڑھنا شروع کیا۔

قبلہ بھائی اور بھابی جان۔ آداب

میں چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر وہ ٹھکانہ چھوڑنے پہ مجبور ہو گئی ہوں جس کا انتخاب آپ نے اپنی مرضی اور حکم سے کیا تھا لیکن فکر کی کوئی بات نہیں میں اس وقت جہاں رہ رہی ہوں وہاں۔ مجھے پورا پورا تحفظ مل رہا ہے صرف اس خیال سے کہ میری اچانک گمشدگی آپ کی پریشانیوں میں اضافے کا باعث نہ بنے یہ چند سطور اطلاعاً رقم کر رہی ہوں۔ خدا کرے میرا یہ خط آپ تک بحفاظت پہنچ جائے۔ ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کر اندھیرے میں چھوڑے ہوئے تیر کی طرح یہ غلط ہاتھوں میں پہنچ جائے۔ بس خدا کے بھروسے پر ہی ارسال کر رہی ہوں

باقی۔ والسلام۔

جب وہ خط پڑھ رہے تھے۔ فاخرہ اٹھ کر ان کے پاس ہی آ کھڑی ہوئی تھیں۔

انہوں نے خط ختم کیا تو ایک گہرا سانس لے کر بولیں۔

"بیچاری سلوطہ نے تو اپنا نام بھی نہیں لکھا کہ شاید پریشانی میں بے چاری بھول گئی ہو گی۔ آہ مظلوم بچی۔"

"خیر مظلوم تو کیا ہمارے ہاتھوں ستائی ہوئی ہے اور اگر نام نہیں لکھا تو فرق کیا پڑ گیا۔ اس کی تو تحریر ہی سے ہم نے پہچان لیا ہے۔" ثاقب حسن پژمردگی سے بولے۔

"ہائے بے چاری بچی نہ معلوم کس کے در پہ پڑی ہو گی اور کن حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہو گا اسے۔ اس کے پاس تو [illegible] بھی نہ ہو گی۔ بالکل ہی خالی ہاتھ گئی تھی تمہارے گھر سے۔" فاخرہ بیگم نے بڑے حزینہ انداز میں بات کرتے کرتے اسفند کو مخاطب کر کے پوچھا۔ تو وہ جو جز بز سا بنا بیٹھا تھا دبی زبان سے بولا۔

کوئی ہچکی بھی نہ سسکی۔

مگر بند آنکھوں سے نکلتے اشکوں کے موتی ان کے چہرے کو بھگو رہے تھے۔

انہوں نے اپنی بات کہتے کہتے رُک کر زور سے اپنا نچلا ہونٹ کاٹا۔

میاں کو روتے دیکھ کر فاخرہ بیگم کا بھی دل بھر آیا۔ اور اُن کی آنکھوں میں نمی سی تیرنے لگی تھی لیکن اس کے ساتھ پرانی زیادتیوں کے احساس نے انہیں ندامت اور پچھتاوے کی کیفیت میں مبتلا کر رکھا تھا اسی لیے بالکل خاموش تھیں۔ اور اسفند وہ تو کچھ ایسی گم صم سی کیفیت میں بیٹھا تھا جیسے اسے اردگرد کا ہوش ہی نہ ہو۔

"مگر۔ ہم اس معاملے میں کسی کو قصوروار نہیں ٹھہرا سکتے۔ کیونکہ یہ ہمارے اپنے اعمالوں کی سزا ہے جو ہمیں مل رہی ہے۔ یہاں دنیا کے قانون کا تو کوئی بھروسا ہی نہیں۔ خریدا بھی جا سکتا ہے مگر قدرت کا قانون اٹل ہوتا ہے اور ہم اس کے قانون کی گرفت میں آئے ہوئے ہیں۔" ثاقب حسن نے اتنا کہہ کر پھر تھوڑا سا توقف کیا اور بولے۔

"لیکن ہم نے جو کچھ کیا تھا آپ کی محبت میں کیا تھا آپ کی وجہ سے کیا تھا۔ مگر خدا ہمیں معاف کرے بہت بڑا ظلم کیا۔ بلکہ ایک طرح خود پر ہی ظلم کیا تھا۔ کیونکہ جو دوسروں پہ ظلم کرتے ہیں۔ آخرت تو دور کی بات ہے دنیا میں ہی وہ ظلم پہ ہی لوٹ آتا ہے۔ اور یہ ظلم کا فلسفہ قرآن اور سنت کی روشنی میں تو بہت ادق اور بہت ہی مفصل ہے۔"

ثاقب حسن اتنا کہہ کر خاموش سے ہو گئے۔ تو فاخرہ نے بےچینی سے پہلو بدل کر پوچھا۔

"آخر آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں۔ کیسا ظلم اور کس کا ظلم۔ کیا آپ کا مقصد ورانی سے سلوط کو بیاہ دینا ہے؟"

"نہیں۔ یہ بالکل ہی دوسرا معاملہ ہے۔ بہر حال ہم یہ بھی بتائے دیتے ہیں تاکہ دل پر عرصے سے پڑا بوجھ ہلکا ہو جائے۔" ثاقب حسن بولے تو اسفند بھی ہمہ تن گوش ہو گیا۔

"آپ کو معلوم نہیں فاخرہ ہم نے وردہ کے کس مجبور کو بیاہ کر یا مجبور کیا ہے بے چارگی اور بے بسی کی کن کن منزلوں سے گزارے ہیں اور ہم نے تو کتنی جانوں پر نہیں واقعی خود پر بڑا ظلم کیا ہے۔"

شدتِ غم سے شاید ثاقب حسن کی آواز ترشح سی گئی تھی اسی لیے وہ پھر خاموش ہو گئے۔ فاخرہ خود بھی ندامت اور کشمکش کی اذیت میں مبتلا تھیں اسی لیے انہوں نے اپنے لب بھی سی لیے تھے اور اسفند بھی سناٹوں کی زد میں آیا ساکت سا بیٹھا تھا۔

"آپ کو یاد ہو گا جب طبی رپورٹ کے مطابق آپ اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم قرار دے دی گئی تھیں تو آپ پر بڑا ملال اور مایوسی کا سا اثر دیکھ کر ہم نے آپ کو مشورہ دیا تھا کہ آپ کسی دوسرے کے بچے کو متبنیٰ کر لیں لیکن آپ نے بڑی سختی سے انکار کر دیا تھا یہ کہہ کر کہ پرائی اولاد پر خواہ آپ کتنی ہی جان ماریں گے وہ کبھی اپنی نہیں ہو گی۔ اور پرائی اولاد کو دینے کے باوجود آپ کی تمنا کبھی تسکین نہیں پا سکے گی۔ جبکہ اولاد کی خواہش ہماری کمزوری بن گئی تھی۔ بلکہ ہم اولاد کی خواہش میں پاگل ہو رہے تھے جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہمارے خاندان میں پوتے کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ یعنی اگر خاندانی نرینہ اولاد ہوتی تو ہم بابا جانی کی نصف جائیداد کے وارث قرار دیے جاتے۔" وہ بات کرتے کرتے پھر خاموش ہو گئے۔

"مگر آپ کے والد کے پاس اتنی جائیداد تھی ہی کہاں۔ وہ تو سنا تھا کہ اپنا سب کچھ عیاشی میں ختم کر چکے تھے۔" فاخرہ جتنا جتا سکیں۔

"نہیں نہیں آپ بہت غلط لفظ استعمال کر رہی ہیں آپ۔ شاید یہ بھول گئی ہیں کہ وہ ہمارے والد تھے اور ان کے احترام کا اطلاق آپ پر بھی ہوتا ہے۔" ثاقب حسن نے فوراً ہی انہیں ٹوکا۔

"ہاں ہاں ہوتا تو ہے لیکن جو سنا تھا وہی کہہ دیا۔" فاخرہ نے بُرا مان جانے کے خیال سے فوراً ہی کہا۔

"ہاں اس کے باوجود بھی بابا جان کے پاس بہت کچھ تھا۔ وہ جو کہتے ہیں ناکہ مرا ہاتھی بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے تو یہ مثل ان پہ بھی صادق آتی تھی۔ بہرکیف بابا جان کی پہلی بیوی سے بڑے بھیا اور باجی اماں تھیں۔ دوسری بیوی سے ہم اور تیسری بیوی سے مسعود الحسن تعلقہ دار کی چھوٹی بہن تھیں صرف چار لڑکیاں ہی تھیں۔ بڑے بھیا کی بھی پہلوٹھی کی لڑکی ہی تھی مگر اس سے چھوٹا ایک لڑکا بھی تھا۔ اسی لیے بابا جان کی وراثت میں ان کی پوزیشن بڑی مستحکم ہو گئی تھی ان کے مقابلے میں ہمارے ہاں اولاد ہی نہیں ہو رہی تھی ———— ادھر ہماری ایک مجبوری یہ بھی تھی کہ ہم پاکستان ہجرت کر چکے تھے۔ اور ادھر بابا جان ہم پہ جان چھڑکتے تھے۔ اس پہ مستزاد بڑے بھیا ان کی زندگی میں ہی

ناکہ وہ تاحیات ہو چکے تھے۔ اور شروع سے ہی ان کا رویہ کچھ خود سرانہ سا تھا یعنی وہ اپنی من مانی کرنے کے عادی تھے۔ اور اسی وجہ سے بابا جان ان سے خوش نہیں رہتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ ہم ان کی زندگی میں ہی دوسرا نکاح کر لیں۔ جبکہ آپ پر سوکن لانا اور ان کے بطن سے بچہ پیدا کرا کے آپ کے محرومی کے احساس میں اضافہ کرنا ہمیں کسی قیمت پر بھی گوارا نہ تھا۔ اسی لیے ہم ٹالا کرتے رہے۔ مگر ادھر سے تقاضے اتنے بڑھے کہ بابا جان ہی کیا چچا، پھپھیاں، دوست احباب بھی مصر ہو گئے کہ بس دو حرف خط بھیج پٹ تیسری شادی رچالو۔"

بات کرتے کرتے گلا خشک ہو گیا تھا شاید جسے کھنکار کر صاف کرنے کی غرض سے ثاقب حسن نے رُک کر تھوڑا سا توقف کیا۔ پھر انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ بات کرتے کرتے خاموش ہو جانا اس کے فاخرہ کو کس قدر کھل رہا ہے جو بار بار بےچینی سے پہلو بدل رہی تھیں۔ اس کے انہیں یہ احساس بھی نہیں رہا تھا کہ اسفند بھی اس وقت یہیں موجود ہے۔

"ہم تو اس وقت بھی راضی نہ تھے اور سب کو لولی پاپ تھما کر لاہور چلے آئے تھے۔ مگر۔ قدرت کے کھیل نرالے ہوتے ہیں اور بابا جان یوں تو کافی عرصے سے علیل تھے کہ ضعیفی بذات خود ایک عارضہ ہی ہوتی ہے۔ کہ ایک دم ہی ان پر ہمارے خاندانی مرض دمے نے غلبہ کر دیا اور اس کے ساتھ ان پر ڈبل نمونیے کا حملہ ہوا۔ وہ تو زندگی باقی تھی جو بروقت علاج معالجے سے تو مرض پر قابو پا لیا گیا۔ مگر اس علالت کی وجہ سے وہ صاحب فراش ہو گئے۔ ہم تو ان کی علالت کا سن کر ہی روانہ ہو گئے تھے۔ وہاں پہنچے تو بابا جان کا پھر وہی تقاضا تھا کہ فوراً شادی رچالو۔ یہ ہماری آخری خواہش ہے اور اس کے لیے ایک شریف خاندان کی لڑکی بھی دیکھ رکھی ہے۔ چنانچہ ہم ان کی آخری خواہش کا احترام کرنے پر بالآخر مجبور ہو گئے۔ اور ایک روز نہایت سادگی سے ہمارا نکاح پیر صاحب کی نواسی فخر النساء سے ہو گیا جو مسعود الحسن تعلقہ دار کے ننھیالی عزیزوں میں سے ہوتی تھیں۔

فخر النساء خوب رو تو بہت تھیں مگر یتیم اور نادار تھیں۔ واجبی سی تعلیم حاصل کی تھی انہوں نے لیکن بڑی سمجھدار اور سلیقہ شعار تھیں۔ اور سب سے بڑھ کر خاصی بڑی عمر کی تھیں کیونکہ غربت کی وجہ سے ان پر کوئی معقول پیغام ہی نہیں آیا تھا۔ یہ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ کسی لحاظ سے بھی گری پڑی نہیں تھیں۔ مگر ہم ان کے ساتھ زیادہ وقت نہیں گزار سکے تھے کیونکہ ہمارا ایک پیر کانپور میں اور ایک لاہور میں ہوتا تھا۔

تین سال میں دو تین پھیرے لگا آتے تھے۔ وہ بھی چند روز کے لیے۔ اور وہ ہماری صورت ہی تکتی رہ جاتی تھیں۔ کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لاتی تھیں نہ ہم نے کبھی انہیں یہ بتایا تھا کہ ہم کب تک رہیں گے کب واپس جائیں گے اور کب لوٹیں گے اور نہ انہوں نے کبھی پوچھا تھا۔ حتیٰ کہ جب وہ حاملہ ہوئیں اس وقت بھی نہیں۔ اصل میں اس وقت تو ہماری حالت کچھ ایسی تھی جیسے سرکش موجوں میں گھرے قریب ہی نظروں کے سامنے پھیلے ساحل کو پرامید نظروں سے دیکھ رہے ہوں کہ شاید کوئی ابھرتی ہوئی لہر ہمیں ساحل تک بہا کر لے جائے۔ کہ ہمیں تو صرف اور صرف بیٹے کی تمنا تھی۔ اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہو رہا تھا ہمیں اس سے کوئی غرض نہ ہوتی۔

دوسرے معنوں میں ہم نے ساری خواہشوں اور تمناؤں کو داؤں پر لگا رکھا تھا لیکن قدرت کی ستم ظریفی کہہ لیں یا قسمت کا انکار کہ تمنا اس امیدوں کے بعد اولاد بھی ہوئی تو ایک لڑکی کی صورت میں۔" ثاقب حسن ایک تسلسل سے بولتے بولتے شاید تھک گئے تھے اسی لیے خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگے۔

"یعنی سلوط؟" فاخرہ سے بولے بغیر نہ رہا گیا تو انہوں نے یہی کہہ دیا۔

"ہاں سلوط ہی۔" ثاقب حسن نے تھکے تھکے سے لہجے میں کہا۔

"لیکن سلوط تو زاہدہ تو نہیں تھی جب آپ اسے میرے پاس لائے تھے۔" فاخرہ نے کہا۔

"زاہدہ صرف ڈھائی سال کی تھی۔ مگر خدا ہمیں معاف کرے ہم نے لڑکی پیدا کرنے کی پاداش میں فخر النساء کو طلاق دے دی۔ بڑی مشکل سے ہم نے بیٹے سے جدا ہونے بیٹی کو ان کے پہلو میں پڑا دیکھ کر فوراً ہی اٹھا لیا اور اسے اپنی پھوپھی زاد عفت آرا کی تحویل میں دے دیا۔ فخر النساء زار و قطار روتی ہی رہ گئیں۔ ہم نے سلوط کو انہیں سونپا کیونکہ انہیں کہا بابا جان کا ڈر تھا سر پر تھا اس لیے ہم —— فوری طور پر طلاق نہیں دے سکتے تھے لیکن بابا جان کی آنکھ بند ہوتے ہی۔ ان کے چالیسویں کے بعد ہم نے انہیں طلاق دے دی۔

اور سلوطا کو لے کر یہاں چلے آئے۔"

انہوں نے بات کرتے کرتے ایک سرد آہ بھری اور پھر گویا ہوئے۔

"قدرت نے مرد کو عورت پر قوام بنا کر اس لیے برتری دی ہے کہ وہ اسے پورا پورا تحفظ دے۔ اس کی ضروریات کا خیال رکھے، اس کے احساسات اور خواہشات کا احترام کرے کہ وہ مرد کے مقابلے میں ایک کمزور اور نازک سی شے ہوتی ہے۔ اس لیے نہیں کہ اس پر جبر و ظلم کی انتہا کر دے۔ شوہر ہو تو اسے محکوم اور زر خرید سمجھے۔ اس کے حقوق پامال کرے۔ اس کے احساسات و خواہشات کا گلا گھونٹ دے اور اپنا سب سے بڑا ہتھیار یعنی طلاق کا لفظ بار بار اس پر آزمائے۔ بلکہ قصور بے قصور محض اپنی حاکمیت کے زعم میں اسے سرے سے طلاق ہی دے دے۔ جیسے کہ ہم نے دی تھی سائرہ کو۔ وہ نیک بخت جو کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لائی تھی۔ ہمارے ارادوں سے آگاہ ہو کر تصور سے کانپور تک کا سفر تنہا طے کر کے ہمارے پاس آئی تھی

کس قدر روئی اور گڑگڑائی تھی وہ۔ حتیٰ کہ ہمارے قدموں میں سر بھی رکھ دیا کہ مجھے طلاق نہ دیں۔ اگر آپ میری رفاقت برداشت نہیں کر سکتے تو آپ کو اختیار ہے آپ پھر کبھی میری شکل نہ دیکھیں۔ جہاں چاہیں رہیں۔ میری بیٹی کو بھی اپنے سائے سے دور رکھیں مگر مجھے طلاق نہ دیں۔ میں اپنی بیٹی کی قسم کھاتی ہوں کہ کبھی آپ سے کوئی تعلق رکھوں گی نہ توقع۔ بس آپ کے نام پر ہی بیٹھے بیٹھے زندگی گزار دوں گی۔ دیکھیں میرے سر پر میرے باپ کا سایہ نہیں ہے۔ بہنیں ہیں تو وہ پردیس میں ہیں اور بھائی اور بھاوج رہ گئے ہیں۔ مجھ طلاق یافتہ کو اپنے گھر میں قدم بھی نہیں — رکھنے نہیں دیں گے۔ وہ روتی رہی اور تڑپ تڑپ کر کہتی رہی۔

مگر ہمارے کان تو بہرے ہو گئے تھے اور دل پتھر اور ہمارے ہاتھ میں آئی جیسے ساری خدائی تھی کہ ہم اس کے شوہر تھے۔ ہمیں تو اس کی باتوں نے کچھ زیادہ ہی بھڑکا دیا اور ہم نے مشتعل ہو کر وہیں کھڑے کھڑے اسے طلاق دے دی۔"

گلا رندھ جانے کی وجہ سے ان کی آواز نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ تیزی سے امڈتے ہوئے اشکوں کو سختی سے روکنے کے باوجود اشکوں کی چند لڑیاں ان کی پلکوں سے پھسل کر ان کے دامن پر آ گریں۔

"لیکن لیکن آپ نے ایسا کیوں کیا۔ یہ اتنا بڑا ظلم ہے کہ میں تو کبھی بھول کر بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ" فاخرہ کے دل میں سوت کی ہمدردی ایک دم ہی ابل پڑی تو انہوں نے ملامت آمیز لہجے میں کہنا چاہا۔ مگر ثاقب حسن نے انہیں فقرہ پورا کرنے کی مہلت نہیں دی۔

"ارے ظلم کیا تھا تو اس کی سزا بھی تو بھگتی ہے۔ اور بھلا ایک ظلم کیا تھا ہم نے۔ سب سے پہلے تو خدا کی ناشکری کے مرتکب ہوئے تھے۔ کہ لڑکی ہی سہی خدا نے ہمیں اولاد سے تو نوازا تھا۔ اور ناشکروں کو قدرت معاف نہیں کرتی۔ اس پر ہم نے دوسرا ظلم یہ بھی توڑا کہ انہیں طلاق دے کر اور تڑپ تڑپ کر مرنے کے لیے مجبور کر دیا۔ اور اس سے بڑا ظلم یہ کہ خود اپنے جگر گوشے کو بھی محبت اور التفات نہ دے سکے۔ اور خود اپنے ہاتھوں اس کی زندگی تباہ کر دی۔ بلکہ اسے اپنے ہاتھوں سے کھو ہی دیا۔ اب ہمیں معلوم ہے قدرت ہمیں اس کی اتنی بڑی سزا دے گی کہ ہم اسے کبھی دیکھ نہ سکیں گے۔" اتنا کہہ کر ثاقب حسن پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

فاخرہ بھی خود پر قابو نہ رکھ سکیں اور اس گریہ زاری میں ان کا ساتھ دینے لگیں۔

"ارے آپ کیوں رو رہی ہیں۔ آپ کی خاطر ہی تو ہم نے یہ سب کچھ کیا تھا کہ اولاد کی نعمت سے محروم ہونے کے باوجود آپ دنیا میں ہمیں سب سے زیادہ عزیز تھیں۔ آپ نے تو اچھے برے وقت میں کتنا ہمارا ساتھ نبھایا۔ آپ نے سلوطا کو بھی قبول کر کے ہم پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔ آپ تو ہماری محسن اور مربی ہیں۔" ثاقب حسن بیوی کو روتا دیکھ کر بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔

"نہیں نہیں خدارا آپ مجھے یوں تو شرمندہ نہ کریں۔ لفظوں کی مار نہیں دیجیے ثاقب۔ میں تو پہلے ہی پچھتاوے کی آگ میں جلتی جا رہی ہوں۔ کس قدر شرمندگی محسوس کر رہی ہوں اپنی کوتاہیوں پر۔ میرا دل تو اس بچی کے اکیلے پن پر خود ہی ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہے۔ میرے رویے نے تو ممتا کے جذبے کو بھی شرمسار کر کے رکھ دیا ہے۔ ارے ہر عورت کا دل ممتا کے جذبے سے لبریز ہوتا ہے اور میرے دل میں تو یہ جذبہ ٹھاٹھیں مارتا تھا لیکن میں نے محض شک اور غلط فہمی کی بنا پر اس جذبے کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ ہم تو آپ کے قصوروار اور خطاکار ہیں۔ ہم تو منہ دکھانے کے بھی نہیں رہے۔" اتنا کہہ کر فاخرہ ہچکیوں اور سسکیوں سے رونے لگیں۔

"آپ نے اس غریب سے ہمارا انتقام لیا اور قدرت نے ہمارے ظلم اور زیادتیوں کی ایسی سزا دی کہ ہماری بیٹیا کو ہی ہم سے چھین لیا۔ اب ہم شاید کبھی اسے دیکھ نہ سکیں۔ آپ کو کیا معلوم فاخرہ بیگم ہمارا سینہ غم سے پھٹا جا رہا ہے۔ ہم جانکنی کی سی کیفیت میں مبتلا ہیں۔ ہائے آج تو ہم بالکل ہی بے یار ہو گئے۔" ثاقب حسن پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے تو اسفند نے اٹھ کر ان کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"دل کو سنبھالیے پھوپھا جان آپ کی تسلی کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ سلوطا کا خط تو آپ تک پہنچ گیا۔ خدا نے چاہا تو وہ بھی کبھی نہ کبھی آپ کو مل جائیں گی۔ بلکہ میں ان کو ڈھونڈ کر لاؤں گا۔ ملک کا چپہ چپہ چھان ماروں گا ان کے لیے۔ یوں بھی پھوپھا جان ڈھونڈنے سے جب خدا مل جاتا ہے تو وہ تو انسان ہیں۔ آپ اس قدر مایوس نہ ہوں۔"

"ہاں ہاں بیٹا خدا تمہیں عمر دے۔ تم یہ بے لوث فریضہ انجام دو گے تو خدا تم کو اس کا بہترین اجر دے گا۔ ہماری تو ہمت ہی نہیں، ہوش گم ہوئے ہیں۔ ہم میں اتنی طاقت کہاں کہ اسے تلاش کرتے پھریں۔" فاخرہ بیگم خوش ہو کر بولیں۔

"ارے پھوپھو بیگم۔ آپ اس طرح ممنونیت کا اظہار کر کے مجھے شرمندہ نہ کریں۔ کیونکہ سلوطا کی تلاش میں میری اپنی غرض بھی شامل ہو گی۔ اس لیے کہ میں بہت پہلے ہی انہیں اپنے لائف پارٹنر کی حیثیت سے سلیکٹ کر چکا ہوں۔ اور اصل میں میرے [illegible] کی وجہ سے وہ گھر چھوڑنے پر مجبور ہوئی تھیں۔" اسفند نے بڑی صداقت سے اصل بات بتا دی۔

"ہائیں۔ یہ میں کیا سن رہا ہوں اسفند بیٹے۔" ثاقب حسن زوردار دھماکا ہونے کی طرح اچھل پڑے۔

"ارے سنیے تو کیا میں تو ان کی غیر متوقع آمد سے ہی کھٹک گئی تھی کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے۔" فاخرہ نے آنسو پونچھتے ہوئے [illegible] آواز میں کہا۔ مگر اسفند نے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے ثاقب حسن کو مخاطب کر کے پوچھا۔

"پھوپھا جان کیا میں سلوطا کا خط دیکھ سکتا ہوں؟"

"ہاں کیوں نہیں۔ لو ضرور دیکھو کیونکہ اب تم نے اقبال جرم کر کے اسے تلاش کرنے کا وعدہ بھی کر لیا ہے تو پھر

شکوے شکایت اور خفگی کی گنجائش ہی کہاں باقی رہ جاتی ہے۔"

ثاقب حسن نے جیب سے لفافہ نکال کر اسے تھماتے ہوئے قدرے بشاش لہجے میں کہا۔ اسفند نے ان کے ہاتھ سے لفافہ لے کر اندر سے خط نکال کر پڑھنے کے بجائے صرف لفافے کو غور سے الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر وہ الفاظ انہیں واپس دیتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہے آپ اطمینان رکھیں پھوپھا جان ان شاء اللہ میں جلد ہی انہیں ڈھونڈ نکالوں گا لیکن صرف ایک شرط پر کہ انہیں اپنی تحویل میں لینے کے بعد آپ ان کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھما دیں گے۔"

"ہاں ہاں بالکل۔ اس طرف سے تو تم اطمینان رکھو۔ ہم تمہاری یہ شرط دل و جان سے پوری کریں گے ان شاء اللہ۔"

ثاقب حسن نے اسے اطمینان دلاتے ہوئے مگن سے لہجے میں کہا۔ پھر تھوڑی دیر مزید ان کے پاس بیٹھ کر وہ [illegible] سے جلد ہی آنے کا وعدہ کر کے اپنی عارضی اقامت گاہ پر چلا آیا۔

سڑک تو پکی اور دور تک ہی تھی جس پر وہ نئے ماڈل کی لینڈ روور برق رفتاری سے اڑائے لیے جا رہا تھا۔ اب یہ الگ بات تھی کہ گزشتہ دو تین یوم سے مسلسل بارش ہونے کی وجہ سے سڑک چکنی اور پھسلواں ہو گئی تھی اور سڑک کے دونوں اطراف میں بنی کچی فٹ پاتھ تو بارش کے جمع شدہ پانی کی وجہ سے کیچڑ دلدل کا نقشہ ہی پیش کر رہی تھی۔

لیکن وہ بے خوف و خطر بڑی بے پروائی اور بے احتیاطی سے اپنے خیالات کی پرواز سے کہیں زیادہ اونچی اڑان سے گاڑی کو بھگائے لیے جا رہا تھا۔ اس کا رخ سرگودھا شہر کی طرف تھا۔

جہاں پہنچنے کی اسے ایسی جلدی تھی نہ ایسی کوئی ایمرجنسی پیش آگئی تھی جو گھڑی کی چوتھائی میں سارے فاصلے پھلانگ جاتا۔ البتہ اسے پہلی بار سرگودھا آنے کا اتفاق ہوا تھا اور وہ شام پڑنے سے قبل ہی اپنی منزل پر پہنچنا چاہتا تھا جبکہ ابھی تو سہ پہر ہی ڈھل رہی تھی۔

آسمان کی نیلی ردا کو سرمئی بادلوں کی ہلکی سی تہہ نے ضرور ڈھانپ رکھا تھا مگر مغربی افق پر سمت جلنے والی دھوپ نے آکاش کی وسعتوں میں دور تک ایک شنگرفی اجالا سا پھیلا رکھا تھا۔

جو یہ تصور کر لیا جاتا کہ اسے شام کا دھندلکا پھیل جانے کی وجہ سے کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ جب کہ اس کے گاڑی چلانے کا انداز کچھ یہی ظاہر کر رہا تھا کہ یا تو اسے کچھ نظر نہیں آ رہا یا وہ آنکھیں بند کر کے گاڑی چلا رہا ہے۔

یا پھر اپنے ہوش میں نہیں ہے۔

اور حقیقت بھی کچھ یہی تھی۔

وہ واقعی اس سے کہیں اور پہنچا ہوا تھا۔

اس کے خیالات بھٹکے ہوئے تھے۔

اور بھٹکے ہوئے خیالات کے تانے بانے میں اس کا ذہن بری طرح الجھ کر رہ گیا تھا۔

ذہنی الجھاؤ کی یہ کیفیت اب سے نہیں بلکہ اس وقت سے تھی، جب ایک ہفتے قبل وہ پھوپھا سے بڑے دعوے سے یہ کہہ کر بلکہ ان دونوں میاں بیوی کو یہ اطمینان دلا کر آیا تھا کہ انہیں پریشان یا ہراساں ہونے کی مطلق ضرورت نہیں چونکہ سلوطا کو بے ٹھکانے کرنے کا ذمہ دار وہ خود ہی ہے، اس لیے وہ نہ صرف سلوطا کو کھوج نکالے گا بلکہ سیدھا ان دونوں کے پاس پہنچا کر ہی دم لے گا۔

لیکن۔ اپنی رہائش گاہ پر واپس آنے کے بعد لاہور سے کوچ کر جانا تو کجا اس نے گھر سے باہر بھی قدم نہیں نکالا تھا۔

کہاں یہ عالم تھا کہ وہ لاہور سے جانے کے لیے رسیاں تڑا رہا تھا۔

دل پر ایک وحشت سی طاری رہتی تھی اور اجمال کے گھر میں اسے ایک منٹ رکنا بھی گوارا نہ ہو رہا تھا۔

اور کہاں یہ عالم کہ پورا ایک ہفتہ گزر گیا تھا۔

اور اس ایک ہفتے کے عرصے میں اتنی توفیق بھی نہیں ہوئی تھی کہ ایک بار ہی سہی۔ پھوپھی پھوپھا سے مل کر آ جاتا۔

احاطے میں تو پھوپھو کی زبانی سلوطا کا سارا احوال سن کر وہ سخت دل برداشتہ ہو گیا تھا اور ذہنی طور پر بھی بری طرح الجھ گیا تھا۔

حالانکہ ان کی اور بابا حضرت کی زبانی بہت پہلے ہی وہ سن چکا تھا کہ سلوطا شادی شدہ ہے۔ لیکن اب پھوپھو کی زبانی سلوطا کی ساری روداد سن کر اور یہ جان کر کہ اسے طلاق ہو چکی ہے۔ وہ سلوطا کی طرف سے بد دل سا ہو گیا تھا۔

کیونکہ اسے اپنے معیار پر پوری اترنے والی کسی ایسی رفیق زندگی کی تلاش تھی جو خوبصورت اور حیادار ہونے کے ساتھ خوش خلق اور اچھوتی سی بھی ہوتی۔ بالکل شفاف پانیوں میں کھلے تر و تازہ کنول کے اس پھول کی طرح جسے کسی انسانی ہاتھ نے چھوا تک نہ ہو۔

بی بی شادی شدہ ہے۔ اور اس پر طلاق یافتہ بھی۔

جب کہ وہ تو لاعلمی میں سلوطا کی ظاہری صفات اور خوبیوں پر ہی فریفتہ ہوا تھا۔

اس کی خوبصورتی پر مر مٹا تھا۔

لیکن جذبۂ عشق اپنی جگہ۔

چونکہ وہ زندگی کے ہر معاملے میں حقائق کو سامنے رکھ کر عمل کرنے کا عادی تھا۔ اس لیے یہ حقیقت اس پر بڑی گراں گزری تھی کہ جس ہستی کو اس نے اپنے لیے پسند کیا تھا۔ دل و جان سے چاہا تھا۔ اس ہستی پر صرف اس کا حق نہیں ہے یا وہ محض اس کی ملکیت نہیں ہے بلکہ اس کی ملکیت پر بہت پہلے ہی کوئی اور مرد اپنا قبضہ جما چکا ہے۔ اسے معلوم تھا کہ یہ زندگی بھر کا معاملہ ہو گا۔ اور یہ بھی کہ سلوطا کے بارے میں اس کی ماں اور بہنوں کے خیالات کیا ہیں۔

اور وہ سلوطا کے ساتھ گھر کی ایک پروردہ لڑکی کی حیثیت سے ہی پیش آتی رہی ہیں۔ اور پھر سب سے بڑھ کر وہ والدین کی اکلوتی نرینہ اولاد ہونے کی وجہ سے ان کی امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز ہے۔ ان کا واحد سہارا ہے۔ لہٰذا سلوطا سے شادی کر کے وہ ان کی ساری امیدیں خاک میں ملا دے گا۔ ان کے ارمانوں پر پانی پھیر دے گا۔ اور اگر ضد اور ہٹ دھرمی سے کام لے بھی لیا تب بھی بات بالکل نہیں بنے گی۔ لازماً سلوطا کو وہ مقام اور وہ مرتبہ نہیں ملے گا جس کی اس کی بیوی یا گھر کی واحد بہو کی حیثیت سے وہ مستحق ہو گی۔ بہتر ہے تو یہ کرے کہ سلوطا کا خیال بالکل ہی چھوڑ دے۔ بس وہ اسی ادھیڑ بن میں کئی روز تک لگا رہا تھا۔

اور بہت غور و خوض کرنے کے بعد بھی اب تک کسی نتیجے پر نہ پہنچا تھا۔ ورنہ اصولاً تو اسے اسی روز جس روز پھوپھو سے سلوطا کو ڈھونڈ نکالنے کا وعدہ کر کے آیا تھا، شام کی فلائٹ سے کراچی لوٹ جانا چاہیے تھا کیونکہ لفافے پر کراچی کی مہر لگی ہوئی تھی جس میں سلوطا نے خط رکھ کر پھوپھا کو بھیجا تھا۔ مگر وہ پورے سات روز کا عرصہ ضائع کر کے سرگودھا جا رہا تھا۔ اب یہ بھی نہیں تھا کہ اسے سلوطا پر کی گئی اپنی زیادتی کا کچھ احساس ہی نہیں تھا۔ بلکہ اسے تو اپنی زیادتی پر سخت افسوس تھا۔ رنج تھا۔ پچھتاوا اور ندامت بھی۔ اس کے خیال میں اس نے سلوطا جیسی معصوم لڑکی پر بڑا ظلم توڑا تھا۔ ستم ڈھایا تھا۔ حتیٰ کہ اسے تو پھوپھا سے کیا اپنا وعدہ بھی یاد تھا۔ اور اس نے سلوطا کو ڈھونڈنے کا خیال بھی نہیں چھوڑا تھا۔

البتہ یہ ضرور تھا کہ اب اس کے دل میں وہ لگن، وہ تڑپ باقی نہیں رہی تھی۔ جو ایک چاہت بھرے دل کی کسک بن جاتی ہے۔ اگر سلوطا کے بارے میں کوئی فکر اسے دامن گیر رہتی تو بس یہی کہ نہ معلوم وہ کن لوگوں میں پھنسی ہو گی۔ کیسے حالات پیش آئے ہوں گے اور کیونکر زندگی گزار رہی ہو گی۔

مگر چونکہ پھوپھا کو اس نے اپنے خط میں یہی اطمینان دلایا تھا کہ وہ ہر طرح سے محفوظ ہے۔ لیکن پھر بھی زمانہ اتنا خراب ہے۔ اپنے جان پہچان والوں پر بھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا کہ آج کل سب اپنا مفاد دیکھتے ہیں اور حرص و ہوس کے اندھے ہو گئے ہیں۔ تو پھر بھلا اس کے تحفظ کی کیا ضمانت ہو سکتی ہے۔ جب کہ وہ تو ایک دیہاتی سے ماحول کی پروردہ گھریلو سی لڑکی ہے۔ جسے جبریہ ایک بڈھے شخص کے پلے باندھ دیا گیا تھا۔ تب بھی وہ کوئی احتجاج نہیں کر سکی تھی۔

اور یہ جو کچھ ہوا میری وجہ سے ہوا ہے۔ میں ہی سراسر ذمہ دار اور قصوروار ہوں۔ مگر کراچی اتنا بڑا شہر ہے جس میں سڑکوں کی طرح محلوں کا بھی ایک جال سا بنا ہوا ہے۔ پوری ایک بھول بھلیاں ہے یہ شہر کراچی۔ سمندر کی عمیق گہرائیوں کی طرح اس میں بھی کوئی شے گم ہو جائے تو پھر اس کا ملنا محال ہو جاتا ہے۔ میں عنایا کو اتنے بڑے شہر میں کہاں کہاں ڈھونڈتا پھروں گا۔ یہ تو۔۔۔ قدرت کا ہی کوئی کرشمہ ہوگا یا پھر حالات اور اتفاقات پر ہی موقوف ہوگا کہ وہ ایسا ہی رخ اختیار کریں جیسا کہ میری یہاں لاہور میں آمد پر کیا تھا کہ ایک ہوٹل سے اجمال احمد کے بنگلے میں میرا مستقل ہونا۔

دوسرے بہت اتفاقی بلکہ حادثاتی طور پر پھوپھا کا انفلوئنزا جانا۔ شیراں کی زبانی تمام واقعات کا پتا چلنا اور پھوپھو تک رسائی۔ یہ سب کسی انسان کے بس کا کام تو نہ تھا۔

یہ تو قدرت نے ہی کچھ ایسے حالات پیدا کیے تھے۔

ورنہ ملتان سے روانگی کے وقت میرے تو سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ لاہور پہنچنے کے بعد پھوپھو بیگم اور پھوپھا جان سے میری ملاقات ہوگی اور بہت اتفاقی طور پر سلوطا کا خط لگ جائے گا۔ جس سے اس کا کچھ اتا پتا تو مل جائے گا۔ لہٰذا جب واپس کراچی جاؤں گا تو اسے ڈھونڈنے کی ہر ممکن کوشش ضرور کروں گا اور اگر قدرت کو منظور ہوا تو میری کوششیں رائیگاں نہیں جائیں گی۔۔۔ ورنہ۔۔۔

بس وہ کچھ ایسے ہی خیالات میں غلطاں اور پیچاں الیسی ٹکڑوں میں گھرا تیز رفتاری کا ریکارڈ قائم کرتا چلا جا رہا تھا۔ یا پھر دوسرے معنوں میں اپنے ہوش و حواس میں نہ تھا۔ ہوش تو اسی وقت ہی آیا جب سامنے مخالف سمت سے آتے ایک تیز رفتار اور دیو قامت ٹرک کی زد سے اپنی لینڈروور کو بچانے کی غرض سے اس نے گاڑی بائیں سمت کاٹنی چاہی مگر شومئی قسمت سے آگے سڑک کا بایاں حصہ تیز رفتار ٹریفک کی آمدورفت سے ٹوٹ گیا تھا۔ اس نے رفتار ہلکی کیے بغیر تیزی سے اسٹیئرنگ کو بائیں سمت گھمایا تو گاڑی اس کے قابو سے باہر ہو کر تیزی سے دلدلی قطعہ پر جا اتری اور ایک تناور درخت سے جا ٹکرائی۔

ٹکراؤ اس قدر شدید تھا کہ اس کی طرف کا دروازہ جو بے دھیانی میں اس نے لاک بھی نہیں کیا تھا۔ زور سے کھلا اور وہ ایک شدید جھٹکے سے نیچے دلدلی زمین پر آ گرا۔ اس شدید جھٹکے میں سر بری طرح اسٹیئرنگ سے ٹکرا کر پھٹ گیا تھا۔ اور خون کی ایک پتلی سی سر سے بہہ نکلی تھی۔

مگر اس ساری تکلیف سے بے نیاز وہ کیچڑ میں لت پت زمین پر بے ہوش پڑا تھا۔ ٹرک اسی تیز رفتاری سے کب کا زن سے اس کے پاس سے نکل کر بہت دور چلا گیا تھا۔ اور وہ ایک کسمپرسی کے عالم میں بے سدھ زمین پر پڑا تھا۔ معلوم نہیں زندہ تھا یا مر گیا تھا۔ دور دور تک کسی متنفس کا پتا نہ تھا۔ جو کم از کم اتنا ہی معلوم کر لیتا کہ وہ کس حال میں ہے۔

کتنی عجیب بات تھی۔

ہر دم کراچی کے لیے پر تولنے والے کو نامعلوم کون سی مجبوریاں لاحق ہو گئی تھیں جو وہ اجمال احمد کے گھر میں ہی ٹک کر رہ گیا تھا۔

یا پھر یہ خونیں حادثہ اس کا منتظر تھا۔

وہ پھوپھا کے یہاں سے آیا تھا تو اسی عزم کے ساتھ کہ سب سے پہلی فلائٹ سے وہ کراچی چلا جائے گا۔ لیکن اپنی رہائش گاہ پر آ کر اس کے خیالات نے ایک نیا پلٹا کھایا۔ جس کی وجہ سے دل سے وہ لگن اور امنگ ہی ختم ہو گئی۔ جس کا اظہار وہ پھوپھی اور پھوپھا کے سامنے کر کے آیا تھا۔

اس سمے دوپہر کے کھانے کا وقت تھا۔ مگر اس کی بھوک و پیاس سب کچھ اڑ چکی تھی۔ اس لیے کمرے کا اندر سے کنڈا لگا کر بیٹھ گیا تھا اور الجھے ہوئے ذہن اور لرزتے ہوئے دل کے ساتھ نامعلوم کیا کیا سوچ رہا تھا کہ کچھ ہی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی اور نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اٹھ کر دروازہ کھولنا پڑا۔

دروازہ کھلتے ہی آفتاب اندر آ گیا۔ اس کے پیچھے اجمال بھی تھا۔

یہ نوید بات بہت غیر معمولی تھی کہ آفتاب دوپہر کے وقت آیا تھا۔ جب کہ ہمیشہ وہ ڈیوٹی انجام دینے کے بعد شام کو ہی آتا تھا۔ دوسرے اجمال اس کے پیچھے لگا لگا اس طرح کبھی اس کے کمرے میں نہیں آیا تھا۔ بہرحال اسے اس معاملے میں زیادہ متجسس نہیں ہونا پڑا۔

آفتاب نے آتے ہی اسے بھینچ کر گلے لگاتے ہوئے اپنی آمد کی غرض و غایت بیان کر دی۔

"یار آج خلاف معمول میرے اس وقت اچانک ہی ٹپک پڑنے پر تمہیں تعجب تو ہو رہا ہوگا۔ مگر کیا کروں بات ہی کچھ ایسی ہے۔ میرا ٹرانسفر سرگودھا میں کر دیا گیا ہے۔ اس لیے آج میں آف ڈیوٹی تھا۔ سوچا تم سے ملتا چلوں۔ یہ تو تم نے بڑی راہ دکھائی۔ کہاں غائب ہو گئے تھے۔ ایک دم ہی۔" اس نے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ ڈالا۔

"بس وہ ذرا گھومنے چلا گیا تھا۔ مگر تمہاری روانگی کب تک ہوگی؟" آفتاب سرگودھا جا رہا تھا اور وہ ابھی تک یہاں کے کونے میں ہی دھرنا دیے بیٹھا تھا۔ اس خیال سے اس نے بڑی سبکی محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

"آج شام کی ٹرین سے فیصل آباد جا رہا ہوں۔ ٹرانسفر ہونے کی وجہ سے تین یوم کی چھٹی ملی ہے۔ ابا جی کی طبیعت ناساز ہے اس لیے یہ چھٹی گھر پر ہی گزاروں گا۔ اس کے بعد سیدھا سرگودھا پہنچ جاؤں گا۔" آفتاب نے اپنا پروگرام بتایا۔ "چلو یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ تم بھی آج ہی روانہ ہو رہے ہو۔" اسفند نے کہا۔ تو آفتاب اس کے مزید کچھ کہنے سے پہلے ہی بول اٹھا۔

"اچھا تو کیا تم بھی آج شام ہی یہاں سے کوچ کرنے والے ہو۔"

"ہاں ارادہ تو یہی ہے۔ ابھی بکنگ کرانے جانے ہی والا تھا کہ تم آ گئے۔" اپنی بات اونچی رکھنے کی غرض سے اسفند غلط بیانی سے کام لے کر بولا۔

"لیکن اگر بکنگ ابھی کرائی تو شام کی فلائٹ تو تمہیں ملنے کی ہی نہیں۔ البتہ کل صبح یا شام کو ہی جا سکو گے۔" آفتاب نے کہا۔

"چلو تو جہاں اتنے دن زحمت دی وہاں ایک رات اور سہی کیوں اجمال صاحب۔" اسفند نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنی بات کہہ کر اجمال کو مخاطب کیا۔

"واہ یہ بھی خوب رہی۔ سنتے تو یہی آئے ہیں بلکہ کچھ دستور بھی یہی ہے کہ انسان آتا تو اپنی مرضی سے ہے مگر اس کی واپسی دوسرے کی مرضی سے ہی ہوتی ہے۔۔۔ وہ بھی اس صورت میں کہ آپ آفتاب کے نہیں میرے مہمان تھے۔ اب آپ کی یہ بکنگ وکنگ بھی میری مرضی اور اجازت سے ہوگی۔" اجمال نے بڑے مخلصانہ انداز میں مسکرا کر کہا۔

"او نہیں جمال صاحب! آپ کو اتنے دن زحمت دے دی بس وہی کافی ہے۔ یوں بھی اب آفتاب کے جانے کے بعد لاہور میں میرے لیے رہ ہی کیا جائے گا۔ اور میں تو بہت پہلے ہی یہاں سے جا رہا تھا۔ مگر آپ خود ان سے پوچھ لیجیے کہ ان کے اصرار پر میں نے یہاں اتنا عرصہ بھی گزار دیا۔" اسفند نے کہا۔ تو آفتاب سر کو جھٹکتے ہوئے ٹوک کر بولا۔

"کہاں ہے یار، تم تو کچھ۔۔۔ کچھ کمپلیکسڈ سے ہو گئے ہو۔ یوں بھی تم اسلام آباد جا کر کون سے تارے توڑ لاؤ گے۔ اگر ایسا ہی سیاحی کا شوق ہے تو چلو میرے ساتھ سرگودھا چلے چلو۔"

"لیکن تم تو فیصل آباد جا رہے ہو اور میں اسلام آباد تو نہیں جا رہا۔ میں تو اب سیدھا کراچی ہی جاؤں گا۔" اسفند نے کہا۔

"خیر یہ تو مجھے بھی معلوم ہے کہ کراچی کے علاوہ تم کسی اور جگہ رہ ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ کراچی کی رونق اور ہنگامہ خیز ماحول کے بعد عادی انسان کا دل کسی اور جگہ لگ ہی نہیں سکتا۔ لیکن پھر بھی میرا خیال تھا کہ کسی کشتی شفاخانے کے ساتھ وطن کے دور دراز علاقوں میں گھوم پھر کر اپنے خدمتِ خلق کے جذبے کو تسکین دو گے تو پھر اس سے

"تو یہی بہتر ہے۔ کہ سرگودھا چلے چلو، بہت ممکن ہے کہ وہاں بی ایم اے کے بعد تمہیں کوئی معقول اسامی مل جائے۔" آفتاب نے بات اس کے مطلب کی کہی تھی اس لیے اس کے دل کو لگی۔

"ہاں یہ تو تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو مگر اس کا کیا یقین کہ وہاں مجھے کوئی وکینسی مل ہی جائے۔" اسفند اس کے مشورے پر دل ہی دل میں غور کرتے ہوئے بولا۔

"اب یہاں سے پہلے پاؤں باندھنے کی کوشش تو نہ کرو۔ کیونکہ یہ ایسی کوئی محال یا غیر ممکن بات تو نہیں۔ تقریباً ان دنوں ہی ہر جگہ بہت سی ایسی آسامیاں خالی ہوتی رہتی ہیں، بس قسمت آزمائی شرط ہے۔ اور کچھ نہیں تو لگے ہاتھوں سرگودھا کی سیر بھی ہو جائے گی۔"

آفتاب نے کہا تو اس نے بھی سوچا کہ چلو کیا حرج ہے۔ اسی بہانے کم از کم میں ایک نئی جگہ بھی دیکھ لوں گا۔ کے ساتھ وہاں کے ماحول کا اندازہ بھی لگا لوں گا کہ کیسا ہے، یعنی میری طبیعت سے میل بھی کھاتا ہے یا نہیں۔ یہی کچھ سوچ کر اس نے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے بقول تمہارے میں وہاں بھی قسمت آزمائی کر کے دیکھوں گا لیکن ابھی تو تم خود بھی وہاں نہیں جا رہے یعنی تین چار روز بعد ہی جاؤ گے۔ اتنے میں، میں بھی اسلام آباد کا چکر لگا آؤں گا، کیوں ٹھیک ہے نا۔"

"اوہو۔ پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ، اسلام آباد جانے کے لیے کیا کسی حکیم یا ڈاکٹر نے مشورہ دیا ہے یا پھر تمہارے لیے فرض ہو گیا ہے وہاں جانا۔ ارے بھئی آرام سے یہیں لاہور میں ہی بیٹھے رہو۔ یہ اپنا اجمال [illegible] یا ہیبت ناک بھی نہیں جس سے تمہیں جان جانے کا خطرہ لاحق ہو۔" آفتاب کچھ اتنا چڑ کر بولا کہ اجمال تو اجمال خود اسفند کو بھی بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

"خیر یہ تو تمہاری پرانی عادت ہے۔ اپنی بات کو اسی طرح منواتے ہو لیکن میں نے انکار تو نہیں کیا سرگودھا جانے سے۔ آج پیر کا دن ہے۔ میں ہفتے کے روز وہاں پہنچ جاؤں گا۔ تم اطمینان رکھو۔" دوست کے خلوص کے آگے آخر ہتھیار ڈالنے ہی پڑے۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔ مگر یہ بھی سن لو کہ تم اسلام آباد ہرگز نہیں جاؤ گے۔ کیونکہ ایک مرتبہ تم ہاتھ سے نکل گئے تو پنجرے سے نکلے ہوئے پرندے کی طرح ایسے پھر سے اڑو گے کہ پھر کبھی ہاتھ نہیں آؤ گے۔" آفتاب اٹھتا ہوا بولا۔

"ارے ارے یہ ایک دم ہی کیوں اٹھ کھڑے ہوئے تم۔ اگر کھانا نہ سہی تو کچھ ٹھنڈا گرم ہی پی لو۔" اجمال نے اسے ایک دم ہی اٹھتے دیکھ کر کہا۔

"نہیں کچھ کھانے پینے کا موڈ ہوتا تو تم سے پوچھے بغیر ہی کیا پی لیتا۔ اس وقت تو مجھ پر سفر سوار ہے ابھی جا کر سامان بھی چیک کرنا ہے۔ ایک آدھ چیز ادھر رہ گئی تو پھر کون لینے آئے گا۔" آفتاب نے کہا۔ اور پھر اجمال کا شانہ تھپتھپا کر اور اسفند سے ہاتھ ملا کر اسے سرگودھا پہنچنے کی تاکید کر کے اسی وقت چلا گیا۔

تو یوں وہ دوست سے کیے وعدے کو ایفا کرنے کی غرض سے سرگودھا جا رہا تھا۔ ارادہ تو اس کا بذریعہ ٹرین جانے کا تھا مگر اجمال نے اسے ٹرین کے تکلیف دہ سفر سے بچانے اور کچھ اس غرض سے کہ وہ نئے ماڈل کی لینڈ کروزر جو [illegible] کی ملکیت تھی۔ اسے آفتاب کے گھر پہنچانے کے خیال سے اسے یہی مشورہ دیا کہ اگر وہ کار کے ذریعے قومی شاہراہ سے سفر کرے گا تو وقت کی بھی بچت ہوگی اور سفر بھی آسان ہو جائے گا۔

یہ لینڈ کروزر آفتاب نے بہت چاہت سے پائی پائی جمع کر کے خریدی تھی۔ اور وہ تو راستوں سے ناواقف ہی تھا، اجمال نے اس کی سہولت کے لیے اپنا ایک آدمی جو شاہین آباد اپنے گھر والوں سے ملنے جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ کر دیا تھا۔ شاہین آباد سے سرگودھا بمشکل تیس پینتیس میل پر واقع ہے اور راستہ بھی سیدھا تھا۔

اس لیے اس شخص کے بہت کہنے سننے کے باوجود کہ وہ اسے سرگودھا ہی پہنچا کر آئے گا۔ اسفند نے اسے زحمت دینی گوارا نہ کی۔ اور اسے اس کی منزل پر اتار کر تنہا ہی سرگودھا کا رخ کیا۔ کہ یہ حادثہ پیش آ گیا۔

آفتاب کے اصرار نے اسے اس حادثے سے دوچار کیا تھا۔

اسے قضا یہاں تک کھینچ لائی تھی۔ جو وہ سرگودھا سے ادھر ہی حادثے کا شکار ہو گیا تھا۔ — ٹرک والا تو پکڑے جانے کے ڈر سے ٹرک کو بھگا لے گیا تھا اور وہ مشیت الٰہی کے رحم و کرم پر سڑک کے کنارے درخت کے نیچے خون میں لت پت بے سدھ پڑا تھا۔

شام کا دھندلکا اب سیاہیوں میں تبدیل ہونے لگا۔ یا آسمان پر چھائی بدلیوں کی وجہ سے اندھیرا کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا تھا۔ تبھی شاہین آباد کی سمت سے آتی ایک ایمبولینس جس میں کسی ہسپتال کا کچھ عملہ یعنی ڈاکٹرز بھرا ہوا تھا۔ اس کے قریب آ کر رکی۔

"کسی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔" ایک آواز آئی۔

"نہیں یہ تو ایکسیڈنٹ میں مرنے والے کسی شخص کی ڈیڈ باڈی لگ رہی ہے۔" کسی اور نے اپنا خیال ظاہر کیا اور جلد جلد دروازے کھلے اور کئی شخص تیزی سے باہر اتر آئے۔

ان میں سے وہ اشخاص جو ڈاکٹرز تھے، اپنا ڈاکٹری بیگ اٹھائے تیزی سے اس کی طرف بڑھے۔ بڑے غور اور توجہ سے اس کا معائنہ کیا، اس کی نبض دیکھی، زخم ٹٹولے۔ اور پھر بڑی عجلت اور پھرتی میں اسے احتیاط سے اٹھا کر ایمبولینس میں ڈالا اور سرگودھا شہر کے ایک سرکاری ہسپتال میں پہنچا دیا۔

اس کے تقریباً سارے جسم پر چوٹیں آئی تھیں۔ مگر سر کی چوٹ بہت خطرناک اور شدید تھی۔ خون بھی بہت بہہ گیا تھا۔

اس کی نبض ڈوب رہی تھی نزع کا سا عالم طاری تھا۔ آپریشن تھیٹر کی میز پر وہ جاں کنی کے عالم میں پڑا تھا۔

مسلسل چار گھنٹے سے ڈاکٹرز اس کی جان بچانے کی ان تھک کوششوں میں مصروف تھے۔ دو مرتبہ خون بھی دیا جا چکا تھا۔ پوری چار بوتلیں چڑھائی گئی تھیں۔ لیکن یہ چار بوتلیں بھی اس کے جسم سے بہہ جانے والے خون کی کمی کو پورا نہ کر سکی تھیں۔

اسے مزید خون دینے کی ضرورت تھی۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ ہسپتال کے بلڈ بینک میں یونیورسل پول زیرو نمبر کا خون ختم ہو چکا تھا۔ رات تیزی سے گزرتی جا رہی تھی۔ اس پر موسلا دھار بارش پھر شروع ہو گئی تھی۔ سڑکیں دریا بنی ہوئی تھیں اور راستے بند ہو گئے۔ ایسی چھاجوں برستے پانی میں یونیورسل پول کسی اور جگہ سے حاصل کرنا۔ جوئے شیر لانے کے مترادف ہی لگ رہا تھا۔

اور زندگی کا ایک ایک لمحہ اس پر بھاری تھا۔ عرصۂ حیات تنگ ہو کر بالکل موت کے دہانے سے جا لگا تھا۔ جبکہ اس ہسپتال میں وہ سب کے لیے یکسر اجنبی تھا۔ یعنی کوئی اسے جانتا تھا نہ اس سے کوئی واسطہ رکھتا تھا۔

اس کے باوجود بھی انسانی برادری کے مربوط سلسلے سے منسلک دردمندی۔ ہمدردی اور ایک دوسرے کے کام آنے کا جذبہ تقریباً ان کے تمام مسیحاؤں کے دلوں میں موجزن تھا۔

وہ ہر قیمت پر ایک کڑیل نوجوان اور بے یار و مددگار شخص کی جان بچا لینا چاہتے تھے۔ اور اسی جد و جہد میں انہوں نے دوسرے اسپتالوں سے زیرو نمبر کے خون کی دستیابی کے لیے فون پر رابطہ قائم کر رکھا تھا۔ مگر ابھی تک کہیں سے کوئی مدد نہیں آئی تھی۔ اور ادھر وقت تھا کہ نکلا جا رہا تھا۔

اور اسفند کی جان تھی کہ اس کے خاکی جسد سے کسی بھی لمحے نکلنے کے لیے پر تول رہی تھی۔ ہسپتال میں ایک کھلبلی مچی ہوئی تھی۔

نرسیں تک اپنے چہروں پر تردد کے آثار لیے۔ انسانیت کے سب سے بڑے جوہر یعنی بے لوث جذبے اور ہمدردی کا اظہار کر رہی تھیں۔

کیونکہ اس موت کے دہانے پر کھڑے شخص سے ان کی کوئی غرض اٹکی تھی نہ ہی ان کا اس سے کوئی نزدیکی رشتہ تھا۔ بس وہ انسان تھا۔ ان کا ہم قوم اور ہم مذہب تھا۔ سبھی کے قلوب سے اس کی سلامتی کی دعائیں نکل رہی تھیں۔ لیکن سب کے ہونٹوں پر ایک ہی سوال تھا۔ کہ زیرو نمبر کا خون کہاں سے حاصل کیا جائے؟

اور تھی ہسپتال کی ایک نو وارد معمولی سی نرس نے آگے بڑھ کر اپنی خدمات پیش کر دیں۔
"ڈاکٹر صاحب! میرا خون نیگیٹو ہے۔ آپ جتنا چاہیں میرے جسم سے لے سکتے ہیں۔"
"آپ کا خون نیگیٹو گروپ کا ہے مس شان! مگر آپ کو کیسے معلوم؟" ڈاکٹر کے اسسٹنٹ نے استفسار کیا۔
"مجھے معلوم ہے تبھی تو کہہ رہی ہوں، ویسے آپ چاہیں تو میرا خون ٹیسٹ کر سکتے ہیں۔" مس شان نے نہایت سنجیدہ لہجے میں کہا۔
"لیکن مس شان! آپ تو خود ہی بہت نازک سی ہیں۔ بالفرض اگر آپ کا خون نیگیٹو کا بھی ہے اور کم نکلا بھی گیا تو پھر آپ کے اندر رہ ہی کیا جائے گا۔" سرجن انصاری ہنس کر بولے۔ جو بہت ہی خوش مزاج اور زندہ دل مشہور ملنسار جانے جاتے تھے۔
"آپ میری فکر نہ کریں۔ ویسے بھی میں اتنی کمزور نہیں ہوں۔ آپ پلیز زخمی کی جان بچانے کی کوشش کیجیے۔" مس شان کا لہجہ ملتجی سا ہو گیا تھا۔
اس وقت وہاں دو سرجن اور دو ڈاکٹر کھڑے تھے۔ نرس کے جذبے سے متاثر ہو کر انہوں نے آپس میں کچھ مشورہ کیا اور مس شان کو اس کمرے میں لے گئے جہاں خون ٹیسٹ کیا جاتا تھا۔ فوراً اس کا خون ٹیسٹ کیا گیا۔ نرس کا دعویٰ درست ہی ثابت ہوا۔ جیسا کہ اگلے ہی چند لمحوں بعد اس کا خون لیا گیا۔ اور پھر اسے پندرہ منٹ کمرے میں لیٹے رہنے کی ہدایت کر کے اور جوس وغیرہ پلا کر سب اس روم سے چلے گئے مگر مس شان کو تو جیسے قرار ہی نہیں تھا۔
وہ کبھی اٹھ کر بیٹھتی کبھی لیٹ جاتی۔ چشم تصور میں زخمی نوجوان کا پٹیوں میں جکڑا چہرہ اور چہرے پر چھائی موت کی زردی۔ آپریشن کی میز پر بے حس و حرکت پڑا سراپا۔ اور ناک میں لگی آکسیجن کی نالی بار بار سامنے آ کر اس کے اضطراب میں اضافے کا باعث بن رہی تھی۔
دل اندر ہی اندر ٹکڑے ہوا جا رہا تھا اور لبوں سے آہستہ آہستہ دعائیں نکل رہی تھیں۔ "اے رب رحیم وہ جو کوئی بھی ہے اس پر رحم کر۔ اے زندگی دینے والے! اسے بچا لے۔ اسے زندگی دے دے۔ میری زندگی میری عمر بھی اسے ہی عطا کر دے۔ میں نے جس جذبے کے تحت اسے اپنا خون دیا ہے تو اس جذبے کی لاج رکھ لے۔ اے میرے مولا تو میری سن لے۔ میری سن لے۔"
اسے معلوم تھا کہ زخمی نوجوان کے جسم میں اس کا خون پہنچانے کی تیاری کی جا رہی ہوگی اور اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ صرف ایک خون کی بوتل جو اس کے جسم سے نکالی گئی ہے کافی نہیں ہوگی۔ جب کہ اس سے قبل چڑھائی گئی خون کی چار بوتلیں اس کے خون کی کمی کو پورا نہ کر سکیں۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اٹھ کر جائے اور آپریشن روم میں نصب شیشے کے پیچھے سے اندر کا احوال معلوم کر لے۔
مگر وہاں ہسپتال کے عملے کے علاوہ اور لوگوں کی موجودگی کا بھی امکان تھا۔ اور وہ کسی کے سامنے پڑنا نہیں چاہتی تھی۔
اس نے تو اپنا خون دے کر کسی کی جان بچانے کی کوشش کی تھی۔
ایک انسانی فریضہ انجام دیا تھا۔
کسی کے سامنے جا کر وہ اپنی اس نیکی کو ضائع کرنا نہیں چاہتی تھی۔
یوں بھی یہ نفسیاتی اثر تھا۔
یا جسم سے خون کی پوری ایک بوتل نکل جانے کا سبب۔
جو وہ واقعی نقاہت سی محسوس کر رہی تھی۔
اٹھ کر ڈیوٹی روم میں آئی تو سر میں ایک گھمیری آنے کی وجہ سے لڑکھڑا سی گئی۔ اتفاق سے ایک سینئر نرس مسز نائر اس وقت ڈیوٹی روم میں موجود تھی۔ اس کے لڑکھڑا جانے پر۔ وہ زبردستی اسے پکڑ کر اس سائیڈ روم میں لے آئی جو ریسٹ روم کہلاتا تھا اور وہاں عموماً طبیعت خراب ہونے پر نرسیں اور سسٹرز آرام کیا کرتی تھیں۔ اصل میں تو چونکہ رات کا وقت تھا اور باہر شدید بارش ہو رہی تھی اس لیے وہ اسے چھٹی دلوا کر اس کے گھر بھی نہیں بھجوا سکتی تھی۔ البتہ مسز نائر نے جا کر ڈاکٹر کو بتا ضرور دیا تھا کہ مس شان بہت کمزوری محسوس کر رہی ہے۔ لہٰذا وہ جا کر اس کا معاینہ ضرور کر لے۔
مگر مس شان کا ٹلوا سک روم میں بھی جی نہیں لگا۔ مسز نائر کے جانے کے تھوڑی دیر بعد وہ پھر اٹھ کے بیٹھ گئی۔

ایک بے کلی سی اس پر مسلط تھی۔
بار بار اس کا دھیان اسی زخمی مریض کی طرف جا رہا تھا۔
ایک جستجو تھی۔ ایک چینک سی لگی تھی۔
ذہن میں ایک ہی خیال گردش کر رہا تھا اور دل میں خدشات کی ایک روشنی جل رہی تھی۔
کہیں اس کی قربانی رائیگاں نہ چلی جائے۔
یوں اس زخمی کے بچنے کے امکانات بہت کم تھے۔
اور سرجن حارث نے تو صاف صاف کہہ دیا تھا کہ صرف خون کی ایک بوتل کافی نہیں ہوگی۔ اس لیے مزید دو تین بوتلوں کا بندوبست کرنا چاہیے۔ اس پر ایک دوسرے سرجن نے کہا تھا کہ انتظام تو ہم نے کر لیا ہے لیکن اس اتنے خراب موسم میں فوری طور پر خون فراہم نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا فی الوقت تو مس شان کے خون سے ہی کام چلا لینا چاہیے۔ اور ریسٹ روم میں بیٹھے بیٹھے جب اس سے ضبط نہ ہو سکا تو وہ اٹھ کر پھر باہر آ گئی۔ یہی معلوم کرنے کے لیے کہ اس کے خون دینے کا نتیجہ کیا رہا۔
مگر باہر آ کر دیکھا تو آپریشن روم کا دروازہ بند تھا اور دونوں سرجن اور ڈاکٹرز نرسیں سب اندر ہی سرگرم عمل تھے۔
وہ ستون کی آڑ میں ستون کا ہی سہارا لیے بڑی دیر تک آپریشن تھیٹر کے سامنے ہی کھڑی رہی۔
تب جا کے تکلیف دہ انتظار کے بعد آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا اور دونوں سرجنوں کے ساتھ تینوں ڈاکٹرز اور دو نرسیں باہر نکلیں تو وہ ستون کی آڑ سے نکل کر بے تابانہ ان کی طرف بڑھی۔
"اینی نیوز سر؟ کوئی خیر خبر؟" اس نے اسی بے تابانہ لہجے میں پوچھا۔
"اوہ یس۔ ہاں ہاں! زخمی کے جسم میں آپ کا خون چڑھا دیا گیا ہے۔" ایک ڈاکٹر نے بتایا۔
"تو کیا کوئی امکان ہے اس کے بچ جانے کا؟" اس نے ڈاکٹروں کی ٹیم کے ساتھ چلتے ہوئے پھر سوال کیا۔
"خیر امکان تو نہیں کہہ سکتے البتہ امید ضرور ہے۔ کیونکہ موت و زیست تو خدا کے اختیار میں ہوتی ہے۔ بندہ تو صرف کوشش ہی کر سکتا ہے سو ہم اس کی جان بچانے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔" اس ڈاکٹر نے کہا تو اس کا چہرہ اتر سا گیا۔
"ویسے بائی دا وے کیا اس سے آپ کی کچھ رشتے داری ہوتی ہے؟" اسی ڈاکٹر نے پوچھا۔
"نہیں سر رشتے داری تو دور کی بات میں تو اسے جانتی بھی نہیں۔" اس نے کہا۔
"پھر تو آپ کا جذبہ قابل تحسین ہے۔ لیکن آپ کیسا فیل کر رہی ہیں۔ کوئی ویک نیس کوئی تکلیف تو محسوس نہیں ہوئی آپ کو خون دینے کے بعد؟" ڈاکٹر کو اس سے باتیں کرتے کرتے ایک دم ہی خیال آیا کہ ابھی کچھ دیر پہلے اس نے خاصی مقدار میں اپنا خون دیا ہے تو اس نے پوچھا۔
"نو سر میں بالکل ٹھیک ہوں۔" اس نے اتنا ہی کہا اور وہاں سے پلٹ کر ڈیوٹی روم میں چلی آئی کہ ایک معمولی سی نو وارد نرس ہوتے ہوئے اس نے ایک ڈاکٹر سے جتنا بھی پوچھ لیا تھا وہی بہت تھا۔
اس سرکاری ہسپتال کے تقریباً تمام ہی عملے میں ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ ڈاکٹرز سے لے کر چھوٹے درجے کے ملازمین سبھی ملنسار اور ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے۔

اگلی صبح بارش تھم گئی تھی اور چونکہ مس شان کی ڈیوٹی نائٹ کی تھی اس لیے اور کچھ اس لیے بھی کہ ساری رات وہ بہت بے سکون رہی تھی۔ اس کا چارج لینے والی دوسری نرس کے آنے سے قبل ہی وہ مسز نائر سے اجازت لے کر اپنے گھر چلی آئی تھی۔ اس کا گھر یا ہاسٹل ہسپتال سے زیادہ دور نہیں تھی۔ بلکہ ہسپتال کی عقبی باؤنڈری وال کے پیچھے ہزار گز کے فاصلے پر بنے نرسوں کے ایک ہاسٹل میں رہتی تھی۔ جہاں اس کی ہم پیشہ دوسری نرسیں بھی اقامت پذیر تھیں۔ پروین، شہناز، عفت اور تہمینہ اس کے کمرے میں رہا کرتی تھیں۔
پورے دن ہی وہ سخت نقاہت محسوس کرتی رہی تھی اور اس نے تو اس نقاہت کا سبب کسی کو بتایا ہی نہیں تھا مگر سپرنٹنڈنٹ نے آ کر بہانہ چھوڑ دیا تھا۔ ہاسٹل کی انچارج جو ایک پرائیویٹ کلینک میں مڈوائف بھی تھی اور اس ہاسٹل کا نظم و نسق

چلا رہی تھی۔ سب کا بہت خیال رکھتی تھی۔ اس نے فوراً ہی طاقت کا انجکشن دیا اور تقریباً سارا دن ہی مختلف اوقات میں تازہ جوس اور مقوی غذائیں کھلاتی رہی تھی اور اس نے اس کے بہت کہنے سننے کے باوجود اسے شام کو ڈیوٹی پر بھی نہیں جانے دیا تھا۔ جب کہ اس کا دھیان بار بار اسی زخمی مریض کی طرف لگا ہوا تھا۔ یہ ضرور تھا کہ اس نے اسے اپنا خون دیا تھا لیکن وہ صرف یہ جاننا چاہتی تھی کہ وہ کیسا ہے؟

کیا اس کے بچ جانے کے کچھ امکانات پیدا ہو گئے ہیں۔

آخر خدا خدا کر کے شام کو پروین اور عفت وغیرہ اپنی اپنی ڈیوٹیز بھگتا کر آئیں تو ان کی زبانی اس نے یہ مژدہ سنا کہ زخمی زندہ ہے بلکہ اس کے زندگی کی طرف لوٹ آنے کے امکانات پیدا ہو گئے ہیں تو مارے خوشی کے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے [illegible] میں گر گئی۔

زخمی نوجوان موت کے منہ میں جاتے جاتے واقعی زندگی کی طرف لوٹ آیا تھا۔ سب سے حیران کن بات یہ تھی کہ مس شان کا خون دینے کے بعد اسے مزید خون چڑھانے کی ضرورت نہیں پڑی تھی جب کہ تقریباً سارے سرجنز اور ڈاکٹرز اس کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے۔ بس اس امید موہوم پر کہ شاید ان کی کوششیں بار آور ہو جائیں اور شاید مالک کون و مکاں اسے زندگی عطا کر دے وہ اس کی جان بچانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ مس شان کا خون اس کے جسم میں داخل کرنے کے بعد بھی وہ اس کی طرف سے مطمئن نہ تھے مگر ان کی بے لوث خدمات، انتھک کوششیں اور پھر سب سے بڑھ کر جذبۂ ترحم اور ہمدردی، اس پر مستزاد مس شان کا اتنا بڑا ایثار۔ شاید یہ سارے بے لوث اور بے کھوٹ صادق جذبے حق سبحانہ تعالیٰ کو پسند آ گئے تھے جو ہر عیب سے مبرا ہے اور صداقتوں کا صلہ ضرور دیتا ہے۔

تبھی تو اس نے ایسے ممدوں اور — بے لوث جذبوں کو دیکھتے ہوئے زخمی نوجوان کو اس کی زندگی لوٹا دی تھی ورنہ سر سے لے کر پیروں تک کوئی جگہ ایسی نہ تھی جو زخمی نہ ہوئی ہو۔

اس پر والدین، بہنیں اور رشتے دار۔

یعنی اس کے لیے سچے دل سے دعائیں کرنے والے۔

اس کی حالت زار پر رونے اور تڑپنے والوں کے تو فرشتوں کو بھی علم نہ تھا کہ وہ کیسے زبردست حادثے کا شکار ہوا ہے۔

اور لقمۂ اجل بنتے بنتے اجنبی اور انجان لوگوں کی بے لوث خدمات، کوششوں اور صادق جذبوں کے طفیل موت کو شکست دے کر زندگی کی طرف لوٹ آیا ہے۔

وہ جو کہتے ہیں نا کہ جس کا کوئی نہیں ہوتا اس کا خدا ہوتا ہے۔ اور خدا ہی دوسروں کے دلوں میں رحم و ہمدردی ڈالتا ہے۔

وہی ضرب المثل کہ خدا مہربان تو کل مہربان۔

مگر بندہ — کسی مصیبت میں مبتلا کر دیا جاتا ہے تو اپنی عاجل، بے صبری اور ناشکری فطرت کی وجہ سے اس ارحم الراحمین کی رحمت سے مایوس ہو جاتا ہے۔ ورنہ اس کی رحمت تو بے پایاں اور بے حساب ہے۔ اس کی رحمت کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہیں ہے کہ رحمت کے سارے باب اسی کی طرف سے کھلتے ہیں۔ کرم کی برکھا وہی برساتا ہے۔

تین روز تک موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد وہ زندگی کی طرف لوٹ کر آیا تھا تو بڑے حیرت انگیز طور پر روبصحت ہو رہا تھا۔ کرنل ڈاکٹر عارف تو اسے ایک مریکل ہی کہتے تھے۔

پوری طرح ہوش میں آنے کے بعد اس نے سب سے اپنا تعارف بھی کرا دیا تھا اور آفتاب کا بتا کر اسے بلوا لیا تھا۔ آفتاب بڑی پابندی سے تقریباً روز ہی اس سے ملنے آتا تھا اور وہاں ہسپتال میں — اس کی ایک بہت ہی اعلیٰ ڈگری یافتہ ہونے کی وجہ سے تقریباً تمام ڈاکٹروں سے ہی دوستی ہو گئی تھی۔ اور وہاں۔

ایک خبر یہ بھی گرم تھی کہ ہسپتال کی ایک نرس نے اپنا خون دے کر اسے زندگی کی طرف لوٹایا تھا۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا تھا کہ خون کی چار بوتلیں چڑھانے کے باوجود بھی چونکہ اس کے جسم میں خون کی کمی پوری نہیں ہو سکی تھی اس لیے او نیگیٹو بلڈ کی ضرورت تھی جو موسم کی خرابی کی وجہ سے فوری طور پر دستیاب نہیں ہو سکا تھا۔ اس لیے مجبوراً نرس کی درخواست پر اس کا خون لیا گیا تھا۔ بہرحال دوسروں کے نزدیک یا دوسرے معنوں میں ہسپتال کے عملے کے نزدیک یہ کوئی ایسی اہم یا خاص بات نہ تھی۔

کیونکہ طبی امداد کے طور پر عموماً ایسی مدد دینی ہی پڑتی ہے۔

مگر خود اسفند کے نزدیک یہ بہت اہم اور بڑی بات تھی۔

وہ اس نرس کو دیکھنا چاہتا تھا جس نے اسے زندگی کے سب سے نازک لمحات میں اپنا خون دیا تھا۔

اس کے خیال میں وہ اس کی محسنہ تھی اور وہ اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ کئی بار اسٹاف کے لوگوں سے بھی اس کے متعلق پوچھ چکا تھا۔

بلکہ اسے بلوا بھی چکا تھا۔

مگر یا تو وہ آف ڈیوٹی ہوتی یا پھر بہت مصروف۔

اور پھر اس کی ڈیوٹی عموماً رات کو ہی لگتی تھی۔

گو رات گئے تک جاگتی بھی تھی مگر جہاں وہ ہمیشہ کنی کترا جاتی۔

وہاں ادھر — وہ اس کے انتظار میں سلیپنگ پلز کے اثر سے پڑ کر سو جاتا۔

یوں یہ آنکھ مچولی کئی روز تک قائم رہی۔

اصل میں مس شان نے دانستہ اس سے روپوشی اختیار کر رکھی تھی۔ وہ روگردانی سے کام لے رہی تھی۔ کیونکہ اسے یہ گوارا نہ تھا کہ اس کے سامنے جا کر اسے خواہ مخواہ ہی احساس ممنونیت میں مبتلا کر کے گویا اپنی ایک چھوٹی سی نیکی کو برباد کرے۔

جب کہ بات بھی کافی پرانی ہو چکی تھی۔

بلکہ ہسپتال کے عملے کے نزدیک آئی گئی ہو چکی تھی۔

مگر وہ تھا کہ اس کے نزدیک نرس سے مل کر اس کا شکریہ ادا کرنے کے سوا کوئی دوسرا مقصد باقی ہی نہیں رہ گیا تھا۔

اب تک پٹیوں کی قید میں جکڑا پڑا تھا۔ ورنہ خود اٹھ کر اس سے ملنے، اس کا شکریہ ادا کرنے جاتا۔

وہ بارہا آفتاب سے بھی اس بات کا تذکرہ کر چکا تھا۔

مگر آفتاب نے کبھی اس کی بات کو اہمیت نہیں دی تھی۔ بلکہ آل رائٹ — کہہ کر ٹال دیا تھا کہ

"اچھا بھئی۔ پہلے ٹھیک تو ہو جاؤ پھر اس کا شکریہ بھی ادا کر لینا۔ وہ یہیں تو ملازمت کرتی ہے۔ کہیں بھاگی تو نہیں جا رہی۔"

کیونکہ آفتاب کے نزدیک اپنا لہو دے کر کسی کی جان بچانا ایک لائق تحسین بات ضرور تھی مگر اتنی بھی نہیں جتنا کہ وہ ظاہر کر رہا تھا یا سمجھ رہا تھا۔ یوں تو اس کے زخم تیزی سے بھرنے شروع ہو گئے تھے۔ پیشانی اسٹیئرنگ سے ٹکرائی تھی تو بھوں بری طرح پھٹ گئی تھی اور نصف سر تک سر کی کھال بری طرح رگڑ کھانے کی وجہ سے کٹ کر آنکھوں اور پیشانی پر آ گئی تھی جسے دوبارہ اپنی جگہ جمانے کی غرض سے اٹھارہ ٹانکے لگے تھے۔ گھٹنے کہنیاں سبھی زخمی ہو گئے تھے اور ٹخنے کی ہڈی اگر ٹوٹی نہیں تو اپنی جگہ سے کھسک ضرور گئی تھی جسے آپریشن کے ذریعے اس کی جگہ پر سیٹ کر کے تلوے سے پنڈلی تک پلاسٹر چڑھا دیا گیا تھا جس کی وجہ سے ہسپتال میں اس کا قیام طویل ہو گیا تھا مگر جب سے وہ ہوش میں آیا تھا اپنے سارے اخراجات خود اپنی جیب سے ادا کر رہا تھا۔ وہ کمرشل وارڈ سے اسپیشل وارڈ میں منتقل ہو گیا تھا۔

چہرہ بن گیا۔ اس کی گفت و شنید، عادات و اطوار اور رکھ رکھاؤ سبھی کچھ اس کے اعلیٰ طبقے سے ہونے کی غمازی کرتے تھے۔

پھر سب کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ وہ ایک اعلیٰ ڈگری اور تعلیم یافتہ انگلینڈ ریٹرن ڈاکٹر بھی ہے۔ اسی لیے سب اس کی بہت عزت کرتے تھے اور وہ سب میں بے حد ہر دلعزیز ہو گیا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ عام دستور کے مطابق جو ہسپتالوں کا ایک چلن سا بن گیا ہے اس کے قیام کی طوالت ڈاکٹروں اور ہسپتال کے عملے کی بے نیازی اور لاپروائی کا شکار نہیں ہوئی تھی بلکہ اس کے برعکس اسے خصوصی توجہ سے نوازا جاتا تھا۔

بہرکیف — پھر وہ دن بھی آ گیا جب پٹیوں سے آزاد ہو کر وہ اس قابل ہو گیا کہ ہسپتال سے ڈسچارج لے سکے۔ ایکسیڈنٹ کی چوٹ ہی تکلیف دہ تھی جس کی وجہ سے اس کے پیر میں لنگ سا آ گیا تھا۔ اصل میں آفتاب نے اپنے ایک دوست [illegible] کے ہاں جو اتفاق سے سرگودھا کا ہی رہنے والا تھا اس کی رہائش کا بندوبست کیا تھا اور محض اس کی خاطر ہفتے عشرے کی چھٹی لے کر آیا تھا۔

اور جب تقریباً سارے ہی عملے کا شکریہ ادا کر کے اور رخصتی کلمات کہنے کے بعد وہ آفتاب کے ساتھ باہر کو نکلا تبھی اسے اپنی محسنہ بڑی شدت سے یاد آ گئی۔ اس نے چلتے چلتے کسی خیال سے رک کر ہیڈ نرس مسز ضیا سے پوچھی۔

"مس شان کہاں مل سکیں گی مسز ضیا؟" اور اس سوال پر مسز ضیا نے پہلے تعجب سے اسے دیکھا اور پھر تھوڑا سا مسکرائی۔

"ڈارک روم میں مسٹر۔" اور اس کے مسکرا کر ڈارک روم کہنے پر آفتاب کچھ اور ہی سمجھا۔ اسے ٹہوکا دے کر آہستہ سے بولا۔

"یار کیوں ایک معمولی سی نرس پر اپنی انرجی ضائع کر رہے ہو۔ تم سے کھڑا تو ہوا نہیں جا رہا۔ چلو سیدھی طرح جیپ میں جا کر بیٹھو۔" مگر جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔

ضیا کو مخاطب کر کے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

"کیا ڈارک روم میں کوئی اور بھی موجود ہوگا۔ میرا مطلب ہے مس شان کو کیونکر شناخت کر سکوں گا۔" اس کے اس سوال کا جواب بھی مسز ضیا نے واقعی نکال کر ہی دیا۔

"مسٹر، شناخت کر لینا کچھ مشکل تو نہیں ہوگا۔ کیونکہ جب وہ ڈارک روم میں پہنچتی ہے تو وہاں اجالا سا پھیل جاتا ہے۔ مگر وہ بہت خوبصورت ہے۔ وہ دیکھیے۔ وہ سامنے۔ وہ جو ڈیوٹی روم کی طرف جا رہی ہے وہی مس شان ہے۔"

مسز ضیا کی زبانی اس کا اتا پتا معلوم کرتے کرتے وہ سامنے آ گئی تو آفتاب کو بھی وہیں چھوڑ کر اس کی طرف بڑھ گیا۔

"کمال ہے۔ عجیب شاعرانہ مزاج رکھتی ہے یہ مسز ضیا بھی۔ مگر اب تم بھی ذرا دل تھام کے ڈارک روم میں قدم رکھنا۔ پہلے ہی چلنے میں لڑکھڑا رہے ہو۔ اس کے حسن کا جلوہ دیکھ کر کہیں پھسل پڑے تو کہیں پھر تمہارے گٹے میں پلاسٹر نہ چڑھوانا پڑ جائے۔" آفتاب بڑے بڑے قدم اٹھاتا اس کے پیچھے چلتا ہوا بولا۔

"میں تمہاری طرح بے چینی کا بدھتا نہیں کہ ذرا کوئی اچھی صورت دیکھی اور ہو گئے چاروں خانے چت۔ اور نہ اس وقت میں کسی مذاق کے موڈ میں ہوں۔ انسانیت کے اصول کے تحت اس کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں اور بس۔" وہ آفتاب کے مزاحیہ فقروں پر قدرے جھنجلاتے ہوئے انداز میں بولا۔

اسی اثنا میں دونوں ڈیوٹی روم کے دروازے تک پہنچ گئے تھے۔ اس نے ڈیوٹی روم میں قدم رکھا تو آفتاب فقرہ چست کیے بغیر نہ رہا۔

"ذرا سنبھل کے میری جان۔" مگر اس نے اس کی بکواس پر کوئی دھیان نہ دیا اور سیدھا اندر چلا گیا۔ وہ بڑی سی ٹیبل پر رکھے کسی چارٹ پر جھکی شاید اسی کا مطالعہ کر رہی تھی کہ اس نے اس سے تھوڑے فاصلے پر رک کر پوچھا۔

"اگر میں غلطی پر نہیں تو آپ ہی مس شان ہیں؟" اور وہ بڑے غیر ارادی طور پر اس کی آواز پر چونکتے ہوئے سیدھی ہو کر اس کی طرف پلٹی تو اس کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی اسفند کو یوں لگا جیسے زمین کی گردش تھم گئی ہو۔

اور زمین تو کیا کائنات کی ہر شے سانسیں لینا ترک کر گئی ہو۔ کہنے کو ہزاروں باتیں تھیں اور پوچھنے کو بے شمار سوالات مگر تعجب اور بے یقینی کی یلغار میں اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی گویائی سلب ہو گئی ہو۔ اور ہونٹوں پر تالے سے پڑ گئے ہوں۔ وہ ساکت سا۔ تعجب سے آنکھیں پھاڑے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

جب کہ اس کے برعکس مس شان کی شفاف پیشانی پر ناگواری کی شکنیں سی ابھر آئیں۔ اور حسین ترین چہرے سے برہمی کے آثار ہویدا ہونے لگے۔

اس نے میز پر پڑا ہوا چارٹ اٹھایا اور پلٹ کر ڈیوٹی روم سے جانے لگی تو آفتاب نے جس کے لیے سارا عمل اور معاملہ نہایت ہی ناقابل فہم تھا آگے بڑھ کر اس کا راستہ روکتے ہوئے اس کے ڈیوٹی روم میں آنے کی غرض و غایت بیان کی۔

"یہ میرے دوست ڈاکٹر اسفند چونکہ صحت یاب ہو کر گھر جا رہے ہیں اس لیے اس وقت آپ کا شکریہ ادا کرنے آئے ہیں۔ آپ نے اپنا خون دے کر نہ صرف ان پر احسانِ عظیم کیا ہے بلکہ دوسرے معنوں میں انہیں خرید لیا ہے۔"

گو آخری فقرہ آفتاب نے بظاہر نہایت سادگی سے کہا تھا مگر مس شان کو وہ معنی خیز سا لگا۔ وہ کچھ زیادہ ہی کبیدہ ہو کر بولی۔

"میرے خیال میں آپ کو شدید قسم کا مغالطہ ہوا ہے ورنہ میں نے کسی پر احسان کیا ہے نہ کسی کو خریدا ہے۔ بس ایک انسانی فریضہ ادا کیا ہے جس کی ادائیگی ہر انسان پر ہی لازم ہے۔" اس نے آفتاب کی طرف دیکھے بنا گھومتے ہوئے بغیر ہی کہا۔ اور پھر جیسے ڈیوٹی روم سے نکل گئی۔

اس کے جاتے ہی آفتاب اس کی طرف گھوما جو ڈیوٹی روم میں رکھی ٹیبل سے کچھ فاصلے پر اسی ساکت اور صامت سی کیفیت میں کھڑا تھا۔

آفتاب نے اس کے قریب جا کر اس کی آنکھوں کے سامنے پہلے ہاتھ ہلایا۔ پھر اس کی پیشانی چھو کر تشویشناک انداز میں منہ بنایا اور پھر اس کی نبضیں ٹٹولنے لگا۔

مگر نہ معلوم کہاں پہنچا ہوا تھا اس وقت وہ کہ اس نے جنبش کی نہ پلک جھپکائی۔

آخر جب تنگ آ کر آفتاب نے اسے بری طرح جھنجھوڑا تو اس نے بری طرح آفتاب کو جھڑکا۔

"یہ کیا حماقت ہے۔ آفتاب تم اپنے ہوش میں تو ہو؟"

"ہاں میں ہوش تو تمہارے گم ہیں اور الٹا مجھ سے پوچھ رہے ہو کہ میں اپنے ہوش میں تو ہوں۔ کمال ہے یار۔ تم تو اسے دیکھ کر ایسے چت ہوئے جیسے اس سے قبل تم نے کوئی حسین چہرہ دیکھا ہی نہ ہو۔ جبکہ تم تو کئی سال انگلینڈ کے پرستان میں گزار کر آئے ہو۔ بھلا وہ بھی دل میں کیا سوچ رہی ہوگی کہ ڈاکٹر سردار محمد اسفند علی آر سی پی اظہارِ تشکر نہیں بلکہ اظہارِ عشق کرنے کی غرض سے آئے تھے۔ حد ہو گئی اس دیوانے پن کی بھی۔" آفتاب نے اسے لتاڑا۔

لیکن وہ اپنے حواس میں تھا ہی کہاں۔

اس کے ہوش تو وہ گم کر گئی تھی۔ وہی ایک معمولی سی لڑکی مس شان۔ وہ اسی کے خیالوں میں گم تھا۔

اور خود کو اس بات کا یقین دلانے میں کوشاں تھا کہ اس نے جو صورت ابھی ابھی دیکھی ہے وہ سلوچنا کے سوا کسی کی نہیں ہو سکتی۔ اور ادھر آفتاب تھا کہ ایک تسلسل سے بولے جا رہا تھا۔ آخر وہ بہت جھنجلا کر بولا۔

"افوہ تم تھوڑی دیر کے لیے اپنا منہ بند نہیں کر سکتے۔ بیکار میں ہی میرے کان کھائے جا رہے ہو۔"

"میں تو کان ہی کھا رہا ہوں مگر وہ تو تمہاری عقل ہی چر گئی ہے۔ کہ آخر بات کیا ہے کچھ تو بتاؤ۔" آفتاب نے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا کہ وہ ہنوز ایک خود فراموشی کی کیفیت میں مبتلا تھا۔

"جب کوئی بات نہیں تو پھر تمہیں کیا بتاؤں۔ چلو آؤ اب چلتے کیوں یہاں یوں تو بڑی عجلت دکھا رہے تھے۔"

وہ آفتاب کی باتوں سے زچ سا ہو کر بولا اور یہی بات کہتا ہوا ڈیوٹی روم سے باہر نکل آیا۔

"ہوں تو دال میں کچھ کالا ضرور ہے جو تم یوں اتنی کترا رہے ہو۔" آفتاب اس کے ساتھ ڈیوٹی روم سے باہر آتا ہوا بولا کہ بچہ یار اتنا بیوقوف تو نہیں تھا جو مس شان کو دیکھ کر اس کے بے خودی کے مظاہرے کو سمجھ نہ سکتا۔

"ارے نہیں یار دال میں کچھ کالا ہے نہ پیلا۔ اصل میں میں تو اب تک یہی کہتا آ رہا تھا کہ وہ بہت ضعیف عمر کی ہوگی کوئی نہ کوئی صورت ضرور ہوگی۔ مگر اب جو اسے دیکھا تو سارے اندازے ہی باطل نکلے۔ اور بس۔"

آفتاب کو اس قدر تجسس دیکھ کر آخر اسے بات بتانی ہی پڑی۔

"ہوں تو یہ بات ہے۔ اور وہ جو مسز ضیا اس کی تعریف میں رطب اللسان نظر آ رہی تھی اس کی باتوں کو کیا تم نے دیوانے کی بڑ سمجھا تھا۔" آفتاب اس کے ساتھ چلتا ہوا جیپ کے نزدیک آ کر بولا۔

"ہاں میں اس کی باتوں کو بڑ ہی سمجھا تھا۔ کیونکہ جس انداز میں وہ مسکرا کر کہہ رہی تھی اسے میں نے مذاق پر ہی محمول کیا تھا جیسے تو میں ایک وہم ہی سا یقین ہو گیا تھا۔" مگر اس کی اس وضاحت پر بھی آفتاب کو یقین نہیں آیا۔

"لیکن اسے دیکھ کر اگر تمہیں تعجب بھی ہوا تھا تو اس قدر تو نہیں ہونا چاہیے تھا کہ تمہارا انداز ہی عشق ہو گیا۔"

آفتاب نے اس کے ساتھ جیپ میں ——— بیٹھ کر جیپ اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"او ہو بھئی اب اگر مگر کی رٹ لگا کر بات کا بتنگڑ بنا لینے کی کوشش کیوں کر رہے ہو۔ میں تو اسے دیکھ کر اس وجہ سے بھونچکا رہ گیا تھا کہ بھلا اس نازک اندام سی لڑکی کے جسم سے خون کی پوری ایک بوتل نکل گئی ہو گی تو اس کے ناتواں آ گیا ہوگا۔" اس نے آفتاب کے تجسس کو ختم کرنے کی غرض سے مزید بات بتائی۔

"ہا ہا ہا۔ اماں یار تم تو ... کہ تم اسے دیکھ کر چاروں خانے چت ہو گئے۔ خیر اب زیادہ مسکہ نہ لگاؤ۔ ہم قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ تمہارے رخ روشن پر اس وقت جو مس شان کے بعد کی سی کیفیت طاری ہے۔"

پہلے اسے تو معمولی پرلستا و پھر صفائیاں بھی پیش کر لیتا۔ آفتاب بھی ایک کائیاں تھا۔ اتنا تو سمجھ گیا تھا کہ بات کچھ بے ضرر ہے مگر کیا ہے یہ اسے معلوم نہ تھا۔

"تمہارے دماغ میں تو شیطان نے گھونسلہ بنا کر رکھا ہے جہاں ایسی باتوں کے سوا اور سوجھ ہی کیا سکتا ہے۔ مگر اب اس ناٹک کو ختم ہی کر دو تو بہتر ہے۔" وہ اتنی بیزاری اور ناگواری سے بولا کہ آفتاب کو خاموش ہی ہونا پڑا۔ اصل میں وہ اسفند کے خیالات میں بری طرح حارج ہو رہا تھا۔ جونہی وہ چپ ہوا اسفند کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات کی ایک رو سی چلنے لگی مس شان کا چہرہ۔ انداز۔ قدوقامت بلکہ پورا سراپا ایک وجود کی صورت میں اس کی آنکھوں میں اتر آیا۔

وہی چہرہ۔ وہی رنگت۔ وہی سراپا۔ وہی تیکھا سا انداز اور وہی آواز جو اس کے دل میں نقش ہو کر رہ گئی تھی۔ کوئی چیز بھی تو اس بات کی نفی نہیں کر سکتی تھی کہ وہ سلوطہ نہیں ہے۔ اور اگر وہ سلوطہ سے اتنی زیادہ مشابہت بھی رکھتی ہے تب بھی میں یہی کہوں گا کہ وہ سلوطہ ہی ہے۔ کیونکہ میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں سامنا اور صریح دھوکا۔ میں تو ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں بھی اسے پہچان سکتا ہوں۔

وہ خواہ کسی روپ اور کسی بھیس میں بھی میرے سامنے آئے۔ حد تو یہ ہے کہ اس کی آواز بھی ہو بہو وہی ہے۔ ہاں وہ صد فی صد سلوطہ ہی ہے۔ تبھی تو وہ میرے بلانے کے باوجود میرے پاس نہیں آئی۔ میرا سامنا کرنے سے گریزاں رہی۔ کہ کہیں میں اسے پہچان نہ جاؤں۔ ورنہ اگر وہ مس شان ہی ہوتی تو مجھے دیکھ کر اس قدر چونکتی اور گھبراتی نہیں۔ یوں جلدی سے کترا کر نہ نکل جاتی۔ نہ ہی اس قدر ناگواری اور بیزاری کا اظہار ہی کرتی بلکہ بڑے اخلاق اور خندہ پیشانی سے پیش آتی کیونکہ بہرحال رخصت میں اس کا شکریہ ادا کرنے ہی تو گیا تھا اسے کاٹنے یا پھاڑنے کی غرض سے تو نہیں۔

یوں بھی یہ عام سی نرسیں بڑی ہنس مکھ اور تھوڑی تھوڑی خوشامدی سی ہوتی ہیں کہ ان کا پیشہ ہی ایسا ہوتا ہے۔

اپنی طبیعت پر جبر کر کے دوسروں کی دلجوئی اور خدمت کرنا۔ اور ان کا غم بٹانا۔ مگر وہ سلوطہ ہی ہے۔ مجھے معلوم ہے میرے رویے اور الزام تراشی نے اسے مجھ سے سخت بدظن اور متنفر کر دیا ہے لیکن تعجب ہے اس قدر متنفر ہونے کے باوجود بھی اس نے اپنا خون دے کر میری جان کیوں بچائی ہے؟

جبکہ میں نے تو اسے ذلیل و خوار کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا تھا۔ اب یہ سمجھ لوں کہ اس نے انسانی ہمدردی کے جذبے سے زیر ہو کر اور میری بے بسی اور بے کسی پر ترس کھا کر مجھے اپنا خون دیا تھا تو یہ میری بھول ہی ہو گی۔ اس نے یقیناً زخمی حالت میں دیکھ کر مجھے پہچان لیا ہوگا۔ مگر وہ یہاں سرگودھا تک آئی کیسے؟ کیونکہ جبکہ لفافے پر تو کراچی کی مہر لگی ہوئی تھی۔

اور پھر دن ہی کتنے ہوئے ہیں اسے اور مجھے گھر سے نکلے۔ ہم دونوں نے تقریباً ایک ساتھ ہی تو گھر چھوڑا تھا اور اتنے قلیل ترین عرصے میں وہ یہاں سرگودھا بھی پہنچ گئی اور میرے یہاں پہنچنے سے قبل وہ ملازمت پر بھی لگ گئی۔

بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔؟

پھر وہ دل ہی دل میں حساب لگانے لگا کہ سلوطہ کو اس کا گھر چھوڑے آخر کتنے دن ہوئے ہیں۔

اس کے جانے کے اگلے ہی دن وہ گھر کو خیرباد کہہ کر ہوٹل میں چلا گیا تھا۔ جہاں اس نے پورا ایک ہفتہ گزارا تھا۔ کراچی سے ملتان اور ملتان سے لاہور تین روز سفر میں گزارے تھے اور تین ہفتے لاہور میں۔ سرگودھا میں قیام کے ملا کر گویا چونتیس دن اور اسی چونتیس دن کے عرصے میں وہ طویل فاصلے پھلانگ کر کراچی سے سرگودھا بھی پہنچ گئی تھی۔ وہ بھی ہسپتال میں اس کی انٹری سے بہت پہلے۔

کیونکہ وہ وہاں پہلے سے ہی ملازمت کر رہی تھی۔

تو وہ کس طرح اور کس کے ساتھ آئی ہے۔ اور اسے ہسپتال میں اتنی جلد ملازمت کیسے مل گئی؟ کیا اس نے پہلے سے نرسنگ کی ٹریننگ لے رکھی تھی یا کسی کی خاص سفارش پر اسے ہسپتال میں ملازم رکھا گیا ہے۔؟

اور وہ رہتی کہاں ہے۔؟ کس کے پاس رہتی ہے؟

اف۔ اس قسم کے سینکڑوں سوالات تھے جو اس کے ذہن میں کلبلا کلبلا کر ایک ڈنڈی بجا رہے تھے۔ وہ سوالات کی اسی یلغار تلے دبا گم صم سا بیٹھا تھا۔ یوں جیسے جیپ میں موجود ہی نہ ہو۔ آفتاب بار بار کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اس نے جیپ کی رفتار بھی دھیمی کر رکھی تھی۔ ورنہ اس کے دوست اور کولیگ کیپٹن احتشام کا گھر چھاؤنی میں ہی تھا۔

اور چھاؤنی یعنی کینٹ ایریا ہسپتال سے کل چار میل کے فاصلے پر تھا۔ اصل میں تو آفتاب یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس کا دوست ایک عام سی نرس کو دیکھ کر اس قدر حواس باختہ کیوں ہو گیا تھا۔ کیونکہ وہ اس کی فطرت، مزاج بلکہ ٹھوس کردار سے بھی بخوبی واقفیت رکھتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا دوست آجکل کے چھچھورے نوجوانوں کی طرح خوبصورت لڑکیوں کو دیکھ کر پھسل جانے کا عادی نہیں ہے۔ بلکہ وہ بہت معزز، باوقار، مستقل مزاج اور معتبر سا انسان ہے۔ اعلیٰ نسب بھی رکھتا ہے اور حیثیت بھی۔

بہرحال وقت کم تھا اور آفتاب کو ڈیوٹی پر پہنچنے کی جلدی تھی۔ وہ اپنے کیپٹن کمانڈر سے حادثے میں بری طرح زخمی ہو جانے والے کزن کو ہسپتال سے گھر لے کر آنے کا عذر کر کے ہی تین گھنٹے کی چھٹی لے سکا تھا۔ اس لیے کیپٹن احتشام کے بنگلے پر اسے اتار کر۔ بلکہ احتشام کے بھائی سے اس کا تعارف کرا کے اس کی رہائش کے لیے مختص کیے گئے کمرے میں چھوڑ کر اپنی ڈیوٹی پر چلا گیا تھا۔

وہ بھی خدا سے یہی چاہتا تھا کہ کسی طرح اسے تنہائی اور یکسوئی نصیب ہو تو وہ سارے معاملات پر ٹھنڈے دل سے غور کرے۔

اصل میں اپنے تئیں یہ یقین دلانے کے باوجود بھی کہ مس شان اصل میں سلوطہ ہی ہے اسے کلی طور پر اطمینان نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ حالات اور کوائف ہی کچھ ایسے تھے۔

اور پھر وقت کا دائرہ درمیان میں حائل ہو رہا تھا۔ دل تو یہی گواہی دے رہا تھا کہ بلاشبہ وہ سلوطہ ہی ہے۔ لیکن دماغ دل کی اس گواہی کی نفی کرتا نظر آ رہا تھا۔ حالات بھی تو کچھ ایسا رخ اختیار کر گئے تھے کہ ان سارے واقعات کا انحصار اتفاقات۔ حادثات۔ معجزات اور کرشمات پر ہو کر رہ گیا تھا۔

یعنی اس کا سرگودھا تک آنا اور پھوپھی سے ملنا تو اتفاقات پر ہی منحصر تھا۔ اور اس کے نزدیک بھی کوئی ایسا معجزہ یا کرشمہ نہیں تھا کیونکہ دنیا میں آئے دن ایسے ہی واقعات رونما ہوتے ہی رہتے ہیں۔

مگر اس کا سرگودھا آتے ہوئے ایک حادثے سے دوچار ہو جانا اور ایک ایسے ہسپتال میں داخل ہو جانا جہاں انسانی دوستی میں نرس مس شان کا اسے خون دینا اور پھر۔ اس کی سلوطہ سے اتنی زیادہ مشابہت کہ ایک کو چھپاؤ اور دوسری کو سامنے کر دو۔

پھر بھی دیکھنے والا اس میں کوئی خامی، کوئی فرق نہ تلاش کر سکے۔ وہ ڈاکٹر تھا اور اس نے پڑھا ہی نہیں سن اور دیکھ بھی رکھا تھا کہ جڑواں بچوں میں آپس میں بہت مشابہت ہوتی ہے۔

بعض اوقات تو ان کی علیحدہ علیحدہ شناخت کے لیے کوئی نہ کوئی شناختی نشان لگانا پڑتا ہے اور اتنی زیادہ مشابہت صرف جڑواں بچوں میں ہی ہوتی ہے۔ اور پھر ان کے بہن بھائیوں میں اگر ہوتی بھی ہے تو اتنی زیادہ نہیں۔ اور ایسے لوگ جن کا آپس میں کوئی رشتہ ہی نہیں ہوتا۔ جن کی کوئی بھی جداگانہ ہوتی ہے اور [illegible] کی بھی۔ اگر آپس میں مشابہت ہوتی ہے تو اتنی زیادہ نہیں جتنی کہ اس مس شان اور سلوطہ میں تھی۔

جب کہ وہ پھوپھا کی زبانی یہ بھی سن چکا تھا کہ ان کی دوسری بیوی کے بطن سے شرف اور وہ بنت سلوطہ ہی تولد ہوئی تھی۔ گویا اس کا امکان بھی ختم ہو گیا تھا کہ اس کی کوئی دوسری جڑواں بہن بھی ہو سکتی ہے۔ اس نکتے پر غور کرتے ہوئے وہ اسی نتیجے پر پہنچا تھا کہ وہ خود جا کر مس شان سے ملے گا اور یہ معلوم کر سکے گا کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ لیکن اسے یہ بھی یقین ہو چکا تھا کہ اگر وہ واقعی سلوطہ ہی ہے تو پھر اس کے لیے زندگی بہت دشوار رہے گا۔

چونکہ نوبت معمولی سی بات تھی۔ اسفند کو تو ایک بیقراری سی تھی کہ نہ اٹھتے چین نہ بیٹھتے چین۔ بس ایک ہی خیال، ایک ہی لگن، ایک ہی دھن کہ بس کسی نہ کسی طور پر مس شان کی اصلیت کو دریافت یا دوسرے معنوں میں اس کی اصلیت کا پردہ چاک کر کے سلوطہ کو برآمد کر لے۔ گویا اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کس طرح مس شان کو سلوطہ ثابت کر کے دکھا دے۔

ان دنوں وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ پھوپھا سے وعدہ کر کے آنے کے بعد سلوطہ کی طرف سے اس کا اپر کشن بہت خراب ہو گیا تھا۔ اس کے بارے میں کیسے خیالات تھے۔ جن کے پیش نظر وہ سلوطہ کو کھوج نکالنے میں نیت سے کام لے رہا تھا۔

کبھی تو بیٹھے بیٹھے کراچی کی بھری دنیا کو دیکھ کر اس خیال سے وہ الجھا سا ہو گیا تھا کہ کراچی جیسے غدار شہر میں جو سمندر کی طرح ٹھاٹھیں مارتا ہے ایک تنکے کی طرح بہتی ہوئی لڑکی ہر شے کو اپنے اندر سمو لیتا ہے سلوطہ کو آسانی سے ڈھونڈ نکالنا آسان کام نہ تھا۔ البتہ جب وہ کراچی واپس لوٹے گا تو اسے ڈھونڈنے کی کوشش ضرور کرے گا۔ اور اس کا اصل سبب یہی تھا کہ اس کے دل سے سلوطہ کے حصول کی لگن جاتی رہی تھی۔ وہ تو حالات کشاں کشاں اسے سرگودھا لے آئے تھے اور اس علاقے پر وہ صدق دل سے کرشمہ قدرت اور معجزات پر ایمان لے آیا تھا۔

اسے اسپتال سے آفتاب کے دوست کے گھر آئے دو روز ہو گئے تھے۔ اور جب سے بار بار وہ ان حالات پر غور کر کے واقعات کی کڑیاں جوڑ رہا تھا۔

تیسرے روز وہ کیپٹن احتشام کے گھر آیا اس سے اگلے روز اپنی شدید مصروفیت کی وجہ سے آفتاب اس سے ملنے نہیں آ سکا تھا۔ اس نے فون پر اس سے معذرت بھی کر لی تھی۔ مگر اس سے اگلے روز بھی اس کے آنے کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ کیونکہ اس کی راہ دیکھتے دیکھتے شام ہو گئی تھی۔ وہ چاہتا تو خود بھی اسپتال جا سکتا تھا۔ مگر اسپتال جانے کا ایک تو کوئی جواز ہی نہ تھا۔ کیونکہ اس کے ٹخنے پر جو بینڈیج بندھی ہوئی تھی وہ ہڈیوں کو آپس میں جوڑنے کے سلسلے میں باندھی گئی تھی اور اس کے کھلنے یا تبدیل کیے جانے کا فی الوقت کوئی امکان ہی نہیں تھا۔

جبکہ چلنے پھرنے میں اسے کوئی تکلیف یا دقت بھی نہیں ہوتی تھی۔ بس کبھی کبھی پیر زمین پر ٹکاتے وقت ہلکی سی چبھن ضرور محسوس ہوتی تھی۔ اور یہ کوئی ایسی قابلِ تشویش بات نہیں تھی۔

دوسرے وہ آفتاب کے ساتھ جانا چاہتا تھا کیونکہ آفتاب کو نہ صرف بات کرنے کا ٹکٹ آ جاتا تھا بلکہ وہ اسپتال کے عملے سے خاصا گھل مل بھی گیا تھا۔ (کہ اس کی فطرت ہی کچھ ایسی تھی) اور اگر وہ مس شان کے بارے میں کچھ معلومات بہم پہنچا سکتا تھا تو اسی کے ذریعے پہنچا سکتا تھا۔ بلکہ وہ تو مس شان سے ملنے اور اسے غور سے دیکھنے کو بے چین ہوا جا رہا تھا۔ بس یہی ایک اشتیاق یہی ایک آرزو تھی جس نے اسے کیپٹن احتشام کے گھر کے اجنبی سے ماحول میں رہنے پر مجبور کر رکھا تھا۔ ورنہ وہ تو ایک دن بھی سرگودھا میں رہنے کا روادار نہ ہوتا۔

کیونکہ مس شان اس کی راہ میں ایک رکاوٹ سی بن کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اور وہ اس کا معمہ حل کیے بغیر واپس نہیں جا سکتا تھا۔ بہرحال پورا دن گزار کر کہیں بعد مغرب آفتاب نکل کے آیا تھا اس نے آتے ہی گزشتہ روز نہ آسکنے کی گویا صفائی پیش کی۔

"ویری سوری یار، پرسوں ڈیوٹی پر واپس پہنچتے ہی کچھ ایسے اہم کام سر پر ڈال دیے گئے کہ پلک جھپکانے کی بھی مہلت نہیں ملی یقین کرو دو راتوں سے سویا ہی نہیں۔ آج میس کے قریب کہیں جا کر فرصت ملی تو اتنا تھک گیا تھا کہ پہنچتے ہی وردی اور جوتوں سمیت ہی پڑ کر سو گیا۔ اب آنکھ کھلی تو بس لباس تبدیل کر کے سیدھا تمہارے پاس چلا آیا۔"

اور وہ جس کا موڈ آفتاب کا انتظار کرتے کرتے نہ صرف آف ہو گیا تھا بلکہ اس اجنبی ماحول میں تنہا بیٹھے بیٹھے وہ بوریت کا شکار بھی ہو گیا تھا پھولے پھولے منہ کے ساتھ نروٹھے سے انداز میں بولا۔

"جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے تو کم از کم میرے سامنے تو تمہیں کوئی وضاحت پیش کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ میں تمہارے فرائض کی نوعیت سے بخوبی واقف ہوں۔"

"اچھا اگر واقف ہی ہو تو پھر تمہارے رخِ روشن پہ یہ اتنی موٹی چربی کی تہہ کیوں جمی نظر آ رہی ہے اس پر انداز تکلم بھی ایسا جیسے کورے مٹکے میں پتھر بھر کر کوئی اسے ہلا رہا ہو۔" آفتاب نے اسے منہ پھلائے دیکھ کر پوچھا۔

"چربی کی تہہ میرے چہرے پہ نہیں تمہاری آنکھوں پہ چڑھ گئی ہے۔ تبھی تو ساون کے اندھے کی طرح تمہیں ہرا ہی ہرا نظر آ رہا ہے ورنہ میں تو جیسا تھا ویسا ہی ہوں اب تمہیں دیکھ کر ٹھمکا لگانے سے تو رہا تھا۔" اسفند نے جلے کٹے سے انداز میں کہا۔

"ہا ہا ہا یہ ٹھمکا بھی خوب کہا تم نے۔ گویا رقص کے فن پہ بھی تمہیں خاصا عبور حاصل ہے۔ واہ کیسے ٹھمک ٹھمکا کہا ہے۔ واہ جواب نہیں اس ادا کا بھی۔" آفتاب ایک قہقہہ لگا کر بولا۔ اب آفتاب کو اس کی ناراضگی کا اصل سبب تو معلوم نہ تھا۔ وہ تو یہی سمجھ رہا تھا کہ اس کی دو دن کی غیر حاضری نے اسے ناراض کر دیا ہے۔ اسفند نے جواب میں بھی کچھ نہیں کہا۔ بس اس پہ ایک جلتی سلگتی نظر ڈال کر رہ گیا۔

"ارے یار جب میری مجبوری سے واقف ہی ہو تو پھر اتنا تاؤ کھانے کی کیا ضرورت ہے جانتا ہوں کہ اس اجنبی اور نئے سے ماحول میں تنہا رہ کر تم نے بڑی کوفت اٹھائی ہوگی۔ مگر خیر اب تو میں فارغ ہوں کل عام تعطیل ہے اور پرسوں بھی سمجھو چھٹی ہی ہوگی اس کے بعد پورا نہیں تو کم از کم آدھا دن بلکہ آدھی رات تو تمہارے ساتھ ہی گزرا کرے گی۔" آفتاب اسے اس قدر چیں بجبیں دیکھ کر بولا۔

"ہونہہ آدھا دن اور آدھی رات۔ جیسے میں ساری زندگی یہیں گزارنے آیا ہوں۔ پتا نہیں وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جو مجھے بیٹھے بٹھائے یہاں آنے کی سوجھی تھی۔ جو یہاں آ کر ایسا پھنسا کہ آج بیس بائیس روز ہو گئے اور کوشش کے باوجود یہاں سے نکل ہی نہ سکا۔ مگر اب ایک دن بھی مزید مجھے یہاں گزارنا گوارا نہیں میں کل صبح ہی یہاں سے چلا جاؤں گا۔" اسفند بگڑے بگڑے انداز میں بولا۔

"اچھا تو کیا تمہارے ٹخنے کی چوٹ ٹھیک ہو گئی ہے۔" آفتاب نے واپسی کے لیے اسے اس قدر سنجیدہ دیکھ کر اسے ٹخنے کی تکلیف کا احساس دلایا۔

"ٹخنے کی چوٹ کوئی ایسا مشکل یا تشویش ناک مسئلہ نہیں ہے۔ جونہی ہڈی اپنی جگہ پہ جم جائے گی بینڈیج بھی کھول دی جائے گی اور یہ کام کراچی میں بھی ہو سکتا ہے بلکہ زیادہ بہتر طور پر ہو سکتا ہے۔" اس نے بیزار کن سے لہجے میں کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر ابھی تو تمہارے سر کے ٹانکے بھی خشک نہیں ہوئے۔ تمہیں جانے سے پہلے کم از کم ایک مرتبہ کرنل عارف کو دکھا دینا چاہیے تھا۔ اور چلنے پھرنے میں تمہارے پیر میں تکلیف تو نہیں ہوتی۔" آفتاب چاہ رہا تھا کسی بہانے وہ اپنے دوست کو جانے سے باز رکھے۔

"نہیں۔ اب مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ سر کے ٹانکے بھی آدھے سے زیادہ خشک ہو کر جھڑ چکے ہیں۔ اور اگر نہ بھی جھڑے ہوں گے تب بھی میں یہاں سے جانے کا مصمم ارادہ کر چکا ہوں۔" اسفند اٹل سے لہجے میں بولا۔

"خیر تمہاری مرضی۔ ورنہ میں نے تو ایک قاعدے کی بات کہی تھی۔ کہ ایک تو تم خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے کمزور ہو گئے ہو۔ دوسرے جانے سے پہلے تمہیں کم از کم کرنل عارف اور سرجن افتخار وغیرہ کا شکریہ تو ادا کرنا چاہیے تھا جنہوں نے تمہیں بچانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا بلکہ دوسرے معنوں میں دن کو دن سمجھا تھا نہ رات کو رات۔" آفتاب نے کہا۔

"خیر ان دونوں سرجنز کا ہی نہیں بلکہ تقریباً پورے ہی عملے کا شکریہ میں پرسوں وہاں سے روانگی کے وقت ادا کر چکا ہوں اور جہاں تک میری جان بچانے کا سوال ہے تو وہ اللہ تعالیٰ نے ایک نرس کے دل میں میری ہمدردی اور رحم ڈال کر بچائی تھی۔ ویسے بھی موت اور زیست خدا کے ہی اختیار میں ہوتی ہے۔ کسی بندے میں اتنی تاب اور مجال نہیں کہ وہ کسی کو مار یا جلا سکے۔" اسفند بولا۔

"خیر یہ تو ایک جاہل شخص بھی جانتا ہے کہ موت و زیست خدا کے اختیار میں ہی ہوتی ہے۔ مگر موت کے منہ سے نکال کر زندگی کی طرف لے جانے کا فرض بھی خدا نے بندے کو ہی سونپا ہے۔ ورنہ ایکسیڈنٹ کے بعد جو حالت تمہاری ہو گئی تھی اگر ایسی حالت میں تمہیں یونہی چھوڑ دیا جاتا یعنی فی سبیل اللہ تو پھر آج تم یوں بیٹھے باتیں کرتے نہ نظر آتے۔ ویسے یار ایک بات تو بتاؤ۔ کیا تم نے اپنے شوق سے یہ میڈیکل لائن اختیار کی تھی یا محض اپنے والدین کی دیرینہ خواہش پہ یہ لائن اختیار کرنے پہ مجبور ہو گئے تھے۔" آفتاب اس کی باتوں پہ قدرے جز بز سا ہو کر بولا۔

"کیوں بھئی یہ خیال تمہیں کیوں آیا۔ جبکہ تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ میرا شروع سے رجحان ہی اس طرف تھا۔ اور پھر میں کسی پریشر میں آ کر وہ بھی میڈیکل کا چناؤ کرنے میں تو کسی کا بھی دخل برداشت نہیں کر سکتا تھا یوں بھی میں نے جتنا پڑھا ہے اپنے شوق سے ہی پڑھا ہے۔" وہ بھی قدرے چمک کر بولا۔

"تو پھر میں یہی کہوں گا کہ تم نے اتنا کچھ پڑھ کر محض گدھوں پہ ہی لادا ہے۔ تبھی تو ڈاکٹر ہو کر تم ایسی باتیں کر رہے ہو جو صرف ان پڑھ ہی کر سکتے ہیں۔"

آفتاب نے کہا۔ اور اسفند نے سوچا کہ اس نے آفتاب کی اسپتال جانے کی اچھی خاصی تجویز کو رد کر کے سخت حماقت کا ثبوت دیا ہے ورنہ اتنا اچھا موقع ملا تھا مس شان تک رسائی کا۔ اب بھلا اس سے کیونکر کہے کہ میں تو تمہارے انتظار میں اپنی غرض سے بیٹھا تھا کہ کب تم آؤ اور کب میں کسی نہ کسی بہانے سے اسپتال پہنچوں۔

"یار یہ بے تکی اور بے مروتی کم از کم تمہارے پیشے سے تو مطابقت نہیں رکھتی۔ تمہیں تو بہت خلیق۔ بہت منکسر المزاج ہونا چاہیے۔" اسے خاموش دیکھ کر آفتاب سمجھا کہ اس نے اپنی باتوں سے اسے قائل کر دیا ہے۔

"ارے بھئی آخر تم چاہتے کیا ہو۔ کیا یہی کہ میں کل اپنا جانے کا ارادہ ملتوی کر دوں تو یہ ممکن ہی نہیں۔" اس نے دانستہ تھوڑا سا چڑ کر کہا۔

"خیر ممکن اور ناممکن کی بات تو رہنے ہی دو۔ کیونکہ ہمیشہ سے یہی دستور رہا ہے کہ انسان آتا اپنی مرضی سے ہے اور جاتا دوسرے کی مرضی سے ہے۔ لیکن میں اب تمہیں روکوں گا نہیں۔ البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ جانے سے پہلے ایک مرتبہ اپنا چیک اپ ضرور کرا لو۔" آفتاب بولا۔

"مگر اب وقت ہی کہاں رہا ہے چیک اپ کرانے کا۔ بس میں جا رہا ہوں اور اس وقت رات ہو گئی ہے۔" اس نے اس انداز میں کہا جیسے آفتاب کی باتوں سے زچ ہو گیا ہو۔

"رات ہو گئی ہے تو کون سی ایسی آدھی یا تین چوتھائی رات ہوئی ہے۔ ابھی تو مغربی افق پہ شفق کے رنگ بھی نہیں دھندلائے۔ یہ کہو کہ تم جانے کے موڈ میں نہیں ہو۔" آفتاب اس کے اوپر ذرا سے بگڑتے پر چڑھ کر بولا۔

"ارے نہیں یار موڈ موڈ کیسا۔ کہیں نا کہیں تو چلنا ہی ہے تو پھر چلو اسپتال ہی چلے چلتے ہیں۔" اس نے مزید انکار کرنا مناسب نہ سمجھا اور اسپتال جانے کے لیے آمادگی کا اظہار کرتا ہوا بولا۔

"او کے۔ تو چلو پھر جلدی سے تیار ہو جاؤ۔" آفتاب نے اس کی آمادگی پر خوش ہو کر کہا۔

"ہیں تیار ہونا کیا ہے۔ میں کوئی بر دکھوے کو تو جا نہیں رہا۔ بس اسی پینٹ اور شرٹ میں چلا چلتا ہوں۔ ضرورت ہو تو اس پر کوٹ پہن لوں گا۔"

"ہاں کوٹ ضرور پہن لو کیونکہ گلابی جاڑا شروع ہو چکا ہے اور خنکی بھی بڑھ گئی ہے۔" آفتاب نے کہا تو اس نے اٹھ کر کوٹ پہنا اور چپ چاپ آفتاب کے ساتھ اس کی جیپ میں بیٹھ کر اسپتال کا رخ کیا۔

وہ بڑے مخمصے میں پڑ گیا تھا۔ یعنی آفتاب کے ساتھ آنے کو تو آ گیا تھا لیکن دل کی بات اسے نہیں بتا سکا تھا۔ اور پھر اس نے تو آفتاب پر ظاہر بھی یہی کیا تھا کہ اسے اس وقت اسپتال کی کوئی احتیاج ہے نہ دلچسپی۔ اس کے باوجود بھی وہ چاہ رہا تھا کہ آفتاب کے ذریعے مس شان سے ملے اور اسی کی وساطت سے مس شان سے بات کرے۔ مگر ایسا کرے تو کیونکر کرے۔ کیونکہ اسے کسی قیمت پر بھی یہ گوارا نہ تھا کہ سلوطہ سے اپنے تعلق کو بیان کرنا تو بڑی بات وہ سلوطہ کا نام بھی اس کے سامنے لے۔ کہ یہ اس کا اور اس کی پھوپھی کا ذاتی مسئلہ تھا۔ اور آفتاب کو اصل حقیقت سے آگاہ کرنا وہ اپنے وقار کے منافی سمجھتا تھا۔

ویسے بھی بھلا وہ سلوطہ سے متعلق ساری تفصیل کیونکر بیان کر سکتا تھا۔ آفتاب سے کیسے کہہ سکتا تھا کہ اس کے پھوپھا کی بہن یا پھر صحیح معنوں میں بیٹی گھر چھوڑ کر کہیں روپوش ہو گئی تھی وہ بھی اس کے گھر سے بلکہ خود اسی نے اسے گھر سے نکل جانے پہ مجبور کر دیا تھا۔ اور اس ضمن میں باقی تمام واقعات بھلا وہ کیسے اسے بتاتا کہ میں مس شان کی خوبصورتی پر نہیں مر مٹا بلکہ یہ جاننے کے لیے بے چین ہوں کہ کیا وہ سلوطہ ہی ہے اور اسی لیے بڑی بے چینی سے تمہارا منتظر تھا کہ تم آؤ اور تمہارے ساتھ چل کر مس شان کی اصلیت کا پتا چلاؤں۔ اور اسی جستجو نے میرے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی ہیں۔ میں یہ حقیقت معلوم کیے بغیر یہاں سے جا ہی نہیں سکتا۔ وہ تو بس تمہاری دو دن کی غیر حاضری پر خفگی کا ایک اظہار تھا۔ ورنہ میرا تو دور تک بھی واپسی کا ارادہ نہیں ہے۔

گومگوں سی کیفیت میں مبتلا وہ یہی سوچے جا رہا تھا کہ آفتاب کو کن الفاظ اور معنوں میں اپنے اسپتال جانے کا مقصد سمجھائے۔ آخر بہت سوچ و بچار کے بعد اس نے موضوع نکالا۔

"یار یوں تو تقریباً ہر اسپتال کا عملہ ہی فرض شناس اور مستعد ہوتا ہے لیکن ۔۔۔ اس اسپتال کے عملے کے خلوص، اپنائیت اور توجہ سے میں بہت متاثر ہوا ہوں۔ اور خاص طور پر نرس شان سے جس نے مجھے اپنا خون دے کر زندگی کی طرف لوٹا دیا۔ اصل میں تو شکریہ مجھے اس کا ادا کرنا چاہیے۔"

"لیکن تم نے اس کا شکریہ ادا تو کر دیا اب کتنی بار کرو گے آخر جبکہ وہ تو ایسی بگڑی ہی جیسے تم نے کوئی بے جا بات کہہ دی ہو۔" آفتاب بولا۔

"لیکن میں نے تو اس کا شکریہ ادا نہیں کیا تھا۔ وہ تو تم نے ہی بیچ میں کود کر نہ جانے کیا اٹ شنٹ بک دیا تھا تبھی تو اس کی تیوری ایک دم ہی چڑھ گئی تھی۔" اسفند نے کہا۔

"لو یہ اور ہوئی۔ ارے کمبخت تو تم نے تو تمہید نہیں ڈالی تھی۔ اس پر اسے دیکھ کر تمہاری سٹی ہی گم ہو گئی تھی آخر مجھے ہی بیچ میں کودنا پڑا تھا اور میں نے اس سے کون سا ایسا اظہار عشق کیا تھا صرف تمہارے آنے کی غرض و غایت ہی تو بیان کی تھی۔"

"ہاں ہاں یہ تو تم نے اچھا ہی کیا تھا مگر میں خود اپنی زبان سے ایک مرتبہ اور اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ تمہارے بقول اگر وہ ایک معمولی سی نرس بھی ہے تب بھی ہر مرد پر عورت کا احترام کرنا واجب ہے۔ خواہ وہ کسی بھی طبقے سے تعلق رکھتی ہو اور اس نے تو مجھ پر ایک احسان عظیم کیا ہے۔ اسپتال پہنچ کر سب سے پہلے ہی اس کا شکریہ ادا کروں گا۔" اسفند نے آخر اپنا مدعا بیان کر ہی دیا۔

"ہا ہا ہا تو یہ کہو کہ اس کے تیر نظر نے تمہیں گھائل ہی کر کے چھوڑا۔ ویسے وہ جو انگریزی کا ایک مقولہ ہے۔

Love at first sight saves lot of money and time.

یعنی پہلی نظر کی محبت میں پیسہ بھی بچتا ہے اور وقت بھی، تو تمہارے لیے تو یہ بہت سود مند رہے گا۔ یعنی خیال برا نہیں ہے۔ سوا اس کے کہ وہ لڑکی تمہارے طبقے سے میل نہیں کھاتی۔" آفتاب نے قہقہہ مار کر کہا۔ مگر اس کا لہجہ چبھتا سا تھا۔ اور وہ جو نہایت صبر و تحمل سے اس کی بکواس سن رہا تھا اس نے الٹا اس پہ طنز کرتے ہوئے کہا۔

"تمہاری اس لو ٹینڈنسی (LOW TENDENCY) سے اس سے زیادہ اور میں کیا ایکسپیکٹ (توقع) کر سکتا ہوں۔ ورنہ میں تو ایک اخلاقی فریضہ ادا کرنا چاہ رہا تھا۔ اور تم ہو کہ اپنی جنگلی ہوئی ذہنیت میں بات کو کہاں سے کہاں لے گئے۔"

"اے کاش جیسا کہ تم کہہ رہے ہو یہ بات وہیں تک محدود ہو۔" آفتاب پھر فقرہ کسنے سے باز نہ آیا۔ اسفند نے اس کے اس فقرے کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا۔ کیونکہ وہ اس گفتگو کو طول دینا چاہتا تھا نہ اہمیت ہی۔ یوں بھی اس نے یہ موضوع آفتاب کو پہلے سے ہموار کرنے کے لیے شروع کیا تھا۔ مبادا عین وقت کے وقت وہ ہتھے سے اکھڑ جائے۔ بہر حال۔ کچھ ہی دیر بعد راستہ تمام ہوا اور وہ دونوں اسپتال پہنچ گئے۔ اندر عمارت میں قدم رکھتے ہی فرش سے اٹھتی فنائل اور دواؤں کی ملی جلی بو نے ان کا سواگت کیا۔

اسپتال کا ماحول بھی وہی تھا جو تقریباً سارے اسپتالوں کا ہوتا ہے۔ وہی مریضوں کی آمد و رفت۔ وہی ادھر ادھر پھرتی نرسیں۔ اسٹریچر اور ٹرالیاں دھکیلتے وارڈ بوائز۔ اکا دکا راؤنڈ لگاتے ہوئے ڈاکٹرز اور وارڈ کے کھلتے بند ہوتے دروازے۔ مگر اس پر بھی ایک سونا سونا پن۔ ایک ویرانی سی۔ یوں بھی اس لمحے اسپتال میں انتشار نہیں تھا۔ زندگی کی تحریک اگر رواں دواں تھی تو بہت نپے تلے انداز میں ایک قاعدے کے ساتھ ایک گمبھیر سی خاموشی چہار اطراف مسلط تھی۔

"یار تو کوئی نظر نہیں آ رہا۔ آؤ سرجن عارف کے روم میں چلتے ہیں۔" آفتاب نے ادھر ادھر گھومتی غیر شناسا صورتوں کو [illegible] برآمدے کے چکنے اور چمکتے ہوئے فرش پر چلتے ہوئے کہا۔

جبکہ اسے کسی سرجن سے غرض تھی نہ ڈاکٹر سے۔ وہ تو اندر داخل ہوتے ہی ادھر ادھر دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ دیکھو مس شان ملتی بھی ہے کہ نہیں۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ اس کی ڈیوٹی چینج ہو گئی ہو۔ اور رات کے بجائے صبح میں تبدیل ہو گئی ہو۔ یا پھر وہ اندر کسی وارڈ یا روم میں موجود ہو۔ اب بھلا میں اس کی تلاش میں کمرہ کمرہ چھاننے سے تو رہا۔ آفتاب نے سرجن عارف کے روم میں چلنے کو کہا تو وہ انہی خیالات میں کھویا کھویا اس کے ساتھ سرجن عارف کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اور جب وہ دونوں ایک طویل راہداری سے گزر کر اور ایک نصف سے زیادہ کوریڈور عبور کر کے سرجن عارف کے کمرے تک پہنچے تو باہر بیٹھے ہوئے چپراسی نے ان کا راستہ روک کر بتایا کہ سرجن عارف ابھی تک نہیں آئے اور اب ان کے آنے کا کوئی امکان ہی ہے۔ تب آفتاب نے اسفند سے کہا۔

"چلو پھر واپس چلتے ہیں۔"

"ہاں خواہ مخواہ یہاں آ کر وقت ضائع کیا۔" اسفند بھی بولا کہ اسے مس شان کے ملنے کی بھی کوئی امید نظر نہیں آ رہی تھی۔ اندر ہی اندر وہ بجھ سا گیا تھا۔ دفعتاً آفتاب نے اسے ٹہوکا مارتے ہوئے کہا۔

"لو بھئی گلتو ان آج خود چل کر پیاسے کے پاس آ رہا ہے۔ خاصے خوش قسمت ہو تم اس معاملے میں یار۔"

"بائی دا وے۔ کیا مطلب ہے تمہارا؟" اسفند۔ اس کے جملوں کا مارنے کے باوجود بھی نہیں سمجھ سکا کہ اس کا اشارہ کس طرف ہے۔

"مجھ سے کیا پوچھ رہے ہو وہ دیکھو سامنے۔ وہ تمہاری گل اندام ادھر ہی کا رُخ کر رہی ہیں۔" اور اس کی بات پر اسفند نے بہت چونک کر سامنے دیکھا۔ اصل میں دونوں دوست راہداری عبور کر کے پیچ سے ہوتے ہوئے اسی جگہ آ گئے تھے۔ جہاں مریضوں کے وارڈ تھے اور سرے پہ ڈیوٹی روم۔ اور مس شان شاید ڈیوٹی سے ہی نکلی تھی ان کا رُخ ان دونوں کی طرف ہی تھا۔ اسے دیکھ کر اسفند کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔

قدرت اس پر اس قدر مہربان بھی ہو سکتی ہے اسے یقین ہی نہ آیا۔

اصل میں وہ اس قدر غیر متوقع اسی وقت نظر آئی تھی جب وہ اس طرف سے مایوس ہو کر واپس جا رہا تھا۔ وہ خود پر قابو نہ پا سکا۔ اور آفتاب کو پیچھے ہی چھوڑ کر تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ اور وہ جو اسے اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر جلدی سے دوسری طرف گھوم کر واپس جانے لگی تھی۔ وہ اس کا پیچھا کرتا ہوا اس کے قریب جا کر بولا۔

"سنیے مس شان میں آپ سے۔" تو اس نے گھڑی بھر کو رک کر اس کی طرف گھومے بغیر بڑے درشت لہجے میں کہا۔

"میں اس وقت سخت مصروف ہوں آپ پلیز میرا ٹائم ویسٹ نہ کیجیے۔" اور اتنا کہہ کر وہ بڑی سرعت سے ایک وارڈ میں گھس گئی۔ اور وہ اپنا سا منہ لیے وہیں کھڑا رہ گیا۔

"معلوم ہوتا ہے مس شان نے گھاس نہیں ڈالی۔ تبھی تو تم ریوڑ سے بچھڑ جانے والے مینڈھے کی طرح ایک دم بے کسی کا اشتہار بنے نظر آ رہے ہو۔ مگر خیر ہمت نہیں ہارتے دیر آید درست آید۔" آفتاب نے جو اسے مس شان کی طرف بڑھتا دیکھ کر اپنی جگہ پہ ہی رک گیا تھا۔ اچانک پیچھے سے آ کر اس کے شانے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو بری طرح چونک کر اس نے اپنے شانے پہ رکھا اس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے بڑے غصے سے کہا۔

"ہو گا بھی تمہیں تو سوائے اول فول بکنے کے کچھ آتا ہی نہیں۔ ورنہ اس کی کیا مجال جو مجھے گھاس نہیں ڈالے ایک معمولی نرس۔" حالانکہ اس وقت تو نہیں مگر آفتاب کے کہنے پہ ہی اسے اپنی اور شان کے درمیان حیثیتوں کے فرق کا اس کے ہاتھوں خوار ہونے کا احساس ہوا تھا۔ اس لیے وہ ایک دم ہی کھول اٹھا تھا۔

"ہیں ہیں اتنا غصہ ٹھیک نہیں ہے۔ ویسے بات کیا ہوئی کچھ تو بتاؤ؟" آفتاب نے قدرے سنجیدہ ہو کر پوچھا۔

"بات کیا ہوتی۔ اسی روز کی طرح نخرہ دکھا گئی ہے۔ مگر خیر دیکھا جائے گا۔ آؤ اب چلتے ہیں۔" اس سے پہلے کہ آفتاب مزید کوئی سوال کرے اسفند نے جلدی سے باہر کا رُخ کرتے ہوئے کہا۔ پھر جیپ میں بیٹھنے کے بعد بھی خاموش خاموش سا رہا۔ جبکہ آفتاب بہت کچھ تاڑ گیا تھا اور بہت کچھ کہنا بھی چاہ رہا تھا۔ مگر وہ اسفند کی فطرت سے بھی بخوبی واقف تھا۔ کہ اس سے کچھ اگلوانا تو کجا اس معاملے کو زیادہ کریدنے پہ وہ اس سے خفا ہو جائے گا۔ وہ اس کا موڈ بحال کرنے کی غرض سے اسے شہر کے سب سے بڑے ہوٹل میں لے گیا۔ جہاں بیٹھ کر دونوں نے کھانا کھایا۔ موضوع بدلا۔

ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں۔

اس کے باوجود بھی اسفند الجھا الجھا سا رہا۔

پھر آفتاب اسے اس کی رہائش گاہ پہ چھوڑ کر صبح آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ اور وہ شب خوابی کا لباس تبدیل کیے بغیر بڑی دیر تک بیٹھا۔ اپنے اس حد تک گر جانے پہ کھولتا ہی رہا۔

آخر مجھے کیا ضرورت تھی اس قدر بے قابو ہو جانے کی کہ اسے دیکھ کر بلا سوچے سمجھے اس کی طرف دوڑ پڑا۔ اور نتیجے میں منہ کی کھائی کس قدر ذلیل ہوا ہوں میں خود اپنے ہاتھوں۔ آفتاب بھی کیا سوچتا ہوگا۔ میں کس قدر گیا گزرا انسان ہوں۔ کہ اتنی اعلیٰ حیثیت اور نسب رکھتے ہوئے بھی ایک معمولی سی نرس کی خوبصورتی پہ فریفتہ ہو گیا ہوں۔ آخر میں یہ کیوں بھول گیا تھا کہ میری بھی ایک مستحکم اور اعلیٰ شخصیت ہے۔ میں معاشرے میں ایک اونچا مقام رکھتا

ہوں۔ اور ذاتی طور پر بھی اونچا ہوں۔ اب آفتاب کو یہ تو معلوم نہیں ہوگا کہ وہ غیر معمولی حد تک سلوط سے مشابہت رکھتی ہے۔ اور ... میں یہی معلوم کرنے کی غرض سے اسے اتنی اہمیت دے رہا ہوں۔ وہ تو یہی سمجھ رہا ہے کہ عمر کے تقاضے اور جوانی ... نے مجھے اس کی طرف مائل کر رکھا ہے۔ اور اس کی یہ سوچ کچھ غلط بھی نہیں کہ ظاہری طور پہ وہ جو کچھ دیکھ رہا ہے اگر کوئی اور بھی دیکھتا تو یہی سمجھتا۔ تبھی تو وہ اپنی دانست میں وہ مجھے ہوش میں لانے کے لیے جلی کٹی سناتا رہتا ہے۔ لعنت ہے ایسے مجھ پہ اور لعنت ہے ایسی سوچ پہ۔ اب سلوط خواہ ساری عمر ہی نہ ملے میں تو اس کے پیچھے ... خوار نہیں کروں گا۔

یہ سب سوچتے ہوئے اس نے اٹھ کر لباس تبدیل کیا۔ اور انہی خیالات میں الجھے الجھے وہ سونے کی غرض سے ... لیٹ گیا۔ چند کروٹیں لیں۔ اور سلوط کی تلاش سے بری الذمہ ہونے کے بعد ذہن کو کچھ سکون ملا تو اس نے ... نئے دماغ سے پھر سوچنا شروع کیا۔

... دل۔ دماغ کا ساتھ دے رہا تھا نہ دماغ سے کیے گئے فیصلے کی تائید کر رہا تھا۔ بلکہ اسے سختی سے ڈانٹنے اور ... پکارنے کے باوجود چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ بلاشبہ مس شان سلوط ہی ہے۔ بڑے ٹھوس دلائل پیش کر رہا تھا کہ اگر ... شان سلوط نہ ہوتی تو بھی اس کو کبھی یہ خیال نہ ہوتی کہ اتنی حقارت سے اسے نظر انداز کر دے۔ اس کے سلوط ہونے ... کے اور پچھلے سارے ثبوت پیش کر رہا تھا۔

اسے سلوط کا رویہ۔ اس سے روگردانی کرنا۔ اس کے سامنے پڑنے سے کترانا۔ اور سب سے بڑھ کر اپنا خون دینا ... اسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد اس سے سامنا ہونے میں سخت ناگواری اور بے رخی کا اظہار کرنا۔ اور ابھی چند ... منٹ پیشتر اس بری طرح اسے دھتکار دینا۔ ہر ثبوت ہر دلیل۔ اس کے سلوط ہونے کی تصدیق کرتی تھی۔ اور وہ سوچ ... رہا تھا کہ غلطی اصل میں اس کی تھی۔

اس نے اگر آفتاب کو اتنا ہی بتا دیا ہوتا کہ وہ مس شان کی خوبصورتی پہ نہیں مر مٹا بلکہ اسے ایک ایسی لڑکی کی تلاش ہے جو ہوبہو مس شان کی ہمشکل تھی۔ اور اسے مس شان پر اس لڑکی کا شبہ ہے۔ اور اپنے اس شبے کو یقین میں بدلنے کی کوشش میں وہ مس شان تک رسائی حاصل کرنا چاہتا ہے اور بس۔ تو پھر بات اتنی نہیں بگڑتی۔ یا پھر کم از کم آفتاب ... اس کی طرف سے خراب نہ ہوتا۔

اسے ملال تھا تو صرف اس بات کا کہ آفتاب کے سامنے اس کی پوزیشن کس قدر ڈاؤن ہو گئی ہے۔

اصل میں تو دل کی پکار پر اس نے یہ مصمم ــــ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ سلوط کو مس شان کے خول سے نکال کر ... رہے گا۔ خواہ اس کوشش میں اسے کتنا ہی خوار کیوں نہ ہونا پڑے۔ اور پھر جو کچھ اس نے سوچا تھا اس میں خوار ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مگر اس معاملے میں آفتاب کا تعاون حاصل کیے بغیر کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اور وہ اسی کشمکش و پیچ میں تھا کہ آفتاب سے کیا کہہ کر اسے اس معاملے میں شامل کرے کہ وہ کسی قیمت پہ بھی سلوط ... کے آسانی سے ہاتھ آ جانے کا موقع گنوانا نہیں چاہتا تھا۔

گویا اب مس شان کے بارے میں کوئی شک و شبہ باقی نہ رہا تھا اور اسے پکا یقین ہو گیا تھا کہ وہ سلوط ہی ہے ... یوں بھی دل میں بسی سلوط کی محبت نے اسے کچھ اتنا بے کل سا کر رکھا تھا کہ اس نے وہ پوری رات کچھ سو کر ... کچھ جاگ کر کاٹی تھی۔

... وہ ناشتے سے فارغ ہو کر بیٹھا ہی تھا کہ آفتاب اُسے لینے آ پہنچا۔ پروگرام تو کوئی خاص نہیں تھا۔ پھر بھی یہ دونوں ... سے باہر نکل آئے تھے۔ وہ دونوں کچھ دیر تو ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے پھر اسفند نے کسی خیال کے تحت ... سے پوچھا۔

"یار ... تمہاری لینڈ روور ماس کا کیا بنا۔؟"

"ٹھیک ہے۔" آفتاب بولا۔

"اور وہ ... گویا بالکل ہی ناکارہ ہو گئی۔" کہ وہ تاسف سے بولا۔

"وہ لیس زمین پر پیر جماتے وقت ہلکی سی درد کی چبھک ہوتی ہے۔ مگر ایسی کوئی خاص بات نہیں۔" اس نے لاپروائی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"اگر خاص بات شدید بھی ہے تب بھی تمہیں کم از کم دکھا تو دینا چاہیے تھا۔" آفتاب نے گویا بڑی ترکیب سے ہسپتال کا ذکر چھیڑا۔

"کہہ تو دیا کہ ایسی تشویش کی بات نہیں ہے تو پھر دکھانے سے فائدہ۔" وہ قدرے چڑ کر بولا۔

"اچھا تو گویا آج بھی ہسپتال نہیں جاؤ گے۔" آفتاب نے پوچھا۔

"نہیں ۔۔۔ ضرورت ہی کیا ہے۔ وہاں جانے کی۔" وہ بیزاری سے بولا۔

"اچھا ۔۔۔ مگر وہ تمہاری مس شان۔"

"میری تو کیا وہ تمہاری ہی ہوگی۔ دیکھو پھر وہی باتیں کرنی شروع کر دیں تم نے۔" وہ ایکدم ہی بگڑ اٹھا۔

"ارے نہیں یار ۔۔۔ میں نے سوچا جب باہر ہی نکلے ہیں تو کیوں نہ مس شان سے ملتے چلیں۔ تم نے کہا تھا کہ بعد میں کبھی ان کا شکریہ ضرور ادا کرو گے تو پھر آج میں اسے باتوں میں لگا کر تمہیں اس کا شکریہ ادا کرنے کا موقع فراہم کر دوں گا۔" آفتاب نے کہا۔

"بس تم تو معاف ہی رکھو ۔۔۔ بات کرنے کا موقع فراہم کرنے کے بجائے مار کھلوانے کے اسباب ضرور پیدا کر دو گے۔ اور ویسے بھی اب سلوطہ کا شکریہ ادا کرنا ضروری نہیں سمجھتا۔ بس تم نے میری طرف سے کر دیا تھا ۔۔۔ یہی بہت ہے۔"

"مگر یہ سلوطہ کون ہے۔ ؟ کیا مس شان کی طرف سے مایوس ہو کر تم نے کسی سلوطہ کا سہارا لیا ہے۔ یار میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اس قدر ہرجائی سی فطرت کے مالک ہو گے۔" آفتاب نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ لیکن اس کے لہجے میں ایک ملامت سی پنہاں تھی۔

"ارے نہیں یار۔ میں شان ہی کی بات کر رہا ہوں۔ اس کا اصل نام سلوطہ ہی ہے۔"

"اچھا۔ مگر یہ معلومات تم نے کیسے فراہم کیں۔؟" آفتاب نے پوچھا تو اس نے مختصر الفاظ میں اسے سلوطہ کے بارے میں بتایا کہ وہ اس کے پھوپھا کی سوتیلی بہن ہے اور پھوپھا اور پھوپھی کے ناروا سلوک سے دل برداشتہ ہو کر گھر سے بھاگ آئی تھی۔ اور وہ اس کی تلاش میں لاہور آیا تھا۔

"مگر تمہیں اپنے پھوپھا کی سوتیلی بہن سے ایسی کیا نسبت تھی جو تم اس کی تلاش میں بھٹکتے پھر رہے ہو۔"

"کیونکہ یہ میرے پھوپھا کی عزت کا معاملہ ہے۔ تم ہی سوچو کوئی جوان جہان لڑکی راتوں رات چپکے سے گھر سے بھاگ جائے تو۔" اسفند بولا۔

"تو کیا وہ کسی کے ساتھ گھر سے فرار ہوئی تھی۔؟" آفتاب نے پوچھا۔

"نہیں بھئی یہ وہ کیس نہیں ہے ۔۔۔ وہ تو خفا ہو کر غصے میں تنہا ہی گھر سے نکل کھڑی ہوئی تھی اور جب سے لاپتا ہے۔"

"اچھا تو یہ بات تھی ۔۔۔ تعجب ہے تم نے یہ بات مجھے شروع میں ہی کیوں نہ بتادی۔" آفتاب ایک ٹھنڈی سی سانس لے کر بولا۔

"تم نے موقع ہی کب دیا کچھ بتانے کا ۔۔۔ ورنہ میں تو کل تم سے یہی کہنا چاہ رہا تھا۔" اسفند نے کہا۔

"خیر شکر ہے اصل بات معلوم ہو گئی۔ ورنہ تمہیں اس معمولی سی نرس پر مائل دیکھ کر میں نے یہی تاثر لیا تھا کہ تم بھی آجکل کے بے راہ روی کا شکار انہی بدمعاش زادوں میں سے ہو جو اپنے خاندانی وقار اور عزت کو پس پشت ڈال کر ایسی پیشوں میں گر جاتے ہیں۔" آفتاب نے اطمینان کا سانس لے کر کہا۔

"کمال ہے تم تو میری فطرت سے بخوبی واقف ہو پھر بھی میرے بارے میں اتنی غلط رائے قائم کر لی۔" اسفند قدرے گلہ آمیز لہجے میں بولا۔

"لیکن ۔۔۔ اب کیا کرتا کچھ صورتحال ہی ایسی پیدا کر دی تھی تم نے ۔۔۔ ویسے باتیں دارد ہے کیا مس شان نے ایڈمٹ کر لیا ہے کہ وہ سلوطہ ہی ہے۔" آفتاب نے اس کے گلے کا جواب دے کر کسی خیال کے تحت پوچھا۔

"نہیں ابھی اس سے کچھ پوچھنے کا موقع ہی کب ملا ۔۔۔ لیکن اب جلد ہی اس سے قبول دواؤں گا۔" اسفند بولا۔ کچھ دیر خاموشی طاری رہی۔ آفتاب بھی خلاف عادت معمول خاموشی سے جیپ چلاتا رہا۔ پھر اسفند نے کہا۔

"آؤ چلو وہیں چلتے ہیں۔ اگر ڈاکٹر عارف مل گئے تو ساتھ تمہیں بھی دکھا دوں گا۔"

آفتاب ۔۔۔ کچھ نہیں بولا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں ہسپتال کے کمپاؤنڈ میں کھڑے تھے۔

"یار ایسا کرو سیدھے ڈیوٹی روم میں چلو۔ کیونکہ وہاں اس کے ملنے کے امکانات زیادہ ہوں گے۔" آفتاب نے اس کے ساتھ ہسپتال بلڈنگ کی طرف بڑھتے ہوئے مشورہ دیا۔

"ضروری تو نہیں کہ وہ ڈیوٹی روم میں تنہا ہی مل جائے۔ وہاں دوسری نرسیں بھی موجود ہوں گی۔ اور وہاں جا کر الٹی ہماری پوزیشن خراب ہوگی۔" اسفند نے کہا۔

"ابھی پوزیشن اچھی ہونے کا کیا سوال ہے۔ کوئی تم وہاں اس سے اظہار عشق کرنے تو نہیں جا رہے۔ کوئی بہانہ کر دیں گے کہ فلاں سے ملنا ہے یا پھر ڈاکٹر عارف کا حال پوچھ لیں گے۔" آفتاب اس کی ہچکچاہٹ پر چڑ کر بولا۔

"اچھا پھر چلو وہیں چلتے ہیں۔" اسفند نے آمادہ ہو کر کہا۔ اس اثناء میں وہ دونوں ہسپتال کی بیرونی سیڑھیاں عبور کر کے آگے بڑھے ہی تھے کہ وہ سامنے ہی بالائی منزل پر جانے والے زینے سے اترتی نظر آئی۔ اس کے ساتھ کوئی دوسری نرس بھی تھی۔ اور وہ دونوں ہنستی مسکراتی باتیں کرتی نیچے اتر رہی تھیں کہ آؤ اسے پہلے پکڑ لیں۔ پھر اسفند اس کی طرف لپکا۔ اور پہلی سیڑھی کے آگے کھڑا ہو کر بولا۔

"سلوطہ۔" مس شان جو اس کے راستہ روک کر کھڑے ہونے پر دو تین سیڑھیاں اوپر ہی رک گئی تھی۔

اس نے اپنی ساتھی نرس سے آہستہ سے کچھ کہا۔ اور جواب میں سر ہلا کر اس نے اسفند سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

"جی، آپ کو کس سے ملنا ہے۔؟"

"ان سے میرا مطلب ہے مس شان سے۔" اسفند نے انگلی سے مس شان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو اس نرس نے مسکرا کر شان کی طرف دیکھا اور پھر آہستہ آہستہ دونوں کھسر پھسر کرنے لگیں۔

"دیکھیں سسٹر میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں مس شان، آپ پہلے میری بات سن لیں۔" اس کی خاموشی سے اسفند کی کچھ ہمت بندھی تو اس نے تھوڑی سی عجلت دکھاتے ہوئے مس شان سے کہا۔

تو مس شان اس کو جواب دینے کے بجائے دوسری نرس سے بولی۔

"پتا نہیں کون شخص ہے یہ، روز آ کے مجھے تنگ کرتا رہتا ہے۔ [illegible] نام لے کر مجھے پکارتا ہے ۔۔۔ ذرا تم ہی اس کی بات سن لو عفت۔" اتنا کہہ کر وہ دو تین سیڑھیاں اوپر چڑھ گئی۔ اور عفت نے پہلے بڑی ملامت آمیز اور تنقیدی نظروں سے گھور کر اسے دیکھا اور پھر بولی۔

"تمہیں شرم نہیں آتی مسٹر۔ بظاہر تو تم خاصے شریف لگتے ہو مگر حرکتیں ساری لوفروں کی سی کرتے ہو۔ آئندہ اگر تم نے اسے چھیڑا تو تمہاری ایسی درگت بناؤں گی کہ ساری عمر یاد رکھو گے۔ جاؤ دفعان ہو جاؤ یہاں سے۔" اسے اس بری طرح دھتکار کر عفت بھی تیزی سے مڑی اور مس شان کے ساتھ اوپر چڑھتی چلی گئی۔ ایک تو اس کی آواز بہت اونچی تھی اور پھر اوپر کا رخ کرتے ہوئے بھی وہ اسے برے برے ہوئے الفاظ سے نواز رہی تھی۔

اُف ذلت کی انتہا ہو گئی تھی۔

آفتاب بھی اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا سب سن رہا تھا۔

اور سامنے طویل سی گیلری کے آخری سرے پر ریسپشن پہ بیٹھا شخص بھی ان ہی کی طرف متوجہ تھا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ وہاں کوئی دوسرا موجود نہ تھا۔ اس کے باوجود بھی اپنی اس حد تک ذلت کے احساس نے اسفند کو سر تا پا کھولا کر رکھ دیا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ جھپٹ کر اوپر جائے اور مس شان کو گھسیٹتا ہوا نیچے لا کر اتنا مارے کہ اس کا حلیہ تک بگاڑ کر رکھ دے۔

اور اسے اتنا مجبور کرے کہ وہ چیخ چیخ کر کہے کہ ہاں میں ہی سلوطہ ہوں۔ مگر اسی دم آفتاب نے بھی اس کی دلی کیفیت کو محسوس کر لیا تھا۔ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی غرض سے بہت دھیمے اور ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

"آؤ یار، واپس چلتے ہیں۔ ان آتھی تھرڈ کلاس عورتوں سے اس کے سوا اور کیا توقع ہو سکتی ہے۔ وہ جو کہتے ہیں ان سنی کر جاؤ تو ان چیپ گرلز کی باتوں کو بھی اسی طرح ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دینا

چلیے — آؤ دوست، لعنت بھیجو ان دونوں پر اور میرے ساتھ چلو۔" مگر اسفند ایک دم ہی اس کے ساتھ چلنے پر آمادہ نہ ہوا بلکہ تھوڑی دیر وہیں کھڑا کچھ سوچتا رہا پھر اس کا ہاتھ اپنے شانے سے ہٹا کر چپ چاپ جیپ کی طرف بڑھ گیا۔

"غصہ کرنا اسی لیے حرام ہے کہ غصے کی حالت میں انسان اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔ ذرا سوچو غلطی تمہاری نہیں تھی۔ یہ جو تیز طرار منچلے اور بھٹکے ہوئے نوجوان اپنی ہی قوم کی عزت و ناموس کے رہزن ہر جگہ دندناتے پھرتے ہیں اسی نے ہمیں انہی میں شمار کیا ہوگا۔ ہمیں اس طرح بغیر موقع اور محل دیکھے اس سے بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔"

آفتاب تو اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی غرض سے اور بھی بہت کچھ کہتا رہا تھا۔ لیکن اس کے جانے سے اسے صرف ایک بات ہی یاد رہ گئی تھی کہ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو کہ کیا غلطی تمہاری نہیں تھی۔ اور وہ بڑی دیر تک صرف یہی سوچتا رہا کہ اس نے ایسی کیا غلطی کی تھی۔ اسے چھیڑا تھا۔ نہ کوئی عامیانہ سا فقرہ ہی چست کیا تھا اور نہ کوئی عشقیہ ڈائیلاگ ہی بولا تھا۔ پہلے دو مرتبہ اس کا شکریہ ادا کرنا چاہا تھا اور آج بھی بہانہ وہی تھا البتہ اس نے اسے سلوطہ کہہ کر ضرور مخاطب کیا تھا۔ اور اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس کے منہ سے اپنا اصلی نام سن کر ہی وہ چڑ گئی تھی۔ کیونکہ اپنا نام سن کر اس کے چہرے کا تاثر یکدم بدل گیا تھا۔ اس نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

ایک لمحے کو اس کے چہرے پر سہم اور گھبراہٹ کے سے آثار ہویدا ہوئے تھے۔ تبھی تو اس نے اپنا چہرہ عفت کی جانب پھیر کر اس سے کچھ کہا تھا۔

بلکہ عفت اس سے کچھ پوچھ رہی تھی اور اس کے استفسار پر اصل بات بتانے کے بجائے اس نے اتنا سنگین جھوٹ بولا تھا۔ "پتا نہیں یہ کون شخص ہے روز آ کر مجھے تنگ کرتا ہے۔ نئے نئے نام رکھ کر پکارتا ہے۔ ذرا تم ہی اس کی بات سن لو عفت۔" اور جواب میں عفت نے وہی کیا تھا جو ایک دوست کو کسی بدقماش شخص سے بچانے کے لیے ایک دوست کرتی ہے۔

کیونکہ ایک تو وہ اچھی طرح اسے جانتی تھی۔ اگر سلوطہ بھی نہیں تھی تب بھی اسے یہ بھی طرح معلوم تھا کہ وہ ایک ڈاکٹر ہے جسے مرتی حالت میں اس نے اپنا خون دیا تھا۔

دوسرے وہ شکل و صورت اور لباس اور حلیے، کسی اعتبار سے بھی لوفر نہیں لگتا تھا۔ اب سے کچھ دن پہلے جب وہ ہسپتال میں زیر علاج تھا تو آفتاب سے بھی سب کی شناسائی ہو گئی تھی اور سب اسے بڑے احترام سے کیپٹن صاحب کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ اور وہاں کا ہاؤس سرجن ڈاکٹر قیوم رضا، آفتاب کا پرانا واقف کار تھا۔ تو کیا اس نے میری ہاتھوں ہوئی اپنی تذلیل کا بدلہ اس صورت میں لیا ہے۔ پھر اسے اپنے رویے اور اس اہانت آمیز گفتگو کا خیال آیا۔ جو اس نے ماں کے کہنے پر غلط بیانی پر اس سے کی تھی۔

مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میں نے اس کی اہانت کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑا تھا۔ حتیٰ تو یہ تھی کہ اسے گھر سے نکال باہر کیا تھا۔ مگر یہ جو کچھ بھی کیا تھا کسی تھرڈ پرسن کے سامنے نہیں کیا تھا۔

کیونکہ اس وقت میں اور وہ کمرے میں تنہا تھے

مگر اس نے تو — نہ صرف خود بلکہ عفت سے کہہ کر میری تذلیل کروائی تھی۔ وہ بھی آفتاب کے سامنے۔ ریسپشن کے اور وہاں سے گزرتے ہوئے ایک شخص کے سامنے جو کہ تو نہیں تھا مگر اس نے یقیناً اس طرح دیکھا ہوگا۔ اس پر آفتاب کہتا ہے کہ میں اس کا خیال چھوڑ دوں۔ دوسرے معنوں میں گویا اتنی آسانی سے اس کا لگایا ہوا یہ زخم اپنے سر لے لوں۔ نہیں نہیں، ایسا تو مر کر بھی مجھے گوارا نہیں۔ اور پھر مجھے پھوپھا جان سے کیا وعدہ بھی تو پورا کرنا ہے۔ اگر مس شان، سلوطہ نہ بھی ہوئی تو بھی میں اسے سلوطہ ہی بنا کر پھوپھا جان سے کیا وعدہ ضرور پورا کروں گا۔ خواہ اس کے لیے مجھے مس شان کو اغوا ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ مگر نہیں، وہ سلوطہ ہی ہے — سلوطہ ہی ہے۔

یہ سب سوچتے سوچتے وہ پاگل سا ہو گیا تھا۔

دو روز مزید گزر گئے تھے۔ گویا کیپٹن احتشام کے یہاں اس کا قیام طویل ہوتا جا رہا تھا اور یہ احساس بڑا گراں گزر رہا تھا۔ آفتاب والسترا یا پھر اپنی مصروفیات کی وجہ سے گذشتہ روز نہیں آیا تھا۔ وہ یہی انتظار کر رہا تھا کہ آفتاب آئے تو وہ اسے اپنے ارادوں سے باخبر کر کے اسی کے ذریعے احتشام کے گھر سے کسی عمدہ سے ہوٹل میں شفٹ ہو جائے۔ آخر شام کو آفتاب آیا تو آتے ہی اس نے معذرتی سے انداز میں کہا۔

"میں کل کتنی کوشش کی یار کہ وقت نکال کر تھوڑی دیر کے لیے تم سے مل آؤں مگر مصروفیت ہی کچھ ایسی نوعیت کی تھی کہ آنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔"

"یار تم یہ اپنے نہ آنے کی صفائیاں کیوں پیش کرتے ہو۔ اب میں مہمان تو نہیں رہا اور پھر خواہ مخواہ ہی یہاں جما بیٹھا ہوں۔ تمہارے پاس اتنا فالتو وقت کہاں ہوگا کہ تم روز روز میرے پاس آتے رہو گے۔" اس نے عجیب سے انداز میں کہا تو آفتاب سمجھا کہ اس پر ابھی تک غصہ چڑھا ہوا ہے۔ اس نے تعجب سے کہا۔

"ہائیں — کیا مطلب؟ تمہارا غصہ ابھی تک فرو نہیں ہوا جو اب تم مجھ پر اتارنے کی کوشش کر رہے ہو۔ لو بھلا روز روز آنا تو دور کی بات، مجھے تو ہر وقت ہی تمہارے پاس ہونا چاہیے۔ کیونکہ تم میرے بلانے پر ہی تو یہاں آئے ہوئے ہو۔"

"اوہو، تم سمجھے نہیں یار، میرا مقصد یہ ہے کہ ایک طرف تو تمہیں اتنی کڑی ڈیوٹی انجام دینی ہوتی ہے اور دوسری طرف دھبے جیسا احتشام — وہ بھلا اپنے دل میں کیا سوچتا ہوگا کہ میں تو اس کے گھر میں دھرنا ہی دے کر بیٹھ گیا ہوں۔ ادھر میری مشکل یہ ہے کہ میں ابھی یہاں سے جا بھی نہیں سکتا۔ کیا تم ایسا نہیں کر سکتے کہ میرے لیے کسی عمدہ ہوٹل کا کمرہ بک کرا دو۔"

"بد نصیب دشمناں۔ تمہاری دماغی صحت تو ٹھیک ٹھاک ہے جو بیٹھے بٹھائے ایسی اوٹ پٹانگ باتیں کرنے لگے ہو۔ ویسے کیا یہاں تمہیں کوئی تکلیف ہے یا پھر گھر کے مکینوں سے کوئی شکایت ہے؟"

"نہیں بھئی۔ نہ تکلیف ہے اور نہ شکایت بلکہ ان لوگوں کی خاطر مدارات اور خلوص سے تو میں ان کے احسانوں تلے دبا جا رہا ہوں بلکہ دب گیا ہوں۔"

آفتاب نے اس کی بات کاٹ دی۔ "اس میں احسان کی کیا بات ہے؟ پھر تمہیں اس کے گھر میں رہتے ہوئے کتنے ہو گئے ہیں مشکل سے ایک ہفتہ۔ بقول تمہارے کوئی ساری زندگی تو رہنے سے رہے یہاں۔ اس لیے مزید جتنے دن رہنے کا ارادہ ہے آرام سے یہیں رہو۔ احتشام اپنا پرانا یار ہے ویسے یار جاوے کتنے دن رہنے کا ارادہ ہے یہاں؟" آفتاب نے بڑی خوبصورتی سے اس سوال کو الفاظ کا جامہ پہنایا جو کچھ دیر سے اس کے ذہن میں کلبلا رہا تھا۔

"ابھی یہ تو معلوم نہیں۔ البتہ زیادہ عرصے نہیں رہوں گا۔ بلکہ زیادہ سے زیادہ چار پانچ روز میں اپنا کام نمٹا کر یہاں سے چلا جاؤں گا۔" اسفند نے بتایا۔

"مگر کون سا کام؟" آفتاب نے متحیر سے انداز میں پوچھا۔ کیونکہ جہاں تک اسے معلوم تھا سرگودھا میں تو اسے کوئی ایسا کام درپیش نہیں تھا جو اس کی واپسی میں رکاوٹ بنتا۔

"وہی سلوطہ کو دریافت کرنے کا کام۔ اس کے علاوہ میری اور کون سی ایسی غرض اٹکی ہوئی ہے یہاں۔" اسفند بڑی متانت سے بولا۔

"یعنی کہ کیا ابھی تک تمہارے سر پر سلوطہ کو برآمد کرنے کا بھوت سوار ہے؟ مگر کیا دو روز پہلے کا تلخ تجربہ تمہارے لیے کافی نہیں جو مزید خود کو خوار کرنے پر تلے ہوئے ہو؟ کمال ہے یار تم تو ایک دم بنڈل قسم کی شے ثابت ہوئے ہو۔" آفتاب نے تیز لہجے میں اسے ملامت سی کی۔

"مزید کچھ کہنا چاہتے ہو اس سلسلے میں تو وہ بھی کہہ دو۔ پھر میں تمہاری ساری باتوں کا جواب اکٹھا ہی دے دوں گا۔" اسفند جیسے بالکل چکنا گھڑا ہی ثابت ہوا۔

"مزید کیا کہوں۔ جبکہ تمہاری عقل تو شاید بھیجے کے بجائے گدی میں ہے بلکہ سرے سے بھیجے میں ڈالی ہی

نہیں گئی۔ اب بھلا اپنے پھوپھا کی سوتیلی اور مغرور بہن کی ذات سے تمہیں ایسی کیا دلچسپی ہے جو تم اپنی نوسٹ وقار کو داؤں پر لگانا چاہ رہے ہو۔" اس کی بات پر آفتاب جلے کٹے انداز میں بولا اور تب اسفند کو ساری بات اس کو بتانی پڑی۔

"یوں تو یہ بات ہے ورنہ میں بھی تو کہوں کہ اتنا شریف اور حسب نسب والا دوست اس قدر گراؤنڈ سے کام کیوں لے رہا ہے۔ اور میں تو تمہارے یہ سب بتانے سے بہت پہلے ہی کچھ گیا تھا کہ دال میں کالا کچھ ضرور ہے۔ اس لیے تو میں رہ، تمہیں جتانے کو میں تم سے کڑوی کسیلی۔"

"اف۔ سیدھے سیدھے چلتے چلتے تو تم پٹری سے اتر گئے۔ میں تمہاری ذہانت کا امتحان تو نہیں لے رہا ہوں کہ اس سے کہاں ملوں اور اصل حقیقت کیسے اگلواؤں۔ کیونکہ اسپتال میں اس سے ملنا کچھ مناسب نہیں۔ ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ جب وہ اسپتال سے باہر نکلے تو گھر تک اس کا تعاقب کیا جائے تاکہ اس کا پتا معلوم ہو سکے۔"

"ہائیں تعاقب۔ نا بابا نا۔ تعاقب تو میں نے کبھی دشمن کا بھی نہیں کیا نہ یاد ہے قد یادہ یہی کیا کہ بھاگتے ہوئے دشمن کا نشانہ باندھ کر گولی داغ دی۔ باقی انشاءاللہ خیر صلا۔" آفتاب ایک دم ہی بھڑک کر بولا۔ اس کی باتوں سے اندیشوں سے زیادہ تمسخر جھلک رہا تھا۔

"تو پھر یہ کریں گے کہ کسی سے اس کا اتا پتا معلوم کر کے سیدھے اس کے گھر ہی پہنچ جائیں گے؟"

"ہائیں کیا کہا۔ اس کے گھر پر جاؤ گے تم یاس کے گھر پہ۔ وہ بھی گویا میرے کاندھے پر بندوق رکھ کے۔ نہیں بھئی میری توبہ۔ میں تو یہی شکر کر رہا ہوں کہ اس روز بیٹھے بیٹھے بچ گیا تھا نہ جانے کون سی نیکی آڑے آ گئی تھی۔ ورنہ جنوں کے ساتھ ساتھ گھن کی طرح تمہارے ساتھ میں بھی پس کر رہ جاتا۔ کیونکہ تمہاری تو وہی مثل ہے کہ ہم تو ڈوبیں گے صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔" آفتاب نے گویا ہنسی ہنسی میں ہی اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔

"اچھا چھوڑو تم میرا ساتھ نہیں دے سکتے تو نہ دو۔ مگر اتنا تو کرو کہ میرے ساتھ اسپتال چلے چلو۔ تم بے شک جیپ سے مت اترنا۔ مگر جیپ میں بیٹھ کر میرا انتظار ضرور کرنا۔ باقی کام میں خود نمٹا لوں گا۔" اور آفتاب نے تھوڑی دیر تک سوچنے کے بعد کہا۔

"اچھا چلو یہاں تک تو میں تمہارا ساتھ دے سکتا ہوں۔ مگر میں سوچ رہا تھا کہ مس شان حسینہ عالم تو نہیں ہے جو اس کا حصول تمہاری زندگی کا نصب العین بن جائے۔ تم کہو تو میں اس سے کہیں بڑھ کر حسین اور خاندانی لڑکی تمہارے لیے فراہم کر سکتا ہوں۔ دیکھو برا ماننے کی بات نہیں یہ محض میرا ایک مخلصانہ سا مشورہ ہے۔" آفتاب نے اس کے تیور بگڑتے دیکھ کر جلدی سے اپنی بات کی وضاحت کی۔

"چلو خیر تم اسپتال چلو اب مجھے کوئی احمقانہ مشورہ نہ دینا کیونکہ صرف حسن ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ بلکہ سیرت۔ شرم و حیا کا لحاظ بھی بہت ہوتا ہے۔ بہت سی خوبیاں جو سلوط میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔"

"او کے چیف۔ اینڈ وہ مائی الو لو جیز سر۔ دل پری پہ آئے یا گدھی پہ۔ دل ہی جو تا ہے جو پریوں کی صفات گدھیوں میں بھی ڈھونڈ لیتا ہے۔" آفتاب آخر دل کی بات زبان پہ لے ہی آیا کہ وہ بہت سطحی سی نظر رکھنے والا شخص تھا۔ اگر مس شان سلوط ہی تھی تو اس نے اسے ایک معمولی نرس کے روپ میں دیکھا تھا اس لیے وہ سلوط کو خاطر میں ہی نہیں لا رہا تھا۔ اسفند بھی سمجھ رہا تھا کہ اس پر اس کے کوئی اور بھی وجہ سوار تھی اس لیے اس نے آفتاب کی بات کا جواب دینا یا اسے قائل کرنا ضروری نہ سمجھا۔

کچھ ہی دیر بعد۔ اسپتال کی باؤنڈری وال کے باہر جیپ روک کر وہ جیپ سے اترا اور آفتاب کو جیپ میں ہی چھوڑ کر اندر چلا گیا۔ اور سیدھا ڈیوٹی روم میں پہنچا۔ اتفاق سے اس سمے سسٹر ضیا اور کئی دوسری نرسیں جو اس سے واقف تھیں وہیں موجود تھیں۔ جو اس سے بڑے تپاک سے ملیں۔ اور اس کی خیر خیریت پوچھتی رہیں۔ تب اس نے ادھر ادھر دیکھ کر سسٹر ضیا سے پوچھا۔

"کیا مس شان آج آف ڈیوٹی ہیں جو نظر نہیں آ رہیں۔"

"نہیں۔ ان کی ڈیوٹی تو آج میٹرنٹی وارڈ میں لگی ہوئی ہے اور وہ اوپر آفس میں موجود ہے۔" سسٹر ضیا نے حسب عادت مسکرا کر بتایا۔ مگر اس کے انداز میں معنی خیزی تھی۔

"ارے عجیب اتفاق ہے۔ اس روز بھی آپ کے بتانے پر میں ان کا شکریہ ادا کرنے یہاں آیا تھا تو وہ کسی مریض کو اٹینڈ کرنے گئی ہوئی تھیں۔" اس نے اس تاثر کو توڑنے کی غرض سے جو سسٹر ضیا نے باندھا تھا۔ گویا مس شان کے بارے میں پوچھنے کی وضاحت کی۔

"ٹھیک ہے سر آپ اوپر جانے کی زحمت نہ کریں میں اُسے میں بلوائے دیتی ہوں۔" سسٹر ضیا بولی۔

"نہیں نہیں بہت بہت، میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے بلکہ ابھی وات کی فلائٹ سے واپس جا رہا ہوں۔ اگر آپ کچھ کر سکتی ہیں تو یہ کیجیے کہ مجھے ان کے گھر کا پتا بتا دیجیے۔ اگر ہو سکا تو میں خط کے ذریعے ان کا شکریہ ادا کر دوں گا۔"

"یہ تو وہ برابر والے نرسوں کے ہوسٹل میں رہتی ہے مگر آپ اسپتال کا پتا لکھ کر نرسوں کے ہوسٹل کے حوالے سے اسے خط لکھ سکتے ہیں۔"

ہوسٹل کی انچارج اس وقت اتفاق سے آفس میں ہی موجود تھی۔ وہ سیدھا اس کے پاس پہنچا۔ اور جاتے ہی مدعا بیان کیے بغیر اس نے اس سے پوچھا۔

"میڈم کیا میں یہ معلوم کر سکتا ہوں کہ آپ کے ہوسٹل میں رہائش پذیر نرس مس شان کا اصلی نام کیا ہے۔" یہ سوال بے تکا بھی بہت ذاتی اور مشتبہ سا تھا۔ انچارج۔ میڈم پیرا نے بہت چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر اس کے چہرے پر ناگواری کے اثرات ابھر آئے۔

"جی نہیں مجھے بالکل نہیں معلوم۔ اگر معلوم بھی ہوتا تب بھی نہیں بتاتی۔ کیونکہ ہمارے ہوسٹل کے اصولوں میں یہ بات شامل نہیں ہے کہ کسی غیر متعلقہ شخص کو یہاں رہنے والے کسی فرد کے بارے میں کچھ بتایا جائے۔" میڈم پیرا نے بڑی صاف اور شستہ اردو میں جواب دیا۔

"لیکن معاملہ کسی غیر متعلقہ شخص کا نہیں میڈم بلکہ بڑا سیریس ہے۔ جس سے میں آپ کو باخبر کر دینا چاہتا ہوں۔" اسفند بات پر وہ تھوڑا سا نرم پڑ کر بولی۔

"لیکن مجھے بھی تو معلوم ہو کہ آخر معاملہ کیا ہے۔ کیونکہ جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ بڑی بے ضرر سی لڑکی ہے۔ مصیبت زدہ اور بے یار و مددگار بھی؟"

"نہیں وہ مصیبت زدہ ہے نہ بے یار و مددگار۔ بلکہ اس کے سارے رشتے دار موجود ہیں۔ اس کے والد ہندوستان سے آ گئے ہیں اور اس کے ایک دم ہی غائب ہو جانے کی وجہ سے سخت علیل ہیں۔" اسفند نے اس کی معلومات کی تردید کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھیں جناب ہم آپ کی بات پر کیونکر یقین کر سکتے ہیں جبکہ آج سے پہلے ہم نے آپ کو کبھی دیکھا ہی نہیں۔" وہ کچھ ہچکچاتے سے لہجے میں بولی۔

"آپ زیادتی سے کام لے رہی ہیں میڈم۔ ورنہ ہم لوگ یہاں تفریح کی غرض سے نہیں آئے جبکہ میرے دوست ڈاکٹر اسفند نے کہا ہے معاملہ واقعی کافی سیریس ہے۔ اور ہم تو صرف اس کا نام ہی معلوم کرنا چاہتے ہیں اس سے رابطہ قائم کرنا ہمارا مقصد نہیں ہے۔" آفتاب جس کا تجسس اسفند کو ہوسٹل میں جاتے دیکھ کر انتہا کو پہنچ گیا۔ اس سے برداشت نہ ہو سکا تو وہ بھی جیپ سے اتر کر آفس میں آ گیا تھا اور چونکہ ڈیوٹی سے سیدھا اس کے پاس آیا تھا اس لیے اتفاق سے یونیفارم میں ملبوس تھا۔

اور اس کی فوجی وردی نے ہی میڈم پیرا کو حد درجہ متاثر کیا۔ بلکہ دوسرے معنوں میں سہما کر رکھ دیا تھا۔ وہ پچھلے زمانے بھر کا انکسار و سمیٹ کر بڑی لجاجت بھرے لہجے میں بولی۔

"آپ یقین جانیں سر۔ مجھے اس کا نام بالکل معلوم نہیں۔ البتہ اس کے بارے میں ضرور جانتی ہوں کہ وہ ایک بڑی مارا ماری کراچی سے آئی ہے۔ بلکہ میری ایک پرانی دوست جو میری طرح ایک پرائیویٹ کلینک میں مڈ وائف ہے نے اسے یہاں بھیجا ہے۔ میں ایسا کرتی ہوں کہ فلورا کا ایڈریس آپ کو دیے دیتی ہوں باقی تفصیل آپ اس سے معلوم کر

لیجیے گا۔" میڈم پیریرا کی بات پر دونوں دوستوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر آفتاب نے اسفند سے کچھ جھک کر آہستہ سے اس نے کچھ کہا۔ مگر اسفند نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے میڈم پیریرا کو مخاطب کر کے کہا۔

"نہیں ہمیں کسی کا ایڈریس درکار نہیں۔ جو کچھ معلوم کرنا تھا ہم معلوم کر چکے ہیں۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔"

"تو کیا آپ اسے اپنے ساتھ لے جانے آئے ہیں؟" پیریرا نے سہمے سہمے متفکرانہ انداز میں پوچھا۔

"نہیں۔ فی الوقت تو ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ البتہ بعد میں اگر ضرورت پڑی تو ہم مجبور ہوں گے۔" اسفند نے اسے مرعوب دیکھ کر قدرے رعونت سے کہا اور پھر وہاں سے جانے لگا تو تنبیہی سے انداز میں میڈم پیریرا کو مخاطب کر کے بولا۔

"آپ اس معاملے کو اگر صیغہ راز میں رکھیں گی تو یہ آپ کے لیے ہی بہتر ہو گا۔ اوکے بائے۔" اور پھر آفتاب کو ساتھ لے کر آفس سے نکل آیا۔

"دیکھو یار۔ میری بات ذرا ٹھنڈے دل سے سنو۔ تم نے جو اس پر ظلم ڈھایا اس کا ازالہ اسی طرح ممکن ہے کہ اس سے یہ اگلوا لینا کہ وہ ملوث ہی ہے۔ اس لیے اسے منانے ونانے کا خیال تو چھوڑ ہی دو۔ تم تو ایسا کرو کہ اگر وہ واقعی ملوث ہی ہے تو اپنے پھوپھا کو اس کی یہاں موجودگی سے مطلع کر دو۔ ظاہر ہی وہ یہ اطلاع ملتے ہی بھاگے بھاگے یہاں آ جائیں گے اور اس طرح ساتھ کے ساتھ تمہارا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ کیوں۔ کیا خیال ہے تمہارا؟"

پہلی بار اس نے نہایت سنجیدگی اور مدبرانہ انداز میں اسے مشورہ دیا۔ جسے سن کر وہ پھڑک ہی اٹھا۔ اور آفتاب کے جاتے ہی اس نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ پوری تفصیل کے ساتھ پھوپھا کو خط لکھ کر رات ہی کو اسے لیٹر بکس میں ڈال آیا۔ اور پھر پھوپھا کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔

اسفند اور آفتاب کے جانے کے بعد سسٹر پیریرا کو ایک دم ہی خیال آیا کہ یہ دونوں نوجوان مونا شان کے بارے میں جو اتنی پوچھ گچھ کر کے گئے ہیں کہیں ہاسٹل سے سیدھے اسپتال پہنچ کر مونا سے الٹے سیدھے سوالات نہ کر بیٹھیں اور وہ ان سے ڈر کر خود ہی کچھ نہ بک دے۔ اسی خیال کے تحت سسٹر پیریرا نے اسی وقت اسپتال فون کر کے میٹرنٹی وارڈ کا نمبر لیا۔ اتفاق سے خود مس شان نے ہی ریسیو کیا۔ سسٹر پیریرا نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"ہیلو مونا۔ تم اس وقت کیا کر رہی ہو؟"

"ڈیوٹی انجام دے رہی ہوں۔ لیکن سسٹر پیریرا آج فون کیسے کر لیا آپ نے؟" اس نے اس کے سوال کا جواب دے کر متعجب سے لہجے میں پوچھا۔

"بس یونہی کر لیا۔ ویسے تم ڈیوٹی سے کب تک فارغ ہو گی؟" یہ بھی ایک تعجب خیز بات تھی کہ سسٹر پیریرا معمولاً سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس سے ایسا بے تکا سوال پوچھ رہی تھی اسے کچھ زیادہ ہی اچنبھا ہوا۔

"یہی تقریباً ایک بجے تک سسٹر؟"

"ہاں ہاں۔ وہ تو مجھے بھی معلوم ہے مگر خیر تم ایسا کرنا کہ ڈیوٹی کے بعد کہیں اور نہیں جانا۔ سیدھی ہاسٹل چلی آنا۔" [illegible] سے بھی کہیں زیادہ تعجب خیز بات تھی جو اب تک اس نے کہی تھی۔ ورطۂ حیرت میں غوطے کھاتے ہوئے اس کی اس بات پر اسے تاؤ آ گیا۔

"مگر سسٹر میں بھلا ڈیوٹی کے بعد کہاں جاتی ہوں جو آج جاؤں گی۔ میں تو روز ہی اسپتال سے سیدھی گھر آتی ہوں نا۔"

"ارے نہیں۔ میرا مطلب کچھ اور ہے۔ خیر تم جب ڈیوٹی سے واپس آؤ گی تو بتاؤں گی۔ اوکے سو لونگ۔" سسٹر پیریرا نے کہا اور فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ جبکہ وہ ہیلو ہیلو ہی کرتی رہ گئی۔

اصل میں سسٹر پیریرا نے ایکسٹینشن فون ہونے کی وجہ سے اسے فون پر کچھ بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا مگر

ایک تو یہ بہت خلافِ توقع اور معمول پہلی بار اس نے مسز شان کو فون کیا تھا اور یہ کیا کم تعجب کی بات تھی کہ پھر فون جس نوعیت کا تھا اس نے اسے سخت الجھن میں ڈال دیا تھا آخر یہ چکر کیا ہے؟ مسز پریرا کو کیا ضرورت پڑ گئی مجھے فون کرنے اور یہ کہنے کی کہ میں سیدھی ہاسٹل آؤں اور کہیں نہ جاؤں جبکہ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ میں اور کہیں جاتی ہی نہیں۔ صرف کبھی کبھار مارکیٹ چلی جاتی ہوں تو وہ بھی چھٹی کے دن۔

پھر اس نے ایسی بات کیوں کہی؟ ظاہر ہے بلاوجہ تو نہیں کہی ہو گی؟ تو پھر کیا وجہ ہو سکتی ہے اور کیا مقصد ہو سکتا ہے یہ کہنے کا؟

کوئی نہ کوئی بات ہے ضرور جبھی تو کہہ رہی تھی کہ جب ڈیوٹی سے واپس آؤ گی تو بتاؤں گی۔ یہی سب سوچتے سوچتے اس کا تجسس انتہا کو پہنچ گیا تھا اور ابھی صرف دن کے گیارہ ہی بجے تھے۔ اور اپنے ڈیوٹی آورز مکمل ہونے تک تو تجسس کے مارے اس کی حالت ہی غیر ہو جاتی۔ اس لیے لنچ ٹائم کے فوراً ہی بعد اس نے میٹرن سے ہوم کی وارڈن سے سر درد کا بہانہ کر کے آدھے دن کی چھٹی مانگی اور سیدھی ہاسٹل چلی آئی۔

اور تب مسز پریرا کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ اسفند اپنے ایک دوست کے ساتھ اسے پوچھتا ہاسٹل آیا تھا اسے اپنے پیروں تلے زمین کھسکتی ہوئی محسوس ہوئی۔

اس میں شک نہیں کہ مسز پریرا کو ماسوائے اس کے کہ وہ ایک مصیبت زدہ اور بے سہارا لڑکی ہے جسے اس کی ایک بہت ہی عزیز دوست نے کراچی سے اس کے پاس بھیجا ہے اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم تھا حتیٰ کہ اس کا اصل نام بھی نہیں۔ اور اب دو آدمیوں کے اچانک آ جانے اور اس کے بارے میں استفسار کرنے پر وہ اس کی طرف سے خاصی مشکوک ہو گئی تھی۔

اس نے اسے یہ بتانے کے بعد کہ وہ اشخاص جن میں ایک فوجی تھا تمہیں پوچھتے ہوئے آئے تھے اور تمہارا سلوط بتا رہے تھے۔ انہوں نے تمہارے بارے میں جو بتا کر دیا ہے اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ تم بغیر کسی کو بتلائے چپکے سے گھر سے بھاگ آئی ہو اور تم نے اپنا نام بھی تبدیل کر رکھا ہے۔ تم نے ظاہر کیا ہے کہ تم اس دنیا میں تنہا اور بے یار و مددگار ہو۔ اور ان دونوں کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ تمہارے سارے رشتے دار موجود ہیں حتیٰ کہ باپ بھی بحال ہیں انڈیا سے واپس آئے ہیں۔ مسز پریرا نے گویا اس کی خبر لینے کے انداز میں کہا۔

”لیکن لیکن مسز یہ بالکل جھوٹ ہے۔ آپ یقین مانیں۔“ اس نے کہنا چاہا۔

”میں اب تمہاری کسی بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں۔ وہ جس طرح بات کر رہا تھا اسے کسی طرح بھی جھوٹ نہیں سمجھا جا سکتا اور وہ مجھے وارن بھی کر گیا ہے کہ اگر ضرورت پڑی تو وہ کسی وقت بھی تمہیں لینے آ جانے گا۔ دیکھو مونا۔ خواہ وہ جھوٹ بول رہا ہو یا تم۔ لیکن کم از کم میں اس معاملے میں کوئی رسک نہیں لے سکتی۔ اگر پھر وہ دونوں کل آ گئے تو میں بلا کسی انکوائری اور تصدیق تمہیں اس کے حوالے کر دوں گی۔ کیونکہ اس معاملے میں ان دونوں نے ——— کر کے اپنے ہاسٹل کی ریپوٹیشن خراب نہیں کروں گی۔ میری مشکل یہ بھی ہے کہ میں تم کو یہاں سے کہیں بھیج بھی نہیں سکتی۔ کیونکہ تمہیں غائب پا کر وہ دونوں میری گردن ناپیں گے۔ البتہ ایک صورت میں تم ان سے خود کو بچا سکتی ہو۔ اور وہ یہ ہے کہ اپنا پورا پتا رشتے داروں کے نام اور خود اپنا اصلی نام بتا دو۔ ہم وہاں باقاعدہ انکوائری کرائیں گے اگر تمہاری بات سچ ثابت ہوئی تو پھر کسی کی مجال نہ ہو گی جو تمہارے حصول کے لیے ہاسٹل میں قدم بھی رکھ سکے۔“

لیکن وہ بھلا کیسے بتاتی اپنا اصلی نام۔

جبکہ وہ تو ہمیشہ کے لیے اسفند کی زندگی سے نکل آئی تھی۔

بلکہ وہ اس کی زندگی میں داخل ہی کب ہوئی تھی ——— خود اسفند ہی گویا زبردستی اپنے یک طرفہ جذبے سے مغلوب ہو کر دوسرے معنوں میں ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گیا تھا اور کچھ اس طرح پڑا تھا کہ وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہی تھی۔ اور اسے اس بری طرح اپنی محبت میں غرق دیکھ کر وہ اسے اپنی حقیقت سے آگاہ کر کے اس کا دل توڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اور چونکہ بات اتنی زیادہ آگے بڑھ گئی تھی اور اور وہ ایک ٹھکرائی ہوئی ہستی تھی بلکہ ایک دوسرے مرد کی ملکیت تھی۔ اس لیے اسے یہ گوارا ہی نہیں ہوا تھا کہ اصل بات بتا کر نہ صرف اسفند کی نظروں سے گر جائے بلکہ اس کی نفرتیں بھی مول لے لے۔

اصل میں تو شروع شروع میں وہ یہی ——— سوچ کر خاموشی سے سب کچھ برداشت کرتی رہی تھی کہ جیسا کہ اس کے بھائی اور بھابی نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ دونوں زیادہ سے زیادہ چار ماہ بعد اسے واپس بلا لیں گے۔ کہ ہندوستان تو وہ صرف ایک ڈیڑھ ماہ قیام کی غرض سے ہی گئے تھے تو اسفند اپنے گھر خوش ہے اور وہ اپنے گھر خوش۔ پھر اگر اسفند اس کے معاملے میں سیریس بھی ہو گیا تو اس کے بھائی بھاوج اسے اصل معاملے سے آگاہ کر دیں گے۔ اور اس طرح گویا سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی۔ بلکہ الٹی اسفند کی ہمدردیاں اس کے ساتھ ہو جائیں گی۔

لیکن چار سے چھ ماہ ہو گئے اور پھر چھ سے ایک سال بلکہ ایک سال سے کہیں اوپر۔ لیکن خبر لیتی تو کجا خود بھائی بھاوج ہی کی خیر خبر نہیں ملی۔ حد تو یہ تھی کہ انہوں نے خط کے طور پر دو حرف بھی اسے لکھ کر نہیں بھیجے۔

بیچاری لڑکی انجان سمیت ہر طرح سے حسین تر تھی۔

لیکن حیثیت کے لحاظ سے اس کی وہی مثل تھی جیسے مور فی اپنے بدنما پیروں کو دیکھ کر ناچتے ناچتے رک جاتی ہے۔

شعیب منصور کا گھرانا اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔

ان کے تمام ملاقاتی دوست احباب بھی تمام کے تمام متمول تھے اور ان سے بھی کہیں زیادہ تھے اور ایسے ذل اپنے سے بھی اونچی حیثیت کی لڑکیاں مانگتے ہیں۔

کیونکہ بڑے سے اسٹیٹس والوں کی لڑکیاں جہیز بھی بہت اونچا لاتی ہیں۔ اور پھر بڑی ترت پھرت۔ اسمارٹنس اور بیباب صفت لڑکیوں کو ہی پسند کیا جاتا ہے جو اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی ہوں۔ پھر بھلا پیسے والوں کی اس دوڑ میں بیچاری دبلی ربانی اور ایک روایتی مشرقی لڑکی کی دال کہاں گل سکتی تھی۔ یوں بھی حیثیت اور اٹیکس کے سامنے آج کل حسن اور شرافت کوئی وقعت ہی کہاں رکھتے ہیں۔ کچھ یہ وجہ تھی اور کچھ اس لیے بھی کہ زینت اور نازش وغیرہ جب بھی کوئی بہت ٹٹول ٹٹول کر اس کے بارے میں پوچھتا تو اس سے یہی کہہ دیتیں کہ اس کی تو منگنی ہو چکی ہے اور پوچھنے والا پھر چپ سادھ لیتا۔ وہ تو اسفند ہی تھا جو اس کے لیے جھاڑ کا کانٹا ثابت ہوا تھا اور اس کا کانٹا بنا دیے جانے میں تمام تر غلطی اس کی تھی۔

اس نے اگر شروع میں ہی اسفند کو حقیقت سے آگاہ کر دیا ہوتا تو بات اس حد تک نہ بگڑتی۔ سچ بات تو یہ تھی کہ خود اسے بھی اسفند دل سے پسند تھا کیونکہ درانی سے تو زبردستی اس کے جسم کا سودا ہوا تھا وہ بھی صرف چار دن کے لیے۔ مگر اس کے بعد بھی وہ درانی کے نام پر تو چڑھا دی گئی تھی۔

لیکن اسفند ہی وہ پہلی ہستی پہلا مرد تھا جو اس کے دل میں آ بسا تھا۔ ایک وہ تھیں سینکڑوں مرتبہ جب بھی اس نے اپنے دل میں جھانک کر دیکھا تھا اسے اپنے دل کے سنگھاسن پر اسفند ہی بیٹھا نظر آیا تھا۔ جبکہ وہ اسفند کے لیے شجرِ ممنوعہ کی سی حیثیت رکھتی تھی۔

پھر بھی دل پر کسے اختیار ہوتا ہے مگر دل اور خیالات دونوں ہی آزاد ہوتے ہیں۔

اور زندگی کے بیشتر اہم اور نازک مسائل میں بہت ہی غیر جانبدارانہ رول ادا کرتے ہیں۔ اور وہ اسے اس لیے کہ اتنا زیادہ چاہنے لگی تھی کہ وہ محبت کے جذبے کو بہت پاک اور مقدس سمجھتی تھی۔ اور وہ اس خوش فہمی میں مبتلا تھی کہ جب اسفند کو اس پر بیتی ہوئی بپتا کا علم ہو گا تو ہمدردی کے ساتھ اس کی چاہت میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔ اور اگر درانی نے اسے آزاد کر دیا تو اسفند یقیناً اس کا ہاتھ تھام لے گا۔ کیونکہ اسے یہ بھی اچھی طرح معلوم تھا کہ بھائی اور بھاوج اسے درانی کی قید سے آزاد کرانے کی غرض سے ہی انڈیا گئے ہیں۔ گو اسے یقین تو نہ تھا کہ ایسا ہو ہی جائے گا لیکن وہی مثل تھی کہ جب تک سانس ہے تب تک آس ہے۔

اور بس اسی امید موہوم کے سہارے محض اسفند کی شدید چاہت کے بل بوتے پر اس نے اپنے اس ماضی میں چپ سادھ رکھی تھی۔ مگر بھانڈا پھوٹا تو بھلا کس طرح۔

اور اسفند کی شدید چاہت کا پول بھی کھلا تو بھلا کیسے۔ کہ ڈراپ سین اس کی شدید یا وحشیانہ نفرت پر ہوا کہ اخلاق اور لحاظ تو بڑی چیز ہے اس نے تو رواداری اور مروت کو بھی بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ اور جہاں مروت باقی نہ رہے وہاں کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ ماسوا بربریت اور حیوانیت کے۔ کیونکہ انسانیت کا دوسرا نام مروت ہی ہے۔

ورنہ آپس میں مروت باقی نہ رہے تو انسان جانور بن کر ایک دوسرے کو کاٹنے پھاڑنے لگے۔

انسانیت میں اخلاق کا درجہ بھی دوسرے نمبر پہ آتا ہے۔ سب سے اصل مروت اور رواداری ہوتی ہے۔

اور اسفند نے سب کچھ اٹھا کر پھینک دیا تھا۔ اسی کی وجہ سے اسے گھر سے بے گھر ہونا پڑا تھا۔

اور اس کے گھر سے نکل کر ہر قدم اٹھاتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ اگر ان بڑھتے ہوئے قدموں میں کوئی قدم اس کی عزت پہ حرف لانے کا باعث بنا تو اس سے پہلے ہی وہ خود کو ختم کر لے گی۔

پھر بھلا وہ اسفند سے کوئی واسطہ رکھنا پسند کرتی۔ بلکہ اسے تو مر کر بھی یہ گوارا نہ تھا۔

اس لیے سسٹر پریرا کو اس نے بڑی قطعیت کے ساتھ جواب دیا۔

”نہیں سسٹر آپ میری بات کا یقین کریں۔ یا تو وہ شخص کسی اور کے دھوکے میں مجھے سلوط سمجھ بیٹھا ہے یا پھر کوئی اور حربہ چلانا چاہ رہا ہے ورنہ میں تو اس اتنی بڑی دنیا میں تن تنہا ہوں۔ والدین تو کیا میرا کوئی رشتے دار بھی نہیں ہے۔ ایسا ہی ہے تو آپ سسٹر فلورا سے معلوم کر لیں۔“

”اچھا ٹھیک ہے پھر میں فلورا سے بات کر کے ہی کسی نتیجے پہ پہنچوں گی۔“ سسٹر پریرا نے کہا۔

اس نے کہنے کو تو کہہ دیا تھا کہ ایسا ہی ہے تو آپ سسٹر فلورا سے اس کی تصدیق کر لیں۔ کیونکہ جب یہ بات ہو رہی تھی اس وقت تو اس نے یہی سوچا تھا کہ وہ سسٹر پریرا سے پہلے ہی سسٹر فلورا کو کراچی فون کر کے اسے ساری بات بتا دے گی کیونکہ وہی مہربان اور شفیق سی ہستی اس کی رازداں، خیر خواہ اور ہمدرد تھی۔ لیکن شام تک اسی کوشش میں فون کے ارد گرد منڈلانے کے باوجود اسے سسٹر فلورا سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔ رات کو سسٹر فلورا کو فون کرنا بیکار ہی تھا کیونکہ فلورا کی ڈیوٹی شام کو ختم ہو جاتی تھی۔ اور اس کا فون پہ ملنا ممکن ہی نہیں ہو سکتا تھا۔

جبکہ شام تک تو وہ یہی سوچ سوچ کر اپنا خون خشک کرتی رہی کہ پریرا نے ضرور فلورا سے بات — کر لی ہوگی۔ اور اب وہ کسی وقت بھی مجھے طلب کر لے گی۔ اور کسے معلوم کہ میرے ساتھ ساتھ وہ ان دونوں کو بھی طلب کر لے اور مجھے زبردستی ان کے ساتھ جانے پر مجبور کر دے۔ اس سے بہتر کہ ایسی کوئی بات ہو میں خود ہی کیوں نہ یہاں سے چلی جاؤں۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ اس کے کمرے میں اس سمیت تین نرسیں اور رہتی تھیں۔ اور سب ہی اپنی اپنی ڈیوٹی سے تھک کر واپس آ گئی تھیں۔ ان میں عفت بھی شامل تھی۔

اس لیے فی الفور جانا تو بڑی بات وہ اپنا ضروری سامان بھی پیک نہیں کر سکتی تھی۔ مگر اس نے سوچ لیا تھا کہ جب سب سو جائیں گی اس وقت وہ اٹھ کر چپکے چپکے اپنا سامان باندھ لے گی۔ اور اگلے روز بارہ بجے کے قریب جب پریرا نیچے آفس میں ہوتی ہے اور نرسیں اپنی اپنی ڈیوٹی پہ۔ وہ اپنا سوٹ کیس لے کر عقبی دروازے سے نکل جائے گی۔

اس پروگرام کے تحت اس نے یہی کیا جو سوچا تھا۔ وہ رات کے بارہ بجے تک بستر پہ خاموش پڑی اپنی روم میٹس کے سونے کا انتظار کرتی رہی اور جب اسے اچھی طرح اطمینان ہو گیا کہ سب بے سدھ پڑ کر سو گئی ہیں تو اس نے بہت احتیاط سے آواز پیدا کیے بغیر الماری میں رکھا اپنا کچھ سامان سوٹ کیس میں ڈالا۔ کپڑے وغیرہ تو اس کے سوٹ کیس میں ہی رکھے رہتے تھے۔ البتہ سوٹ کیس کو بھی الماری میں ہی مقفل کرتی تھی وہ۔ کیونکہ الماری بھی مشترکہ ہی تھی۔ بہرحال اس نے اپنا سوٹ کیس الماری سے نکال کر اسے اپنے سرہانے کی طرف بیڈ کے نیچے چھپا دیا۔ اور اس کام سے فارغ ہو کر سونے کی غرض سے بستر پہ لیٹ گئی لیکن کوشش کے باوجود اسے نیند نہیں آئی۔ کروٹیں لو تو اسفند

کا خیال اس دن کے بعد سے جس روز اسے زخمی حالت میں دیکھا تھا اسے بار بار آیا تھا۔ مگر ان خیالات سے کوئی اچھی یاد وابستہ نہیں ہوتی تھی۔ اور اگر ہوتی بھی تو صرف تھوڑی دیر کے لیے پھر وہی اس کی اہانت آمیز گفتگو، غصے سے آگ بگولا ہونا اور گھر سے نکال دینا ہی چشم تصور میں گھومتا رہتا تھا۔ اور پھر گھر سے نکلنے کے بعد کی ٹھوکریں۔ فلورا سے ملاقات اور پھر سرگودھا پہنچنا۔ اور اس وقت بھی اسے اس بے سرو سامانی اور کسمپرسی کے عالم میں اسفند کے گھر سے نکل کر جو واقعات پیش آئے تھے ایک ایک کر کے یاد آ رہے تھے۔ بلکہ کسی فلم کی ریل کی طرح ایک ایک کر کے اس کی یادداشت کی سطح پر اتر رہے تھے۔

وہ رات کے نو بجے کا عمل تھا جب وہ شعیب منصور کے گھر سے نکلی تھی۔ شاہراہ فیصل پر ٹریفک اسی زور و شور سے رواں دواں تھا جیسے کہ دن کی پر ہنگامہ ساعتوں میں ہوتا ہے۔

بسیں اور ویگنیں بھی انسانوں کے ہجوم سے لبریز۔ اسٹاپوں پہ ٹھہرتی اپنے روٹس پہ آ اور جا رہی تھیں حتیٰ کہ شاہراہ کے دونوں اطراف میں فٹ پاتھوں پر بھی راہ گیروں کی آمد و رفت جاری تھی۔ جبکہ وہ کوئی ایسی الہڑ اور معصوم دوشیزہ تو نہیں تھی کہ زمانے کے نشیب و فراز سے واقف ہی نہ ہوتی۔

وہ جن لمحات میں گھر سے نکلی تھی۔ ان میں ایک جوان لڑکی کے لیے قدم قدم پہ خطرات پنہاں تھے۔ اس کی مثال کچھ ایسی ہی تھی جیسے بازوں اور شکروں کے نرغے میں ایک ننھی منی کمزور سی چڑیا ہوتی ہے۔ جسے ان عقابی نظروں سے بچنے کے لیے کوئی پناہ گاہ بھی نہیں ملتی۔ لیکن حتی الامکان وہ کوشش یہی کرتی ہے کہ ان عقابی نظروں سے بچی رہے۔ اور اسی کوشش میں اس نے فٹ پاتھ چھوڑ کر بنگلوں کی باؤنڈری وال کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیا تھا۔ کیونکہ بنگلوں کے آس پاس کا ماحول قدرے سنسان اور نیم تاریک تھا وہ چاہتی تو یہ راستہ چھوڑ کر سیدھی فٹ پاتھ پہ آ جاتی اور کسی بس اسٹاپ پہ رک کر بس کا انتظار کرتی۔

مگر اس کی تو کوئی منزل تھی نہ ٹھکانہ۔ سامنے سڑک پہ رواں دواں بھاری ٹریفک کا ایک شور بپا تھا۔ کاریں، بسیں، رکشا، ٹیکسیاں اور موٹر سائیکلوں کی ہیڈ لائٹس آنکھوں میں چکا چوند سی پیدا کرتی لگ رہی تھیں۔ مگر اس کے اندر تاریکی اور سناٹے سے اتر آئے تھے۔ وحشت اور دہشت نے ڈیرے سے جما رکھے تھے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جائے تو کہاں جائے؟ کرے تو کیا کرے؟

مگر اس اتنے عظیم الشہر کراچی کے لاکھوں لاکھ باسیوں میں سے کسی سے بھی تو اس کی واقفیت نہیں۔ کوئی ایک بھی تو اس کا جان پہچان والا نہ تھا۔ ماسوا سہیل منصور کے۔ مگر ان لوگوں سے تو ہمیشہ کے لیے ہر تعلق قطع کر آئی تھی۔

لاہور بھی واپس نہیں جا سکتی تھی کہ اول تو لاہور میں اس کا تھا ہی کون؟ اور لاہور کی اقامت نے ہی تو اس پر دنیا کی جہنم کے سارے دروازے کھول دیے تھے۔

بھائی اور بھاوج کا بھی کوئی پتا و نشان نہ تھا۔ اور ادھر رات کے وقت تن تنہا یوں سڑک پہ نکلنا بھی خود اپنے لیے ہزاروں خدشات اور خطرات پیدا کرنے کے مترادف تھا۔ اس پہ ادھر ادھر گھومتے بھیڑیا صفت انسانوں کا خوف۔

اور وہ لمحے لمحے سے چونکتا انداز میں ادھر ادھر دیکھتی۔ بنگلوں کی باؤنڈری وال کے ساتھ آگے بڑھتی جا رہی تھی۔

یہاں تک کہ بنگلوں کا سلسلہ ختم ہو کر کمرشل ایریا شروع ہو گیا۔ جہاں بہت گہما گہمی تھی۔ بیکری، پرویژن اسٹور، سگریٹ پان کی دکان۔ الیکٹرک اپلائنسز کی دکانیں تھیں۔ اور اندر ایک سپر مارکیٹ بھی تھی۔ آگے پیچھے کئی گاڑیاں دکانوں کے آگے پارک کی ہوئی تھیں۔ حالانکہ یہ ایک سروس لین تھی پھر بھی اس پہ ایک تسلسل سے کاریں، ٹیکسیاں اور اسکوٹرز وغیرہ گزر رہے تھے۔ اور راہ گیر بھی خاص تعداد میں چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ اور وہ بڑی آسانی سے سب کی نظروں میں آ سکتی تھی۔ گو کراچی میں ایک خوبی یا خامی یہ بھی ہے کہ عام حالات اور معاملات میں کوئی کسی کی

طرف زیادہ توجہ نہیں دیتا۔

لیکن جوان لڑکی کی مثال رنگین آنچل کی سی ہوتی ہے جس کی ایک جھلک دیکھتے ہی مردوں کے دل مچل مچل اُٹھتے ہیں۔ اور اس کے ہاتھ میں تو سوٹ کیس بھی لٹک رہا تھا۔ اور وہ تھی بھی نازک کی نزاکت کا مُنہ بولتا ثبوت رہا تھا۔ اسی پر بعض لوگ اس کی طرف متوجہ بھی ہو گئے تھے۔ گویا خطرہ تھا کہ ان کے سر پر منڈلا نے لگا تھا اور اس سے پہلے کہ کوئی اس کے نزدیک آ کر اس سے کچھ پوچھ بیٹھے۔ یا اسے تنہا دیکھ کر کوئی مذموم حرکت کر بیٹھے کہ عورت کی آبرو تو سیپ میں بند آبدار موتی کی طرح ہوتی ہے جس سے کوئی انسانی ہاتھ مس بھی کر جائے تو اس کی نرمی اور آب و تاب ماند پڑ جاتی ہے اسے ڈر تھا تو بس اسی بات کا ورنہ حالات کی کسے پرواہ تھی۔ ان جیسے حالات میں جن سے وہ دوچار تھی کوئی اور چارہ کار نہ دیکھ کر وہ جلدی سے سڑک پار کر کے ذرا ہٹ کر بس اسٹینڈ پر آ کھڑی ہوئی۔ پھر کتنی ہی بسیں آئیں اور مسافروں کو اتار اور چڑھا کر اپنی راہ ہو لیں مگر وہ چپ چاپ کھڑی ہی رہی۔ جبکہ بس اسٹینڈ پر شیڈ کے نیچے ایک بینچ بھی پڑا تھا اور اتفاق سے خالی تھا۔ مگر وہ اس بینچ پر بھی نہیں بیٹھی۔ کیونکہ منزل تو بڑی چیز اسے تو کسی سمت کا ابھی اندازہ ہی نہ تھا۔ پھر بھلا کسی بس میں بیٹھنے سے فائدہ ہی کیا ہوتا۔ بڑے ہی کٹھن لمحات تھے اس کے لیے۔

کہ پیچھے جو راستہ چھوڑ کر آئی تھی اس پر پلٹ کر جانا ناممکن تھا نہ آگے جانے کی کوئی راہ نظر آ رہی تھی۔

کیسی بے بسی اور کسمپرسی کے لمحات تھے کہ سوچ بھی ناکارہ ہو گئی تھی اور دماغ بھی جواب دیتا لگ رہا تھا۔ اور وہ سڑک پر چلتے ہوئے ٹریفک پر بلا مقصد ہی نگاہیں مرکوز کیے۔ نامعلوم کن خیالوں میں گم کھڑی تھی جبکہ پہلو سے۔ بالکل ساتھ ہی ایک غیر مانوس مگر نرم سی آواز نے اس کی بند بنا رہی کیفیت کو یک لخت منتشر سا کر دیا۔

"کہاں جانا ہے تمہیں؟" اس سوال پر اس نے گردن موڑ کر بائیں سمت دیکھا۔ شلوار سوٹ میں ملبوس، اور دوپٹہ اوڑھنی کو ماتھے پر بالوں کی آخری حد تک ڈھانپے اور عمر کے جولانی دور کو بہت پیچھے چھوڑ آنے والے جھول کھائے ہوئے چہرے کی وہ ایک معمر سی خاتون تھی۔ جس کے چہرے پر عمارت کے عظیم ہونے کی بھی کوئی نشان یا آثار موجود نہ تھے۔ لیکن اس کی آنکھیں۔

قدرے چھوٹی اور متجسس سی آنکھوں میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جس نے اس کے خوف کو کسی حد تک زائل کر دیا تھا۔ لیکن وہ جواب میں کچھ بھی نہیں کہہ سکی۔ کہ کہنے کو تھا ہی کیا۔

"کیا نو وارد ہو یہاں؟" اس نے پھر سوال داغا۔ اور اسے جھوٹ بولتے ہی بنی۔

"جی۔" اس نے پست سی آواز میں کہا۔

"اچھا مگر کہاں سے آئی ہو۔؟"

"لاہور سے۔"

"کب آئی ہو۔"

"ابھی۔"

"کیا تنہا ہو۔؟"

"جی۔"

"ارے تنہا آئی ہو تو۔ جن کے یہاں آئی ہو کیا وہ لوگ تمہیں لینے اسٹیشن بھی نہیں آئے۔"

"نہیں کیونکہ میرا یہاں کوئی رشتہ دار ہے نہ واقف کار۔"

"اوہو تو پھر تم یقیناً یہاں کسی ملازمت کے سلسلے میں آئی ہو گی۔" خاتون نے سر ہلا کر کچھ اس انداز میں کہا جیسے وہ تنہا اس کی کراچی آمد کا مفہوم سمجھ گئی ہو۔

"جی نہیں میں ملازمت کے سلسلے میں بھی نہیں آئی۔" اسے مزید جھوٹ بولنا گوارا نہ ہوا۔

"تو پھر کیا گھر سے بھاگ کر آئی ہو۔" عورت نے ایک دم ہی مشکوک ہو کر پوچھا۔

"نہیں۔ میں گھر سے بھاگی بھی نہیں۔ کیونکہ میرا تو یہاں نہ وہاں کوئی رشتے دار ہی نہیں ہے۔ میں تو اس بھری دنیا میں بالکل تنہا ہوں۔" اس نے پہلی بار کھل کر بات کی۔

"اچھا اگر بالکل تنہا ہو تو اب تک کیا در ختوں اور جھونپڑوں میں زندگی گزارتی آئی ہو۔"

"اب تک۔" سوال چونکہ بہت ٹیڑھا تھا اس لیے اس نے جھوٹ گھڑتے ہوئے سوچا۔ اگر اس خاتون کو اب بھی صحیح بات نہ بتائی تو عین ممکن ہے کہ یہ میری طرف سے مشکوک ہو کر میرے لیے کوئی نئی مشکل کھڑی کر دے۔

"بھائی کے ایک عزیز کے یہاں رہ رہی تھی۔" اس نے بتایا بھی تو کچھ اس طرح جیسے دل سے گھڑ کر بتا رہی ہو۔ اور خاتون پچ مچ اس کی طرف سے مشکوک ہی ہو گئی اور اسے قائل یا شرمندہ کرنے کی غرض سے آنکھیں مٹکا کر بولی۔

"لو ابھی تو کہہ رہی تھیں کہ اس بھری دنیا میں میرا کوئی ہے ہی نہیں پھر یہ بھائی ایک دم ہی کہاں سے پیدا ہو گئیں۔" کوئی اور وقت ہوتا یعنی وہ اتنے خدشات میں نہ گھری ہوتی تو اس خاتون کو بری طرح لتاڑ دیتی کہ وہ اپنے کام سے کام رکھے اور اس کی ذاتیات میں دخل نہ دے۔ مگر اس لمحے تو عرصہ حیات جن اس پر تنگ ہو رہا تھا بلکہ وہ خاتون کے اس سوال کا کیا جواب دیتی کیونکہ اسے اپنے نجی معاملات سے آگاہ کرتی۔ یا اتنا ہی کہہ دیتی کہ جن لوگوں کے ساتھ وہ رہ رہی تھی انہوں نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد بولی۔

"دیکھیں آپ مجھے غلط نہ سمجھیں میں کسی کے یہاں ڈاکہ ڈال کر آ رہی ہوں نہ کسی کے ساتھ بھاگ کر۔ بلکہ میں واقعی ایک مصیبت زدہ لڑکی ہوں۔"

"ٹھیک ہے اگر تم مصیبت زدہ بھی ہو تو آخر جانا کہاں ہے۔ کون سے روٹ کی بس پکڑنا چاہتی ہو جو آدھے گھنٹے سے یہاں کھڑی ہو۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ کیونکہ آدھے گھنٹے سے تو میں تمہیں یہاں کھڑا دیکھ رہی ہوں۔"

"اصل میں تو میں لوگوں کی نظروں سے بچنے کے لیے یہاں آ کر کھڑی ہو گئی تھی ورنہ خود مجھے بھی معلوم نہیں کہ مجھے کہاں جانا ہے تو پھر کوئی بس پکڑنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔" اس نے کہا تو خاتون نے بڑی گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کمال ہے بظاہر تو تم پوری جوان اور سیانی ہو مگر باتیں بچوں کی سی کر رہی ہو یا پھر مجھے باتوں میں اڑانا چاہ رہی ہو۔ یعنی تم کہتی ہو کہ تم سیدھی لاہور سے یہاں آ رہی ہو۔ تو جب تمہارا کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا تو اسٹیشن کے ویٹنگ روم ہی میں کیوں نہ رک گئیں۔ یہاں — بازار کھڑے ہو کر اپنی آبرو کو داؤ پر لگانے کیوں آگئیں۔ دیکھو میں خفیہ پولیس کی ایک کارندہ ہوں اور مجھ سے جھوٹ بولو گی تو تمہیں سخت نقصان اُٹھانا پڑے گا۔" وہ تو آہستہ بولی لیکن مگر وہ خاتون اتنی اونچی آواز میں بات کر رہی تھی کہ ارد گرد کھڑے لوگ ان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ اس پر وہ بتا رہی تھی کہ وہ خفیہ پولیس کے محکمے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس صورت حال سے سہم کر اس نے ملتجی سے لہجے میں کہا۔

"خدا کے لیے مجھے غلط نہ سمجھیے اور ذرا آہستہ بولیے۔ آپ اگر پولیس کے محکمے سے تعلق رکھتی ہیں تو خدارا مجھ مصیبت زدہ کی مدد کیجیے۔ اور مجھے کسی ایسے ادارے تک پہنچا دیجیے جہاں مجھ جیسی لاوارث اور مصیبت زدہ لڑکیوں کو تحفظ دیا جاتا ہے۔ کیونکہ میری تو کچھ میں نہیں آ رہا کہ میں جاؤں تو کہاں جاؤں۔ جہاں سے آ رہی ہوں ان لوگوں نے میری زندگی کچھ ایسی عذاب بنا دی تھی کہ میں نے وہاں سے نکلنے ہی میں اپنی بہتری سمجھی۔" سچ کے انداز نے آپ کو منوانے کی بڑی قوت ہوتی ہے۔ شاید اسی قوت نے اس مشکوک خاتون کو متاثر کیا تھا۔ وہ کچھ دیر تک سوچنے کے بعد بولی۔

"تم نے ایسے ناوقت اس گھر سے نکل آنے میں اپنی بہتری سمجھ کر سخت حماقت کی ہے۔ بہر حال سب کے اپنے اپنے حالات اور مجبوریاں ہوتی ہیں اور تمہاری بھی یہ کوئی مجبوری ہی ہو گی۔ لیکن میں اس وقت تو تمہیں کسی ایسے ادارے تک نہیں پہنچا سکتی البتہ میں تمہیں اپنے گھر لیے چلتی ہوں جہاں تم آرام سے رات گزار لینا۔ پھر میں کل کسی دارالامان

کا پتا معلوم کر کے تمہیں وہاں چھوڑ آؤں گی۔"

مگر خاتون کی اس ہمدردانہ پیشکش کو غنیمت سمجھنے کے بجائے وہ بدک سی اٹھی۔ کر کسی اجنبی اور وہ بھی خاتون کے ساتھ یوں بلا سوچے سمجھے جا بھی کیسے سکتی تھی۔ پتا نہیں وہ کون ہو اور کیسی ہو۔ اسے ساتھ لے جا کر وہ اس پر قبضہ کر کے کہیں کسی کے ہاتھ اسے بیچ دیا تو پھر وہ دین کی رہے گی نہ دنیا کی۔ اسی خدشے کے تحت اس نے کہا۔

"نہیں میں آپ کے ساتھ ہرگز نہیں جاؤں گی۔ آپ میں اگر تھوڑی سی بھی ہمدردی ہے تو بس مجھے کسی ادارے کا پتا بتا دیں میں خود ہی وہاں پہنچ جاؤں گی۔" خاتون نے عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔

"تم خاصی سمجھدار معلوم ہوتی ہو اور مجھے تم سے ایسے ہی جواب کی امید تھی۔ تم مجھ پر اعتبار نہیں کر رہیں تو یہ تمہاری عقلمندی ہے کیونکہ آج کل تو اپنوں پر بھی مشکل ہی سے اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ تم اگر میرے ساتھ جانے پر آمادہ نہیں ہو تو آؤ میرے ساتھ چلو میں تمہیں تمہارے اس ٹھکانے پر چھوڑ دوں جہاں سے تم آئی ہو۔"

"نہیں نہیں وہاں اب پھر پلٹ کر جانا مجھے مر کر بھی گوارا نہیں۔" وہ جھٹکے سے انداز میں بولی۔

"تو کیا یہاں سڑک کے کنارے کھڑے رہ کر خود اپنے آپ کو خطرات کی دعوت دو گی۔ دیکھو میں تم سے یہ تو نہیں کہوں گی کہ مجھ پر اعتبار کرو۔ کیونکہ ایسا کہنا نری حماقت ہی ہو گا کہ میں تمہارے لیے ایک بالکل ہی اجنبی اور غیر عورت ہوں۔ البتہ اتنا اطمینان ضرور دلا سکتی ہوں کہ وہ جو اوپر بیٹھا اپنے بندوں کی ہر اچھی اور بری بات پر نظر رکھتا ہے۔ وہ میری نیت اور ارادوں سے اچھی طرح باخبر ہے اس لیے میری نیت اور ارادوں میں کسی فتور کو دخل ہی نہیں ہو سکتا۔ اور اگر تم اس ذات برحق پر ایمان رکھتی ہو تو میرے ساتھ چلی چلو ورنہ میں زبردستی تمہیں مجبور نہیں کروں گی۔" دوسرے معنوں میں اس خاتون نے اپنے نیک ارادوں اور نیک نیتی کا خدا کو گواہ بنایا تھا۔ اور ایسی بات اگر کوئی عام بندہ بھی کہہ سکتا ہے تو اسی وقت جب اس کا دل نور ایمان سے منور ہو۔ اس نے بھی سوچا کہ اب مزید انکار اس کی راست گوئی کی توہین ہو گا۔ اس لیے اس نے گویا ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

"اچھا چلیے مگر برائے مہربانی۔ جب وعدہ مجھے کل کسی ادارے میں ضرور پہنچوا دیجیے گا۔" وہ پہلی بار ہنس کر بولی۔

"میں نے وعدہ تو نہیں کیا تھا لیکن اگر تم اسے وعدہ ہی سمجھ رہی ہو تو میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گی کہ کل تک تم کو کسی دارالامان میں پہنچا دوں۔" اپنی بات کہہ کر اس نے قریب سے گزرتی ہوئی موٹر رکشا کو ہاتھ کے اشارے سے روکا اور پھر اس کے ساتھ رکشا کی طرف بڑھتی ہوئی بولی۔

"یوں تو عموماً میں بس سے ہی سفر کرتی ہوں مگر اب مزید بس کے انتظار میں کھڑا رہنا مناسب نہیں۔ اس لیے رکشا میں ہی چلتے ہیں۔" اور پھر اس کے ساتھ رکشا میں بیٹھ کر اس نے رکشا والے سے کہا۔

"مارٹن روڈ لے چلو۔" اور پھر شاہراہ فیصل پر واپس پلٹ کر ایک موڑ مڑنے کے بعد ناک کی سیدھ میں جو رکشا نے فراٹا بھرا تو سڑک شیطان کی آنت بن گئی۔ جو کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ اور راستہ بھی کہیں بہت روشن تھا اور کہیں نیم تاریک مگر ٹریفک تھا کہ چاروں طرف سے اُبلے پڑ رہا تھا۔

اصل میں وہ شہید ملت روڈ تھی جو شاہراہ فیصل سے شروع ہو کر جیل کے آخری سرے تک ختم ہوتی ہے۔ اور وہیں بائیں ہاتھ کو مارٹن کوارٹرز کا علاقہ تھا۔ خاتون تمام راستے ایک لفظ نہیں بولی تھی۔

جہاں تک اس نے محسوس کیا وہ تمام راستے زیر لب کچھ پڑھتی رہی تھی۔ رکشا والے نے اس کے بتانے پر اندر گلی در گلی میں کوارٹروں میں ایک کوارٹر کے آگے رکشا روکی۔ خاتون نے پہلے اسے اتارا پھر خود اتر کر میٹر ___ چارجز کرایہ ادا کیا۔ اور سامنے بنے ایک چھوٹے سے کوارٹر کی طرف بڑھتی ہوئی اس سے بولی۔

"آؤ بسم اللہ۔ اندر چلو۔" اور اس کے ساتھ ہی اس نے دروازے پر پہنچ کر کنڈے میں پڑے بڑے سے تالے کو کھولا اور اندر ایک چھوٹے سے کمرے میں داخل ہو کر بجلی کا سوئچ دبا دیا۔

روشنی ہو جانے کی وجہ سے کمرے کی ہر شے واضح ہو گئی۔

کمرے میں ایک پلنگ۔ ایک چوکور میز دو کرسیوں۔ دو صندوقوں اور صراحی کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔ البتہ فرش پر ایک ننھا سا غالیچہ ضرور بچھا ہوا تھا۔ مگر چیزوں کی سیٹنگ کچھ اتنے قرینے سے کی گئی تھی کہ نفاست کے ساتھ ساتھ خوش سلیقگی کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ اب تک منہ اسی طرح ڈھانپے کہ صرف اس کی آنکھیں ہی تھوڑی سی نکلی نظر آ رہی تھیں دروازے کے آگے ہی کھڑی تھی۔ خاتون نے دروازے کا اندر سے کھٹکا لگاتے ہوئے اس سے کہا۔

"بیٹی آرام سے میرے پلنگ پر بیٹھ جاؤ۔ اطمینان رکھو یہاں کوئی مرد تو کیا عورت بھی نہیں آئے گی۔ تم بے فکر ہو کر اپنا یہ چادر وہ بھی چہرے سے ہٹا دو اور مجھے تھوڑی دیر کے لیے اجازت دے دو۔ اصل میں دیر ہو جانے کی وجہ سے میں ابھی تک عشا کی نماز بھی نہیں پڑھ سکی ہوں۔ بس ذرا نماز پڑھ لوں پھر تم سے دل کھول کر باتیں کروں گی۔" سلوطا پر گویا پہلا اطمینان اسی کی پرہیزگاری کا پڑا تھا۔ اس کے دل میں جو شک و شبہات باقی رہ گئے تھے وہ بھی دور ہو گئے۔ عورت دوسرا دروازہ کھول کر باہر صحن میں کہیں وضو کرنے چلی گئی۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد وضو سے تر چہرہ لیے اندر آئی اس کی طرف کوئی توجہ دیے بغیر جانماز بچھا کر نماز ادا کرنے لگی اور سلوطا نے اٹھ کر پہلے دوسرے کھلے ہوئے دروازے سے باہر جھانکا۔

باہر اسے ایک تنگ سا صحن نظر آیا جس کے بائیں طرف باورچی خانہ، غسلخانہ اور بیت الخلا بنا ہوا تھا۔ باہر صحن میں ہلکی پاور کا بلب جل رہا تھا اس لیے ہر چیز واضح اور صاف نظر آ رہی تھی۔ باہر صحن میں بالکل سناٹا پڑا تھا پھر بھی سلوطا نے اس کے پلنگ کی طرف بڑھنے سے پہلے دوسرے دروازے کی بھی اندر سے چٹخنی لگائی اور اپنی چادر اتار کر اور دوپٹے کو قرینے سے اوڑھ کر اس کے پلنگ پر بیٹھ گئی۔

پھر تھوڑی دیر نہیں بلکہ خاصی دیر اسے انتظار کرنا پڑا تب کہیں جا کر وہ خاتون نماز سے فارغ ہوئی اور جانماز تہہ کر کے اسے صندوق پر رکھ کر بولی۔

"پہلے میں کھانا گرم کر کے لاتی ہوں۔ آج تو صبح سے کچھ کھایا ہی نہیں کام ہی کچھ اتنا بڑھ گیا تھا کہ سر اٹھانے کی بھی مہلت نہیں ملی۔ تمہیں بھی تو بھوک لگ رہی ہو گی۔"

"نہیں میں تو کھانا کھانے کے بعد ہی وہاں سے نکلی تھی۔ لیکن آپ ضرور کھائیں آپ نے ویسے بھی صبح سے کچھ نہیں کھایا۔" سلوطا بولی۔

"ہاں ہاں بھئی۔ میں تو ضرور کھاؤں گی میں بھوک کے معاملے میں ویسے بھی کچی ہوں۔ یوں بھی بیٹی بڑھاپے میں انسان صرف کھانے کے سہارے جیتا ہے۔ کیونکہ جوانی میں تو پانی بھی اسے خون بن کر لگتا ہے۔ اصل میں عمر عمر کا فرق ہوتا ہے نا۔" خاتون نے کہا اور پھر چٹخنی کھول کر باہر نکل گئی۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی جس میں بڑی نفاست سے کھانا چنا ہوا تھا۔

ایک خوبصورت سے نقشین پیالے میں تھوڑی سی دال تھی۔

ایک میں سالن۔ اچار کی بوتل۔ ایک پلیٹ میں روٹی اور پانی سے لبالب شیشے کا گلاس۔ جبکہ ٹرے میں ایک سفید جھگ ٹرے کلاتھ بھی بچھا تھا۔ ٹرے کو اس نے ایک چھوٹی سی چوکور میز پر رکھا اور کرسی گھسیٹ کر اس کے آگے ہی بیٹھ گئی۔ سلوطا نے محسوس کر لیا تھا کہ اس کی نظریں بار بار اس کے چہرے کا طواف کر رہی ہیں۔ اس کے دل میں پھر شک و شبہات سر ابھارنے لگے تھے۔ کہیں یہ محض ایک دکھاوا ہی نہ ہو۔ پارسائی کا ڈھونگ ہی نہ ہو۔ خیر نا سا بھی سہی مگر کوارٹر کے اس کمرے میں وہ تنہا تو ہرگز نہیں رہتی ہو گی۔ یہی سب سوچ سوچ کر وہ دل ہی دل میں ہولتی رہی۔

ادھر وہ خاتون بڑی ہی باتونی ثابت ہوئی تھی اور ٹیپ کی طرح مسلسل بجے ہی جا رہی تھی۔

"بازار کا کھانا خواہ کتنا ہی عمدہ کیوں نہ ہو مگر مجھے تو اپنے ہاتھ کا پکایا ہوا کھانا ہی مزا دیتا ہے۔ اس لیے میں صبح تڑکے اٹھ کر نماز اور گھر کی جھاڑ پونچھ سے فارغ ہونے کے بعد اپنا کھانا تیار کر کے جاتی ہوں۔ مگر ساتھ اس لیے نہیں لے جاتی کہ ایک تو فرصت ہی مشکل سے ملتی ہے دوسرے ٹھنڈا کھانا مجھے ہضم نہیں ہوتا جاول

مجھے بہت مرغوب ہیں مگر چاول کھانے سے میرے پیٹ میں اپھارا سا ہوتا ہے جوڑوں میں بھی درد ہونے لگتا ہے اسی لیے عرصہ ہوا میں نے چاول کھانے چھوڑ ہی دیے ہیں۔ اصل میں یہ کراچی کی ہوا بہت مرطوب ہوتی ہے نا اسی لیے بادی چیزیں مجھے بہت نقصان دیتی ہیں۔"

ادھر اس کی جان پر بنی تھی اور ادھر یہ نہایت غیر متعلقہ اور فضول سی باتیں سننے کو مل رہی تھیں گویا دوسرے معنوں میں خاتون کو یہ احساس ہی نہیں تھا کہ وہ کسی خوشی وقتی میں اس کے یہاں نہیں آئی ہے۔ یا پھر وہ دانستہ ایسی باتیں کر کے اسے بہلانا چاہ رہی تھی۔ مارے کوفت کے سلوطہ کا برا حال ہو رہا تھا۔ لیکن مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق وہ بڑے صبر و تحمل سے اس کی لنترانی کو برداشت کر رہی تھی۔

آخر کھانے کے اختتام پر وہ خاتون خود ہی خاموش ہو گئی۔ اٹھ کر خاموشی سے ٹرے اٹھائی اور باہر نکل گئی۔

اس مرتبہ کچھ زیادہ ہی دیر لگا کر آئی۔ مگر آئی تو ایک چھوٹی سی طشتری میں چائے کے دو کپ لے کر آئی۔

"یوں تو خاصی گرمی پڑ رہی ہے۔ مگر ہم کراچی والے تو صدقی سدا چائے کے رسیا ہوتے ہیں اس لیے تمہارے لیے یہ گرم گرم چائے بنا کر لائی ہوں جبکہ چاہیے تو تھا کوئی ٹھنڈی چیز یا شربت پیش کرتی۔ مگر غریب کے پاس فریج ہے نہ بازار سے کوئی برف لانے والا ہے۔ بس تھوڑی دیر کے لیے یہ سمجھ لو کہ جیسا ساز ویسا راگ۔ اب یہاں تمہیں برف میں لگا ٹھنڈا پانی بھی نہیں مل سکے گا۔"

"لیجیے۔ میں ایسی کون سی برف کی عادی ہوں۔ بس جیسا مل جاتا ہے وہی کھا پی لیتی ہوں۔ اصل میں میں نے خود کو ہر طرح کا عادی بنا رکھا ہے۔" سلوطہ بولی۔

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے بیٹی۔ کیونکہ اسی مزاج کا انسان برے سے برے حالات کا سامنا کر سکتا ہے۔ ہاں اب بتاؤ کہ تمہاری بھابی کے رشتے داروں نے تمہارے ساتھ ایسی کیا بدسلوکی کی تھی جو تمہیں ان کے گھر سے نکلنے پر مجبور ہونا پڑا؟" خاتون نے گویا اب اصل مقصد کی طرف آتے ہوئے پوچھا۔

"یہ بڑی طویل داستان ہے خالہ جان۔ بس آپ اتنا سمجھ لیجیے کہ کچھ ایسی ہی نوبت آ گئی تھی جو میں نے ان کے گھر سے نکل کر اپنی عزت بچانے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ معاف کیجیے گا میں نے آپ کو خالہ جان کہہ دیا۔" سلوطہ نے گویا یہ کہہ کر بڑی خوبصورتی سے اپنے معاملات پر پردہ ڈالا۔

"خیر خالہ جان بھی کہا تم مجھے اماں جان بھی کہہ سکتی ہو۔ لیکن اگر آنٹی فلورا کہو تو زیادہ بہتر ہوگا۔" خاتون مسکرا کر بولی۔

"آنٹی فلورا۔ لیکن آپ تو مسلمان ہیں ابھی عشاء کی نماز پڑھ رہی تھیں۔" سلوطہ نے سخت متعجب ہو کر کہا۔

"ہاں الحمدللہ میں مسلمان ہی ہوں۔ لیکن تمہاری طرح میری داستان بھی بہت طویل ہے۔ اگر موقع ملا تو پھر کبھی سنا دوں گی۔ اس وقت تو تم اپنی سناؤ۔" خاتون نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں پہلے آپ اپنی داستان سنائیے۔ ورنہ میری عادت ہے کہ تجسس کے عالم میں کوئی بات ہی نہیں کر سکتی۔"

"اچھا پہلے تم چائے تو پی لو۔ ٹھنڈی ہو جائے گی تو کیا خاک مزا دے گی۔" لیکن اس نے سنا تھا کہ بعض لوگ چائے یا پانی وغیرہ میں بے ہوشی کی کوئی دوا ملا دیتے ہیں۔ کہیں ان آنٹی فلورا نے بھی کوئی ایسی حرکت نہ کی ہو جو یہ چائے پی کر بعد میں مجھے پچھتانا پڑے۔

"آپ اتنی محبت سے میرے لیے چائے بنا کر لائی ہیں اس لیے انکار کرتے ہوئے شرم آ رہی ہے۔ ورنہ یقین جانیں میں صبح ناشتے کے سوا بالکل چائے نہیں پیتی۔ اور رات کو پینے سے تو میری نیند اڑ جاتی ہے۔ خیر پی لوں گی مگر ذرا ٹھنڈی تو ہو جائے۔" اس نے تھوڑے سے تامل کے بعد گویا بہت خوبصورتی سے چائے پینے سے انکار کیا تو آنٹی فلورا نے اس کے آگے سے پیالی اٹھاتے ہوئے کہا۔

"اگر نیند اڑ جاتی ہے تو ہرگز نہ پینا۔ یوں بھی بہت تھکی تھکی سی لگ رہی ہو۔ تمہارے چاند سے مکھڑے پہ جو یہ اضمحلال سا نظر آ رہا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تم کئی راتوں سے نہیں سوئیں۔ میرے خیال میں تو اب تم آرام سے پڑ کر سو جاؤ۔ باقی باتیں ہم کل کسی وقت کر لیں گے" اور اس نے سوچا کہ کل باتیں کرنے کا موقع ہی

کب ملے گا۔ وہ تو کسی دارالامان میں چلی جائے گی۔

"جی ہاں تھکی ہوئی ضرور ہوں مگر اب اتنی بھی نیند نہیں آ رہی۔ اور کم از کم آپ کی داستان سننے سے قبل تو بالکل نہیں آئے گی۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"ارے بچی دنیا میں ایسا کون ہوگا جس کے ساتھ کوئی نہ کوئی داستان، کوئی نہ کوئی المیہ نہ لگا ہوگا۔ جبکہ میری تو ایک بہت ہی معمولی بہت ہی حقیر سی ہے۔ خیر تمہیں اس قدر اشتیاق ہی ہے میری داستان سننے کا تو سنو۔" اس نے اپنی بات کہہ کر قدرے توقف کیا اور پھر بولی۔

"میں اپنی داستان تو تمہیں بعد میں سناؤں گی لیکن پہلے میں تم سے ایک جھوٹ بات کہنے پر معذرت کر لوں۔"

"جھوٹ بات؟" سلوطہ نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں میں نے خود کو پولیس کا کارندہ ظاہر کر کے جھوٹ ہی بولا تھا۔ اصل میں اس وقت کچھ سچویشن ہی ایسی تھی کہ مصلحتاً مجھے غلط بیانی سے ہی کام لینا پڑا تھا۔ کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ اگر تم کوئی ایسی ویسی لڑکی ہوئیں تو میرے اتنے ذاتی استفسارات پر کہیں الٹا مجھے ہی پھنسوا دو۔ کہ آج کے کھوٹے اور مطلبی زمانے میں ایسا ہی ہوتا ہے کبھی کبھی کسی کی ہمدردی اور خیر خواہی کرنے میں الٹی آنتیں گلے پڑ جاتی ہیں۔" خاتون نے کہا تو سلوطہ بولی۔

"یقین جانیں آنٹی میں آپ کو پولیس کے محکمے سے متعلق سمجھ کر بھی بالکل مرعوب نہیں ہوئی تھی کیونکہ میرا ضمیر مجرم نہیں تھا۔"

"ہاں ہاں میں تو چند سوالات کے بعد ہی سمجھ گئی تھی کہ تم بہت راست گو اور بے قصور ہو۔ لیکن یہ میرا اخلاقی فرض تھا کہ میں تم سے اپنی دروغ گوئی کی معذرت کر لوں۔ بہرحال اس وقت رات کے گیارہ بج چکے ہیں تم اگر چاہو تو سو سکتی ہو ورنہ۔"

"نہیں نہیں آپ اپنی داستان سنائیے۔" سلوطہ جلدی سے بولی۔ حالانکہ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ آنٹی فلورا کو سخت نیند آ رہی ہے۔ وہ بار بار جمائیاں بھی لے رہی ہیں اور ان کی آنکھیں بھی بند ہو رہی ہیں۔ مگر اس کا تو ارادہ نہیں تھا سونے کا۔ وہ ساری رات جاگ کر گزار دینا چاہتی تھی۔ خاتون نے پہلی بار تھوڑا سا منہ بنایا پھر دیوار کی طرف سرک کر تکیے سے ٹیک لگا لی۔

"میرے والد گرامی ہو مکینیشیر میں انگریز کمشنر کے اردلی تھے۔ بہت اچھی تنخواہ تھی اور تنخواہ کے علاوہ ٹپ وغیرہ بھی بہت مل جاتی تھی۔ اس پر ان کے پاس چند بیگھے زمین بھی تھی اور ذاتی مکان بھی۔ یعنی کوئی مالی مسئلہ درپیش نہ تھا۔ میں تو اتنی چھوٹی تھی کہ مجھے معلوم ہی نہ تھا کہ کہاں سے آتا ہے اور کیسے آتا ہے۔ مرغن کھانے، کیک، پیسٹریاں، بسکٹ، چاکلیٹ، ٹافیاں، پھل اور میوے کوئی نعمت ایسی نہ تھی جو کھانے کو نہ ملتی ہو۔ ہم تین بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ بڑا بھائی زمینوں کی دیکھ بھال کرتا تھا جو شہر سے باہر ایک قریبی گاؤں میں تھی اور جس میں ابا کا ذاتی یا آبائی مکان بھی تھا جس میں بڑا بھائی رہتا تھا۔ ہم باقی بہن بھائی اور والدین ابا کو محکمے کی طرف سے ملے سرکاری کوارٹر میں رہتے تھے۔ بڑے سے چھوٹی آپا تھیں اور ان سے چھوٹے بھائی کو ابا نے ایک مشنری اسکول میں داخل کرا رکھا تھا۔ اس بھائی سے چھوٹی میں تھی اور میرے بعد چھوٹا بھائی۔ اتنے سکھ چین سے زندگی گزر رہی تھی کہ آج کل کے زمانے میں کوئی چاہے بھی تو نہیں گزار سکتا۔ میری عمر اس وقت مشکل سے سات سال کی تھی اور میں کچھ بہت ہی لاپروا کھلنڈری واقع ہوئی تھی۔ کچھ ہوش نہ تھا کہ گھر میں اور گھر سے باہر کیا ہو رہا ہے۔ یوں بھی گھر میں، میں ٹکتی ہی کب تھی۔ ہمارے پڑوس میں ایک مسیحی گھرانا آباد تھا۔ آنٹی پامیلا اور انکل کرسٹوفر۔ ان کے بھی کئی بچے تھے۔ میں سارا سارا دن ان کے گھر میں گھسی ان کے بچوں سے کھیلتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی اماں سے اسی بات پر بہت پٹتی بھی تھی کہ میں گھر میں ٹک کر کیوں نہیں بیٹھتی۔ مگر آنٹی پامیلا ہمیشہ مجھے پٹنے سے بچا لیتی تھیں۔

ان کے اور اماں کے درمیان بہت گہری دوستی تھی۔ ابا جو کچھ بھی کمشنر صاحب کے یہاں سے بچا کھچا لاتے اماں

اس میں سے آنٹی پامیلا کا حصہ ضرور علیحدہ نکال کر رکھ لیتی تھیں۔ مگر خود ان کے ہاتھ کا پکایا ہوا یا بھیجا ہوا کچھ نہ کھاتی تھیں۔ کیونکہ انہوں نے کتے پال رکھے تھے جو اُن کے ہاتھوں اور کپڑوں کو حتیٰ کہ کبھی کبھی منہ کو بھی چاٹ لیا کرتے تھے مگر وہ کبھی ہاتھ یا منہ نہیں دھوتی تھیں۔ جبکہ اماں پنج وقتہ نمازی اور پرہیزگار تھیں۔ اور یوں بھی ہمارے مذہب میں کتے کی رال ناپاک ہوتی ہے۔ جس گھر میں کتا ہوتا ہے اس میں رحمت کے فرشتے نہیں آتے اور ہم کتے کو انتہائی پلید سمجھتے ہیں۔ خیر آنٹی پامیلا بھی اماں کی اس بات کا ذرا بھی بُرا نہیں مانتی تھیں۔ بلکہ اماں کی دیکھا دیکھی انہوں نے بھی کتوں سے پرہیز کرنا شروع کر دیا تھا۔ اصل میں اماں ان کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ مجھے تو یہی یاد ہے کہ بعض دن تو اماں انہیں پورا پورا کھانا بھیج دیا کرتی تھیں۔ انکل کرسٹوفر کو بڑے ہمدرد آدمی تھے ان کے بچوں کی ان سے جان نکلتی تھی لیکن میرے ساتھ وہ بڑی نرمی اور شفقت سے پیش آیا کرتے تھے۔ بیسیوں بار انہوں نے ابا سے کہا تھا کہ مجھے اسکول میں داخل کرا دیں۔

مگر چونکہ سرکاری اسکول ہمارے گاؤں سے بہت دور تھا اور مشنری اسکول میں بھائی کو بھی مشکل سے داخلہ ملا تھا شاید اس لیے ابا نے مجھے اسکول میں داخل نہیں کرایا تھا۔ آنٹی پامیلا ہی مجھے انگریزی کا قاعدہ پڑھایا کرتی تھیں کیونکہ اردو پڑھنی اور لکھنی انہیں آتی ہی نہیں تھی۔

بہرحال۔ جانے ایک دم ہی بیٹھے بٹھائے سب کو کیا ہو گیا تھا کہ ابا نے بڑے بھائی کو بھی اپنے بلا لیا تھا۔ اور ہم سب کو لے کر کواڑ میں بند ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ مجھے یہ یاد نہیں کہ وہ دن کو بند ہو کر بیٹھے تھے یا رات کو لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ وہ جھٹپٹے کا وقت تھا میں شاید گھر کی بندش سے ہی گھبرا کر گھر سے باہر نکل گئی تھی حالانکہ اماں مجھے آوازیں ہی دیتی رہ گئی تھیں مگر میں بھاگ کر برابر والے آنٹی کے کواڑ میں جا کر چھپ گئی تھی۔ پھر نہ معلوم کیا ہوا تھا میں آنٹی کے اس چھوٹے سے اسٹور میں کب تک اور کتنی دیر تک چھپی رہی تھی۔

لیکن باہر نکلی تو رات ہو چکی تھی۔ اور کچھ ایسا غل مچا ہوا تھا کہ کانوں کے پردے پھٹتے محسوس ہو رہے تھے۔ بچاؤ بچاؤ کی آوازیں، "جے ہند" اور "ست سری اکال" کے نعرے اور لوگوں کی چیخ و پکار۔

ظاہر تھا میں ایک کمسن سی بچی تھی اس لیے ان ڈراؤنی آوازوں اور شور سے خوفزدہ سی ہو گئی تھی۔ اس کے باوجود بھی میرا تجسس انتہا کو پہنچ گیا تھا میں یہ دیکھنے کے لیے اسٹور سے نکل کر سیدھی باہر بھاگی کہ باہر کیا ہو رہا ہے تو کسی نے بھاگ کر مجھے پیچھے سے دبوچ لیا۔ میں نے دہشت زدہ ہو کر اس کی طرف دیکھا تو وہ آنٹی تھیں جنہوں نے منہ پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کی تاکید کی اور یوں میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

"باہر نہیں جاؤ۔ باہر تمہارا واسطے بہت خطرہ ہے۔ آؤ ہم تم کو اپنا باہر والا کوٹھی میں چھپا دیں۔ آؤ جلدی آؤ۔" آنٹی جلدی جلدی مجھے اسٹور روم میں گھسیٹ کر لے گئیں۔

وہ بہت خوفزدہ لگ رہی تھیں اور تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ اس لیے شاید میں بھی ڈر گئی تھی۔ ورنہ ان دنوں مجھے خطرے کا مفہوم ہی معلوم نہیں تھا۔

پھر آنٹی مجھے اپنے بچوں کی آنکھ بچا کر کواڑ کے عقبی حصے میں بنی ایک چھوٹی سی کوٹھری میں لے آئیں جس میں کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا اور اس قدر اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

"دیکھو بیٹا یہ لوگ سب مار دے گا تم ادھر آرام سے بیٹھو۔ ہم ابھی تھوڑا دیر بعد آ کر تمہیں ادھر سے نکال لے گا۔ دیکھو اگر تم باہر آیا تو ادھر یہ بہت ظالم لوگ جا رہا ہے تمہارا گلا کاٹ دے گا۔" آنٹی نے مجھے تاکید کی اور پھر بھاگ کر اندر چلی گئیں۔ اور میں ڈری سہمی اسی کھولی کے فرش پر تھوڑی سی جگہ بنا کر بیٹھی اور پتہ نہیں کب سو گئی۔" اپنی داستان یا یوں دستاتے سناتے خاتون کو شاید کسی دلخراش یاد نے خاموش ہونے پر مجبور کر دیا۔ مگر پھر کچھ ہی دیر بعد۔ وہ اپنی آنکھوں کو رگڑنے کے بعد بولیں۔

"اور جب میری آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ میرا سب کچھ لٹ چکا تھا۔ تباہ ہو چکا تھا۔ ماں باپ بہن بھائی اور گھر جیسے ہندوؤں اور سکھوں نے جلا ڈالا تھا۔ کچھ بھی تو باقی نہیں رہا تھا سوا میری اپنی ذات کے ورنہ بڑا بھائی اگر گاؤں سے بلایا جاتا تو اس کے بچنے کے تو امکانات ہو سکتے تھے۔ مگر وہاں تو سب ہی شہید کر دیے گئے تھے۔ اور مجھ شقی دل کو دیکھو کہ میں ہمیشہ کے لیے اپنوں سے بچھڑ جانے پر روئی۔ چلائی نہ تڑپی۔ البتہ گم سی ہو کر رہ گئی۔

آنٹی کے ملنے جلنے والوں اور دوستوں کے بچے آتے تو میں بہت فخریہ انہیں اپنا گواڑ دکھا کر کہتی۔

"دیکھو یہ میرا گواڑ تھا۔ اس میں میرے والدین اور بھائی بہن رہتے تھے مگر ہندوؤں اور سکھوں نے سب کو مار ڈالا۔ اب میں ہی بچی ہوں۔" میں یہ کہہ کر کبھی ہنسنے لگتی اور کبھی رونے لگتی۔

آنٹی نے مجھے اپنے یہاں پناہ دی تھی اور سب سے چھپا کر رکھا تھا۔ مگر دوسروں پر یہ راز جلد ہی فاش ہو گیا کہ قائم علی کی چھوٹی بیٹی کو مسز کرسٹوفر نے اپنے یہاں چھپا رکھا ہے۔

مسلمانوں کے خون کے پیاسے کتے ابھی تک مسلمانوں کی بو سونگھتے پھر رہے تھے انہیں معلوم ہوا تو آنٹی پر چڑھ دوڑے۔ اور مجھے ان کے حوالے کر دینے کا مطالبہ کرنے لگے۔ انکل کرسٹوفر نے بھی کہا کہ ہاں اس مسلمان لڑکی کو ان لوگوں کے حوالے کر دو مگر آنٹی پامیلا کسی طور پر مانی ہی نہیں۔

"ہم نے فریدہ کو اپنی بیٹی بنا لیا ہے۔ اور اسے کرسچین بنا کر اس کا نام فلورا رکھ دیا ہے ہم اس کو ہرگز ہرگز تم لوگوں کے حوالے نہیں کرے گا۔" آنٹی بھی اپنے موقف پر اڑ ہی گئیں۔ اصل میں تو میری زندگی باقی تھی اس پر قدرت کی مصلحت کچھ یہی تھی کہ اس نے آنٹی پامیلا کے دل میں میری محبت ڈال دی تھی۔ جو ان درندہ صفت وحشی لوگوں نے زیادہ میل و حجت نہیں کی اور مجھے آنٹی کے پاس چھوڑنے کے لیے راضی ہو گئے۔

پھر میری پرورش آنٹی کے یہاں ہونے لگی۔ انہوں نے مجھے گڑھ مکتیسر کے واحد مشنری اسکول میں داخل کرا دیا اور خود بھی مجھے عیسائی مذہب کی تعلیم دینے لگیں۔ ہر اتوار کو وہ مجھے گرجا بھی لے جاتی تھیں۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بت کے سامنے وہ مجھے گھٹنے ٹیکنے اور سر جھکانے کو کہتیں۔ وہ مجھے بائبل کے کوٹیشن پڑھنے کو کہتیں تو میں وہ بھی پڑھ لیتی لیکن جب مقدس پانی پینے کو کہتیں تو میں انکار کر دیتی۔

اور جب بھی وہ مجھے مسیحیوں کے مخصوص اشارے سے کراس بنانے کو کہتیں تو کراس بناتے ہوئے میرے منہ سے آپ ہی آپ کلمہ طیبہ جاری ہو جاتا۔ اور اس پر وہ کبھی کبھی اتنی خفا ہوتیں کہ مجھے مارنے پیٹنے سے بھی دریغ نہ کرتیں۔

اور کبھی مجھے یہ ڈراوا دیتیں کہ اگر تم نے ہمارے کہنے کے مطابق نہیں کیا تو ہندو اور سکھ لوگ تم کو پکڑ کر لے جائیں گے اور پھر تمہیں قتل کر دیں گے۔

لیکن اس وقت مجھے موت کا مفہوم معلوم ہی نہ تھا البتہ میں گلا کاٹ دینے کے خیال سے بہت ڈرتی تھی۔

اصل میں میرے لاشعور میں اماں کی بھائیوں اور بہنوں کو نصیحتیں اور ان کا سختی سے صوم و صلوٰۃ کا پابند ہونا کتوں سے اس قدر پرہیز کرنا کچھ اس مضبوطی سے جم کر بیٹھ گیا تھا کہ آنٹی کا کوئی بڑے سے بڑا ڈراوا بھی مجھے متاثر نہیں کرتا تھا۔ اور اس بات کا احساس تو مجھے بہت بعد میں ہوا اس وقت تو مجھے کچھ معلوم ہی نہ تھا۔ اصل میں جو انسان پیدائشی مسلمان ہوتا ہے وہ مرتے دم تک مسلمان ہی رہتا ہے خواہ اس کی پرورش اور تربیت کیسے ہی ماحول میں کیوں نہ ہوئی ہو وہ مسلمان ہی رہتا ہے کیونکہ اسے اندر ہی اندر غیبی طور پر ہدایت ملتی رہتی ہے۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے۔

بہرحال اس مسیحی ماحول میں گویا چھوٹی سے بڑی ہوئی۔ یعنی پورے چھ سال تک آنٹی اور ان کی فیملی کے ساتھ رہی۔ اس عرصے میں آنٹی اور انکل نے ہر ممکن طریقے سے مجھ پر زور ڈالا کہ میں ان کا مذہب اپنا لوں مگر جب میں آمادہ نہ ہوئی تو انہوں نے میری طرف سے مایوس ہو کر مجھے مشنری ایک نن کے ساتھ جو پاکستان جا رہی تھی۔ لاہور بھیج دیا۔ لاہور میں بھی مجھ پر کافی دباؤ ڈالا گیا حتیٰ کہ مجھ پر سختی بھی کی گئی۔ مگر میری ماہیت میں تبدیلی نہ آ سکی۔ اصل میں آنٹی پامیلا نے بوقت رخصت میرے بارے میں ان نن سے کہہ دیا تھا کہ میری دلی خواہش تو یہی ہے کہ یہ میرا مذہب اختیار کر لے لیکن اگر یہ آپ کے سمجھانے پر نہ مانے تو اسے اس کی مرضی پر چھوڑ دیجیے گا۔ اصل میں میں نہیں چاہتی کہ اس پر کوئی زیادتی کی جائے کیونکہ اس

کی ماں کے مجھ پر بہت سارے احسانات ہیں، اور یہ مجھے اپنی اولاد کی طرح عزیز ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس نے تنگ آکر مجھے ایک زمیندار خاتون کے یہاں ملازم رکھوا دیا جو پیروں سے معذور تھی اور میری خوش قسمتی سے مسلمان بھی۔ اس نے میری بپتا سنی تو مجھ پر ایسی مہربان ہوئی کہ اس نے اپنی خدمت کرانے کے ساتھ ساتھ مجھے تعلیم بھی دلوائی اور اس طرح گھر میں ہی ایک استانی سے پڑھ کر میں نے چار برس کے اندر اندر میٹرک کا امتحان دے دیا۔ مگر یہ میری بدنصیبی ہی تھی کہ بیگم صاحبہ پر ایک رات فالج گرا۔ اور وہ چند روز میں ہی چٹ پٹ ہو کر رہ گئیں۔ بیگم صاحبہ ایک تو لاولد تھیں اس پر بیوہ بھی تھیں۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے شوہر کے بھتیجوں نے ان کے گھر اور املاک پر قبضہ کر لیا۔ اور یوں انیس سال کی عمر میں مجھے ان کے گھر سے نکلنا پڑا۔ مگر اس دوران میں اس نرس سے جو ان کی تیمارداری کرنے پر مقرر کی گئی تھی، میری بھی خاصی واقفیت ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے نرسنگ اسکول میں داخلہ لینے کا مشورہ دیا تھا۔ بلکہ خود میرا داخلہ کرا دیا تھا۔ میرے پاس خاصی رقم جمع ہو گئی تھی۔ جس سے میں نے نرسنگ کورس کیا اور پھر جلد ہی مجھے ایک ہسپتال میں نوکری مل گئی اور وہ دن اور آج کا دن میں اس پیشے پر لگی ہوئی ہوں۔ البتہ لاہور میں تھی اور اب کراچی آ گئی ہوں۔" خاتون نے گویا اپنی داستان ختم کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن آپ نے اپنا نام کیوں نہیں بدلا؟" سلوط نے پھر پوچھا۔

"ارے بیٹی! نام بدلنے سے بھی کیا فرق پڑتا۔ یوں بھی اگر نام کے کچھ اثرات بھی ہوتے ہیں تو فریدہ نام میرے لیے بہت منحوس ثابت ہوا تھا کیونکہ اس نام نے میرا سب کچھ چھین لیا تھا۔ اور پھر فلورا کی مجھے شروع ہی سے عادت پڑ گئی تھی۔ اس پر آنٹی پامیلا نے ہی مجھے یہ نام دیا تھا اور مجھ سے رخصت ہوتے وقت وہ جس طرح بلک بلک کر رو رہی تھیں، میرا دل نہیں چاہا کہ ان کے دیے ہوئے نام کو بدل دوں۔" فلورا نے اسے بتایا اور پھر ایک طویل سی جمائی لے کر بولی۔

"اوہو! ایک بج رہا ہے، جبھی تو مجھے اتنی سخت نیند آ رہی ہے۔ ویسے بھی میں صبح کی اذان کے وقت اٹھنے کی عادی ہوں۔ رات میں زیادہ سے زیادہ دس بجے تک سو جاتی ہوں مگر اب تو خدا ہی ہے جو اتنے سویرے آنکھ کھلے۔ خیر اب تم یہیں پلنگ پر سو جاؤ۔ میں نیچے غالیچے پر سو جاؤں گی اور تم خود اٹھ کر دونوں دروازوں کے کھٹکے چیک کر لو کہیں یہ نہ ہو کہ تم شک و شبہات میں تمام رات جاگتی رہو۔"

"اوہ! آنٹی فلورا دل کی بات کیسے پڑھ لیتی ہیں۔" اس نے شرمندہ ہو کر دل میں سوچا اور جلدی سے بولی۔

"نہیں غالیچے پر تو میں سوؤں گی۔ آپ اپنے پلنگ پر سوئیے اور بلا وجہ ہی میری خاطر اپنے آرام میں خلل نہ ڈالیے۔"

مگر فلورا نے اس کی بات نہیں مانی اور غالیچے پر ہی سو گئی۔

فلورا تو کچھ ہی دیر بعد غالیچے پر لیٹ کر بے سدھ ہو گئی۔ مگر اسے بالکل نیند نہیں آئی۔ اس نے اٹھ کر پہلے دروازوں کے کھٹکے چیک کیے۔ پھر پلنگ پر بیٹھ کر اس کے بارے میں سوچتی رہی کہ آیا اس کی باتوں میں کچھ صداقت بھی ہے یا نہیں۔ اور یہی سب سوچتے سوچتے جاگتے رہنے کی ہزار کوشش کے باوجود رات کے نہ جانے کس پہر اس کی آنکھ لگ گئی۔

اور جب کھلی تو یہ دیکھ کر کہ کمرے کا بلب جل رہا ہے اور صحن کی طرف کھلنے والا دروازہ چوپٹ کھلا ہے اور فلورا بھی کمرے سے غائب ہے، اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ کیونکہ باہر ابھی گہری تاریکی تھی۔ کہیں وہ میرے سونے سے فائدہ اٹھا کر کسی کو بلانے تو نہیں گئی۔ یا پھر مجھے اس مکان میں اکیلا چھوڑ کر کہیں چمپت نہ ہو گئی ہو۔ اس خیال نے اسے دہلا کر رکھ دیا۔ کیوں نہ میں دروازے کا اندر سے کھٹکا لگا کر بیٹھ جاؤں۔ اس طرح کم از کم وہ کسی کو اندر لانے میں تو کامیاب نہ ہو سکے گی۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے فی الوقت اسے یہی ترکیب نظر آئی۔ مگر ابھی اس نے اٹھنے کی غرض سے اپنے پیر فرش پر جمائے ہی تھے کہ وہ کھلے دروازے سے اندر آ گئی۔

"ارے تم بھی جاگ گئیں۔ چلو اچھا ہوا۔ جلدی سے جا کر وضو کر لو۔ اذان ہوئے کافی دیر ہو چکی ہے۔" اس نے کمرے میں قدم رکھتے ہی اسے جاگتا ہوا دیکھ کر کہا۔ تو سلوط نے دل ہی دل میں خود کو ملامت کی۔ اتنی بے اعتمادی بھی اچھی نہیں ہوتی سلوط بلکہ بدگمانی بن جاتی ہے اور بدگمانی بہت بڑا گناہ ہے۔

بہرحال۔۔۔ اس نے محض اس پر یہ جتلانے کی خاطر وہ اس کی طرف سے بدگمان نہیں ہوئی ہے اٹھ کر وضو کیا اور پھر کمرے میں آ کر نماز فجر ادا کی۔

"مجھے تو ابھی بہت سے کام کرنے ہیں۔ تم ایسا کرو کہ ایک دو گھنٹے اور آرام کر لو پھر کلینک جاتے وقت میں تمہیں جگا دوں گی۔" فلورا نے نماز سے فارغ ہونے کے بعد کہا۔ اس کا سر بھی بھاری ہو رہا تھا۔ اس لیے وہ بلا جواب دیے خاموشی سے پلنگ پر لیٹ گئی۔

"تم فکر نہ کرو۔ میرے کلینک میں ڈاکٹر صاحب سے علاج کرانے ایک سوشل ورکر آتی ہیں۔ میں ان سے آج ضرور کسی ایسے ادارے کے بارے میں معلوم کروں گی جہاں تم عزت کے ساتھ رہ سکو۔" فلورا نے اسے اس قدر خاموش دیکھ کر گویا اطمینان دلایا۔

"یہ آپ کا مجھ پر بہت بڑا احسان ہوگا۔ کیا آپ ایسا نہیں کر سکتیں کہ مجھے بھی اپنے ساتھ کلینک لے چلیں۔ ویسے بھی میں یہاں تنہا رہ کر کیسے وقت گزاروں گی۔" سلوط نے تکیے سے سر اٹھا کر پوچھا۔

"ہیں۔ اچھا تم بھی چلی چلنا۔ اصل میں ڈاکٹر صاحب بڑے خر دماغ ہیں۔ مگر خیر میں اس کا بھی کوئی نہ کوئی بندوبست کر لوں گی۔" فلورا نے اسے ساتھ لے جانے پر آمادگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ تب وہ تھوڑی دیر کے لیے سو گئی۔

پھر سات بجے کے قریب فلورا نے اسے جگایا اور چائے کے ساتھ ایک سلائس چٹ کرتے ہوئے اسے تیار ہو جانے کو کہا۔ وہ جلدی جلدی ناشتہ کر کے اس کے ساتھ کلینک روانہ ہو گئی۔ کلینک تک کا سفر اس نے بس سے کیا جو نرسری میں واقع تھا۔ مگر جیسی کہ اس کی خواہش تھی اور فلورا کا خیال تھا کہ وہ اس سوشل ورکر مریضہ سے کسی دارالامان جیسے ادارے کا پتا چلا لے گی تو اس روز وہ سوشل ورکر ہی نہیں آئی۔ فلورا نے دوسری نرسوں وغیرہ سے بھی پوچھا لیکن تقریباً سب ہی نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اور تین روز گزر گئے۔ فلورا نے کہا تھا کہ چھٹی کے دن وہ خود جا کر معلوم کرے گی۔ مگر ہوا یوں کہ اس روز جس کے اگلے دن عام تعطیل کا دن تھا۔ وہ اسے اپنے ساتھ کلینک لے کر گئی تو اتفاق سے فلورا کی ایک جگری دوست شیلا جو لاہور سے آئی ہوئی تھی، اس سے ملنے آ گئی۔ وہ اب تک اس ہسپتال میں کام کر رہی تھی جس میں فلورا عرصے تک ملازمت کرتی رہی تھی۔ دونوں بڑی محبت اور گرم جوشی سے ملیں اور بڑی دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ مگر ڈیوٹی کا سوال تھا۔ اور وہ کلینک میں بیٹھ کر اتنے آرام سے باتیں نہیں کر سکتی تھی۔ اسی لیے ڈیوٹی ختم ہونے سے دو گھنٹے قبل ہی وہ ڈاکٹر سے اجازت لے کر اسے اپنے گھر لے آئی۔ شیلا چاہ رہی تھی کہ فلورا اس کے ساتھ لاہور چلے اور اپنی پرانی ملازمت سنبھال لے۔ لیکن فلورا کسی طرح آمادہ ہی نہیں ہو رہی تھی۔ تب معاً اسے سلوط کا خیال آیا تو اس نے شیلا سے پوچھا۔

"ارے ہاں شیلا! تم اس مونا کو اپنے ساتھ کیوں نہیں لے جاتیں۔ تمہارے پاس تو اسے رکھنے کے لیے جگہ بھی بہت ہے۔ اور پھر تم اسے نرسنگ کے کام پر لگوا دینا۔" مگر اس سے پہلے کہ شیلا کچھ کہتی، سلوط نے کہا۔

"لیکن میں تو لاہور ہرگز نہیں جاؤں گی آنٹی فلورا! ہاں البتہ مجھے کسی اور جگہ لگوا دیں تو آپ کی مہربانی ہوگی۔"

اور فلورا اچھے سے کہ لاہور جانے سے انکار کر دینے کی وجہ معلوم تھی۔ اس نے کچھ سوچ کر کہا۔

"مگر اور کس جگہ بھیجوں تمہیں۔ کیوں شیلا پنڈی یا کسی اور شہر میں کوئی ایسا نرسنگ ہوم ہے جہاں کسی سے تمہاری واقفیت ہو کیونکہ مونا کو نرسنگ کی ٹریننگ بھی تو لینی پڑے گی۔" شیلا نے پہلے تو نفی میں گردن ہلا دی پھر کچھ یاد کر کے بولی۔

"ارے ہاں، وہ اپنی ونی ہے نا۔۔۔ وہی ونیفریڈ پیریرا۔"

"ہاں ہاں۔" فلورا نے جلدی سے کہا۔

"وہ آج کل سرگودھا میں نرسوں کے ہوسٹل کی انچارج لگی ہوئی ہے۔ تم اس سے بات کرو نا۔"

"اب میں کیا بات کروں۔ تم لاہور میں رہتی ہو تم خود ہی اس سے رابطہ قائم کر کے پوچھ لو۔ بلکہ ایسا کرو کہ مونا کو اپنے ساتھ لاہور لے جاؤ۔ پھر ونی سے بات کر کے اسے سرگودھا بھیج دینا۔" شیلا پہلے تو راضی نہیں ہوئی پھر کچھ سوچ کر اس نے آمادگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا چلو ٹھیک ہے۔ پر تم بھی ونی سے بات کر لو۔ مجھ سے زیادہ تمہاری اس سے گاڑھی چھنتی تھی۔ وہ تمہاری بات نہ ٹالے گی۔ نمبر تو ابھی اپنے پرس میں دیکھتی ہوں۔ شاید میری پاکٹ ڈائری میں اس کا نمبر بھی موجود ہو۔" شیلا نے کہتے کہتے اپنا پرس کھول کر اس میں جھانکا اور پھر تھوڑی دیر اسے ٹٹولنے کے بعد ایک چھوٹی سی ڈائری پرس سے نکال کر اس میں درج ونی کا نمبر تلاش کر کے اس نے کہا۔

"اوہ گڈ لک۔ یہ دیکھو اس کا نمبر بھی مل گیا۔ چلو اب اسے کسی کاپی پر نوٹ کر لو۔" اور پھر فلورا نے اٹھ کر ایک کاغذ پر اس کا نمبر لکھ لیا۔

"میں کل دوپہر کی گاڑی سے لاہور واپس جا رہی ہوں۔ اگر مونا کو میرے ساتھ بھیجنا ہی ہے تو پھر ساتھ کے ساتھ اس کا ٹکٹ خرید لو۔ پھر کل ان چھوٹی سی بنا دو شام کو پیا ٹکٹ خریدنے جائے گا تو ساتھ کے ساتھ اس کے ٹکٹ کے پیسے بھی اسے دے دو۔" اور فلورا نے ایک دم ہی الماری سے سلویا سے پیسے ہی مانگے۔ بلکہ وہ کچھ سوچنے لگی اور قدرے توقف کے بعد بولی۔

"نہیں ابو لے تمہارے ساتھ جانے کی ضرورت نہیں۔ میں پہلے فون پر دلی سے بات کر دوں گی۔ اور اگر اس نے اسے کہیں ملازم رکھوانے کی حامی بھر لی تو فوراً اسے سرگودھا لے کر جاؤں گی۔ ویسے تمہارا بے حد شکریہ کہ تم نے مجھے۔"

"اچھا جیسی مرضی تمہاری۔" سہانا نے کہا اور کچھ دیر بیٹھ کر واپس چلی گئی۔ اور یوں صرف دس روز کے اندر اندر سلویا فلورا کے ساتھ سرگودھا پہنچ گئی۔ فلورا واقعی اس کے لیے فرشتۂ رحمت ثابت ہوئی تھی۔ اس نے سلویا کی پوری داستان سن کر اس نے فلورا کو یہ بتایا تھا کہ دراصل دلاور اس کے پیچھے پڑا ہوا ہے اور جنونِ انتقام میں اس کی جان لینا چاہتا ہے جن لوگوں کے ہاں جا کر وہ اس سے چھپی تھی انہوں نے اس سے سازباز کر کے اس کا پتا دے دیا تھا۔ اس لیے اسے وہاں سے بھاگنا پڑا تھا اور اسی کہانی کے پیشِ نظر معلوماً فلورا نے اسے نام تبدیل کر دینے کا مشورہ دیا تھا۔ بلکہ اس کا نام مونا رکھ دیا تھا۔

بہرحال سرگودھا آ کر نرسوں کے ہوسٹل میں جگہ دینے کے ساتھ ساتھ دلی نے اسے قریبی ہسپتال میں ہیلپر کے طور پر کام پر لگوا دیا تھا۔ تاکہ پریکٹیکلی اسے نرسنگ کا تجربہ بھی حاصل ہوتا رہے اور تنخواہ بھی ملتی رہے اور تنخواہ بھی صرف تین سو روپے ماہوار تھی۔

سرگودھا آنے کے بعد اسے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ بالخصوص اپنی خوبصورتی کی وجہ سے۔ یوں بھی وہ ایک معمولی سی نرس تھی۔ اور آج کے حرص و ہوس کے زمانے میں کسی بے حیثیت اور بے زر کی کوئی قدر و منزلت ہی کہاں ہوتی ہے۔ اور ایسے انسان کو خود اپنی حفاظت کے لیے بہت دلیر اور سخت بننا پڑتا ہے۔ اب یہ اس کی خوش قسمتی ہی تھی کہ دلی نرسنگ جیسی دبنگ اور مردمار قسم کی عورت نے اس کی حفاظت کا ذمہ لے رکھا تھا۔ اور دلی سے چھوٹے بڑے سب ہی ڈرتے تھے۔ کیونکہ وہ ہسپتال کے ایڈمنسٹریشن کی نگران بھی تھی۔ اور اسی کی وجہ سے اس نے ہسپتال میں کچھ قدم بھی جما لیے تھے۔ مگر ابھی اسے ہسپتال میں کام کرتے ہوئے دو ماہ کا عرصہ بھی نہیں ہوا تھا کہ یہاں اس کے لیے بہت سی مشکلات کھڑی کر دینے والا مسئلہ پیدا ہو گیا۔

وہ تو اس دن کو کوس رہی تھی جس روز اس نے ہمدردی میں آ کر اسفند کو خون دیا تھا۔ اس کا ایک سبب یہ تھا کہ اسے معلوم تھا کہ اسفند اپنے والدین کی اکلوتی نرینہ اولاد ہے۔ اور حبیب منصور اور سہیل منصور کے یہاں بھی صرف بیٹیاں رہی۔ بیٹیاں ہیں۔ اس لیے اسے ہر طور زندہ رہنا چاہیے۔ لیکن اسے خون دینا تو غضب ہی ہو گیا۔

حالانکہ پہلی مرتبہ جب وہ اس سے ملنے آیا تھا تو اس نے یہی تاثر دینے کی کوشش کی تھی کہ وہ شدید مغالطے کا شکار ہے۔ یعنی وہ ہرگز ہرگز سلویا نہیں ہے۔

لیکن اس کے باوجود بھی وہ ماننے پر تیار نہیں ہوا تھا اور ستم یہ کیا تھا کہ دلی کے ہاں ہوسٹل تک پہنچ گیا تھا اور دلی کو معلوم ہو جانا گویا غضب ہو گیا تھا۔ وہ تو بال کی کھال کھینچنے کی عادی تھی اور انسان کو گھر بیٹھے جا کر اس کا کچا چٹھا پھوڑتی تھی جبکہ وہ اپنے ہوسٹل کی ریپوٹیشن خراب ہونے سے بھی ڈرتی تھی کہ اس طرح اس کی بدنامی ہوتی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اب آسانی سے اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ بلکہ خود اپنے ہاتھوں اسے ان لوگوں کے حوالے کر کے رہے گی۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر اس نے ہوسٹل سے چپ چاپ نکل جانے کی پوری تیاری کر لی تھی۔ اور اگلے دن اس خیال سے کہ کسی کو معلوم نہ ہو کہ وہ ہوسٹل کو خیرباد کہنے والی ہے وہ حسبِ معمول تیار ہو کر اپنی ڈیوٹی پر پہنچ گئی۔ اصل میں تو یہی وقت ہوتا تھا۔ ہاسٹل میں سناٹا ہونے کا کیونکہ تقریباً ساری ہی نرسیں اپنی اپنی ڈیوٹی پر چلی جاتی تھیں اور دلی بھی اس وقت اپنے آفس میں ہوتی تھی۔ صرف چوکیدار اور جمعدار قسم کے لوگ ہی گیٹ پر ادھر ادھر کبھی نظر آتے تھے۔ اور ہاسٹل کے عقبی سمت کا چھوٹا سا دروازہ ویران ہی پڑا رہتا تھا۔ بلکہ زیادہ تر بند ہی رہتا تھا کیونکہ وہ دروازہ آمد و رفت کے لیے استعمال نہیں ہوتا تھا۔

گویا یہی موقع تھا باہر نکل جانے کا۔

مگر اس روز جانے ہی اسے کچھ ایسے کام سونپے گئے تھے کہ تمام وقت نرسوں کے ساتھ گھومتی پھرتی رہی۔ جب کہیں جا کر اسے فرصت ملی تو اس نے وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ سب کی نظر بچا کر پچھلے سے ہسپتال سے نکل کر ہاسٹل پہنچی۔

وہ روم میں پہنچی۔ یہ بھی اس کی خوش قسمتی ہی تھی کہ اسے ہوسٹل میں آتے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے روم میں کوئی موجود نہ تھا۔ اس نے روم میں آ کر ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا۔ جلدی سے الماری کھول کر اپنا سوٹ کیس اٹھایا اور پھر روم سے نکل کر عقبی دروازے کی جانب چل کر اور بڑے محتاط انداز میں ادھر ادھر دیکھتی ہوئی پچھلا گیٹ کھول کر ہاسٹل سے باہر نکل آئی۔ فلورا کے پاس جانے کے سوا اس کا اور کوئی ٹھکانہ نہ تھا نہ کوئی راستہ ہی نظر آ رہا تھا۔ اس لیے اس نے ایک رکشا لے کر سیدھا اسٹیشن کا رخ کیا۔

پھوپھا کو خط بھیجے دو روز ہو گئے تھے۔ اور تیسرے روز بھی ان کے آنے کے آثار دور دور تک نظر نہیں آرہے تھے
ادھر چونکہ پھوپھا کے گھر کا پتا معلوم نہیں تھا اس لیے اسفند نے جمال کے ملازم شیر محمد عرف شیرا کی معرفت انہیں وہ خط
بھیجا تھا۔ وہ بھی اجمال کے پتے پر۔ اول تو اسے یہی یقین نہ تھا کہ اس کا خط وقت پر پہنچ بھی گیا ہوگا۔ کیونکہ محکمہ ڈاک کی
ناقص کارکردگی سے وہ بخوبی واقف تھا کہ بعض خطوط دوسرے روز ہی پہنچ جاتے ہیں اور بعض محکمہ ڈاک کے ہی کھاتے
میں رلتے پڑے رہتے ہیں اور ہفتے عشرے سے بھی زیادہ مدت میں پہنچتے ہیں۔ دوسرے بالفرض اگر وقت سے پہنچ بھی گیا
ہوگا تو شیرا نے اپنے تمام کام نمٹانے کے بعد شام کو ہی وہ خط پھوپھا تک پہنچایا ہوگا اور یہ بھی ممکن ہے کہ اگلے روز پہنچایا ہو۔
یا پھر شیرا کو وہ خط سرے سے ملا ہی نہ ہو۔ اگر ایسا ہوا تو پھر تو سارا کام ہی چوپٹ ہو کر رہ جائے گا۔ یہی سب سوچ کر اس نے شیرا
کو فون کرنے کی ٹھانی تھی کہ اسے اجمال کا فون نمبر معلوم تھا اور یہ بھی معلوم تھا کہ اجمال یا تو کہیں باہر گیا ہوا ہوگا یا پھر گھر کہیں
ہوگا تو سو رہا ہوگا۔ کیونکہ وہ دن کے بارہ بجے اٹھنے کا عادی تھا۔

اس وقت دن کے گیارہ بجے تھے اور ہشام کے بھائی اکرام کے ساتھ اس کی کار میں ٹیلی فون آفس جا رہا تھا کہ تبھی پھوپھا
کی ٹیکسی گیٹ کے آگے آکر رکی تو وہ کار سے اتر کر اس کی طرف لپکا۔ اسی اثنا میں ثاقب حسن بھی ٹیکسی سے اتر چکے تھے۔ اس
نے انہیں سلام کر کے جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر ٹیکسی والے کو پکڑایا اور پھوپھا کو لے کر اندر آگیا۔ اکرام بھی کار سے
اتر کر باہر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے اس کے پاس آتے ہی پھوپھا کا اس سے تعارف کرایا اور پھر معذرتی لہجے میں بولا۔

"مائنڈ نہ کرنا یار۔ جن کی خاطر فون کرنے جا رہا تھا وہ خود ہی آپہنچے ہیں۔"

"ارے نہیں ڈاکٹر صاحب۔ بھلا مائنڈ کرنے کی اس میں کیا بات ہے۔ بلکہ یہ تو خوشی کی بات ہے کہ ہمارے گھر میں
ایک مہمان کا اور اضافہ ہو گیا۔" اکرام نہایت خوش دلی سے بولا۔

"ارے نہیں صاحبزادے۔ ہم مہمان کی حیثیت سے آپ کو زحمت دینے یہاں نہیں آئے بلکہ ہمارا یہاں قیام بہت
مختصر ہوگا۔ شاید دو تین گھنٹے۔" ثاقب حسن نے مسکرا کر کہا۔

"دو تین گھنٹے کیوں پھوپھا جان۔ کیا آپ کا آج ہی واپسی کا ارادہ ہے؟" اسفند نے ان کی بات پر متعجب سا ہو کر پوچھا۔

"نہیں۔ ارادہ تو نہیں ہے لیکن ہم زبردستی کے مہمان بننے کے قائل نہیں۔ یہاں کے کسی ہوٹل میں قیام کر لیں گے۔" ثاقب حسن
بولے۔

"واہ یہ تو سراسر غیریت ہوئی پھوپھا جان کہ ہمارا گھر موجود ہوتے ہوئے آپ ہوٹل میں قیام کریں۔ ہاں البتہ یہ ضرور ہے کہ
خود آپ کو یہاں رہنا پسند نہ ہو۔" اکرام بڑی اپنائیت کا اظہار کرتا ہوا بولا۔

"اچھا بھتیجے۔ اب آپ اپنائیت کو بیچ میں لے آئے ہیں تو پھر ہم سوچیں گے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔" ثاقب حسن نے اس
کی اپنائیت سے متاثر ہو کر شگفتہ لہجے میں کہا۔ اسفند کا دل چاہا کہ کہے یہ مصنوعی تکلف آپ ان لوگوں سے کہاں برتنے بیٹھ گئے
یہ لوگ بہت سادہ لوح اور مخلص ہیں۔ مگر اس نے بات ٹالنے کی غرض سے کہا۔

"اچھا آئیے۔ آپ اندر تو چلیے پھوپھا جان۔ آپ کے قیام کا مسئلہ بعد میں حل ہو جائے گا۔" ثاقب حسن شاید خود بھی یہی
چاہ رہے تھے۔ چپ چاپ اس کے ساتھ ہو لیے۔

"آپ نے یہاں پہنچنے میں بڑی دیر لگا دی۔ پھوپھا جان اور ادھر میں آپ کا انتظار کرتے کرتے تھک گیا۔" اسفند نے کمرے
میں آکر انہیں بٹھاتے ہوئے کہا۔

"کمال ہے ہم نے تو بالکل دیر نہیں لگائی۔ گزشتہ شب تمہارا خط ملا اور آج ہم آگئے۔" ثاقب حسن بولے۔

"لیکن میں نے تو آپ کو بدھ کی رات ہی وہ خط روانہ کر دیا تھا جو میرے اندازے کے مطابق جمعرات کی شام تک آپ کو مل
جانا چاہیے تھا۔ اور آپ کہہ رہے ہیں وہ کل جمعہ کی رات کو آپ کو ملا تھا۔" اسفند دنوں اور گھڑیوں کا حساب لگاتا ہوا بولا۔

"ارے بھئی تم نے خط ہی بھیجا تھا کوئی ٹیلیگرام تو نہیں۔ اور شیر محمد کہہ رہا تھا کہ اسے کل جمعہ کی صبح کو تمہارا خط ملا تھا مگر ہاں
جمعہ کو تو عام تعطیل ہوتی ہے۔ پھر اسے جمعرات کو ہی ملا ہوگا اور اسے ہم تک پہنچانے کی فرصت اسے جمعہ کو ہی ملی۔" ثاقب حسن نے خود
ہی حساب لگاتے ہوئے اپنی غلطی کی تصحیح کی۔ پھر بولے۔

"خیر چلو۔ اب تو ہم آ ہی گئے۔ مگر جس کارن آئے اس کا تو تم نے اب تک کوئی ذکر ہی نہیں کیا جب کہ ہم تو اسٹیشن سے سوچ
کر چلے تھے کہ جس ٹیکسی میں جا رہے ہیں اسی میں تمہیں بٹھا کر سیدھے بٹیا کے پاس پہنچیں گے اور پھر اسی ٹیکسی میں بٹیا کو لے کر
اسٹیشن کا رخ کریں گے۔ اسی لیے تو ہم نے تمہارے میزبان سے کہہ دیا تھا کہ ہمارا بہت مختصر قیام ہوگا۔" اور پھوپھا کی اس
سادگی پر دل ہی دل میں وہ خوب ہنسا۔

"لیکن پھوپھا جان۔ آپ نے حالات کا جائزہ لیے بغیر پہلے سے ہی یہ پروگرام کیسے مرتب کر لیا۔ میرا مطلب ہے پہلے
چل کر تو معلوم کر لیں کہ آیا آپ کی بٹیا آپ کو پہچانتی بھی ہیں۔ انہیں ساتھ لے جانے کا سوال تو بعد میں ہی آتا ہے۔" اسفند نے کہا۔

"ہائیں کیا مطلب۔ کیا تمہیں یقین نہیں کہ وہ نرگس سلوطا ہی ہے۔ پھر تو تم نے خواہ مخواہ ہی ہمارا وقت کھوٹا کیا۔ وہ اگر
وہ تمہاری پھوپھی بیگم..." ثاقب حسن بہت چمک کر بولے تو اس نے ان کی بات قطع کر کے کہا۔

"نہیں پھوپھا جان۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں۔ نہ ہی ایسا احمق یا عقل سے پیدل ہوں کہ سلوطا کے بارے میں پوری معلومات
حاصل کیے بغیر صرف دھوکے اور شبہے کی بنا پر کسی دوسری لڑکی پر سلوطا کا گمان کرتا۔ بلکہ میرا مطلب یہ تھا کہ وہ اس قدر بدظنی
اور متنفر نظر آتی ہیں کہ کہیں میری طرح آپ کو بھی پہچاننے سے انکار نہ کر دیں۔" اسفند نے اپنی بات کی وضاحت کی۔

"خیر خیر۔ اب تو ہم آ ہی گئے ہیں۔ اور صورت حال خواہ کیسی بھی کیوں نہ ہو ہم ان سے ملے بغیر جانے کے ہی نہیں۔ لہٰذا اب
اب تم وقت ضائع کرنے کے بجائے ابھی اور اسی وقت ہمیں ان کے پاس لے چلو۔" ثاقب حسن اپنی بے تابی دکھاتے ہوئے بولے

"جی۔ جی ہاں ضرور۔ میں خود بھی ایک لمحہ ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ بس ابھی ملازم سے ٹیکسی منگواتا ہوں۔" اسفند اٹھتا
ہوا بولا اور پھر فوراً ہی باہر نکل گیا۔ اور کچھ ہی دیر بعد واپس آیا تو ثاقب حسن سے بولا۔

"چلیے پھوپھا جان۔"

"ہائیں۔ کیا یہاں گھر سے ہی آواز دینے پر ٹیکسی آجاتی ہے؟" ثاقب حسن نے اٹھتے ہوئے تعجب سے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ وہ اصل میں، میں نے ملازم کو ٹیکسی منگوانے کے لیے بلوایا تو اکرام نے کہا کہ آپ میری کار لے جائیں۔"

اسفند نے مسکرا کر کہا۔

"اچھا — یہ تو بہت ہی اچھا ہوا — کم از کم پرائیویٹ سواری میں یہ تو آسانی رہتی ہے کہ انسان اسے اپنی مرضی سے جہاں اور جتنی دیر چاہے لے جا سکتا ہے۔" ثاقب حسن نے اس کے ساتھ کار کا رخ کرتے ہوئے کہا۔ اس سے ملنے کے خیال سے ان کا دل بھی کھلا جا رہا تھا۔

بلکہ وہ جو اتنی زیادہ باتیں کر رہے تھے اور اس قدر شگفتہ موڈ میں نظر آ رہے تھے تو بیٹی سے ملنے کی خوشی میں ہی نظر آ رہے تھے۔

پھر دونوں کار میں بیٹھ کر ہوسٹل روانہ ہوئے۔ تب بھی ہوسٹل پہنچنے تک ثاقب حسن مسلسل بولتے ہی رہے جب کہ نظر نا کم گو اور روکھے پھیکے سے انسان تصور کیے جاتے تھے۔ اسفند بھی ان کے اس وقت کے جذبات کو سمجھ رہا تھا اس لیے اسے ان کے اتنے زیادہ چہکنے پر تعجب نہیں ہوا۔

پھر کوئی آدھے پون گھنٹے کا فاصلہ طے کر کے اسفند نے ہوسٹل کے گیٹ کے قریب ہی کار روکی اور اسے لاک کر کے گیٹ میں داخل ہونے لگا تو وہاں موجود دربان نے اس کا راستہ روکا۔ کیوں کہ ہوسٹل میں ہر کس و ناکس کے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ دو روز قبل بھی جب اسفند ہوسٹل آیا تھا تو کوئی دوسرا دربان موجود تھا جس نے بہت رد و قدح کے بعد اسے اندر جانے کی اجازت دی تھی۔ اور اس روز بھی اسفند کو کچھ ایسی ہی صورت حال کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ بہرحال اس نے یہی کہا کہ وہ ڈاکٹر ہے اور ہوسٹل کی انچارج سسٹر پیریا سے ملنے آیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے جیب سے اپنا کارڈ بھی نکال کر دکھا دیا جبکہ وہ ان پڑھ ہی تھا۔ تب کہیں جا کر دربان نے ان دونوں کو اندر جانے کی اجازت دی۔

وہ پھر پہلے کے ساتھ سیدھا سسٹر پیریا کے آفس میں پہنچا۔ سسٹر پیریا کی آفس ٹیبل کے گرد اس سمے دو اشخاص بیٹھے تھے جن سے وہ باتیں کر رہی تھی۔ اسے آفس میں داخل ہوتے دیکھ کر کچھ دیر کے لیے تو بات ہی کرنا بھول گئی اور اندر ہی اندر ایک جھرجھری سی بھی آ گئی۔ کیونکہ وہ اسفند کے آنے کی نوعیت سے واقف تھی۔ مگر تھی بڑی ہی مضبوط قوت ارادی کی مالک اور بڑی دبنگ قسم کی عورت۔ اس نے دوسرے ہی لمحے خود پر قابو پالیا اور پھر باتوں میں مشغول ہو گئی۔ اسفند سیدھا اس کی طرف ہی بڑھتا چلا آیا۔

"گڈ مارننگ مسز پیریا۔" اسفند نے متبسم سے انداز میں کہا۔

"گڈ مارننگ سر۔" پیریا نے باتیں کرتے کرتے چونک کر یوں اس کے سلام کا جواب دیا جیسے وہ اس کے آفس میں آ جانے سے لاعلم ہو۔ پھر اس انداز میں اس کی طرف دیکھا جیسے پوچھنا چاہ رہی ہو اب آپ کس غرض سے آئے ہیں۔ اسفند بھی اس کی اس چندراہٹ کو سمجھ گیا تھا۔ مسکرا کر بولا۔

"میرے خیال میں اپنا تعارف پیش کرنے کی مجھے ضرورت تو نہیں کیونکہ تین روز قبل بھی میں کیپٹن آفتاب کے ساتھ یہاں آ چکا ہوں۔"

"جی ہاں، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔" پیریا نے تروکھے پن سے کہا۔

"پھر تو آپ کو میرے یہاں آنے کی غرض و غایت کا بھی اچھی طرح علم ہو گا۔" اسفند نے جتانے کے سے انداز میں بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں۔ بخوبی۔" وہ قدرے رعونت سے بولی۔

"تو پھر آپ سے التماس ہے کہ آپ —" اسفند نے اپنا مدعا بیان کرنا چاہا تو پیریا اس کی بات کاٹ کر بولی۔

"لیکن سر اس معاملے میں جو کچھ مجھے معلوم تھا وہ میں آپ کو بتا ہی چکی ہوں۔ اچھا ایک منٹ —" یہ کہہ کر گویا اس نے ایک منٹ کی مہلت مانگی۔ اور پھر ان دونوں آدمیوں سے جو ابھی تک میز کے گرد ہی بیٹھے تھے مخاطب ہو کر کہا۔

"اچھا۔ آپ ایسا کریں کہ کل آفس آ جائیں یا کسی وقت میرے پاس آ جائیں۔ اس وقت تو میں بہت بزی ہوں۔" اس سمے وہ بظاہر جتنی تر و تازہ سی نظر آ رہی تھی اندر ہی اندر اتنی ہی خوف زدہ تھی۔ اس کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی اسفند کو یہ بتانے کی کہ سلوطہ ہوسٹل چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ بلکہ ایسا سخت اور روکھا پھیکا رویہ اختیار کر کے وہ چاہ رہی تھی کسی طرح اسفند کو سر سے ٹال دے۔ اور یہ ایک منٹ کی مہلت اس نے صرف ان دونوں آدمیوں کو ہٹانے کی غرض سے نہیں مانگی تھی بلکہ اصل

حقیقت سے روگردانی کرنے کی غرض سے بھی مانگی تھی۔ مگر یہ ایک منٹ کا وقفہ بھی اسفند کو بہت شاق گزر رہا تھا۔ ان دونوں آدمیوں کے جاتے ہی وہ تیوری چڑھا کر بولا۔

"میں آپ سے کسی قسم کی معلومات فراہم کرنے نہیں آیا۔ بلکہ مس ثنا سے ملنے آیا ہوں۔ براہ کرم آپ انہیں یہاں بلوا دیں۔" اور اس کی اس بات پر پیریا بغلیں جھانکتی ہوئی بولی۔

"لیکن سر وہ تو اس وقت ہوسٹل میں موجود نہیں ہے بلکہ —"

"دیکھیں زیادہ اسمارٹ بننے کی کوشش نہ کریں مسز پیریا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ شام کو ڈیوٹی پر جاتی ہیں اور دن کے وقت ہوسٹل میں ہی ہوتی ہیں۔" اسفند اس کی بات کاٹ کر تیز لہجے میں بولا۔

"لیکن ڈاکٹر صاحب ڈیوٹیز چینج بھی ہوتی رہتی ہیں سر۔ آج کل تو اس کی ڈیوٹی دن میں ہی لگتی ہے لیکن اگر نہ بھی لگتی تو —"

"اُفوہ۔ میں یہ لگتی اور نہ لگتی کچھ نہیں جانتا۔ میں تو مس ثنا سے ملنے آیا ہوں۔ اور یہ ان کے والد ہیں۔ اب آپ سیدھی طرح انہیں بلوا دیجیے۔" اس کے حیص بیص کرنے پر اسفند کو بھی تاؤ آ گیا۔ اس نے بڑے سخت اور کرخت لہجے میں کہا۔ اور اس کے منہ سے والد کا لفظ سن کر پیریا کی سٹی ہی گم ہو گئی۔ وہ ایک دم ہی نرم پڑ کر بولی۔

"پلیز سر۔ آپ پہلے پوری بات تو سن لیں۔"

"سنائیے، کیا سنانا چاہتی ہیں آپ۔" ثاقب حسن نے پہلی بار لب کشائی کی۔ مگر پیریا اسفند ہی کو مخاطب کر کے بولی۔

"مس ثنا تو آپ کے آنے کے دوسرے روز ہی یہ ہوسٹل چھوڑ کر چلی گئی تھی اور جہاں تک مجھے یقین ہے آپ کی وجہ سے ہی۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ میڈم۔ کیا ہم آپ کو بہت ہی بے وقوف نظر آ رہے ہیں جیسے بھلا یہ کیا شوشہ چھوڑا آپ نے۔" ثاقب حسن بگڑ کر بولے۔

"نہیں۔ شوشہ نہیں ہے سر۔ بلکہ حقیقت ہے۔ اگر آپ کو میری بات کا یقین نہیں آ رہا تو آپ یہاں ہوسٹل میں بلکہ ہسپتال میں کسی سے بھی پوچھ کر اپنی تسلی کر سکتے ہیں۔" پیریا ثاقب حسن کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر بری طرح گھبرا گئی۔

"خیر۔ آپ کے اس مفروضے پر ہوسٹل اور ہوسٹل کے لوگ تو ایمان لا سکتے ہیں لیکن میں آپ کی بات کسی قیمت پر ماننے کو تیار نہیں ہوں۔" اسفند بھی بڑے کڑے تیور سے بولا اور پھر ثاقب حسن سے مخاطب ہو کر اس نے کہا۔

"یہ کارستانی ان محترمہ کی ہی ہے۔ اصل میں انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ میں سلوطہ کو واپس لے جانے کی غرض سے ضرور آؤں گا اور اسی لیے اس روز انہوں نے مجھ سے پوچھا بھی تھا کہ کیا آپ اسے اپنے ساتھ لے جانے کی غرض سے آئے ہیں۔ تو میں اسی وقت کھٹکا تھا اور سب سے اہم بات یہ کہ میں نے ان کو بڑی سختی سے تاکید کر دی تھی کہ میرے آنے کی غرض و غایت کو راز ہی میں رکھیں۔ لیکن انہوں نے نہ معلوم کس رنگ اور معنوں میں سلوطہ کو سب کچھ بتا دیا ہو گا۔ ورنہ بھلا یوں بھی کوئی چپکے سے ہوسٹل چھوڑ کر جا سکتا ہے۔"

"ارے میاں ان باتوں میں کچھ نہیں رکھا۔ سلوطہ خود اپنی مرضی سے ہوسٹل چھوڑ کر گئی ہے یا انہوں نے اسے کہیں چھپا دیا ہے۔ دونوں صورتوں میں یہ معاملہ بہت نازک صورت اختیار کر گیا ہے چنانچہ اب اس معاملے کے خلاف قانونی چارہ جوئی کیے بغیر کوئی کام نہیں بنے گا۔ یوں بھی تین روز ہو گئے ہیں اس کی گمشدگی کو۔ ہمیں اب یہاں وقت برباد کرنے کے بجائے فوری طور پر پولیس اسٹیشن چلنا چاہیے۔" ثاقب حسن نے دھمکی نہیں دی تھی بلکہ وہ تھانے جانے کے لیے بہت سنجیدہ تھے۔ یوں بھی بیٹی کے اچانک مل کر کھو جانے پر ان کا چہرہ دھواں دھواں سا ہو رہا تھا۔

"جی ہاں۔ علی ہذا القیاس چچا جان۔ وقت کھوٹا کرنے سے فائدہ۔ ہم اس علاقے کے پولیس اسٹیشن ہی چلتے ہیں۔" اسفند کو بھی اس مسئلے کو حل کرنے کی یہی ترکیب نظر آئی۔

"چلو۔" ثاقب حسن نے کہا۔ دونوں جانے لگے تو مسز پیریا نے اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے بڑے ملتجی لہجے میں انہیں پکارا۔

"سنیے پلیز۔ میری صرف ایک بات اور سن لیجیے۔" اسفند نے تو اس کی بات سنی ان سنی کر دی لیکن ثاقب حسن نے پلٹ کر پوچھا۔

"اچھا سنائیے مزید کیا کہنا چاہ رہی ہیں آپ۔" ان کی بات پر پیریا نے جھجک کر میز کی دراز سے ایک چھوٹی سی مجلد

کتاب نکالی اور پھر اس پر ہاتھ رکھ کر کھڑے کھڑے ہی بولی۔

"دیکھیں اگر آپ مسلمان ہیں تو میرا بھی کچھ دین و ایمان ہے اور میں اس مقدس بائیبل پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاتی ہوں کہ مونا اپنے بیگ میں صرف اپنا رپریزنٹیشن لیٹر ہی چھوڑ کر گئی ہے ورنہ میں نے اسے کہیں چھپایا ہے نہ چھپنے کی تلقین کی ہے اور نہ مجھے معلوم ہے کہ وہ یہاں سے کب گئی اور کہاں گئی ہے۔" پیریرا نے صرف حلف ہی نہیں اٹھایا تھا بلکہ اس کی آواز میں بھی صداقت اور کچھ ایسی بے بسی سی جھلک رہی تھی جیسے ایک سچی بات کو جھوٹا ثابت کر دینے پر سچے انسان پر طاری ہوتی ہے۔ دونوں کو پیریرا کی باتوں پر یقین کر لینا ہی پڑا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر اسفند نے اس کی میز کے نزدیک آتے ہوئے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے ہمیں آپ کی باتوں کا یقین آ گیا لیکن اس کے باوجود بھی میں آپ کو مورد الزام ٹھہراؤں گا کیونکہ اگر آپ میرے آنے کی غرض و غایت سے انہیں آگاہ نہ کرتیں تو مایوس کن صورتِ حال کبھی پیدا نہیں ہوتی۔ اس لیے نرس شان کی گمشدگی کی ذمہ دار آپ ہیں صرف آپ۔"

"اوہ — نو نو — دیکھیں آپ مجھے الزام نہیں دیں سر — بلکہ اس میں میرا کوئی قصور ہی نہیں۔"

پیریرا نے اسفند سے کہہ کر پھر ثاقب حسن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھیں آپ ہی انصاف سے کام لے کر سوچیں بند گوار کہ میں اس ہوسٹل کی انچارج ہوں۔ یہ آپ کے بھتیجے صاحب ایک روز اچانک ہی میرے پاس ایک ایسی اسٹوری لے کر آئے جسے سن کر میں بڑے مخمصے میں پڑ گئی۔ کیونکہ مونا کے متعلق جو کچھ مجھے بتایا گیا تھا وہ کچھ اور ہی تھا اور پھر — ایک تو میرے ہوسٹل کے اصول اور قوانین بہت سخت ہیں دوسرے میں یہاں کی انچارج بھی اور یہ میری ذمہ داری بنتی تھی کہ میں مونا سے اصل حقیقت کے بارے میں استفسار کروں۔ اور سچی بات یہ ہے کہ آج کل کے زمانے کی رفتار دیکھتے ہوئے مجھے ڈاکٹر صاحب کی باتوں کا یقین ہی نہیں آیا تھا۔ اب آپ ہی بتائیں کہ ان حالات میں میں ڈاکٹر صاحب کی باتوں کی مونا سے تصدیق کرنے کے سوا اور کیا کر سکتی تھی؟"

"وہ تو ٹھیک ہے میڈم۔ لیکن مجھے اس بات پر تعجب ہے کہ جب آپ کے ہوسٹل کے قوانین اتنے ہی سخت ہیں تو آپ کی لاعلمی میں لائے بغیر ہمارا مطلب ہے آپ کی اجازت کے بغیر کسی لڑکی کا ہوسٹل سے نکل جانا کیا معنی رکھتا ہے۔" ثاقب حسن بولے۔

"ارے چھوڑیں بھی بھائی جان۔ یہ قوانین اور اصول سب دکھاوے اور پبلسٹی کی باتیں ہیں ورنہ ایسے ادارے محض پیسہ کمانے کی غرض سے کھولے جاتے ہیں ... لوگ جس طرح بھرتے ہیں اسی طرح نکل جاتے ہیں۔" اسفند جلے کٹے سے انداز میں بولا۔

"مگر یہ تو ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔ اصل مسئلہ تو نرس شان کو تلاش کرنے کا ہے۔ ان کی نشاندہی کرانے کا ہے۔ کہ وقت بھی تیزی سے بیتتا جا رہا ہے۔ اگر مزید دیر ہو گئی تو پھر تو ہم ہمیشہ کے لیے ان سے محروم ہو جائیں گے۔" یہ جملے ثاقب حسن نے بڑے جذباتی سے انداز میں ہلکی سی رقت کے ساتھ کہے۔ اور شاید انہی جملوں سے متاثر ہو کر اسفند کو معاً کچھ خیال آیا۔

"دیکھیے بائی دا وے مسز پیریرا۔ نرس شان جس طرح چپکے سے یہاں سے گئی ہیں ظاہر ہے بلا آپ کی اجازت اور لاعلمی میں تو یہاں نہیں آئی ہوں گی۔ میرا مطلب ہے کوئی تو ان کو یہاں لایا ہو گا یا پھر وہ خود ہی آئی ہوں گی۔"

"او — یس یس۔ ناؤ یو ہیو کم ٹو دا پوائنٹ۔ ہم سے غلطی ہو گئی ورنہ ہمیں یہ سوال بہت پہلے ہی کر لینا چاہیے تھا۔" ثاقب حسن خوش ہو کر بولے۔

"او — یس — میرا بھی یہی اوپینین (خیال) ہے۔" پیریرا جو اسفند کے جلے کٹے سے انداز میں سوال کرنے پر کسی سوچ میں پڑ گئی تھی اتنی دیر میں پہلی بار تھوڑا سا مسکرا کر بولی۔

"یعنی یہی کہ آپ کو بہت پہلے بتا دینا چاہیے تھا۔" اسفند اس پر مسلسل طنز کر رہا تھا۔

"جی ہاں۔ لیکن آپ کے سوال سے قدرے مختلف۔ میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ اگر مجھ سے آتے ہی یہ بات پوچھ لیتے تو بات اتنی نہ بڑھتی۔" پیریرا بولی۔

"لیکن یہ فرض تو آپ کا تھا کہ آپ خود ہی ہمیں بتا دیتیں۔" اسفند پھر بھی اس پر طنز کرنے سے باز نہ آیا۔

"دیکھیں میں بھی آپ کی طرح انسان ہی ہوں — اور مونا کے معاملے میں میں آپ سے زیادہ پریشان بھی کیونکہ اس کے ایک دم غائب ہو جانے کی تمام تر ذمہ داری مجھ پر ہی آتی تھی۔ اور پھر آپ نے آتے ہی مجھ سے کراس ایگزامن کرنا شروع کیا تو میں بالکل ہی بوکھلا گئی۔ ورنہ —"

"خیر خیر۔ وہ تو جو ہونا تھا سو ہو چکا۔ اب آپ بتا دیں۔" ثاقب حسن نے انتہا کو پہنچے ہوئے تجسس کے سبب اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"اصل میں اسے میری ایک بہت ہی پرانی دوست جو کبھی میری کولیگ بھی رہ چکی تھی کراچی سے اپنے ساتھ یہاں لائی تھی اور اپنی بھانجی کی حیثیت سے اس نے مونا کا مجھ سے تعارف کرایا تھا۔ اور اس کے بارے میں جو اسٹوری سنائی تھی وہ کچھ یوں تھی کہ مونا کا سوتیلا باپ اس کی شادی ایک عیاش اور رئیس بڈھے سے کر رہا تھا جس کے پوتا پوتی مونا کی عمر کے تھے۔ مونا کی ماں سے یہ سب گوارا نہ ہوا تو اس نے چپکے سے مونا کو اس کے پاس بھیج دیا۔ مگر خالہ کے پاس رہنے میں مونا کو خطرہ لاحق تھا اس لیے وہ اسے سرگودھا لے آئی تھی تاکہ میری نگرانی میں ہوسٹل میں رہ سکے اور ساتھ ساتھ سروس بھی کر لی رہے۔ بس جی یہ تھی اس کی اسٹوری۔"

"وہ تو خیر حالات کے تحت بنائی پڑی ہوگی مگر وہ آپ کی دوست آخر ہیں کہاں ہیں؟" اسفند نے قدرے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"کراچی میں ہی عرصے سے اس نے سکونت اختیار کر رکھی ہے۔" پیریرا نے بتایا۔

"تو پھر ان کا اتا پتا بھی تو ہوگا آپ کے پاس۔" ثاقب حسن نے پوچھا۔

"جی۔ گھر کا ایڈریس تو مجھے معلوم نہیں البتہ جس کلینک میں وہ کام کرتی ہے اس کا ضرور معلوم ہے بلکہ فون نمبر بھی۔"

"پھر تو ٹھیک اور پوچھ پوچھ۔ لائیے جلدی سے کلینک کا ایڈریس مع فون نمبر عنایت کر دیجیے۔" ثاقب حسن بے تابی سے بولے تو فلورا نے دراز کھول کر اپنا پرس نکالا اور پھر پرس کھول کر ایک چھوٹی سی ڈائری نکالی اور فلورا کے کلینک کا پتا مع فون نمبر۔ ٹیبل ڈائری کا صفحہ پھاڑ کر اس پر درج کیا اور ثاقب حسن کی طرف بڑھاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"اس کے ساتھ آئی وش یو گڈ لک۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ مونا فلورا کے پاس ہی گئی ہوگی۔"

"فلورا — ! کیا آپ کی دوست کا نام فلورا ہے؟" اسفند نے متعجب انداز میں پوچھا۔

"جی ہاں — اور وہ اسی کلینک میں مڈوائف لگی ہوئی ہے مگر بہت ہی نیک خاتون ہے یعنی پنج وقتہ نمازی اور پرہیزگار اور اس بھری دنیا میں بالکل تنہا ہے۔" پیریرا نے متبسم سے انداز میں فلورا کے بارے میں تفصیل بتائی۔ دونوں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اسے خدا حافظ کہہ کر ہوسٹل سے باہر نکل آئے۔ واپسی میں ثاقب حسن چپ چپ سے لگ رہے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی طرح انہیں بھی سلوط کی طرف سے یہ یقین نہیں ہے کہ وہ کراچی میں انہیں مل جائے گی اور وہ جو بہت گہری اور مضبوط طبیعت رکھتے ہیں آج کی ناکامی پر اندر سے کتنے ٹوٹ پھوٹ رہے ہوں گے۔ ان کا دھیان بٹانے کی غرض سے اسفند نے گفتگو کی ابتدا کی۔

"میرے خیال میں تو ہمیں آج ہی کراچی روانہ ہو جانا چاہیے۔ کیوں پھوپھا جان؟"

"ہاں بالکل۔ ہم خود بھی وقت ضائع کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔" ثاقب حسن نے جواباً کہا۔ کچھ دیر تک خاموشی چھائی رہی پھر ثاقب حسن نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

"کیا نام تھا ہوسٹل کی انچارج کا اس کے؟"

"مسز پیریرا۔" اسفند نے ان کے مزید کچھ کہنے سے پہلے نام بتایا۔

"ہاں مسز پیریرا کے بیان کے مطابق تو اب تک سلوط کراچی پہنچ گئی ہوگی۔ کیونکہ ٹرین سے سفر کیا ہوگا اس نے۔"

"کراچی تو وہ پرسوں شام کو ہی پہنچ گئی ہوں گی پھوپھا جان۔ کیونکہ انہوں نے جمعہ کو ہوسٹل چھوڑا تھا۔ ظاہر ہے سیدھا اسٹیشن کا رخ ہی کیا ہوگا۔ کہ یہاں تو ان کا کوئی اور واقف بھی نہیں ہے۔ لیکن بشرطیکہ وہ کراچی ہی گئی ہوں۔" اسفند نے اپنے دل کی بات لفظوں میں ڈھالی۔

"لیکن بقول تمہارے اس کا یہاں نہیں تو کہیں بھی کوئی واقف کار نہیں ہے۔ ورنہ وہ ادھر کا رخ ہی کیوں کرتی۔ اب خدا جانے کن حالات میں فلورا سے ٹکراتی ہو — خیر میں اس کی فطرت سے بخوبی واقف ہوں۔ وہ اس معاملے میں کوئی غلط قدم اٹھانا گوارا نہیں کر سکتی۔" ثاقب حسن نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"ہاں خدا کرے ایسا ہی ہو — ورنہ انہیں ڈھونڈنے میں بڑی مشکلات درپیش آ جائیں گی۔" اسفند ایک گہرا سانس لے کر بولا۔

"خیر ہم اپنی طرف سے تو بڑی اُمید لے کر جا رہے ہیں باقی معاملہ خدا کو سونپا وہی ہماری مدد کرے گا۔"

"جی ہاں اُمید پر ہی دنیا قائم ہے لیکن پھوپھا جان اگر آپ یہاں سے براہِ راست کراچی جانے کا ارادہ رکھتے ہیں تو پھر کیا پھپھو بیگم عرصے تک لاہور میں تنہا نہیں رہ جائیں گی کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ کراچی میں آپ کا قیام کب تک ہو۔" اسفند نے ایک بہت ہی اہم بات کی طرف اُن کی توجہ دلائی۔ تو انہوں نے ہنس کر کہا۔

"تازہ اور نئے دماغ کی یہی خوبی ہوتی ہے۔ کہ وہ اچھی اور کام کی باتیں سوچتا ہے۔ ویسے مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ ذہانت تمہارے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ اس پر تم بہت حساس بھی ہو ہمارے معیار کی کسوٹی پر سو فیصد پورے اُترتے ہو۔"

"لیکن بات پھپھو بیگم کی ہو رہی تھی میری ذہانت کی نہیں۔" اُن کی بات میں جو معنویت تھی۔ اُسے سمجھتے ہوئے اسفند نے بھی ہنس کر کہا۔

"ویسے تم نے ایک اہم بات کی طرف ہماری توجہ دلائی۔ تمہارا شکریہ لیکن ہم بھی اپنی شریکِ حیات کی طرف سے اتنے لاپروا نہیں ہیں نہ یہاں سے براہِ راست کراچی جانے کا ارادہ ہی رکھتے ہیں۔ بلکہ ابھی دوپہر کی فلائیٹ سے سیدھے لاہور جائیں گے۔ اور پھر شام کی فلائیٹ سے آپ کی پھپھو بیگم کے ہمراہ کراچی۔" ثاقب حسن نے اپنا پروگرام بتایا۔

"اچھا تو کیا آپ اپنے گھر کو مقفل کر کے جائیں گے پھوپھا جان۔ میرا مطلب ہے کہ آپ کے جانے کے بعد وہ محفوظ بھی رہ سکے گا۔" اسفند نے پوچھا۔

"جہاں تک محفوظ رہنے کا سوال ہے تو اس میں چند معمولی برتنوں، پلنگوں اور چارپائیوں کے کچھ ہوگا ہی نہیں۔ اور مقفل اس لیے کر کے جائیں گے کہ وہ ہمارا ذاتی گھر ہے۔ اگر کبھی کوئی اچھا گاہک مل گیا تو اسے فروخت بھی کر دیں گے کیونکہ اب ہم لاہور کی رہائش ترک کرنے کا مصمم ارادہ کر چکے ہیں۔ اور کراچی میں ہی سکونت اختیار کریں گے۔"

"اوہ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے پھوپھا جان۔ پھپھو بیگم ایک عرصے سے ہم سب سے دور ہیں۔ اس طرح کم از کم سب اپنوں سے قریب تو ہو جائیں گی۔" اسفند نے اپنی دلی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"ابھی ہم ان کے شوہر یعنی سر کے تاج ہیں وہ ہم سے ہی قریب نہیں ہوئیں تو آپ سب سے کیا ہوں گی۔" ثاقب نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہا تو اسفند بھی ہنسنے لگا۔ یہی باتیں کرتے ہوئے وہ احتشام کے بنگلے پر پہنچ گئے۔

"اب تم سب سے پہلا کام یہ کرو کہ جہاز کی سیٹس کا انتظام کر لو۔" ثاقب حسن نے کار سے اُترتے ہوئے کہا۔

"وہ کوئی مسئلہ نہیں پھوپھا جان۔ لیکن پہلے طعام بعدۂ الکلام۔" بات کے اختتام پر اسفند ہنسنے لگا۔

"یعنی ہاتھ منہ کی ترائی۔ چلو خیر اس کی اجازت ہے۔" ثاقب حسن نے بھی شگفتہ لہجے میں جواب دیا۔ پھر اسفند انہیں اپنے رہائشی کمرے میں لے آیا۔

دھب دھب دھب۔ رات کے سناٹے کو چیرتی دستک کی آواز آئی تو پلنگ پر لیٹی کسی رسالے کا مطالعہ کرتی سلوط ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے پہلے بند دروازے کی طرف دیکھا اور پھر جانماز پر عشاء کی نماز ادا کرتی فلورا کی طرف۔

اس وقت بھلا کون یہاں آ سکتا ہے۔؟

ممکن ہے کوئی پڑوسی یا محلے دار ہو۔

یا پھر کسی کیس کے سلسلے میں کوئی آیا ہو۔

مگر نہیں۔ آج تک تو کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا کہ کوئی اتنے بے وقت آکر دروازہ کھٹکھٹائے۔ فلورا کو نماز میں مشغول دیکھ کر وہ سراسیمگی کے عالم میں سوچنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد دوبارہ دروازے پر دستک ہوئی۔

جو پہلے کی نسبت قدرے زور سے دی گئی تھی۔

گویا میرا وہم نہیں بلکہ واقعی کوئی ہے۔ مگر کون۔؟ اس کا دل بری طرح دھک دھک کرنے لگا۔ اس اثناء میں فلورا نے جلد جلد التحیات پڑھ کر سلام پھیرا۔ اور دونوں ہاتھ اٹھا کر کوئی دعا دم کی اور پھر ہاتھوں کو چہرے پر پھیرنے کے بعد جانماز سمیٹتے ہوئے اس نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔

"کوئی دروازہ بجا رہا ہے مگر اس وقت کون آسکتا ہے بھلا۔؟" اور اس کی بات کا جواب سلوط نے دیا۔

"یہی میں بھی سوچ رہی ہوں کہیں برابر والی کلثوم خالہ نہ ہوں۔"

"نہیں۔ کلثوم کے دروازہ کھٹکھٹانے کا انداز یہ نہیں ہوتا۔ وہ تو دروازے کو توڑ دینے کے سے انداز میں بجاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ زور زور سے بولتی بھی جاتی ہے۔"

"پھر کون ہو سکتا ہے آخر۔؟" سلوط نے سہمے سہمے سے انداز میں کہا۔

"اب یہ تو پوچھنے پر ہی معلوم ہوگا۔" فلورا بولی۔

"میرے خیال میں تو جواب ہی نہیں دیجیے۔ نہ معلوم کون ہو اور کس مقصد سے آیا ہو۔" سلوط نے مشورہ دیا۔

"لیکن یہ بھی مناسب نہیں کہ میں سرے سے جواب ہی نہ دوں۔ تم اطمینان رکھو۔ میں بلا جانے بوجھے ہرگز دروازہ نہیں کھولوں گی۔ پہلے پوچھ لیتی ہوں کہ کون آیا ہے اس کے بعد ہی۔" تبھی تیسری بار پھر دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ وہ بھی زور زور سے۔ فلورا جلدی سے دروازے کی طرف بڑھی اور جھری سے منہ لگا کر پوچھا۔

"کون صاحب ہیں بھئی۔" اس کے لہجے سے جھلاہٹ صاف نمایاں تھی۔ جواب میں باہر سے ایک نسوانی آواز آئی۔

"میں فاخرہ ہوں سلوط کی بھابی مسٹر فلورا۔ آپ برائے مہربانی دروازہ تو کھولیں۔" فاخرہ کی آواز اتنی صاف اور اونچی تھی کہ اپنے بستر کے قریب کھڑی سلوط نے بھی سن لی تھی۔ فلورا نے مڑ کر سلوط کی طرف دیکھا اور آنکھ کے اشارے سے پوچھا کہ وہ کیا کرے۔ کیا وہ دروازہ کھولے یا آنے والی کو باہر سے ہی واپس کر دے۔ مگر سلوط گم صم سی کھڑی رہی۔

"سنیں مسٹر فلورا اگر سلوط یہاں موجود ہیں تو آپ اُن سے پوچھ لیں۔ وہ مجھے اچھی طرح جانتی ہیں۔" اندر سے جواب نہ پا کر فاخرہ نے دروازے کو کھٹکھٹا کر پھر کہا۔ تو فلورا نے "اچھا ٹھہریئے" کہہ کر دروازہ کھول دیا۔

"کیا میں اندر آ سکتی ہوں۔؟" فاخرہ نے باہر ہی کھڑے کھڑے پوچھا۔

"جی ہاں۔ بصد شوق۔" فلورا نے بڑے تپاک سے کہا۔ تو فاخرہ اندر آ گئیں۔ وہ سامنے ہی کھڑی تھی۔ نظریں جھکائے اسی گم صم سی کیفیت میں۔

اس پر نظر پڑتے ہی دونوں ہاتھ پھیلا کر فاخرہ اس کی طرف لپکیں۔

"ارے سلوط میری بچی میری چاند۔ تم نے تو ہمیں اپنی صورت کو بھی ترسا دیا۔" فاخرہ نے اس کے نزدیک پہنچ کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ لیکن وہ یونہی اکڑی اکڑی سی بلا کوئی تاثر دیے کھڑی رہی۔

"شکر خدا کا کہ تم مل گئیں ورنہ تمہاری گمشدگی نے تو ہماری نیندیں حرام کر دی تھیں تمہاری پریشانی میں تو ہماری بھوک و پیاس تک مٹ کر رہ گئی تھی بیٹا۔" بڑی جذباتی سی کیفیت میں یہ جملے کہتے کہتے فاخرہ کا گلا رندھ گیا۔ تو سلوط متاثر ہونے کے بجائے اُن سے الگ ہو کر بڑی ناگواری سے بولی۔

"میری طرف سے تو شروع ہی سے آپ پریشانی اٹھاتی آ رہی ہیں۔ اب میں آپ کی زندگی سے نکل آئی ہوں تو آپ نے میری وجہ سے خود کو ہلکان کیوں کیا۔؟" اور اس جواب پر فاخرہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں۔ اور قدرے توقف کے بعد بڑی بے بسی سے بولیں۔

"اب میں تمہارے اس سوال کا کیا جواب دوں۔ جبکہ اتنا حوصلہ نہیں رکھتی۔ ہاں اتنا ضرور کہوں گی کہ ہم جو کچھ کرنا چاہ رہے تھے۔ تمہارے ساتھ کی گئی زیادتیوں کے ازالے کے طور پر ہی کرنا چاہ رہے تھے۔ اور تم بھی اس بات سے لاعلم نہیں تھیں اب یہ ہماری بدقسمتی کہ ہمیں اتنی دیر ہوگئی۔ اور ادھر تمہیں سارا بھگتان بھگتنا پڑا۔ اب میں یہاں کھڑے کھڑے اپنی ساری سرگزشت تمہیں کیسے سناؤں۔ جب اطمینان سے بیٹھو گی تبھی سناؤں گی۔" فاخرہ بولیں۔ وہ جو سیدھے منہ بات کرنے کی روادار نہ تھیں۔ اس وقت کس عاجزی سے بات کر رہی تھیں۔ اسے تعجب ضرور ہوا مگر وہ ان کی لاگ لپیٹ کی باتوں سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوئی بلکہ بہت ہی درشتی سے بولی۔

"لیکن مجھے کچھ سننے کا شوق ہے نہ میں اس کی ضرورت ہی سمجھتی ہوں۔ کیونکہ میرے ساتھ جو کچھ بھی ہوا ہے۔ میں اس کا کسی کو دوش دیتی ہوں نہ ذمہ دار ٹھہراتی ہوں۔ بلکہ نوشتۂ تقدیر سمجھ کر صبر کر لیا ہے میں نے۔"

"اب تم اس قدر خفا ہو کہ بات تک سننے کی روادار نہیں تو میں سوائے اس کے تم سے اور کیا کہہ سکتی ہوں کہ تم بھی معاف کردو کہ خدا بھی اپنے بندوں کی غلطیوں کو معاف کر دیتا ہے۔" کوئی اور وقت ہوتا تو بھابی سے اس قدر فتویانہ گفتگو سن کر سلوط فرط حیرت سے بے ہوش ہو جاتی۔ مگر اس سمے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ فاخرہ کے منہ سے نکلی کوئی بھی بات اسے متاثر نہیں کر سکے گی۔

"دیکھیں بھابی جان۔ آپ یہ مجھ جیسے عام سے مکالمے نہ بولیں۔ کیونکہ میرے نزدیک آپ جیسی بلند و بالا ہستی کا اپنے مقام سے نیچے اتر کر بات کرنا مجھے شرمندہ اور ذلیل کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ آپ پلیز یہاں سے چلی جائیں۔ میں نے اپنی زندگی کا جو نیا راستہ چنا ہے۔ اس پر اطمینان سے مجھے چلنے دیں۔ میرا سکون اور آرام غارت کرنے کی کوشش نہ کریں۔" وہ ان کی باتوں سے متاثر ہونے کے بجائے الٹا ان پر برس سی پڑی۔ فلورا جو آمی ہر سے تھوڑے فاصلے پر خاموش کھڑی ان دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔ سلوط کی باتوں پر اس نے اسے ٹوکنے کے سے انداز میں کہا۔

"بائیں بائیں مونا بیٹی — یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ کیا تمہارے دل میں اپنے بڑوں کا ذرا سا بھی احترام نہیں۔" اور پھر فاخرہ سے بولی۔

"آپ تشریف تو رکھیں بیگم صاحبہ — جب سے آئی ہیں کھڑی ہی ہیں۔ اصل میں آپ مونا سے باتوں میں ایسی کھو گئیں کہ میں —"

"کہ میں بھی آپ سے دعا سلام کر سکی نہ آپ سے تعارف ہی حاصل کر سکی۔ لیکن غائبانہ طور پر ضرور آپ کو جانتی ہوں۔" فاخرہ نے اس کا باقی ماندہ فقرہ پورا کیا تو وہ ہنس کر بولی۔

"جی یہ میری خوش نصیبی ہی ہے کہ آپ غائبانہ طور پر مجھ سے واقف ہیں۔ اچھا آپ تشریف تو رکھیں نہ۔"

"نہیں اس وقت میں بیٹھ نہیں سکتی کیونکہ میرے شوہر باہر کار میں بیٹھے میرا انتظار کر رہے ہیں۔" فاخرہ نے نہ بیٹھنے کا عذر پیش کیا۔

"او ہو تو آپ انہیں اپنے ساتھ اندر کیوں نہ لیتی آئیں۔ خیر اب بلا لیجیے۔ یوں باہر کار میں اُن کا بیٹھنا کچھ مناسب نہیں۔" فلورا نے کہا — تو سلوط بڑے برہم سے انداز میں بولی۔

"نہیں کوئی ضرورت نہیں کسی کو اندر بلانے کی آنٹی بس یہ مل لیں میرے لیے یہی بہت ہے۔"

"مونا۔" فلورا نے اسے بڑے تنبیہی انداز میں مخاطب کیا۔

"اگر دشمن بھی ملنے آئے تو اس کے ساتھ بھی مروت اور اخلاق کے ساتھ پیش آنے کا حکم صادر کیا گیا ہے جبکہ یہ تو تمہارے اپنے بھائی کا معاملہ ہے جو تمہارے لیے بزرگ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مجھے تمہاری ان اذیتوں کا احساس ہے جو ان لوگوں کے ہاتھوں تم نے جھیلی ہیں۔ مگر بیٹی سگے رشتے آپس میں اس طرح گتھے ہوئے ہوتے ہیں جیسے ناخن گوشت سے۔ اور اگر ناخن گل یا ٹوٹ بھی جاتا ہے تو دوبارہ اُگ آتا ہے۔ میرا مطلب ہے کوئی کوشش بھی کرے تو سگے رشتوں کو توڑ نہیں سکتا کیونکہ ان کا تعلق خون سے ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ خون ہی ہوتا ہے جو رشتوں کی شناخت کرتا ہے۔"

"جو کچھ بھی سہی آنٹی۔ لیکن میرا اعتماد ہر رشتے سے اٹھ چکا ہے۔ میں سارے رشتے توڑ چکی ہوں آنٹی — آپ ان سے کہیں یہاں سے چلی جائیں اور آئندہ کبھی ادھر کا رخ نہ کریں ورنہ میں یہاں سے کہیں اور چلی جاؤں گی۔" سلوط کے لہجے میں بیزاری اور ناگواری ہی نہیں بلکہ تنفر بھی تھا۔ جسے محسوس کر کے فلورا دم سی بخود کھڑی رہ گئی۔

"واہ کیسے چلی جاؤ گی بیٹا — جب تک ہم زندہ ہیں اور ہمارے دم میں دم ہے ہم تمہیں اسی رشتے کو جوڑنے پر مجبور کرتے رہیں گے۔" ثاقب حسن نے اندر آتے ہوئے کہا۔ اصل میں وہ فاخرہ بیگم کے انتظار میں بیٹھے تو کار ہی میں تھے۔ لیکن جب فاخرہ کو واپسی میں دیر ہو گئی تو ان سے ضبط نہ ہو سکا — بیٹی سے ملنے کے لیے پہلے ہی بیتاب ہو رہے تھے — اسی لیے اتر کر دروازے کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ چھوٹا سا تو گھر ہی تھا۔ سب کی آوازیں بہت واضح طور پر باہر آ رہی تھیں۔ انہوں نے سلوط کی بات بھی سن لی تھی۔ اور بلا اجازت اندر آنے پر مجبور ہو گئے تھے — مگر آتے ہی انہوں نے فلورا سے معذرت کی۔

"معاف کیجیے گا ہمشیرہ ہمیں اپنی بیٹی کی محبت نے آپ کی اجازت کے بغیر اندر آنے پر مجبور کر دیا۔"

"کوئی بات نہیں برادر محترم۔ میں نے ابھی کچھ دیر قبل ہی آپ کو اندر آنے کی اجازت دے دی تھی۔" فلورا نے تھوڑا سا مسکرا کر کہا۔

سلوط سامنے ہی کھڑی تھی۔ چند فٹ کے فاصلے پر — اور ان کے اچانک اندر آ جانے پر حسب عادت سہم سی گئی تھی — کہ وہ شروع سے ان سے بہت ڈرتی تھی۔ اور بچپن ہی سے ان سے جھڑکیاں کھانے کے بعد ان کا خوف کچھ ایسا دل میں بیٹھا تھا کہ ان کی یگانگت اور التفات بھی اس خوف کے اندر زائل ہو کر رہ جاتا تھا اور اس کے اپنی آنکھوں میں غصے اور کھسیاہٹ کی چنگاریاں بھرے جس انداز میں وہ فاخرہ سے باتیں کر رہی تھی بھائی کو دیکھ کر وہ لکڑیں آپ ہی آپ جھک گئیں۔ ثاقب حسن قدم بڑھا کر اس کے قریب جا کھڑے ہوئے اور قدرے شفقت آمیز انداز میں بولے۔

"ہم تمہاری نظر میں سزاوار قصور وار سہی — لاکھ معتوب سہی لیکن بیٹا ہم نے تمہیں آداب و اخلاق سے کبھی عاری نہیں رکھا جو تم ہمیں آداب و سلام تک کرنا بھول گئیں۔" اور وہ جس کا دل ان کے اتنے قریب آ جانے پر خوف سے بری طرح دھڑک اٹھا تھا۔ اس پر اچانک غصے اور پچھتاوے کی آگ غالب آ گئی۔ اور وہ دل کڑا کر کے بڑی بے مروتی سے بولی۔

"جب میں ہر تعلق قطع کر چکی ہوں — خود پر بیتی ہر بات — اپنا ماضی حتیٰ کہ خود اپنا آپ بھلا چکی ہوں تو پھر ان تکلفات اور دکھاوے کی باتوں سے کیا حاصل؟"

"ہے ہے مونا یہ تم کیا کہہ رہی ہو بیٹی — کم از کم میرے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ تم اس قدر بے مروت اور بدلحاظ بلکہ گستاخ ہو گی۔" فلورا اس کے گستاخانہ انداز کو برداشت نہ کر سکی تو اس نے فوراً ہی اسے ملامت کی۔

"نہیں ہمشیرہ آپ ہماری بٹیا کے بارے میں کوئی غلط رائے قائم نہ کریں۔ انہوں نے جو کچھ بھی کہا ہے اور جو سلوک کر رہی ہیں۔ ہم اس سے بھی — کہیں زیادہ سخت سست اور بدسلوکی کے مستحق ہیں۔ اصل غلطی ہماری ہی ہے جو ہم لستے بے موقع آئے اور ان کے ساتھ ساتھ آپ کو بھی ایک خلجان میں مبتلا کر دیا۔" ثاقب حسن خصوصاً بیوی کے سامنے بیٹی کے ہاتھوں خوار ہونے پر اپنی شرمندگی کو مٹانے کی غرض سے بولے۔

"نہیں بھائی صاحب — خلجان میں مبتلا ہونا کیسا مجھے تو آپ دونوں کی آمد سے دلی مسرت ہوئی ہے — لیکن آپ تشریف تو رکھیں۔ آپ بھی بیٹھ جائیے نا بیگم صاحبہ۔ اب تو آپ کے شوہر بھی تشریف لے آئے ہیں۔" فلورا بہت ہی خلیق لہجے میں بولی۔

"نہیں شکریہ ہمشیرہ — ہم اب چلیں گے — یوں بھی ہم نے بے وقت آ کر آپ کے آرام میں خلل ڈالا۔" فاخرہ کے بجائے ثاقب حسن جلدی سے بولے۔ اور پھر انہوں نے سپاٹ چہرہ لیے کھڑی سلوط کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"اچھا بٹیا — ہم لاکھ برے سہی — اور لاکھ تم ہم سے سارے رشتے توڑ لو۔ لیکن ہمشیرہ کے بقول۔ خون کا رشتہ تو ابد تک قائم رہے گا۔ اور اسی خون کے رشتے کے بل پر ہم تم سے درخواست کرتے ہیں کہ تم خواہ ہمارے ساتھ نہ چلو۔ لیکن ہماری خطائیں ضرور معاف کر دو۔ اچھا خدا حافظ۔" اتنا کہہ کر انہوں نے فاخرہ کو چلنے کا اشارہ کیا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ واپسی کے لیے قدم اٹھائیں ثاقب حسن — تیزی سے دہلیز پار کر کے گھر سے باہر آ گئے۔ تو فلورا انہیں دروازے تک چھوڑنے آئی لیکن — دونوں میں سے کسی نے بھی مڑ کر اس کی طرف نہیں دیکھا۔

سلوط کی بدسلوکی اور گستاخانہ رویئے پر فلورا کو رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا۔ وہ دروازے کا کھٹکا لگا کر اپنے بستر پر بیٹھی تو بات کرنی تو کجا اس کا دل سلوط کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کو بھی نہ چاہا۔ یوں بھی عشاء کی نماز پڑھ چکی تھی لہٰذا رات کا کھانا کھا کر تو سونا تھا۔ ویسے بھی یہی وقت ہوتا تھا جب ان سے بات کرنے کی فرصت ہوتی تھی — ورنہ — ان کے گھر سے کلینک کافی دور تھا۔ اور چونکہ وہ بس کے ذریعے کلینک جاتی تھی اسی لیے ساڑھے سات بجے صبح ہی گھر سے نکل جاتی تھی اور پھر سات بجے شام کو ہی ڈیوٹی نبٹا کے واپس آتی تھی۔ اور اگر کوئی سیریس کیس آ جاتا تو واپسی میں اسے دس بھی بج جاتے تھے۔

اس سمے رات کے نو بج چکے تھے۔ اور سلوط کی طرف سے دل میں کبیدگی محسوس کرتے ہوئے اس نے فوری طور پر سو جانے

کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسی لیے دروازہ بند کرنے کے بعد اس نے کمرے کی لائٹ بجھائی اور چپ چاپ اپنے پلنگ پر جو وہ سلوط کے آجانے کی وجہ سے نیا خرید کر لائی تھی لیٹ گئی۔ جبکہ سلوط ابھی تک کھڑی ہی تھی اور بہت بے دردی سے اپنا ناخن چبا رہی تھی۔ اصل میں تو وہ سمجھ رہی تھی کہ اب فلورا اس کے بری طرح لتے لے گی۔

اسے سمجھائے بجھائے گی اور قائل کرنے کی کوشش کرے گی۔
مگر اس کی باتوں کے ردِعمل میں اس نے خاموشی اختیار کی۔
بلکہ خفگی کا اظہار کیا اور بتی بھی بجھا دی۔
سلوط کا دل تو پہلے ہی بھرا چلا آ رہا تھا۔

فلورا کی ناراضگی نے اسے مزید ہوا دی تو پھر اسکی آنکھوں سے اشکوں کا ایک سیلِ رواں ہو گیا اور وہ اندھیرے میں اپنے پلنگ پر بیٹھ کر آنسو بہانے لگی۔ اس کی شُوں شُوں۔ اور ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز اتنی واضح تھی کہ فلورا نے بھی سنی۔ لیکن ایک تو وہ اس سے کبیدہ تھی دوسرے سارا دن ڈیوٹی انجام دینے کی وجہ سے بہت تھک گئی تھی اور اسے سخت نیند آ رہی تھی۔ اسی لیے وہ اسے یونہی روتا بلکتا چھوڑ کر کچھ ہی دیر بعد پڑ کر سو گئی۔

اگلے روز حسبِ معمول صبح تڑکے ہی بیدار ہوئی تو دیکھا سلوط جا نماز بچھائے فجر کی نماز ادا کر رہی ہے۔ معلوم وہ رات کو سوئی بھی تھی یا جاگتی رہی اور روتی ہی رہی تھی۔ فلورا کے دل میں یہ خیال ضرور آیا۔ مگر اس نے سلوط کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ جلدی جلدی وضو کر کے نماز پڑھی۔ اور وضو کرنے سے قبل اس نے پانی کی کیتلی جو چائے بنانے کی غرض سے چولہے پر رکھی تھی۔ نماز سے فارغ ہو کر اسی میں چائے دم کی اور پیالی میں اپنے لیے چائے بنا کر وہیں کھڑے کھڑے کنستر سے آٹا نکال کر جلد جلد گوندھنے لگی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک دو گھونٹ چائے کے بھی پیتی رہی۔ پھر آٹا گوندھنے کے بعد اس نے باقی ماندہ چائے پی کر پیالی دھوئی اور پتیلی کھنگال کر اس نے رات کا لایا ہوا قیمہ دھویا اور مسالے اور گھی سمیت پتیلی میں ڈال کر چولہے پر چڑھا دیا۔ اور دوسرے چولہے کو سلگا کر توے کو اس چولہے پر رکھ دیا اور گوندھے ہوئے میں سے پیڑے توڑ توڑ کر خشکی کی پرات پر رکھنے لگی —

سلوط بھی اس دوران میں بچھونے اور پلنگ سے باورچی خانے کے کھلے در پر آکھڑی ہوئی تھی مگر اس نے اب تک نہ فلورا کو سلام کیا تھا نہ ایک لفظ کہا تھا۔ جبکہ سرگودھا سے واپس آتے ہی یہ سارے کام اس نے بہت زبردستی کر کے اپنے ذمہ لے رکھے تھے مگر اس روز فلورا وہ کام خود انجام دے رہی تھی۔

اس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس سے سخت خفا ہے اتنی کہ بولنے کی بھی روادار نہیں مگر اس کی خفگی کی وجہ سلوط کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی بلکہ وہ تو یہ سوچ سوچ کر حیران ہو رہی تھی کہ یہ میرا اور بھائی جان کا ذاتی معاملہ ہے۔ انہوں نے مجھ پر زیادتیاں ہی نہیں کی تھیں بلکہ ظلم توڑا تھا۔ مجھے برباد اور بے ٹھکانہ کرنے میں ان کا بھی ہاتھ تھا۔ اور آنٹی ان ساری باتوں سے لاعلم نہیں ہیں انہیں بھی معلوم ہے کہ میں نے کتنے دکھ اٹھائے ہیں کتنی اذیتیں جھیلی ہیں۔ اور کیسے کیسے زخم کھائے ہیں کہ میری شخصیت ہی ریزہ ریزہ ہو کر رہ گئی ہے۔ حتیٰ کہ مجھے اپنی ذات تک پر بھی اعتماد نہیں رہا۔ اور میں نے اپنی ان اذیتوں اپنے ان دکھوں کو خود ہی تو سہا ہے۔ کسی نے میرے دکھ نہیں بانٹے۔ کسی نے اذیتیں جھیلنے میں میرا ساتھ نہیں دیا۔ میں خود ہی بالکل تنہا اور بے یار و مددگار طوفانی ہواؤں کی زد میں آئے تنکے کی طرح اِدھر اُدھر رُلتی پھری ہوں اور اب میں نے اپنا ایک ٹھکانہ بنا لیا ہے۔ اپنے لیے ایک نئے راستے کا تعین کیا ہے۔ تو پھر بھابی اور بھائی جان اس نئے راستے میں رکاوٹ کھڑی کرنے آ گئے۔ شاید اس خوش فہمی میں آئے تھے کہ میں اب بھی وہی ہوں۔ سہمی سہمی دلی دبائی اور بے زبان سی سلوط ہوں۔ جسے انہوں نے اپنے مفاد کی بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ اور جو کبھی نہیں بولی تھی۔ حتیٰ کہ اشاروں اور کنایوں میں بھی اپنی ناپسندیدگی کو زبان نہیں دے سکی تھی۔ اور حد تو یہ تھی کہ جب لٹ پٹ کر واپس آئی تھی۔ تب بھی اُن کے اشاروں پر ناچتی رہی تھی۔ انکی مرضی کو مقدم سمجھتی تھی۔

انہوں نے بہت بہلا پھسلا اور سبز باغ دکھا کر کہا کہ میرے برادرِ نسبتی کے یہاں کراچی چلی جاؤ وہ لوگ بہت ہی شریف ہیں اور بڑا اعلیٰ ظرف رکھتے ہیں۔ تم کو سر آنکھوں پر بٹھائیں گے۔ اور پھر صرف ڈیڑھ دو ماہ کا معاملہ ہی تو ہے۔ ہم واپس

آتے ہی تمہیں اپنے پاس بلا لیں گے۔ ارے ہم تمہاری خاطر ہی تو اٹلی جا رہے ہیں۔ تاکہ اس خبیث کی قید سے تمہیں رہائی دلا دیں ہمیشہ کے لیے۔ اور تب میں نے بھی بھائی جان کی لچھے دار گفتگو کے آگے گھٹنے ٹیک دیے تھے۔ اور نہ چاہتے ہوئے بھی کراچی آ گئی تھی۔ مگر کراچی آ کر تو ایسی خواری کا منہ دیکھا کہ خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ اور ان ساری باتوں کے ذمہ دار صرف اور صرف بھائی جان ہیں۔ جو مجھے کراچی بھیج کر بھول ہی گئے تھے کہ ان کی کوئی بہن بھی بستی ہے اس اتنی بڑی پُر ہنگام دنیا میں۔ مگر بھائی جان نے مجھے بہن ہی کب سمجھا۔ میں تو ان کی نظر میں دنیا کی سب سے بیکار اور فالتو شے رہی ہوں۔ بھلا ایک ہی بھائی کی ایک بہن ہوتی ہے تو وہ اس کے کتنے ناز اور نخرے اٹھاتا ہے۔ کس قدر لاڈ کرتا ہے۔ اور کتنا ٹوٹ کر چاہتا ہے۔ مگر یہاں تو لاڈ پیار ناز نخرے اٹھانا اور ٹوٹ کر چاہنا تو بڑی بات ایک نگاہِ التفات کو بھی یہ چھوٹی بہن ترستی تھی۔ جب سگا بھائی ایسا بے حس تھا تو پھر بھابی کو کیا دوش دینا۔

تبھی تو گزشتہ شب مجھے ان کی شیریں کلامی اور اتنی زیادہ یگانگت ذرا بھی متاثر کر سکی نہ متعجب۔ کیونکہ ان کی ساری باتوں کا کھوکھلا پن میں نے محسوس کر لیا تھا۔ ان کی گفتگو سے تصنع اور بناوٹ کی بو آ رہی تھی۔ سو مجھ پر اب انہیں کیا معلوم کہ زندگی کی کٹھنائیوں اور تلخ تجربات نے سلوط کو یکسر بدل ڈالا ہے۔ انہیں کیا خبر کہ سلوط اب پہلے جیسی دلی دبائی بے زبان بلکہ بے ضرر سی سلوط نہیں رہی ہے مگر ہاں۔ میری گرم گفتار سے انہوں نے کچھ تو اندازہ لگا ہی لیا ہوگا۔

جانے کتنی دیر تک وہ باورچی خانے کے کھلے در پر کھڑی کھڑی یہی سوچتی رہی تھی۔ وقت کے گزرنے کا احساس تو اس وقت ہوا جب توے کو چولہے پر سے اتار کر کیتلی پر لٹکانے کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ تو اس نے بری طرح چونک کر فلورا کی طرف دیکھا۔ جو توا لٹکانے کے بعد دست پناہ سے چولہے پر چڑھی قیمے کی پتیلی کا ڈھکنا کھول رہی تھی۔ گو اس کی عادت نہیں تھی کسی بات پر استفسار کرنے یا پوچھنے کی۔

بڑی سے بڑی بات اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتی۔ اس کے ساتھ ہوتی مگر وہ چپ ہی رہتی تھی حتیٰ کہ بڑی سے بڑی بیداد بھی اس پر توڑی جاتی تب بھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لاتی تھی۔ نہ وہ چھچھوری لڑکیوں کی طرح پٹر پٹر بولنے، ہنسی مذاق کرنے اور ہر بات کی ٹوہ میں لگی رہنے کی ہی عادی تھی۔

اس کے مزاج میں بردباری تھی اور فطرتاً بھی باپ کی طرح کم گو تھی۔ بات بھی کرتی تو مختصر۔ ہنستی بھی تو زیرِ لب۔ یعنی اس کا اپنا ایک انداز تھا۔ ایک اسٹائل تھا۔ جس نے اس کے اندر ایک وقار سا پیدا کر دیا تھا کسی اور کا معاملہ ہوتا تو وہ پوچھتی بھی نہیں۔ مگر یہ فلورا کا معاملہ تھا جس کے اس پر بہت سارے احسانات تھے۔ جس نے اسے پناہ ہی نہیں دی تھی بلکہ سہارا بھی دیا تھا تحفظ دیا تھا اور سب سے بڑھ کر اپنی بے لوث چاہتوں سے نوازا تھا۔ اور اس زمانے میں بے لوث چاہتیں مفقود نہ سہی مگر عنقا ضرور ہو کر رہ گئی ہیں۔ اور بے لوث چاہتوں کا متلاشی تو برہنہ پا دردر کا جلتا ہوا صحرا بھی عبور کر جاتا ہے۔ کہ یہ چاہتیں اگر ملتی ہیں تو آبلہ پائی کے بعد ہی ملتی ہیں۔

جیسے کہ سلوط کو فلورا سے ملی تھیں۔ پھر بھلا وہ کیسے اس کی ناراضگی برداشت کر سکتی تھی۔ دل کو سنبھال کر وہ تھوڑا سا آگے بڑھی اور پھر قدرے شگفتہ لہجے میں اسے سلام کیا۔

"السلام علیکم آنٹی!"

"وعلیکم السلام۔" جواب بہت دھیمی آواز میں ملا۔

"ارے یہ آپ کیا کرنے کھڑی ہو گئیں آنٹی؟" اس نے فلورا کے قریب ہو کر پوچھا۔

"بس، یہ میرے کرنے کے کام ہیں۔ اس لیے کر رہی ہوں۔" فلورا روٹھے روٹھے انداز میں بولی۔

"لیکن یہ کام تو آپ نے مجھے سونپ دیے تھے آنٹی! اور پہلے تو بعد میں ڈالتی ہوں میں۔ آپ نے آج پہلے کیوں پکا لیے۔ خیر اب بیٹھیے میں پھیر ہی دوں۔" سلوط اس کے ہاتھ سے کفگیر لینے کی کوشش میں بولی۔

"نہیں بھئی، میری عادتیں نہ بگاڑو۔ تمہارا تو کچھ ٹھیک نہیں کہ کب چلی جاؤ۔ بعد میں تن آسانی کی عادت

مجھے بہت تکلیف دے گی۔" فلورا نے بدستور روٹھے ہوئے انداز میں کہا۔

"اوہ! تو آنٹی میری اس بات پر مجھ سے خفا ہو گئی ہیں۔" سلوطا نے دل میں سوچا اور پھر جھینپے جھینپے انداز میں بولی۔

"وہ تو میں نے بھابی جان سے اس لیے کہہ دیا تھا تاکہ وہ آئندہ یہاں نہ آئیں۔"

"لیکن اگر وہ یہاں آگئیں تو پھر تو تم یقیناً یہاں سے چلی ہی جاؤ گی نا۔" فلورا اب چولھے کی طرف منہ کر کے پتیلی میں کفگیر چلا رہی تھی۔ اس نے ایک بار بھی گھوم کر اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ مگر یہ سوال اس نے گھوم کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ لیکن اس کے سوال کا فی الفور کوئی جواب نہ بن سکا وہ توقف کے بعد کچھ سوچ کر بولی۔

"نہیں۔ میں بھلا کہاں جاؤں گی بلکہ جا سکتی ہوں؟"

"نہیں بھئی تمہارا کوئی بھروسہ نہیں۔ بس جب تک یہاں ہو۔ آرام اور بے فکری سے رہو۔ ان کاموں کا کیا ہے۔ یہ تو زندگی کے روز مرہ میں سے ہیں۔ اور میں تو شروع ہی سے انہیں انجام دینے کی عادی ہوں۔ انہیں تم کر دیا میں انجام دوں میرے لیے ایک ہی بات ہے۔" فلورا پھر چولھے کی طرف گھوم کر پتیلی میں چمچہ چلانے لگی۔

"کمال ہے آنٹی! آپ اتنی سی بات پر اس قدر ناراض ہو گئیں۔ بھلا میں آپ کو چھوڑ کر کہیں جانے کا تصور کر سکتی ہوں۔" سلوطا اس کی خفگی سے عاجز ہو کر بولی۔

"کیوں میرے اندر کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں۔ میرا تو تم سے کوئی رشتہ ہوتا ہے نہ واقفیت۔ جب تم اپنے سگے اور خونی رشتوں کو توڑ سکتی ہو تو میری بھلا کیا بساط اور اوقات۔" فلورا نے اس کی طرف مڑتے ہوئے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔

"نہیں آنٹی! میرا آپ سے خلوص کا رشتہ ہے بے لوث چاہت کا رشتہ ہے اور سب سے بڑھ کر اسلامی رشتہ ہے جو سگے اور خونی رشتوں سے کہیں زیادہ مضبوط اور پائیدار ہوتا ہے کیونکہ یہ خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں بندھا ہوا ہوتا ہے۔" سلوطا قدرے جوشیلے انداز میں بولی۔

"ہاں! اس میں شک نہیں کہ اسلام کا رشتہ بہت مضبوط اور قریبی ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق حق باری تعالیٰ کی ذات اور حبیب پاک سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب حق و باطل کے درمیان معرکہ آرائی ہوتی تھی تو بیٹا باپ کے اور باپ بیٹے کے سامنے شمشیر زن ہوتا تھا۔"

"ہاں تو پھر اسلام کا رشتہ سگے رشتوں سے بڑھ کر ہوا نا۔" سلوطا نے جلدی سے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"ہاں، بے شک ہوتا ہے لیکن۔ اس رشتے میں ورثوں کی تقسیم نہیں رکھی گئی۔ یعنی ایک مسلمان کی جائیداد اور مال و زر کا حق اس کی زندگی یا وفات کے بعد دوسرے مسلمان کو نہیں دیا گیا بلکہ یہ رعایت یا حق سگے اور خونی رشتوں کو ہی ودیعت کیا گیا ہے۔ جیسا کہ کلام پاک میں ارشاد ہوا ہے کہ ہم پیٹ میں ہی بچے کے رشتوں کا تعین کر دیتے ہیں اور پھر نسل باپ ہی سے چلتی ہے۔ خون باپ کا ہی مانا جاتا ہے بلکہ انسان کی شناخت ہی باپ کے خون سے ہوتی ہے۔ لہٰذا تم ان رشتوں کی حقیقت سے انکار نہیں کر سکتیں۔" فلورا اسے قائل کرنے کی غرض سے بڑے ٹھوس دلائل دے کر بولی۔

"لیکن میں نے ان رشتوں کی حقیقت سے کب انکار کیا ہے آنٹی! میں نے تو یہ کہا تھا کہ میں ہر رشتہ توڑ چکی ہوں کیونکہ ہر رشتہ توڑنے کا تو مجھے کم از کم اختیار تھا۔" وہ فلورا کی باتوں سے زچ ہو کر بولی۔

"اچھا اگر تمہیں اتنا ہی اختیار ہے تو پھر اپنے جسم سے یہ گوشت بھی نوچ کر پھینک دو اور یہ خون جو تمہاری رگوں میں دوڑ رہا ہے اسے بھی نکال پھینکو کہ تمہارے دادا سے تمہارے باپ کی رگوں میں منتقل ہوا ہے۔ اور باپ سے تمہاری رگوں میں ہے۔" فلورا اسے سمجھاتے سمجھاتے تنگ آگئی تھی۔ وہ ایک دم ہی طیش میں آکر بولی۔ وہ بھی چھتا سی ہو گئی تھی۔ فلورا کے سامنے وضاحتیں پیش کر کر کے روہانسی سی ہو کر بولی۔

"میں نے آپ سے ابھی کوئی بات چھپائی ہے نہ جھوٹ ہی بولا ہے بلکہ جتنا بھی بتایا ہے۔ میرے ساتھ تو جتنا کچھ ہوا ہے اس کے عشر عشیر بھی نہیں ہے۔ پھر آپ ہی بتائیے کہ میں بھلا کس دل سے ان لوگوں کے ساتھ دوبارہ رابطہ قائم کر سکتی ہوں۔"

"خیر تم چاہو یا نہ چاہو۔ یہ رابطہ تو قائم ہی رہے گا کیوں کہ خون کے رابطے مرنے کے بعد بھی نہیں ٹوٹتے اور میں جانتی ہوں کہ تمہارے بھائی بھاوج نے تم پر زیادتیاں ہی نہیں بلکہ بڑے مظالم ڈھائے ہیں لیکن تمہاری بربادی کے ذمہ دار وہ نہیں تمہاری قسمت ہے۔ کیونکہ جوڑوں کے رشتے عرش پر طے کیے جاتے ہیں۔ اور فرش پر ان کا سنجوگ ہوتا ہے۔ وہ بھی موت کی طرح ایک معینہ وقت پر۔ تمہاری۔ تمہارے بھائی یا کسی کی بھی طاقت نہیں جو قدرت کے فیصلوں میں دخل دے۔ سو تمہارے ساتھ جو کچھ بھی ہوا وہ تمہارا مقدر تھا اور باقی جو حالات اور واقعات پیش آئے یا پیدا کیے گئے۔ ان کے ذمہ دار اور قصوروار تمہارے بھائی ہی ہیں۔ لیکن انہوں نے تم سے معافی تو مانگ لی ہے۔" فلورا نے اس کی کسی بھی تاویل یا عذر کو تسلیم نہیں کیا اور اس کو قائل کرنے کی کوشش کی۔ اب سلوطا اس سلسلے میں مزید کیا کہتی کہ وہ تو اس کی کوئی بات کوئی دلیل ماننے پر تیار ہی نظر نہ آتی تھی۔

"تمہارے بھائی جان تم سے مستفر رہے ہیں کہ اگر تمہاری بھابی تجھ سے رنجیدہ کہ باہر کار میں ان کے شوہر ان کا انتظار کر رہے ہیں۔ تو میں نے بھی کہتی وہ تمہارے باپ ہیں مگر بڑا بھائی بھی باپ کے سمان ہوتا ہے۔ اس پر بھی ان پر شاباش ہے کہ تمہارے اتنے اہانت آمیز سلوک اور باتوں کے باوجود ان کی تیوری پر بل تک نہیں آیا۔ اور وہ تم سے معافی مانگ کر گئے اور معافی تو تمہاری بھابی نے بھی مانگی تھی اور جس طرح وہ تمہاری خوشامد کر رہی تھیں۔ میں نے آج تک کسی بڑی بھابی کو نند کی منت سماجت کرتے نہیں دیکھا۔" اسے خاموش دیکھ کر فلورا نے پھر کہا۔

سلوطا نے بھائی اور بھاوج کے ساتھ بدتمیزی تو کی تھی۔ اور اس کے خیالات بھی ان کی طرف سے برے باغیانہ تھے۔ مگر دل ہی دل میں اپنے اس نارو اسلوک پر وہ پچھتا بھی رہی تھی۔ اس کا ضمیر برابر اسے ملامت کر رہا تھا۔ اب جو فلورا نے ایک طرح اس کے لتے لیے تو اسے رونا آ گیا۔ مگر فلورا نے اس کے آنسوؤں کی طرف ذرا بھی توجہ نہیں دی۔

"ارے بچی! بھائی بہن اور رشتے دار بہت بڑی نعمت ہوتے ہیں۔ ارے ہم سے پوچھو۔ ہم تو ان رشتوں کو ترس گئے ہیں۔ ہمارا سینہ چیر کر دیکھو کر وہاں کتنے گہرے زخم لگے ہیں۔ ہماری تو ساری فیملی فسادات کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔ دونوں بھائی۔ بہن اور ماں باپ کوئی بھی تو نہیں بچا تھا۔ ایک صرف میں ڈکھیا ہی سب کے غموں کا بوجھ اٹھانے کے لیے رہ گئی تھی۔ ارے مال جانے کی بات ہی کچھ اور ہی ہوتی ہے بچی! تم خواہ کہیں بھی رہو کیسی ہی حفاظت میں رہو مگر ہمیشہ خود کو غیر محفوظ ہی محسوس کرو گی۔ کیونکہ اپنوں کے ہوتے دوسروں کے سہارے زندگی گزارنے والے اپنی شناخت کھو دیتے ہیں۔ ان کی شخصیت کھوکھلی ہو کر رہ جاتی ہے۔" فلورا نے ایک اور کچوکا لگایا۔ تو وہ روتے روتے بولی۔

"تو پھر آپ ہی بتلائیے کہ میں کیا کروں۔ میرا دل ان لوگوں سے کھٹا ہو گیا ہے۔ میری طبیعت یہ گوارا نہیں کرتی کہ پھر ان لوگوں کے پاس واپس لوٹ جاؤں۔ اور اب تو اس کی بھی گنجائش نہیں رہی۔ رات کے سلوک کے بعد تو میں خود بھی ان دونوں کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی۔" اپنی بات پوری بے بسی سے کہہ کر وہ پھر رونے لگی۔ فلورا کو اس پر ترس آ گیا۔ اس نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

"واہ کیوں قابل نہیں رہیں۔ تمہارے بھائی بڑے شریف اور ٹھنڈے مزاج کے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی حلیمی کا اس سے اندازہ لگا لو کہ تمہارے اتنے اہانت آمیز رویے اور گفتگو کے باوجود بھی کہ جسے سن کر میں خود پر قابو نہ رکھ سکی۔ انہوں نے نہ صرف اپنی زیادتیوں کا اعتراف کیا بلکہ تم سے معافی بھی مانگ لی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہیں فوراً معاف کر دیں گے۔" تو اس نے اپنے آنسو پونچھ کر کہا۔

"لیکن میں تو ہرگز ان سے معافی نہیں مانگوں گی کیونکہ لڑکپن سے لے کر اب تک ہمیشہ سب کے سامنے ہی خود کو جھکایا ہے۔ میں ہی سب کی کڑوی کسیلی نہایت صبر و سکون سے برداشت کرتی آئی ہوں لیکن اب میرے

اندر برداشت کا مادّہ ختم ہو چکا ہے۔ ہاں البتہ ــ" سلوطہ کچھ کہتے کہتے رکی تو فلورا نے فوراً ہی پوچھا۔
"ہاں، ہاں کہو۔"
"البتہ اگر بھائی جان نے مجھے اپنے ساتھ لے جانے پر اصرار کیا تو شاید چلی ہی جاؤں۔" آخری فقرہ سلوطہ نے دبی دبی زبان سے کہا۔
"یہ شاید کیوں کہا تم نے ــ بس چلی ہی جانا کیونکہ اسی میں تمہارے لیے بہتری ہے۔ لیکن اب تمہیں اس وقت کا انتظار کرنا پڑے گا، جب تمہارے بھائی ادھر کا رخ کریں گے۔"
فلورا کی باتوں سے سلوطہ یہی سمجھی کہ وہ اسے اپنے گھر میں رکھنا نہیں چاہ رہی۔ وہ چپ سی ہو کر یہی سوچنے لگی کہ بھلا تو اب شاید ہی ادھر کا رخ کریں۔ پھر وہ یہاں سے بھلا کہاں جائے گی۔
"غلط باتوں کو دل میں جگہ نہ دو مونا! مجھے تمہاری بہتری اپنے گھر سے زیادہ عزیز ہے۔ ورنہ تمہارے آجانے کی وجہ سے دوسرا بیٹ تو نصیب ہوئی۔ میں نے تمہیں اپنی بہن بنا یا ہے۔ حتیٰ کہ تمہارا نام بھی تبدیل کر دیا ہے۔ پھر بھی میں دل سے یہی چاہتی ہوں کہ تم اپنے بھائی کے پاس چلی جاؤ ــ او ہو ــ آج تو بڑی دیر ہو گئی۔ اچھا چلو جلدی سے کچن میں میرا کھانا رکھ دو۔ اور ہاں تم بھی ناشتہ کر لو۔ میں تو اب دوپہر کو ہی کھانا کھاؤں گی۔ لو میں نے تو ابھی تک کپڑے بھی نہیں بدلے۔" فلورا کو باتیں کرتے کرتے ایک دم ہی وقت گزر جانے کا خیال آیا تو وہ اسے ہدایتیں دیتی اسی دم کپڑے بدلنے اندر چلی گئی۔ اور سلوطہ کچن کھنگال کر جلد ہی سے اس میں قیمہ بھرنے لگی۔

پورا راستہ یعنی مارٹن روڈ سے کلینک تک کا فاصلہ جس خاموشی سے طے ہوا تھا۔ فاخرہ کو وحشت سی ہونے لگی تھی۔ حالانکہ وہ خود بھی بہت خاموش طبع تھی۔ اور ان کے شوہر بھی جو ضرورتاً ہی بات کرنے کے عادی تھے مگر پچھلے دو ورز سے بہت چہک رہے تھے۔
اصل میں۔ جیسا کہ کار میں احتشام کے گھر تک پہنچنے کے درمیانی وقفے میں طے پایا تھا کہ اسفند اور ثاقب حسن دوپہر کی فلائٹ سے لاہور روانہ ہو جائیں گے اور پھر ان کے بعد اپنا ضروری سامان پیک کر کے پھر فاخرہ بیگم شام کی فلائٹ سے لاہور روانہ ہو جائیں گی اس کوشش کے باوجود یہ طے شدہ پروگرام فیل ہو گیا تھا کیونکہ ــ اوّل تو دوپہر کی فلائٹ کے بجائے لاہور کے لیے شام کی فلائٹ مل سکی تھی۔ دوسرے لاہور پہنچنے کے بعد گھر کا سامان سمیٹنے اور پیکنگ کرنے میں اگلا آدھا دن ہی صرف ہو گیا تھا۔ کیونکہ فاخرہ نے گھر میں صرف چار پائیاں ہی چھوڑی تھیں ــ باقی کا کچھ کباڑ اور غیر استعمالی ہے کار سا سامان محلے کے غرباء میں بانٹ دیا تھا۔ اس پر ثاقب حسن کو بینک سے کچھ رقم بھی نکلوانی تھی اور کچھ لوگوں کے جو واجبات تھے وہ بھی ادا کرنے تھے۔ یوں تو فاخرہ بیگم کے تقریباً تمام زیورات ہی حالات کی نذر ہو گئے تھے۔ لیکن جو کچھ باقی رہ گئے تھے۔ وہ انہوں نے ان زیورات کے ساتھ جو سلوطہ کو دُلہن نے واپس کیے تھے بینک کے لاکر میں رکھوا دیے تھے۔ انہیں بھی لاکر سے نکلوانا ضروری تھا۔ اس لیے دونوں میاں بیوی اسفند کے ساتھ ہی گھر سے نکلے تھے اور دونوں کو بینک میں چھوڑ کر اسفند ہوائی جہاز کی سیٹیں بک کرانے چلا گیا تھا۔
یوں تو یہ تینوں اگلے دن سہ پہر کو ہی کراچی پہنچ گئے تھے مگر رہائش کا مسئلہ چونکہ طے نہیں پایا تھا۔ حالانکہ اسفند نے تو کتنا اصرار بھی کیا تھا کہ پھوپھا پھوپھی اس کے گھر میں ٹھہریں۔ لیکن ثاقب حسن کسی طرح آمادہ ہی نہ ہوئے تھے۔ خود فاخرہ بھی بھائی بھاوج بلکہ سہیل منصور سے بھی کچھ اسی درجے کبیدہ ہو گئی تھیں کہ وہ بھی میاں کی ہم زبان ہو گئی تھیں۔ اس پر چونکہ جب تک مکان کا مسئلہ حل نہ ہو جاتا۔ ہوٹل میں ہی قیام کرنا پڑتا اور ثاقب حسن کسی بہت ہی فائیو اسٹار قسم کے بہت ہی عمدہ اور مہنگے ہوٹل میں قیام کرنے کے حق میں نہ تھے۔ اسی لیے انہوں نے ایک تھری اسٹار کے نسبتاً سستے مگر اچھے ہوٹل میں قیام کرنے کو ترجیح دی ــ جبکہ اسفند تو یہی چاہ رہا تھا کہ کسی عمدہ اور فائیو اسٹار ہوٹل میں وہ دس بارہ روز قیام کر سکے گیا تھا۔ وہیں پھوپھا اور پھوپھی کے لیے بھی ایک سوٹ بک کرا دے اور ان کے ہوٹل کے اخراجات وہ خود اٹھائے لیکن ثاقب حسن نے کسی طرح یہ گوارا ہی نہیں کیا۔
بہرکیف، ایک مقامی میگزین کے ذریعے ہوٹل کا چناؤ کرنے کے بعد کمرہ بک کرانے اور کمرے پر قبضہ جمانے

میں شام ہو گئی اور ادھر ثاقب حسن نے جب سے کراچی ایئرپورٹ پر قدم رکھا تھا۔ مسلسل سلوطہ کے نام کی مالا جپ رہے تھے۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ایئرپورٹ سے سیدھے اس کے پاس پہنچ جائیں مگر اصل مسئلہ کلینک تلاش کر کے فلورا تک رسائی حاصل کرنے کا تھا اور ہوٹل کے کمرے میں آتے ہی ثاقب حسن نے سلوطہ کے پاس جانے کی جو رٹ لگائی تھی تو اسفند نے بھی انہیں بہت سمجھایا تھا کہ اس کام کو اب وہ آئندہ روز پر چھوڑ دیں۔ اس وقت تو شام ہو گئی ہے۔ کلینک کو کھلا ہوا ہوگا مگر اس وقت وہاں جانا کسی طور پر مناسب نہیں لیکن ثاقب حسن کا کہنا تھا کہ وہ آج کا کام کل پر چھوڑنے کے عادی نہیں۔ دین (Then) اور دیر (There) کے قائل ہیں۔ اصل میں انہیں یہ خدشہ لاحق تھا کہ کہیں پیرا ــ فلورا کو فون کر کے ڈرا دھمکا نہ دے اور وہ سلوطہ کو کہیں اور نہ بھجوا دے۔
بہرحال، ثاقب حسن کی ضد کے پیشِ نظر اسفند انہیں کار میں جو اس نے اپنے ایک واقف کار ڈیلر کے پاس رکھوا دی تھی۔ کوئی ساڑھے سات بجے کے قریب فاخرہ بیگم سمیت کلینک کا رخ کیا جسے ڈھونڈنے میں کم و بیش آدھا گھنٹہ صرف ہو گیا اور جب وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر فلورا کچھ دیر قبل ہی اپنی ڈیوٹی انجام دے کر اپنے گھر جا چکی ہے۔ تب اسی کلینک کی کئی نرسوں سے اس کے گھر کا پتا دریافت کیا مگر سب نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ حسنِ اتفاق سے وہ ڈاکٹر آ گیا جو یہ کلینک چلا رہا تھا۔ اس نے فلورا کا پتا بتایا۔
اسی تگ و دو میں رات کے ساڑھے آٹھ بج گئے تھے۔ ثاقب حسن نے اسی وقت جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو اسفند جوان کے ساتھ وہاں جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے فاخرہ کو آہستہ سے بتایا کہ وہ اس وقت ان دونوں کے ساتھ فلورا کے گھر جانا مناسب نہیں سمجھتا لیکن اگر پھوپھا ــ جانے کا تہیہ ہی کر چکے ہیں تو پھر وہ کہیں راستے میں ہی اتر جائے گا مگر مسئلہ تو کار ڈرائیو کرنے کا ہے اور اسی وقت تو کوئی ایسا ریڈی میڈ ڈرائیور بھی نہیں ملے گا تو فاخرہ بولیں۔
"اے لو ــ تو کیا تمہارے خیال میں تمہارے پھوپھا جان کو کار چلانی نہیں آتی۔ ارے وہ تو ایکسپرٹ ہیں ایکسپرٹ۔ اب کچھ نہیں ہیں مگر جب کچھ تھے تو ان کے پاس پانچ پانچ کاریاں تھیں پانچ پانچ؟"
"پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں رہا۔ میں اپنے ہوٹل پر اتر جاؤں گا اور پھوپھا جان خود کار ڈرائیو کریں گے۔" اسفند بولا اور پھر راستے میں ہی اتر گیا لیکن اترنے سے پہلے اس نے انہیں مارٹن روڈ کا راستہ اور محل وقوع ضرور بتا دیا تھا۔ یوں تو شہر کراچی میں کسی کا گھر ڈھونڈنے کا مسئلہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے صدیوں سے مدفون کوئی خزانہ ڈھونڈنا کہ اس میں بھی متلاشی کے ہاتھ میں خزانے کا نقشہ ہوتا ہے اور یہاں بھی ڈھونڈنے والے کے ہاتھ میں گھر کا پتا ہوتا ہے اور وہاں کا پتا پاس ہوتا ہے تو انسان اس علاقے کی حدود میں بھی پہنچ جاتا ہے حتیٰ کہ محلے میں بھی۔ گھر کے بہت قریب یا آس پاس ــ اس کے باوجود بھی اہلِ محلہ اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں۔
اور اگر شامتِ اعمال راستے میں کسی راہ گیر یا دکاندار سے پتا پوچھا جائے تو وہ کہتا ہے کہ یہ جو سامنے مین روڈ جا رہی ہے اس کے سرے سرے پر چلے جائیں اور وہاں سے بائیں یا دائیں فلاں سڑک پر مڑ جائیں۔ بس تھوڑا آگے جا کر آپ کو اپنی مطلوبہ جگہ مل جائے گی ــ اور اب جو اس مین روڈ پر چلے تو وہ شیطان کی آنت کی طرح کھنچ کر اتنی لمبی ہو جاتی ہے کہ کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آتی اور جب ناک کی سیدھ میں چلتے چلتے اس سڑک کے سرے پر پہنچتے ہیں تو دائیں یا بائیں پھر وہی لمبی سڑکوں کا جال ــ قسمت سے ہی کسی کو صحیح پتے پر پہنچنا نصیب ہوتا ہے۔
مگر اسفند جیل کے سرے پر شہید ملّت کا جو آخری راؤنڈ اباؤٹ تھا وہیں انہیں چھوڑ کر کار سے اترا تھا اور اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ جیل کی چار دیواری سے آخری سرے کے مقابل میں جو کوارٹر بنے ہوئے ہیں وہ مارٹن روڈ کے ہی ہیں۔ اور آپ وہاں سے کوارٹروں کے نمبر شمار کرتے ہوئے جلد ہی منزلِ مقصود پر پہنچ جائیں گے۔ حالانکہ ثاقب حسن اس بات پر سخت چڑ رہے تھے کہ اسفند کو ان کے ساتھ جانے میں کیا عار ہے مگر انہوں نے کچھ کہا نہیں۔ ان کی طلب صادق تھی۔ اور دل کو لگی ہوئی تھی۔ اس لیے فلورا کا پتا تلاش کرنے میں انہیں دقت نہیں اٹھانی پڑی۔ جب کہ کوارٹروں کے درمیان تنگ تنگ گلیوں کا وہاں بھی ایک جال سا بچھا تھا۔ ورنہ انہیں کافی اندر جانا پڑتا تھا مگر نمبر پڑھتے ہوئے، بلکہ نمبروں کی ترتیب کے مطابق چل رہے تھے اس لیے کچھ ہی دیر بعد انہیں فلورا کے گھر کا نمبر مل گیا تھا۔ اس لیے انہوں نے پہلے فاخرہ کو بھیج دیا تھا

تاکہ اگر کسی غلطی کو ادریہ پر آ گئے ہوں تو ایسے نا وقت ایک خاتون کو دروازے پر کھڑا دیکھ کر کوئی اعتراض نہ کرسکے۔

بہر حال یہ ان کی اپنی کوئی مصلحت تھی گو بیٹھے تو صحیح جگہ پر تھے۔ ناخرہ نے دستک دینے پر دروازہ کھول دیا گیا تھا اور وہ اندر چلی گئی تھی۔ اسی سے انہوں نے اندازہ لگا لیا تھا آرزو ٹھیک پتے پر پہنچے ہیں۔ مگر اس کے بعد جو کچھ ہوا تھا۔ وہ فاخرہ کے سامنے ہی ہوا تھا۔ ان کے دل، جذبات اور احساسات پر جو بھی گزری تھی۔ اس سے بھی فاخرہ لاعلم نہیں تھیں۔ بچے بچارے غلیزا کے گھر کا رخ کرنے کے دوران راستے میں کیسے کیسے منصوبے بناتے رہے تھے۔

”بس اب ہم تین چار روز کے اندر اندر ہی یہاں کے کسی معزز علاقے میں ایک مکان خرید لیں گے۔ کیونکہ جوان بیٹی کا زیادہ عرصہ ہوٹل میں رہنا ٹھیک نہیں۔ اب یہ تو اسفند میاں ہی جانتے ہوں گے کہ ہمارے قیام کے لیے یہاں کا کون سا علاقہ موزوں رہے گا۔“

”یہاں کراچی میں کوئی بھی علاقہ کسی خاص طبقے کے لیے مختص نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے جن علاقوں میں شرفا اور معزز رہتے ہیں یا جو علاقے معزز کہلائے جاتے ہیں۔ ان میں بھی اچھے اور برے ہر قسم کے لوگ رہتے ہیں۔ اصل میں ان علاقوں کی بیشتر آبادی نو دولتیوں پر مشتمل ہے جن میں اچھے ظرف کے لوگ بھی ہوتے ہیں اور ہلکے ظرف کے بھی۔“ اسفند نے کہا۔

”خیر خیر۔ ایسی صورت حال تو تقریباً پاکستان کے ہر بڑے شہر میں ہے۔ لیکن ہم کسی ایسے علاقے میں مکان خریدنا چاہتے ہیں جو کسی معزز علاقے اور شہر کے وسط میں ہو مگر بہت گنجان نہ ہو اور اب مکان کی خریداری کا معاملہ ہم آپ پر چھوڑتے ہیں۔“ ثاقب حسن نے کہا تو اسفند جلدی سے بولا۔

”لیکن پھوپھا جان! میں تو اس فیلڈ میں بالکل کورا ہوں۔ مجھے مکانات وغیرہ کی خرید و فروخت کا بالکل تجربہ نہیں البتہ کراچی میں سینکڑوں اسٹیٹ ایجنسیاں ہیں۔ گو میں کسی سے واقف تو نہیں مگر کسی اسٹیٹ بروکر سے آپ کو ملوا دوں گا۔“

”ارے بھئی نہیں۔ کسی بروکر کے ذریعے مکان خریدنا ہمیں بالکل گوارا نہیں۔ ایک تو یہ بروکر قسم کے لوگ ہمیشہ اپنے فائدے کو مدنظر رکھتے ہیں۔ دوسرے کمیشن بھی بہت زیادہ لیتے ہیں۔ اب نامعلوم یہاں مکانات وغیرہ کی کمیشن کی شرح کیا ہو۔ ظاہر ہے پاکستان کا سب سے بڑا شہر ہے خود اپنی ذات میں چھوٹا پاکستان۔“

”اوہو! یہ بھی مشکل ہے کہ جیسا دیس ویسا بھیس۔ اب یہاں آئے ہیں تو یہیں کے اصولوں اور قاعدوں پر چلنا پڑے گا۔ پہلے یہ دعا کیجیے کہ خدا کرے رضیا مل ہی جائیں۔“ فاخرہ نے ان کی بے موقع گفتگو سے اکتا کر کہا۔

”ارے ملیں گی کیوں نہیں۔ بھلا ہم نسلتے صادق جذبے، ارمان اور آرزوئیں لے کر ان سے ملنے جا رہے ہیں۔ ان کے نہ ملنے کا کیا سوال۔“ ثاقب حسن جذباتی ہو کر بولے تھے مگر اب واپسی میں سلوط! اگرچہ مل بھی گئیں۔ تو اس نے ان کے سارے صادق جذبوں، ارمانوں اور آرزوؤں پر اپنے بے مہر اور گستاخانہ رویے سے پانی پھیر دیا تھا۔ ساری خوشی، سارے صادق جذبے، سارے ارمان اور آرزوئیں سب کچھ پامال ہو گئے تھے۔ فاخرہ کو شدت سے احساس تھا کہ اس کے شوہر کے دل، جذبات اور احساسات کا کیا عالم رہا ہوگا۔

ٹن ٹن ٹن۔ فون کی گھنٹی ایک تسلسل سے بج رہی تھی۔ رات کے ساڑھے گیارہ بج چکے تھے اور زینت اور شعیب منصور کچھ دیر قبل ہی تھک ہار کر اپنے بستر پر لیٹے تھے۔ اصل میں شعیب منصور نے چند کاروباری اہم ہستیوں کو ڈنر دیا تھا۔ سارا دن زینت گھر کی سیٹنگ اور کھانا پکانے میں لگی رہی تھیں۔ اس لیے تھک کر چور ہو رہی تھیں۔ ان کے سر میں درد بھی ہو رہا تھا۔ وہ ابھی سوئی نہیں تھیں۔ مگر گھنٹی کی سمت بھی نہیں ہو رہی تھی۔ وہ چاہ رہی تھیں کہ شعیب منصور خود اٹھ کر فون ریسیو کریں۔ اور فون بھی اسی وجہ سے سرہانے سے اٹھا کر کمرے کے دوسرے کونے میں رکھوا دیا تھا کہ رات بے رات ایک تو وہ ویسے ہی اٹھتے تو نیند میں خلل واقع نہ ہو کیونکہ اکثر و بیشتر رات میں آنے والی کالیں رانگ نمبر ہی ہوتی تھیں۔ لہٰذا زینت شوہر کے اٹھنے کے انتظار میں ہی پڑی رہیں مگر جب کال بیچ میں سے کٹ کر پھر فون کی گھنٹی بجنی شروع ہوئی تو طوعاً و کرہاً زینت ہی کو اٹھ کر فون ریسیو کرنا پڑا۔

”ہیلو! کون بول رہا ہے؟“ انہوں نے جھنجلائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”کیا آپ شعیب منصور صاحب کے گھر سے بول رہی ہیں؟“ ادھر سے فاخرہ نے پوچھا۔

”جی ہاں میں بیگم شعیب بول رہی ہوں۔ مگر آپ کی تعریف؟“ انہوں نے قدرے ترش لہجے میں پوچھا۔

”اوہو آپ ہیں۔ کیا آپ بھابی جان! ذرا منجھلے ابا کو تو بلا دیں۔“ فاخرہ نے کہا تو کچھ دیر کو تو جیسے زینت کو سانپ سونگھ گیا۔ پھر وہ ریسیور ہاتھ میں تھامے اس کا تار کھینچتی قدم بڑھاتی بیڈ کے قریب آ گئیں اور ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے دوسرے بازو سے شعیب منصور کا بازو ہلا کر آہستہ سے بولیں۔

”سنیے، شعیب! شاید فاخرہ بی کا فون ہے۔“ اور شعیب منصور جو جاگ رہے تھے لیٹے لیٹے ہی بولے۔

”شاید سے آپ کا کیا مطلب ہے۔ کیا آپ نے ان سے پوچھا نہیں یا آپ انہیں پہچانی نہیں؟“

”اوہو۔ اگر پہچانی نہیں تو کیا دل سے گھبرا کر کہہ رہی ہوں۔ وہی ہیں اور آپ سے بات کرنا چاہ رہی ہیں۔“ زینت

سے قدرے جھلا کر کہا۔

"اوہ۔ خدا خیر کرے رات کے پونے بارہ بجے فاخرہ بی نے مجھے کیوں فون کیا ہے۔ اچھا لائیے ریسیور مجھے دیجیے۔" شعیب منصور گھبرا کر بیٹھتے ہوئے بولے۔ زینت نے کونے میں رکھا فون ان کے سرہانے لا کر رکھا اور پھر ریسیور ان کے ہاتھ میں دے دیا۔

"ہیلو۔ شعیب اسپیکنگ۔" شعیب منصور نے ریسیور کان سے لگا کر کہا۔

"اوہو۔ آداب عرض منجھلے ابا۔ شکر ہے آپ نے بات تو کی۔ ورنہ بھابی جان تو میری آواز سن کر ایسی خاموش ہوئی تھیں کہ میں سمجھی میری یہ کال ہی ضائع جائے گی۔" فاخرہ نے چہکتے سے لہجے میں کہا۔

"نہیں نہیں اصل میں تمہاری بھابی جان اتنے ناوقت اور غیر متوقع تمہاری آواز سن کر حیرت میں غوطے کھانے لگی تھیں۔ خیر تم بتاؤ کہاں سے بول رہی ہو۔ باہر کہیں سے یا لاہور سے۔" شعیب منصور نے پوچھا۔

"نہیں میں باہر کہیں سے بول رہی ہوں نہ لاہور سے بلکہ آپ کے شہر کراچی سے ہی بول رہی ہوں۔" فاخرہ نے بتایا تو شعیب منصور ان کی کراچی میں موجودگی کا سن کر اچھل سے پڑے۔

"اچھا۔" انہوں نے اچھا کو بہت چبا کر کہا۔

"مگر کراچی پہنچ گئی ہو تو یہ تو بتاؤ کہ اس وقت کہاں ہو۔ اسٹیشن پر یا ایئرپورٹ پر۔ تاکہ میں تمہیں اپنی کار بھیج دوں۔"

"نہیں بڑی نوازش منجھلے ابا۔ کار بھیجنے کی زحمت نہ کریں کیونکہ ہم دونوں یہاں ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔" فاخرہ نے مزید ایک چونکا دینے والا انکشاف کیا تو شعیب منصور کچھ پریشان سے ہو گئے۔

"کمال ہے ہوٹل میں کیوں ٹھہریں کیا میرے گھر کا پتا یاد نہیں رہا تھا یا پھر میرے یہاں ٹھہرنا گوارا نہیں کیا تھا۔ اس قدر غیریت برتنے کی کیا ضرورت تھی بھئی۔ خیر یہ بتاؤ کہ کس ہوٹل میں قیام ہے تمہارا۔" شعیب منصور نے گلہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہوٹل کا نام تو مجھے معلوم نہیں منجھلے ابا البتہ اتنا ضرور معلوم ہے کہ یہ ہوٹل کینٹ اسٹیشن کے علاقے میں ہی واقع ہے۔" فاخرہ کی بات سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ہوٹل کا نام نہیں بتانا چاہ رہیں۔

"تعجب ہے تمہیں ہوٹل کا نام تک معلوم نہیں۔ یہ کہو کہ تم بتانا نہیں چاہ رہیں۔" شعیب منصور برا مان جانے کے سے انداز میں بولے۔

"لیکن منجھلے ابا ہوٹل کا نام معلوم کر کے آپ کیا کریں گے۔ جبکہ۔" تو شعیب منصور ان کی بات کاٹ کر بولے۔

"واہ یہ بھی تم نے خوب کہا کہ کیا کریں گے معلوم کر کے۔ ارے بھئی میں تمہارا پتا معلوم کر کے کم از کم تمہیں لینے تو آ جاؤں گا۔ کیونکہ میں تو یہ گوارا ہی نہیں کر سکتا کہ اپنا گھر ہوتے ہوئے تم ہوٹل میں قیام کرو۔"

"لیکن ہمارے نزدیک یہاں یا آپ کے یہاں رہنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا منجھلے ابا۔ آپ تو یہ بتائیے کہ سب خیریت سے تو ہیں نا اور وہ ہماری بٹیا کیسی ہیں۔" فاخرہ نے اپنے پتے کی بات گول کر کے سب کی خیریت پوچھنے کے ساتھ ساتھ سلوط کا حال احوال پوچھا تو شعیب منصور سمجھے کہ وہ نازپرور کی خیریت پوچھ رہی ہیں۔ خوش ہو کر بولے۔

"بس خدا کے فضل سے بڑے مزے میں ہیں۔ بچہ بھی بڑا صحت مند اور پیارا پیارا سا ہے ان کا۔ اور تمہیں بہت یاد کرتی ہیں۔ عرصہ بھی تو ہو گیا تم سے ملے۔"

"ہاں خدا سب کو خوش ہی رکھے۔ لیکن میں سلوط کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ تین ماہ کا کہہ کر گئے تھے مگر ڈیڑھ سال کا عرصہ لگ گیا واپسی میں۔ بیچاری بچی تو ہمیں رو پیٹ کر بیٹھ گئی — ہو گی۔" شعیب منصور تو فاخرہ کی آواز سن کر ہی سمجھ گئے تھے کہ اب وہ سلوط کو ضرور پوچھیں گی۔ اور وہی ہوا بھی۔ انہوں نے سٹپٹا کر زینت کی طرف دیکھا جو نہایت بیزاری کے عالم میں ان کے قریب ہی بیٹھی آنکھوں کو پٹپٹا کر اور جمائیاں لے کر اپنی نیند اور تھکن کا اظہار کر رہی تھیں۔ شعیب منصور نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے ان سے کہا۔

"سلوط کو پوچھ رہی ہے۔ اب میں ان سے کیا کہوں۔" اور زینت بیگم کے کان ان کی گفتگو پر لگے ہوئے تھے۔ وہ شوہر کی شکل دیکھتی رہ گئیں۔ کہتیں بھی کیا۔ فاخرہ کی آواز سن کر تو خود ان کی سٹی گم ہو گئی تھی۔

"ہیلو۔ ہیلو۔ منجھلے ابا۔ اپنے سوال کے جواب میں — بھائی کو خاموش دیکھ کر فاخرہ نے ہیلو ہیلو کیا تو شعیب منصور جلدی سے بولے۔

"ہاں ہاں ہیلو۔ سلوط بھی بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔"

"اچھا تو ذرا اس کو بلا دیجیے تو۔ کم از کم میں اپنی یہاں موجودگی کی خوشخبری تو اسے سنا دوں۔" فاخرہ نے بڑا اشتیاق دکھاتے ہوئے کہا۔ اور ان کی اس بات پر شعیب منصور بالکل ہی بوکھلا گئے۔ تھوک نگل کر بولے۔

"سلوط کو اس وقت بلواؤں۔ وقت بھی معلوم ہے کہ کیا ہو رہا ہے۔ بارہ بج چکے ہیں بارہ۔ اور اس وقت وہ اپنے کمرے میں پڑی گہری نیند سو رہی ہیں۔ بھلا ان کی نیند میں خلل ڈالنا بھی کوئی معقولیت ہو گی۔"

"نہیں منجھلے ابا اب اس کی نیند میں خلل پڑے یا وہ بے آرام ہو۔ آپ اسے بلوا ہی دیجیے۔ مجھے اس سے ایک بہت ہی اہم بات بھی پوچھنی ہے۔" فاخرہ نے چٹیلے سے لہجے میں کہا تو شعیب منصور پھر ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر بیوی سے بولے

"دیکھیے اب تو آ ہی گئی ہماری شامت۔ فاخرہ بی سلوط سے فون پر بات کرنا چاہ رہی ہیں۔"

"تو پھر میں کیا کروں میری تو خود بھی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" زینت بیزاری سے بولیں۔

"ارے بھئی تو ایسی جلدی کیا ہے۔ کوئی اہم بات بھی کرنی ہے تو کل — یہاں آ کر کر لینا۔ اس وقت آدھی رات کو یہ بچوں کی سی ضد کر کے کیوں خواہ مخواہ اس غریب کو پریشان کرنا چاہ رہی ہو۔" شعیب منصور نے زینت کی پوری بات بھی نہیں سنی اور خود ہی بات بنا دی۔

"منجھلے ابا۔ کم از کم میں تو آپ کو ایسا نہیں سمجھتی تھی جیسے کہ آپ نظر آ رہے ہیں۔ مجھے تو آپ کی غلط بیانی پر افسوس ہی نہیں ہو رہا بلکہ رونا بھی آ رہا ہے۔" فاخرہ نے ایک دم ہی پینترہ بدل کر کہا۔ تو جواب میں کچھ دیر کے لیے شعیب منصور بغلیں جھانکنے لگے۔ اصل میں تو ان کی سمجھ میں ہی نہیں آیا تھا کہ فاخرہ سلوط کی گمشدگی کو جتا رہی ہیں یا پھر اس کو نہ بلوانے پر طنز کر رہی ہیں۔ وہ ہکلا کر بولے۔

"تم — میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔ آخر تم کہنا کیا چاہ رہی ہو۔"

"میں کیا کہنا چاہوں گی منجھلے ابا۔ آپ نے تو مجھے کسی قابل ہی نہیں رکھا۔ بڑے مان سے آپ پر بھروسا کر کے بلکہ امانتاً اس بچی کو آپ کے پاس بھیجا تھا۔ اور خط میں بھی پوری تفصیل سے آپ کو اپنے حالات سے آگاہ کر دیا تھا۔ یہ تک لکھ دیا تھا کہ انڈیا سے واپسی پر آپ کا سارا حساب چکا دوں گی۔ اس کے باوجود بھی آپ نے اسے بوجھ کہا۔ اور اسے گھر سے نکال باہر کیا۔ کیا کہا تھا آخر آپ لوگوں نے اسے لاوارث یا زر خرید۔"

"ارے ارے ذرا مجھے بھی تو کچھ کہنے کا موقع دو۔ میں تو خود تم سے اس قدر شرمندہ ہوں کہ تمہیں اپنی شکل دکھانے کی بھی ہمت نہیں رکھتا۔" شعیب منصور نے بہن کی بات کاٹ کر گویا اپنی صفائی میں کہنا چاہا۔ مگر فاخرہ تیز لہجے میں بولیں۔

"چھوڑیں منجھلے ابا۔ شرمندگی ورمندگی کو۔ سلوط کی گمشدگی اتنی معمولی بات نہیں کہ صرف شرمندگی کا اظہار کرتے سے ٹل جائے بلکہ یہ تو اس کی عزت اور جان کا معاملہ ہے۔ آپ نے اسے گھر سے نکالتے وقت یہ نہیں سوچا کہ آخر وہ جائے گی تو کہاں جائے گی۔ اور کچھ نہیں تو اپنے مرحوم بھائی کا ہی لحاظ کر لیا ہوتا۔ وہ تو کسی طرح قابو میں ہی نہیں آ رہے۔ میری تو جان مٹھی میں کر رکھی ہے انہوں نے مگر کچھ غلط تو نہیں کر رکھی۔ بھلا غضب خدا کا ان کی جوان بچی کو آپ نے کہیں غائب کرا دیا تو پھر وہ اپنا سارا غصہ مجھ پر ہی گرائیں گے آپ پر تو نہیں۔ آپ تو بڑی آسانی سے شرمندگی کا اظہار کر کے بری الذمہ ہو گئے۔" بہن کی کھری کھری سنانے پر شعیب منصور خفیف سے ہو کر بولے۔

"ہاں ہاں تم ہر بات کہنے میں حق بجانب ہو بیٹو مگر خدا گواہ ہے کہ میں نے سلوط کو کبھی اپنی بیٹیوں سے کم نہیں سمجھا۔ اور مجھے تو اطلاع یہ خبر نہ تھی کہ وہ کب گھر سے گئی تھی۔ وہ تو دوسرے دن صبح تمہاری بھابی جان کی زبانی ہی علم ہوا تھا کہ وہ گزشتہ رات سے غائب ہے۔"

"کیوں کیا آپ راتوں کو گھر سے غائب رہتے ہیں جو آپ کو صبح کو معلوم ہوا تھا وہ بھی بھابی جان کی زبانی۔ منجھلے ابا تعجب ہے اس عمر میں آپ اس قدر غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں۔"

"نہیں بھئی غلط بیانی کیسی۔ جبکہ۔"

"غلط بیانی ایسی کہ ابھی کچھ دیر پہلے جب میں نے آپ سے سلوطہ کے بارے میں پوچھا تھا تو آپ مجھے حقیقت سے آگاہ کرنے کے بجائے اوپر ڈرامہ پکڑ کے رہے یا دوسرے معنوں میں مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کرتے رہے کیا یہ غلط بیانی نہیں ہوئی۔" فاخرہ نے حد درجے صاف گوئی سے کام لے کر گویا بھائی کو قائل ہی نہیں شرمندہ کرنے کی غرض سے کہا۔

"ارے نہیں منو غلط بیانی کیسی۔ اصل میں میرا ہوا ؤ ہی نہیں پڑ رہا تھا تمہیں اصل بات بتانے کا۔ بھلا تم ہی بتاؤ تم سے کیسے یہ کہہ دیتا کہ۔"

"جی ہاں جی ہاں واقعی بہت مشکل کام ہوتا ہے سچ بولنا۔ ہواؤ کیسے پڑ سکتا تھا۔ جبکہ آپ نے خود ہی اس غریب کو دھکے دے کر گھر سے نکالا ہے۔ ورنہ اتنا تو میں بھی جانتی ہوں کہ آپ کے سامنے کسی کی مجال نہیں ہو سکتی تھی ٹیڑھی نظر سے اس کی طرف دیکھنے کی گھر سے نکالنا تو بڑی بات۔"

"اف وہ۔ اب میں تمہیں کس طرح یقین دلاؤں منو۔ بس حلف اٹھانے کی کسر رہ گئی ہے تو میں حلفیہ بھی کہتا ہوں کہ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ کب اور کس وقت یہاں سے گئی تھی تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ میں صبح کا گیا شام کو گھر آتا ہوں۔ یہ تمہاری بھابی جان ہی گھر میں رہتی ہیں۔ مگر انہیں بھی اگلے روز صبح کو ہی۔"

"ہاں تو آپ کو گھریلو امور سے کوئی دلچسپی ہے نہ کسی بات کی پرواہ۔ اور آپ کی اسی غفلت سے فائدہ اٹھا کر بھابی جان نے میری ساری کسر اس غریب سے نکالی ہوگی۔ یہ سارا کیا دھرا اصل میں انہی کا ہے۔"

"نہیں نہیں یہ محض تمہارا خیال ہے۔ ورنہ انہیں تم سے ایسی کیا مخاصمت تھی جو وہ تمہاری ساری کسر اس غریب سے نکالتیں۔" شعیب منصور نے بیوی کی طرف سے ان کا دل صاف کرنا چاہا۔

"اے بس منجھلے اکا۔ اب میرا منہ نہ کھلوائیے۔ بھابی جان نے تو ہمیشہ اور ہر معاملے میں میری کاٹ ہی کی ہے۔ آپ کے سامنے وہ ضرور بھیگی بلی بنی رہتی ہیں مگر دوسرے کے سامنے جو میرے لیے زہر اگلتی ہیں وہ سب مجھ تک ضرور پہنچ جاتا ہے۔ اور تو اور میری برائی کرنے میں میرے میاں کو بھی نہیں بخشا انہوں نے۔ جب بھی انہیں میرے میاں سے بات کرنے کا موقع ملا ہمیشہ انہیں یہی مشورہ دیا کہ عقد ثانی کر لیں۔ تاکہ آپ کا بھی کوئی وارث پیدا ہو جائے جو آپ کی نسل بھی چلا سکے اور آپ کی جائیداد کو بھی بچا سکے۔ جبکہ جائیداد کے نام کی ایک اینٹ بھی نہیں ہے حسن کے پاس۔ مگر وہی جس میں چنگاری ڈالنا لیکن وہ یہ کیوں بھول جاتی ہیں کہ ان کے آگے بھی بیٹیاں ہیں اگر دوسرے پہ تعلیم کریں گی ان کے آگے بھی آئے گا۔" زینت کے ذکر پر تو فاخرہ بھڑک ہی اٹھیں۔

"خیر تم میری بیٹیوں کا ذکر تو درمیان میں نہ لاؤ۔ کیونکہ ان بے چاری بچیوں کو تو کوئی واسطہ ہی نہیں کسی بات سے البتہ جہاں تک میری بیوی کا سوال ہے تو تم بڑے شوق سے انہیں جتنا چاہو برا کہہ سکتی ہو۔" شعیب منصور نے فاخرہ کی بات کو کوسنے پر محمول کرتے ہوئے اندر ہی اندر سہم کر کہا۔ تو زینت جن کے کان ان کی گفتگو پہ لگے ہوئے تھے تڑخ کر بولیں۔

"ارے واہ وہی مثل ہے کہ غریب کی جورو سب کی بھابی۔ یعنی میں اتنی گئی گزری ہوں کہ چھوٹی نند جو چاہے مجھے کہہ لے۔" مگر فاخرہ نے شعیب منصور کو ان کی بات کا جواب دینے کا بھی موقع نہیں دیا۔

"لیکن میں ان کو کیوں برا کہوں۔ سلوطہ کے معاملے میں تو میں آپ کو قصور وار سمجھتی ہوں۔ کیونکہ آپ کی غفلت اور لاپرواہی کے نتیجے میں ہی یہ کچھ ہوا ہے۔ مجھے معلوم ہے آپ اسے اپنی بیوی اور بچیوں کے رحم و کرم پہ چھوڑ کر اس کی طرف سے بالکل ہی بری الذمہ ہو گئے ہوں گے۔ اور بھابی جان کی بن آئی ہوگی۔ میں سب جانتی ہوں۔ انہیں تو اگر میرے گھر کا پالتو کتا بھی مل جائے تو وہ اسے زہر کھلا کر مار ڈالیں۔ خیر منجھلے اکا۔ مجھے اور کسی سے کوئی غرض نہیں۔ میں تو صرف آپ کو جانتی ہوں۔ اب آپ ہی کو اسے تلاش کر کے دینا ہوگا۔ ورنہ یہ سمجھ لیجیے کہ میں اپنے نام کی ایک ہوں۔ اگر سلوطہ نہ ملی تو میں اپنی اور سب کی جان ایک کر کے رکھ دوں گی۔

ارے آپ نے اتنا بھی نہ سوچا کہ مجھ دکھیا نے اولاد سے محرومی کے سبب کتنی اذیتیں برداشت کر کے یہ تینتیس برس کا بن باس کاٹا ہے۔ کیونکہ اپنا دامن بچا بچا کر اپنی ازدواجی زندگی کے تپتے ہوئے صحرا سے گزرتی

رہی ہوں۔ اس پر بھی کچھ معلوم ہے آپ کو کہ میرے میاں عقد ثانی کر کے ہی رہے۔ ارے میرے بھیا کبھی آپ نے پلٹ کر میری خبر لی۔ کبھی یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ میری بہن کیسا عذاب بھگت رہی ہے اپنی ایک محرومی اور خامی کا۔ تمہیں نہیں کون کسی کو پوچھتا ہے۔ پرائے گھر جا کر لڑکی بھی پرائی ہو جاتی ہے تا اس سے سارے رشتے ناتے بھی ٹوٹ جاتے ہیں۔ اور آپ کی کونسی آٹھ دس بہنیں تھیں۔ صرف ایک بہن ہی تو تھی۔ مگر۔ مگر۔ مگر سے آگے اشک ان کی آواز پر غالب آ گئے۔ اور وہ رونے لگیں۔ بہن کی باتیں سن کر شعیب منصور ان کی بے بسی پر تڑاپ سے اٹھے۔

"نہیں نہیں تم رو نہیں منو۔ دیکھو مجھے صرف ہوٹل کا نام بتا دو تاکہ مجھے کم از کم تمہارے میاں سے تو معافی کرنے کا موقع ملے۔" مگر فاخرہ نے جواب دینے کے بجائے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ اور شعیب منصور ہیلو ہیلو ہی کہتے رہ گئے۔

"لو عجب احمق لڑکی ہے پتا بتانے کے بجائے فون ہی ڈسکنیکٹ کر کے رکھ دیا۔" انہوں نے بڑے کوفت کے عالم میں ریسیور کو کریڈل میں پٹختے ہوئے کہا۔ زینت تو ان کی بات پہ پہلے ہی جلی بیٹھی تھیں۔ طنزیہ سے انداز میں ہنس کر بولیں۔

"واہ لڑکی بھی خوب کہا آپ نے۔ اب ڈھلتی ہوئی عمروں کی عورتیں بھی آپ کی نظر میں لڑکیاں ہونے لگیں۔"

"لیکن یہاں معاملہ عورتوں کا نہیں صرف فاخرہ کا ہے۔ وہ میری چھوٹی بہن ہے بوڑھی بھی ہو جائے گی تو میری نظر میں چھوٹی ہی رہے گی۔ لیکن تم اتنی جیلس کیوں ہو رہی ہو تم تو پھر بھی عمر میں اس سے دس گیارہ برس بڑی ہو۔" شعیب منصور نے ان کے طنز کا جواب طنز ہی سے دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہیں تو آپ کی نظر میں ہمیشہ سے بری ہوں۔ بوڑھی ہوں۔ جاہل ہوں۔ بدصورت ہوں۔ ساری خامیاں مجھ ہی میں ہیں۔ لو بھلا اب میری عمر کو بھی جتایا جانے لگا۔ اے اگر مجھ میں اتنے عیب تھے تو پھر آپ نے مجھ سے شادی ہی کیوں کی تھی۔" شوہر کے عمر جتانے پر زینت تلملا ہی اٹھیں۔

"بس غلطی سے کر لی تھی۔ مگر تم تو میرے لیے سانپ کی چھچھوندر ہی ثابت ہوئیں جو نگلتے بنیں نہ اگلتے۔" شعیب منصور نے جن کا دل فاخرہ کی باتوں سے دکھ سا رہا تھا نہایت ناگواری سے کہا۔ اور ان کے چھچھوندر کی مثال دینے پر تو زینت سلگ ہی اٹھیں۔

"اف وہ چھچھوندر۔ یعنی اب میں آپ کی نظر میں چھچھوندر ہو گئی۔" غصے میں وہ صرف یہی کہہ سکیں۔

"ہاں میں نے تو صرف چھچھوندر ہی کہا ہے جبکہ تم تو اس سے بھی زیادہ سننے کی مستحق ہو۔ وہ بزرگوں کی اصطلاح میں ادھر ادھر لگائی بجھائی کرنے۔ دلوں میں نفاق ڈالنے اور جھگڑے کرانے والیوں کے لیے جو ایک لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ تم نے اسی ناتپ کی عورتوں کو بھی مات کر دیا ہے۔"

"ہیں یعنی آپ کا مطلب ہے کہ میں کٹنی بھی ہوں کٹنی۔" زینت نے اتنی بڑی بات کہہ جانے پر آنکھیں پھاڑ کر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ جبکہ ان کے لہجے میں غصہ اور کھسیاہٹ بھی شامل تھی۔

"اب تم خود اپنی زبان سے کہہ رہی ہو تو پھر میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" شعیب منصور نے گویا یہ کہہ کر ان کے دل پر ایک اور چرکا لگایا۔

"اچھا اچھا۔ میں کٹنی ہوں چھچھوندر ہوں۔ گویا سارے عیب مجھ میں ہی ہیں۔ واہ واہ یہ صلہ دیا ہے آپ نے وفاداری اور جانفشانی کا۔" تم غصے کی زیادتی سے زینت کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔

"ہاں بس۔ مجھے زیادہ غصہ نہ دلاؤ۔ اور نہ رو کر مجھے ڈرانے کی کوشش کرو۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ یہ عورت کا آخری حربہ ہوتا ہے کہ جب اس کی اصلیت کھل کر سامنے آتی ہے تو اپنے دفاع کے طور پر اسی طرح آنسو بہانے لگتی ہے جیسے کہ اس وقت تم بہا رہی ہو۔ مگر میرا دماغ اس وقت بالکل ٹھکانے نہیں ہے تمہارے لیے بہتر یہی ہوگا کہ خاموشی سے پڑ کر سو جاؤ۔" میاں نے ان کی گریہ زاری کی بھی پرواہ نہیں کی تھی بلکہ ایک طرح انہیں ڈانٹ دیا تھا۔ زینت اپنے آنسو پونچھ کر کچھ زیادہ ہی طیش میں آکر بولیں۔

"نہیں میں آپ کی ذبیل ہوں نہ حکم کی بندی۔ جو آپ کے اشاروں پر ناچوں گی۔ میں تو خاموش رہوں گی نہ سوؤں گی۔ بلکہ آپ کے عاید کردہ رکیک الزامات کا آپ سے جواب طلب کر کے ہی دم لوں گی۔"

تب شاید زندگی میں پہلی بار شعیب منصور بھی طیش میں آ گئے۔ ابھی تک تو وہ ان کے قریب ہی بیٹھے تھے مگر اب غصے میں کھڑے ہو کر بولے۔

"دیکھو زینت، میں نے کہا تھا کہ اس وقت میرا دماغ ٹھکانے نہیں ہے۔ کسی کا باپ بھی مجھ سے اس وقت کوئی جواب طلب کرے گا تو میں اس سے بھی یہی کہوں گا جو تم سے کہہ رہا ہوں۔ ویسے بھی اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی ہے۔ اور اب تک تو میں تمہاری عزت کرتا رہا ہوں۔"

یہ کہہ کر تو انہوں نے زینت کے تن بدن میں آگ ہی لگا دی تھی۔ لیکن ایک تو وہ کبھی اس قدر طیش میں نہیں آئے تھے۔ نہ ایسی اہانت آمیز زبان ہی بولی تھی۔ دوسرے کسی کا باپ پس پردہ انہوں نے انہی کے باپ کو کہا تھا۔ دوسرے عزت کو برقرار رکھنے کی تنبیہ بھی کی تھی۔ اس لیے شدت غصے کے باوجود زینت کو خاموش ہی ہونا پڑا۔ کیونکہ مرد کے موڈ کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا بلکہ شوہر کے موڈ کا۔

جو احساس برتری میں ڈوب کر بعض اوقات عورت پر تشدد کرنے سے بھی نہیں چوکتا۔ اور پھر اس کے پاس چار حروف پر مشتمل الفاظ کا وہ سب سے خطرناک اور تباہ کن ہتھیار بھی ہوتا ہے جو پل کے پل میں ایک لمبے اہم، مضبوط اور پائیدار رشتے کو یوں کاٹ کر رکھ دیتا ہے جیسے گنڈاسے کی ایک ضرب کسی پیڑ کی شاخ کو اس کے جوائنٹ سے کاٹ دیتی ہے۔ اور ایک عزت دار اور وفادار عورت خواہ شوہر پر کتنی ہی حاوی کیوں نہ ہو، بس اسی بات سے تو ڈرتی ہے لیکن زینت اب اتنی بھی بے قصور نہ تھیں بلکہ خود ان کا اپنا ضمیر بھی مجرم تھا۔

اصل میں تو سلوط کو گھر سے نکلوانے میں ان کا ہی ہاتھ تھا۔

اس پر انہوں نے سلوط کے ساتھ کچھ ایسا سلوک روا رکھا تھا جیسا کہ عموماً گھر کی پروردہ لڑکیوں سے رکھا جاتا ہے۔ جبکہ فاخرہ اور ان کے درمیان ہمیشہ سے ہی ایک چپقلش سی قائم تھی۔

لیکن سلوط کو ناپسند کرنے کا سبب فاخرہ سے کبیدگی نہیں بلکہ سلوط کا حسن بے مثال تھا۔ وہ سلیقہ، وہ رکھ رکھاؤ، وہ سادگی اور انکسار تھا جو ان کی بیٹیوں میں مفقود تھا اور پھر بدقسمتی سے بالکل ہی بے مایہ اور بے آسرا تھی بلکہ زینت حیثیت کی پجاری تھیں۔ ان کے حلقۂ احباب میں اشرف اور صرف متمول طبقہ شامل تھا اور وہ خود بھی متمول اور تونگر تھیں۔ بس سلوط اسی معاملے میں ان سے مات کھا گئی تھی۔ اور اس کی اسی کمزوری کی وجہ سے وہ اس پر حاوی ہو گئی تھیں۔ لیکن جہاں تک اسفند کی شادی کا سوال تھا۔ تو وہی کیا، کوئی اور ماں بھی ہوتی تو اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی ایک ایسی لڑکی سے کرنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوتی جس کے بارے میں اس نے بہت ساری غلط سلط باتیں سنی ہوتیں اور جو کسی دوسرے مرد کی ملکیت ہوتی۔ یہاں تک تو ٹھیک تھا لیکن ان سے یہ غلطی ہو گئی کہ انہوں نے اپنے حسد اور جلن میں بہت ہی غلط انداز میں بلکہ دوسرے معنوں میں اسفند کو اس کے خلاف بھڑکایا اور ورغلایا تھا۔ ورنہ یہی باتیں وہ رسانیت سے سمجھا کر کہتیں تو ایسی نوبت کبھی نہ آتی جو اب آ گئی تھی۔

بہرحال شوہر کی دھمکی پر وہ خاموش تو ہو گئی تھیں۔ مگر منہ ہی منہ میں برابر بڑبڑائے جا رہی تھیں۔ حتیٰ کہ لیٹنے کے بعد بھی بڑبڑاتی رہیں۔

"یہ بڑبڑانا بیگمات کی نہیں لونڈی باندیوں کی عادت ہوتی ہے۔ اگر آپ اپنا منہ بند نہیں کر سکتیں تو پھر ڈرائنگ روم میں جا کر سوجاتا ہوں۔ واہ، یہ تو وہی مثل ہوئی کہ چوری کا اور سینہ زوری کا۔ کوئی ایک بات بھی تو ایسی نہیں چھوڑی جس میں انفاق کی قینچی نہیں چلائی ہو آپ نے۔ حتیٰ کہ میری بہن کے خلاف میرے بہنوئی کو بھی ورغلاتے رہے۔ نہیں چوکیں آپ۔ اور پھر اس بے چاری بچی سے جیسا سلوک روا رکھا۔ اس سے بھی میں بے خبر نہیں ہوں۔ لے دے کر آپ نے ہی سنی کو بھڑکا کر گھر سے نکلوایا ہے۔ پھر اب فاخرہ بی تو آ ہی گئی ہیں۔ ان کے اور آپ کی جوان جو انعام اولادوں کے سامنے آپ کی شخصیت پر چڑھے دنیاداری کے خوبصورت پرت اتر یں گے تو سب خود ہی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ آپ کس قدر شاطر فطرت کی مالک ہیں۔" بیوی کو منع کر کے شعیب منصور خود بھی بڑبڑانے کے سے انداز میں کہتے رہے مگر زینت نے ان کی کسی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

خاموش پڑی بڑی تیزی سے آنسو بہاتی رہیں۔

جانے کتنی دیر اور کب تک۔ شعیب منصور تو کچھ دیر کے بعد نامعلوم کیا کیا سوچنے کے بعد پڑ کر سو گئے تھے۔

پھوپھا اور پھوپھی کو ٹیکسی کار سونپنے کے بعد راستے میں ہی ایک جگہ کار سے اتر کر اسفند کا دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ سیدھا اسی ہوٹل میں پہنچ جائے جہاں پھوپھا اور پھوپھی کو ٹھہرایا ہے اور وہاں بیٹھ کر ان کی واپسی کا انتظار کرے کہ سلوط کو پھوپھا کی بیٹی کے روپ میں دیکھنے کا اسفند کو بہت شوق ہو رہا تھا۔

یوں بھی دل تھا کہ اسے دیکھنے کو مچلا جا رہا تھا۔ تڑپا جا رہا تھا۔

مگر پھر اس نے سوچا کہ پھوپھا کے انتظار میں پہلے سے ہوٹل میں جا کر بیٹھ جانا کچھ مناسب نہیں۔ بھلا پھوپھا اور پھوپھی کیا سوچیں گے کہ میں سلوط کو دیکھنے کے لیے اتنا دیوانہ ہو رہا ہوں۔ اور پھر خود سلوط بھی مجھے دیکھ کر معلوم کیسا رویہ اختیار کرے۔ کہیں پھوپھا جان کے سامنے ہی ایسی کوئی بات نہ کہہ دے جس سے مجھے ندامت کا سامنا کرنا پڑے۔ یا جس سے میری اہانت ہو۔

بس یہی سب سوچنے کے بعد وہ جذبۂ شوق کو بڑی سختی سے دل کے اندر ہی گھونٹ کر۔ اسی ہوٹل کے کمرے میں واپس آ گیا۔ جس میں وہ ٹھہرا ہوا تھا۔

آتے ہی کولڈ کافی کا آرڈر دیا۔ اور پھر ٹی وی پر چلنے والی ایک لیٹ نائٹ انگلش موو ی دیکھنے لگا۔ کچھ دیر تک وہ فلم دیکھتا رہا پھر اٹھ کر لباس تبدیل کیا۔ اور بستر پر لیٹ گیا۔ اس روز تقریباً تمام دن وہ گھومتا پھرتا رہا تھا۔ اس لیے بہت تھک گیا تھا۔ مگر اس کے باوجود بھی بڑی دیر تک اسے نیند نہیں آئی تھی۔

وہ سارا دن سلوط کے بارے میں ہی سوچتا رہا تھا۔

کہ پھوپھا اور پھوپھی کی غیر متوقع آمد سے اسے تعجب تو بہت ہوا ہوگا۔ اور وہ کس طرح بلک کر ان کے گلے لگی ہوگی۔

روئی بھی ہوگی اور خوش بھی ہوئی ہوگی۔

اور جب اسے یہ معلوم ہوا ہوگا کہ وہ پھوپھا کی بہن نہیں بیٹی ہے تو اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا ہوگا۔

پھر سلوط کے حسین تر چہرے سے پھوٹتے دھنک رنگ اسے آنکھوں میں جھلملاتے نظر آنے لگے۔

وہ بڑی دیر تک اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اسی کے تصور میں کھویا رہا۔ اس کے خیالوں پر خوابوں پر سلوط ہی چھائی رہی۔ حتیٰ کہ اس کی بند آنکھوں کے اندر بھی اسی کی شبیہ تیرتی رہی۔ دیر سے سویا تھا پھر بھی بہت سویرے اس کی آنکھ کھل گئی۔ جانے کیسی بے کلی تھی، وہ تو شاید سویا بھی بے کل بے کل سا تھا۔ پتہ نہیں کیسے نو بجے تک کا وقت کاٹا تھا حالانکہ تیار تو آٹھ بجے سے ہی ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ مگر یہی سوچ کر کہ ابھی تو پھوپھا پھوپھی! اٹھے بھی نہیں ہوں گے۔ وہ نو بجے تک انتظار کی صلیب پر چڑھا رہا تھا۔ یوں بھی چونکہ اس کی کار پھوپھا کے پاس تھی۔ اس لیے باہر نکل کر اسے سواری بھی پکڑنی تھی۔ اور اس کے خیال میں سواری پکڑنے میں بھی کچھ وقت لگتا تھا۔ اس لیے نو بجے ہوٹل سے نکلنے کا وقت اس نے مناسب سمجھا تھا۔

پھر وہ ٹیکسی پکڑ کر ہوٹل پہنچا تو فاخرہ نے بڑے عجیب سے تاثرات کے ساتھ دروازہ کھولا اور اس کے سلام کے جواب میں ہونٹوں پر انگلی رکھ کر آہستہ سے بولیں۔

"آہستہ بولو اسفند۔ تمہارے پھوپھا جان سو رہے ہیں۔" اور اس سے پہلے کہ وہ آہستہ سے ہی ان سے کچھ پوچھتا، انہوں نے دروازے کے آگے ہی کھڑے کھڑے مڑ کر سوتے ہوئے شوہر پر ایک نظر ڈالی اور پھر دھیرے سے بولیں۔ "آؤ ایسا کرتے ہیں کہ ہوٹل کی لابی یا لاؤنج میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ یوں بھی میں نے اب تک یہ ہوٹل دیکھا بھی نہیں۔" اور اسفند کا دل چاہا کہ کہے کہ آپ کو اس ہوٹل میں آئے ابھی پورا ایک دن بھی نہیں ہوا۔ اور پھر یہ ہوٹل اتنا بڑا دیکھنے اور دکھانے کے قابل بھی نہیں ہے۔ بلکہ اس کی کوئی لابی تک نہیں ہے مگر وہ خاموش ہی رہا اور اسی خاموشی سے ان کے ساتھ باہر نکل آیا۔ ان کے عجیب و غریب رویے اور باتوں سے لگتی تھیں اس نے یہی اندازہ لگایا کہ شاید سلوط نے انہیں منع کر دیا ہوگا کہ مجھے کمرے میں نہ آنے دیا جائے۔ یوں بھی اس کے سوا اور کیا وجہ ہو سکتی تھی۔ بہرحال ہوٹل میں ایک چھوٹا سا

لاؤنج ضرور تھا۔ اور اتفاق سے اس وقت خالی پڑا تھا۔ بس اکا دکا کسٹمر تھے اور میرے ہی وہاں سے آ جا رہے تھے۔ فاخرہ وہیں ایک کوچ پر بیٹھ گئیں اور اسے بھی اپنے ساتھ بٹھا لیا۔

"بڑی مشکل میں پھنسا دیا ہے تم لوگوں نے سلوط کو اپنے گھر سے نکال کر۔ یہ تو کہو کہ بہت غنیمت ہوا جو وہ ہمیں مل گئی لیکن اس کے ملنے کا فائدہ ہی کیا ہوا۔ بلکہ الٹی میری شامت آ گئی۔ اب تمہارے پھوپھا تم لوگوں کی شکلیں تک دیکھنے کے روادار نہیں رہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نہ تم کسی سے ملوگی نہ میں ملوں گا۔ بلکہ اسفند کو بھی سختی سے منع کر دو کہ وہ یہاں نہ آئے۔ ورنہ میں ایسا کروں گا کہ تمہیں بھی اس کے ساتھ رخصت کر دوں گا۔" پھوپھی کی ان بے ربط اور بے تکی باتوں سے بھی اس نے یہی اخذ کیا کہ ضرور سلوط نے ہی سب کے خلاف شکایت کی ہوگی۔ جو پھوپھا نے یہ فیصلہ صادر کیا ہے۔ بہت کچھ سمجھنے کے باوجود بھی اس نے پوچھا۔

"میں سمجھا نہیں پھپھو بیگم کہ آخر آپ کہنا کیا چاہ رہی ہیں اور پھوپھا جان آخر کس بات پر اتنے خفا ہیں جو سب کا بائیکاٹ کرنا چاہتے ہیں جبکہ اب تو انہیں سلوط کی طرف سے بھی کوئی پریشانی نہیں رہی؟" تب فاخرہ نے اسے سلوط کے ان کے ساتھ آنے سے انکار کر دینے بلکہ اس کے رویے اور گفتگو کے بارے میں تفصیل سے سب کچھ بتا دیا۔ حتیٰ کہ اپنے شوہر کے خیالات اور فیصلے کے بارے میں بھی اسے آگاہ کر دیا اور پھپھو کی زبانی یہ ساری تفصیل سن کر اسفند کو یوں لگا جیسے وہ جیتی ہوئی بازی ہار گیا ہو۔ اس نے جواب میں ایک لفظ بھی نہ کہا۔ تھوڑی دیر گم صم سا بیٹھا رہا پھر پھوپھی کے پاس سے اٹھتا ہوا بولا۔

"اچھا اب آپ اپنے روم میں چلیے پھپھو بیگم ویسے بھی یہ عام گزرگاہ ہے اور یہاں بیٹھنا کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔" اور فاخرہ بھی جیسے وہاں سے اٹھنا ہی چاہ رہی تھیں۔ اس کے کہتے ہی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ پھر وہ انہیں ان کے کمرے کے دروازے پر چھوڑ کر یوں ان سے رخصت ہوا جیسے اپنا سب کچھ ہار کر جا رہا ہو۔

وہ فاخرہ کو خدا حافظ کہہ کر سیڑھیاں اترنے لگا۔ تو غصے کے نہیں بلکہ سخت کوفت کے عالم میں مبتلا تھا۔ کیونکہ پھوپھا کی فطرت اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

یہ تو اسے معلوم تھا کہ پھوپھا کچھ فطرتاً ہی خشک مزاج کم گو اور کھردرے قسم کے انسان ہیں اور ان کے بارے میں یہ بات محض سنی ہی نہیں تھی بلکہ اس کا مشاہدہ بھی کر چکا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ پھوپھا کے ان بھرے بھرے سے مزاج میں ایک خوشگوار قسم کی تبدیلی صرف سلوط کی وجہ سے آئی تھی کہ انتہائی مایوس کن حالات میں سلوط کے مل جانے کا امکان پیدا ہو گیا تھا۔ ورنہ کہاں وہ اور کہاں اس قدر شگفتہ انداز گفتگو اور چہکنا اور اب سلوط نے ان کے ساتھ آنے سے انکار کر دیا تھا تو اس کے پاس ان کے کھردرا لول کی وجہ سے تو نہیں کیا تھا۔ ظاہر تھا کہ بھائی اور بھابی کی زیادتیوں اور کوتاہیوں سے حد درجہ دل برداشتہ اور بدظن ہو کر ہی کیا تھا لیکن وہ سارا قصور ہمارے سر تھوپ رہے ہیں حتیٰ کہ تعلق تک قطع کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ انہیں شاید معلوم نہیں کہ آجکل تو اپنے سگے بھی بیگانے بنے ہوئے ہیں۔ کوئی کسی کو تعلق قطع کرنے کی دھمکی دیتا ہے تو یہی کہا جاتا ہے کہ چلو اگر ملنا نہیں چاہتے تو نہ سہی تم اپنے گھر خوش اور ہم اپنے گھر خوش۔ گویا کسی کی کسی کو پرواہ ہی نہیں ہوتی۔ خصوصاً کراچی میں تو یہ بے نیازی عام ہے کہ ملتے ہوئے عمر ہی گزر جائے تو اپنی اپنی مصروفیات میں ایک دوسرے کو پلٹ کر پوچھا ہی نہیں جاتا کیونکہ سب اپنی اپنی دنیا میں گم رہتے ہیں۔ اور میں نے تو الٹا ان پر احسان کیا ہے۔

سلوط کو ڈھونڈ کر دیا ہے۔

ان سے ملوا دیا ہے۔

اس کے باوجود بھی پھوپھا جان نے میرا اور اسے—" وہ نیچے اتر کر سواری کے انتظار میں کھڑا ہو گیا تھا۔ مگر اپنے ان خیالات میں ایسا محو تھا کہ بھول گیا تھا کہ کیوں کھڑا ہے جبکہ خالی سواریاں اس کے سامنے سے گزر رہی تھیں اور ابھی وہ اسی قدر سوچ سکا تھا کہ تبھی ایک کار اس کے اتنے قریب آ کر رکی کہ اگر وہ اچھل کر پیچھے نہ ہٹ جاتا تو یقیناً اس کا پیر کار کے اگلے پہیے کے نیچے آ جاتا۔ ایک دم دل کو دھچکا سا بھی لگا تھا اور ظاہر تھا اسے کار چلانے والے کی اس بے ہودگی پر سخت غصہ بھی آیا تھا اس بدتمیزی پر لال پیلا ہو کر اس نے جونہی چلانے والے کی طرف دیکھا۔ تو یوں لگا جیسے سانس بیچ ہی میں اٹک کر رہ گیا ہو کیونکہ ڈرائیونگ سیٹ پر پاپا ایک شفیق سی مسکراہٹ لیے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس کی وہی حالت ہو گئی کہ نہ جائے

رفتن نہ پائے ماندن — کہ نہ ان سے چھپ سکتا تھا نہ وہاں سے بھاگ سکتا تھا۔ زمین نے ہی جیسے قدم پکڑ لیے تھے اور وہیں پر جم کر رہ گیا تھا۔ یوں جیسے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہو۔

حد تو یہ تھی کہ باپ کو سلام تک کرنا بھول گیا تھا۔ شعیب منصور خود ہی دروازہ کھول کر باہر اترے اور اس کے نزدیک آ کر بولے۔

"ہیلو مائی سن! چلو اچھا ہی ہوا کہ تم مل گئے ورنہ مجھے نہ جانے اور کتنے ہوٹلوں کی خاک چھاننی پڑتی کیونکہ فاخرہ نے غصے میں کچھ بتایا ہی نہیں تھا۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے تم انہی سے ملنے آئے ہو۔" باپ کی باتوں سے اسے یہ تو اندازہ ہو گیا تھا کہ پھوپھی نے ان تک فون کے ذریعے ہی رسائی حاصل کر لی ہے۔ وہ جھجکتے سے انداز میں بولا۔

"جی ہاں مگر آیا ہوں نہیں آیا تھا ڈیڈی—!"

"خیر خیر ایک ہی بات ہے مگر وہ دونوں ہیں کس روم میں؟— چلو آؤ مجھے کم از کم ان کے کمرے تک تو پہنچا دو۔" شعیب منصور بہن سے ملنے کی تھوڑی سی بے تابی دکھاتے ہوئے بولے۔

"نہیں ڈیڈی! آپ ان سے نہ ہی ملیں تو بہتر ہے کیونکہ پھوپھا جان نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ وہ ہم سے کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتے۔ دوسرے معنوں میں وہ ہماری صورتیں دیکھنے کے بھی روادار نہیں ہیں تو ان حالات میں آپ کا ان کے پاس جانا ——— آپ کے وقار کے منافی ہی ہوگا۔" اسفند نے انہیں اصل صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

"خیر اگر وہ روادار نہیں تو میں تو ہوں اور پھر میں اپنی بہن سے ملنے آیا ہوں۔ میرے ملنے ان کی مجال نہیں ہو سکتی کہ مجھے اپنی بہن سے ملنے سے روکیں۔ ارے بیٹا! اگر ایک نالائق ہو تو ضروری نہیں کہ دوسرا بھی ہو جائے۔ چلو تم مجھے کسی طرح ان کے پاس لے چلو۔" شعیب منصور نے بیٹے کی باتوں کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی۔

"نہیں ڈیڈی! اصل میں آپ کو معلوم نہیں کہ حالات کتنی سنگینی اختیار کر چکے ہیں۔ سلوط ملی بھی ہیں تو انہوں نے پھوپھا جان کے ساتھ آنے سے انکار کر دیا ہے۔ بلکہ وہ تو کسی رشتے کی اہمیت کو گردان ہی نہیں رہیں۔"

"اوہ— ویل ڈونٹ وری! خیر آؤ کار میں بیٹھ کر بات کرو۔ یہاں لب سڑک اور وہ بھی ایک پبلک پلیس پر کھڑے ہو کر بات کرنا مناسب نہیں۔" شعیب منصور نے سلوط کا ذکر سن کر جلدی سے اس کے لیے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا اور نہ چاہتے ہوئے بھی اسے ان کی کار میں بیٹھنا پڑا۔ شعیب منصور بھی جلدی سے آ کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئے۔

"ہاں اب بتاؤ کیا کہہ رہے تھے تم؟" انہوں نے ایک منتظر سی نظر اس پر ڈال کر پوچھا۔ تب اس نے ابھی وہ ساری باتیں بتا دیں جو سلوط کے متعلق فاخرہ سے سن کر آیا تھا اور یہ بھی کہ اسی غصے میں پھوپھا ہم سے بھی ہر تعلق قطع کر چکے ہیں۔

"لیکن یہ تم نے ہمیں بتایا کہ سلوط انہیں ملی کیسے ہے اور وہ یہاں کیسے آئے اور ہاں تمہاری ان سے کیونکر ملاقات ہوئی۔ جبکہ کراچی سے تو تم یہ کہہ کر گئے تھے کہ تم لندن جا رہے ہو۔ مگر خدا اللہ جان کو ہمارے سروں پر سلامت رکھے ان کے خط سے معلوم ہو گیا تھا کہ تم یہاں سے لندن نہیں ملتان گئے تھے۔" باپ نے ایک ساتھ کئی سوالات کر ڈالے اور وہ جوان یہ ظاہر نہیں کرنا چاہ رہا تھا کہ وہ بظاہر تو ادھر ادھر گھومنے پھرنے ہی نکلا تھا مگر اس کا اصل مقصد سلوط کو ہی تلاش کرنا تھا اور یہ مقصد اس پر اسی وقت واضح ہوا تھا جب شیر محمد کی زبانی اسے معلوم ہوا تھا کہ ان کے پھوپھا لاہور میں ہی موجود ہیں۔ اس نے باپ کو یہی بتایا کہ لاہور کے ہوٹل سے جس دوست کے مکان میں منتقل ہوا تھا۔ وہ اتفاق سے وہی مکان تھا جس کے پورشن میں پھوپھا رہا کرتے تھے مگر پھر انڈیا سے واپسی پر انہوں نے نئے پورشن میں سکونت اختیار کر لی تھی اور اس گھر میں وہ شیر محمد کے ذریعے ہی پھوپھو سے ملنے گیا تھا۔ اور خود اس نے ہی انہیں سلوط کے اچانک لاپتا ہو جانے کے بارے میں بتایا تھا اور ان کے اس سوال کے جواب میں سلوط پھوپھا کو کیسے مل گئی تھی۔ اس نے یہی کہا تھا کہ سلوط نے خود خط کے ذریعے انہیں اپنا پتا بتایا تھا۔ اپنی منگنی اور لعوج کا ذکر وہ گول ہی کر گیا تھا۔

"واہ یہ تو اور بھی اچھا ہوا کہ سلوط انہیں مل گئی۔ پھر وہ کس بات کا تماشا ہمیں دکھا رہے ہیں۔ صاف ظاہر ہے۔ وہ فاخرہ

بی سے ہی کسی بات کا بدلہ لے رہے ہوں گے۔ خیر تم میرے ساتھ تو چلو۔"

"لیکن میں جا کر کیا کروں گا ڈیڈی — البتہ آپ کو ان کا روم بتائے دیتا ہوں۔" اسفند گویا ان کے ساتھ جانے سے انکار کرتا ہوا بولا۔

"خیر چلو یہی سہی — لیکن مجھے ان کے روم میں چھوڑ کر تم کہیں نہیں جاؤ گے۔ بس بہت کر لی آوارہ گردی کچھ معلوم بھی ہے، کہ تمہارے چپکے سے چلے جانے پر تمہاری ممی نے اپنا کیا حال بنا لیا ہے۔ اگر اپنے باپ کا نہیں تو کم از کم اس دکھی ماں کا تو خیال کر لو۔" شعیب منصور نے اترنے سے پہلے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"تعجب ہے میرے چلے آنے پر تو ممی کی حالت غیر ہو رہی ہے اور انہوں نے جو ایک جوان لڑکی کو گھر سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا اس پر انہیں تھوڑا سا بھی ملال نہیں ہوا؟" اسفند نے ایک زہرخند سے کہا۔

"نہیں ہوا کیوں نہیں بلکہ بہت ہوا ہے لیکن وہ شرمندگی کی وجہ سے اس کا اظہار نہیں کرتیں اور سنو بیٹے! میں مانتا ہوں کہ انہوں نے بڑا غلط طریقہ اختیار کیا تھا، تمہیں تمہاری ضد سے باز رکھنے کے لیے — لیکن اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو وہ بھی غلطی پر نہیں تھیں، کیونکہ وہ کیا دنیا کی کوئی ماں بھی یہ پسند نہیں کرتی کہ اس کا اکلوتا بیٹا ایک ایسی لڑکی کے ساتھ شادی کرے جو کسی دوسرے مرد کے نکاح میں ہو، مذہباً بھی ایسی شادی جائز ہی نہیں۔" شعیب منصور ماں کی طرف سے اس کا دل صاف کرنے کی غرض سے بولے لیکن کچھ غلط بھی نہیں بولے۔ اور وہ بھی یہ سوچ کر کہ ساری غلطی اور زیادتی اسی کی تھی، اس معاملے میں کچھ شیبا بولا۔

"میرے خیال میں یہ بات تو تم کو بھی معلوم ہوگی —" شعیب منصور نے بیٹے کو خاموش دیکھ کر کہا۔

"جی ہاں، معلوم تو ہے لیکن سلوطہ کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا — مگر خیر اب تو انہیں طلاق بھی مل گئی ہے، پھوپھا جان اور پھوپھو بیگم یہی فیصلہ کرا کے تو انڈیا گئے تھے، لیکن وہ شخص کسی طرح راضی ہی نہیں ہوتا تھا، یہی وجہ تھی کہ پھوپھا جان کو واپسی میں اتنی دیر ہو گئی تھی لیکن پھوپھا جان نے دیر سویر کی پروا نہیں کی — اور نہ صرف طلاق دلوائی بلکہ لاکھوں کے زیورات جو دونوں طرف سے سلوطہ کو شادی کے موقع پر چڑھے تھے اور پانچ لاکھ نقد مہر کے وصول کر کے ہی رہے، پھر بھی پھوپھا جان کا باون لاکھ روپیہ وہ شخص ہضم کر گیا۔ بزنس پارٹنر شپ تھی نا اس کے ساتھ۔" مہر کی رقم اور زیورات کی بات اسفند نے محض باپ کی نظروں میں سلوطہ کی اہمیت بڑھانے کی غرض سے بتائی تھی اور پانچ لاکھ نقد اور نصف کروڑ کے بارے میں سن کر شعیب منصور بھی مرعوب ہوئے بغیر نہ رہے۔

"اوہ ویری امیزنگ (بہت تعجب خیز)!" انہوں نے حد درجے متاثر ہو کر کہا

"جی ہاں اور اس سے زیادہ امیزنگ یہ ہے کہ سلوطہ پھوپھا جان کی بہن نہیں بلکہ بیٹی ہیں۔" اس نے تھوڑا سا مسکرا کر بتایا تو شعیب منصور سچ مچ اچھل ہی پڑے۔

"یو آر کڈنگ (تم مذاق تو نہیں کر رہے)؟" انہوں نے بڑے سخت اچنبھے کی کیفیت میں آ کر پوچھا، تب مختصر الفاظ میں ہی اسفند نے انہیں ثاقب حسن کی زبانی سنا ہوا سارا قصہ سنایا تو شعیب منصور کو ناخرہ کی اس بات پر یقین کر لینا ہی پڑا جو انہوں نے ثاقب حسن کے عقد ثانی کرنے کے بارے میں بتائی تھی۔ ورنہ اب تک تو وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ اپنی ایک بہت بڑی محرومی کی وجہ سے ناخرہ میاں کی طرف سے شک و شبہات کا شکار ہو گئی ہیں۔

دونوں باپ بیٹے اب تک کار پارکنگ میں کھڑی کار ہی میں بیٹھے تھے۔ وہ انہیں کار میں بیٹھے کم و بیش آدھا گھنٹہ ہو گیا تھا۔ اور شعیب منصور بیٹے کی زبانی نئے نئے انکشافات سن کر کچھ سوچنے لگے تھے۔

"ڈیڈی بعض اوقات انسان کی قسمت کچھ اتنے حیرت انگیز طور پر پلٹا کھاتی ہے کہ عقل دنگ ہو کر رہ جاتی ہے؟" غالباً اسفند نے یہ بات باپ کے "آر یو کڈنگ" کہنے کے جواب میں کہی تھی۔ مگر شعیب منصور نے شاید سنی نہیں۔ اپنی سوچ سے نکل کر بولے۔

"لیکن یہ سلوطہ آخر کس کے یہاں ٹھہری ہوئی ہے کیا تم کبھی وہاں گئے ہو؟"

"نہیں میں تو وہاں نہیں گیا لیکن ان کا پتا ضرور جانتا ہوں۔ اصل میں وہ کوئی مڈوائف ہے جو نرسری کے ایک کلینک میں کام کرتی ہے۔ اسی کے یہاں رہ رہی ہیں وہ آج کل —" اسفند نے کہا، تو شعیب منصور نے اپنی طرف کا دروازہ بند کر کے کار کو

ریورس دیتے ہوئے کہا۔

"اچھا تمہیں سلوطہ کا پتا معلوم ہے تو ان حالات میں ہمارے لیے بہتر یہی ہوگا کہ فاخرہ کے پاس جانے کے بجائے سلوطہ کے پاس چلیں۔"

"او نو ڈیڈی ہمارا وہاں جانا کسی طور پر بھی مناسب نہیں ہے —" اسفند یوں اچک کر بولا جیسے کار کو بریک لگانا چاہتا ہو۔

"کیوں — کیوں مناسب نہیں؟" شعیب منصور نے کار کا رخ مین روڈ کی طرف موڑتے ہوئے پوچھا۔

"کیونکہ جب وہ پھوپھا جان اور پھوپھو بیگم کو ہی خاطر میں نہیں لائیں تو — لیکن ڈیڈی آپ کا وہاں جانا کسی طور پر بھی مناسب نہیں لہٰذا میں تو بالکل گوارا نہیں کروں گا کہ آپ وہاں جائیں؟" اسفند باپ کو سلوطہ کے پاس جانے سے باز رکھنے کی کوشش میں بگڑے بگڑے سے انداز میں بولا۔

"نہیں سنو بیٹے! اس وقت مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ میں خود جا کر سلوطہ سے ملوں — آخر میری وجہ سے ہی تو اس بے چاری کو اتنی مصیبت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ قصور وار ثاقب یا تم نہیں بلکہ میں ہوں کیونکہ میری غفلت اور بے توجہی کی وجہ سے ہی یہ سارا فتنہ و فساد کھڑا ہوا ہے۔" شعیب منصور گویا اپنی ضمیر پر اڑے ہوئے ہے۔ کار کو مین روڈ پر ڈال کر انہوں نے شہر کا رخ کیا۔

"او ہو ڈیڈی آخر آپ سمجھتے کیوں نہیں۔" اسفند نے جز بز سا ہو کر کہنا چاہا۔

"میں سب سمجھتا ہوں بیٹے! اور میری اپنی بھی کچھ عزت و وقار ہے — لیکن معاملہ اصل میں میری بہن کی زندگی کا ہے، تمہیں ابھی ازدواجی زندگی کا تجربہ نہیں ہے۔ تم اس کی تلخیوں سے واقف ہی نہیں مگر اتنا سمجھ لو کہ جب ثاقب حسن نے بیٹی کے غصے میں ہم سب سے تعلق قطع کر لیا ہے تو تمہاری پھپھو سے تعلق منقطع کر لینا کچھ مشکل تو نہ ہوگا۔ یوں بھی ناخرہ بی بی کی دکھتی ہوئی رگ ان کے ہاتھ میں ہے۔ اور جب وہ اولاد حاصل کرنے کی خاطر عقد ثانی کرنے سے بھی نہیں چوکے تو سلوطہ تو ان کی اکلوتی اولاد ہے اور اس کے ساتھ جو ظلم اور ناانصافی ہوئی ہے، اس کی ساری کسر وہ ناخرہ بی سے ہی نکال سکتے ہیں۔ تمہیں ایسا ہی اپنے وقار کا خیال ہے تو تم نہیں جانا مگر مجھے ضرور جانے دو اور اس کا پتا بتا دو۔"

باپ نے تمام اندیشوں اور نزاکتوں کو سامنے رکھ کر بیٹے کو سمجھایا۔ وہ چپ سا ہو کر بولا۔

"ٹھیک ہے ڈیڈی! میں آپ کو ان کا پتا بتائے دیتا ہوں مگر آپ مجھے راستے میں کہیں ڈراپ کر دیں۔"

"ہاں، یہ ٹھیک ہے مگر یہ تمہاری کار کہاں ہے جو تم کرائے کی سواری میں پھرتے پھر رہے ہو۔" شعیب منصور نے اس کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے پوچھا۔

"وہ پھوپھا جان کے پاس ہے۔ سلوطہ کے یہاں جانے کی غرض سے رات کو انہیں دی تھی۔ مگر اس وقت ان سے چابی لینا بھول گیا، یوں بھی ان حالات میں چابی واپس لینے کا تقاضا کرنا مجھے مناسب نہیں لگا۔" بیٹے نے بتایا تو شعیب منصور مسکراتے ہوئے بولے۔

"ہاں یہ تو تم نے اچھا ہی کیا، معلوم ہے — جب مرد داماد بن جاتا ہے تو بچھو کی جون کیوں اختیار کر لیتا ہے اور معمولی سی بات پر بھی ڈنک مارتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ کم از کم میں ایسے بد طینت مردوں میں سے نہیں ہوں۔" اور جواب میں وہ خاموش ہی رہا۔ دونوں باتیں کرتے کرتے نیپئر بیرکس کی طرف آ گئے تھے۔ اسفند نے باپ کو بہت سمجھا بجھا کر سلوطہ کا پتا بتایا اور پھر ادھر ادھر دیکھ کر بولا۔

"ڈیڈی! آپ مجھے یہیں ڈراپ کر دیں کیونکہ مجھے آگے نہیں پیچھے کی طرف جانا ہوگا۔"

"اچھا ڈراپ تو کیے دیتا ہوں لیکن یہاں نہیں بلکہ تمہارے موجودہ ٹھکانے پر ہی ڈراپ کروں گا۔ اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ تمہیں کہاں اترنا ہے۔ تاکہ واپسی میں تمہیں وہاں سے پک کر لوں —" شعیب منصور نے کار کی رفتار ہلکی کرتے کہا۔ تب بہت مجبور ہو کر اسفند کو اسی ہوٹل کا نام لینا ہی پڑا جس میں رہ رہا تھا۔

اور پھر کچھ ہی دیر کے بعد تاج محل ہوٹل کے سامنے والے راؤنڈ اباؤٹ سے شعیب منصور نے پھر کار کو واپس موڑ لیا۔

"حالات اور اتفاقات بھی انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں۔ اب تم خفا ہو کر گھر سے اس لیے نکلے تھے کہ میں نے سلوطہ کو گھر واپس لانے کا تہیہ کر لیا تھا۔ اور اب تم خود ہی مجھ سے پہلے اس کے پاس پہنچ گئے۔ ویسے تمہارا جذبہ واقعی بہت

صادق تھا۔ شعیب منصور بات کے اختتام پر ہنسنے لگے۔

"اب آپ مجھے شرمندہ کرنے کی کوشش تو نہ کریں ڈیڈی۔ ورنہ میں آپ کی اس بات پر ناراض ہو کر یہیں سے لوٹ جاؤں گی" سلوطہ کو دعوت کی غرض سے ہی بلایا تھا۔ اب یہ اور بات ہے کہ بعض باتیں اتنے غیر محسوس طریقے سے انسان کے ذہن میں موجود ہوتی ہیں کہ جن کا احساس انسان کو بہت بعد میں ہوتا ہے۔ جیسے کہ مجھے ہوا۔" اسفند نے جن الفاظ میں سلوطہ کو تلاش کرنے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

شعیب منصور نے "اچھا" کہہ کر بڑی بے ساختگی سے ایک قہقہہ لگایا۔ پھر اسفند کے بتائے ہوئے ہوٹل کے پارکنگ لاٹ میں کار روک کر جہاں وہ مقیم تھا۔ کچھ دیر تک اسے کچھ سمجھاتے رہے اور پھر اس سے جلد ہی واپس آنے کا کہہ کر سلوطہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

"اف یہ تو دن چڑھ آیا"

کچھ ہڑبڑی ہی تھی اور کچھ گرمی کا احساس۔ جس نے سلوطہ کو گہری نیند سے جگا دیا تھا۔ آنکھیں کھول کر دیکھا تو کھلے دروازے سے نظر آتے صحن کے مقابل کی دیوار پر دھوپ چمک رہی تھی۔

کیا میں آج اتنی دیر تک سوتی رہی ہوں؟

اس خیال کے آتے ہی اس نے سرہانے دیوار میں نصب بریکٹ پر رکھی ٹائم پیس پر نظر ڈالی تو دس بج چکے تھے۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی اور بیٹھنے کی پوزیشن میں آتے آتے اس کی نظر سامنے کونے پر پڑی تو دیکھا فرش پر چٹائی بچھائے سر پہ بگی باندھے فلورا اپنا بکس کھولے اس میں کچھ تلاش کر رہی ہے۔ خلاف توقع گھر میں اس کو دیکھ کر وہ بھی اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ کیونکہ فلورا بڑی بااصول تھی اور کلینک وقت پر جاتی تھی اور پونے آٹھ بجے ہی گھر سے نکل جاتی تھی۔ مگر اب دس بج چکے تھے۔ اس نے کلمہ پڑھتے ہی سب سے پہلے اسے ہی مخاطب کر کے پوچھا۔

"آج آپ ڈیوٹی پر نہیں گئیں آنٹی!"

"نہیں۔" فلورا نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"کیوں آنٹی؟" اس نے دبی دبی سی آواز میں پوچھا۔

"جس طرح تمام رات تم جاگتی رہی ہو۔ اسی طرح رات کا بیشتر حصہ میں نے بھی جاگ کر گزارا ہے۔ پھر بھی معمول کے مطابق اپنے وقت پر میری آنکھ کھل گئی تھی۔ لیکن سر میں بہت درد ہو رہا تھا۔ بدن بھی ٹوٹ سا رہا تھا۔ اس لیے میری ہمت ہی نہیں ہوئی ڈیوٹی پر جانے کی۔" گو فلورا نے ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ اپنے ڈیوٹی پر نہ جانے کا ذمہ دار وہ اسے ٹھہرا رہی ہے۔ مگر سلوطہ ہی کچھ ایسی شرمندگی اور ندامت بھرے لہجے میں بولی۔

"اصل میں میری وجہ سے آپ کو بڑی تکلیف اٹھانی پڑ رہی ہے۔ خیر لیٹیے سر میں درد ہو رہا ہے۔ تو میں آپ کے سر میں تیل کی مالش کر دوں۔ کیونکہ مالش کرنے سے درد بہت کم ہو جاتا ہے۔"

"ارے نہیں۔ کچھ دوائی ہوتی ہو تو بھلا منہ ہاتھ دھویا نہ ناشتا کیا اور چلی ہو مالش کرنے۔ یوں بھی میں سر پر ہونے اور مالش کرانے کی عادی نہیں ہوں۔ بس معمولی سا درد ہے کوئی گولی کھائی ہے ابھی جاتا رہے گا۔" فلورا اپنے بکس کا ڈھکنا بند کرتی ہوئی بولی۔

"اچھا اگر آپ عادی نہیں ہیں تو خیر۔ مگر آپ نے مجھے جگا کیوں نہ دیا۔ میں کم از کم آپ کو چائے اور ناشتا ہی بنا کر دے دیتی۔" سلوطہ بدستور ندامت بھرے لہجے میں بولی۔

"کیوں کیا میرے ہاتھ پاؤں نہیں تھے جو میں ناشتا بنانے کے لیے تمہیں جگا دیتی۔ ساری رات تو تم جاگتی رہی تھیں۔ اس پاتی گہری نیند سو رہی تھیں کہ تمہاری آرام میں خلل ڈالنا مجھے گوارا نہیں ہوا۔" فلورا نے جس سادگی سے اپنے خلوص کا اظہار کیا۔ سلوطہ کا دل تشکر کے جذبات سے لبریز سا ہو گیا۔ وہ اٹھتی ہوئی بولی۔

"اس کا مطلب ہے کہ سر درد کا تو محض بہانہ ہے۔ ورنہ آپ میرے سونے کی وجہ سے آج ڈیوٹی پر نہیں گئیں۔"

"چلو یہی سمجھ لو۔ یوں بھی اب روز روز تو تم کو اپنے ساتھ کلینک نہیں لے جا سکتی۔ تم گھر میں تنہا رہتی ہو تو میرا سارا دھیان تمہاری طرف ہی لگا رہتا ہے۔ کیونکہ جوان لڑکی کی ذمہ داری لینا آسان نہیں ہوتا۔ اور آج تو تم بے سدھ پڑی سو رہی تھیں پھر تمہیں بتائے بغیر یونہی سوتا چھوڑ کر کیسے چلی جاتی۔" فلورا نے بھی اصل بات بتا دی۔

"وہ تو ٹھیک لیکن آخر کب تک آپ میرا بوجھ اٹھائیں گی۔ آپ مجھے کسی دارالامان میں داخل کیوں نہیں کرا دیتیں۔ وہاں تو لڑکیوں کو پورا پورا تحفظ ملتا ہے۔ اگر روپے پیسے کا سوال ہے تو میرے پاس تھوڑی نقد رقم اور چند زیورات موجود ہیں۔ جنہیں بیچ کر میرے اخراجات پورے کیے جا سکتے ہیں۔" سلوطہ یوں بولی جیسے اس زندگی سے عاجز آگئی ہو جو وہ گزار رہی تھی۔

"نہیں بھئی، خواہ تمہارے پاس لاکھوں کی رقم اور زیورات کیوں نہ ہوں۔ میں تمہارے وارثوں کے ہوتے ہوئے کوئی ایسا کام کرنا نہیں چاہتی جس سے بعد میں میری گردن ناپی جائے۔" فلورا بکس کے ڈھکنے پر ہاتھ ٹیک کر اٹھتی ہوئی قدرے بیزاری سے بولی۔

"لیکن میں نے تو پہلے بھی کتنی بار آپ سے کہا ہے کہ میں کسی کو بھی اپنا وارث نہیں سمجھتی۔ میں بالغ اور خود مختار ہوں اپنی مرضی سے جو چاہوں کر سکتی ہوں۔ پھر آپ سے بھلا کون جواب طلب کر سکتا ہے۔" سلوطہ قدرے چیخ کر بولی۔

"تم خود کو خواہ۔۔۔ کچھ بھی کہو اور سمجھو۔ لیکن وارث تو وارث ہوتا ہے اور تمہارا وارث تو اونچے طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے مقابلے میں کہاں بے چاری ایک معمولی سی نرس۔ دیکھو بچی! سچی بات تو یہ ہے کہ میں اب زیادہ عرصے تمہاری حفاظت کا ذمہ نہیں لے سکتی۔ اور تمہارے بارے میں ابھی اچھی طرح جانتی ہوں کہ تم ان لڑکیوں میں سے نہیں ہو۔ جو آزاد اور خود مختار رہتے ہی پر پرزے نکال لیتی ہیں اور مردوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتی ہیں۔ میں اب بھی تم سے کہتی ہوں کہ تم اپنے بھائی کے پاس چلی جاؤ۔ کیونکہ اسی میں تمہاری عزت اور بہتری ہے۔ آخر میں بھی کب تک تمہاری حفاظت کر سکوں گی۔ جب کہ میں تو خود اپنی حفاظت کرنے کے قابل نہیں ہوں۔" فلورا کی باتوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اب وہ زیادہ دیر پناہ اور تحفظ دینے کی روادار نہیں ہے۔ یوں بھی ہمیشہ کی طرح آج اس کے اٹھتے ہی اسے ناشتا کرنے کے لیے بھی نہیں کہا تھا۔ اس پر اتنے صاف اور واضح الفاظ میں اپنے گھر سے چلے جانے کو بھی کہہ رہی تھی۔ اس کے باوجود سلوطہ نے جھجک کر کہا۔

"نہیں نہیں آنٹی! میں یوں ہرگز کبھی بھائی جان کے پاس نہیں جاؤں گی۔ آپ کو معلوم نہیں آنٹی! کہ بچپن سے لے کر اب تک میں سب کے سامنے جھکتی رہی ہوں۔ سب کے طعنے تشنے اور زیادتیاں سہتی رہی ہوں۔ مگر اب مجھ میں اتنی تاب نہیں۔ میں کو اب کچھ نہ کریں انہیں دکھانا چاہتی ہوں اور پھر میں نے ان کی محبت بھری درخواست کو کتنی حقارت سے ٹھکرایا ہے۔ اب میں ان کے پاس کیا شکل لے کر جاؤں گی۔"

"تعجب ہے۔ وہ تمہارے سگے بھائی ہیں کوئی غیر تو نہیں۔ جو تم ان کے بارے میں اتنی غلط باتیں سوچ رہی ہو۔ اسے وہ تو تمہیں دیکھ کر الٹا خوش ہو جائیں گے۔" فلورا نے کہا۔

"نہیں، آپ ان لوگوں کو نہیں جانتیں۔ وہ میرے لیے غیروں سے بھی بدتر ہیں۔ خیر آپ فکر نہ کریں۔ میں خود ہی اپنے لیے کوئی دوسرا بندوبست کر لوں گی۔ یوں بھی آخر مجھے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہو گا۔ کوئی ساری عمر آپ کے اوپر بوجھ بن کر تو نہیں رہ سکتی۔" سلوطہ اس کی باتوں پر رنجیدہ ہو کر بولی۔

"تمہیں بندوبست کیسا۔ میں تو تمہیں گھر سے نکلنے کی اجازت بھی نہیں دوں گی۔ آخر میں نے تمہاری ذمہ داری لی ہے۔ یہ کوئی معمولی بات تو نہیں۔" فلورا ایک دم ہی بگڑ کر بولی۔ پھر قدرے توقف کے بعد اس نے قدرے نرم پڑ کر کہا۔

"دیکھو بیٹی، اگر تم خود چل کر جانا اپنے وقار کے خلاف سمجھتی ہو تو میں چلی جاؤں گی۔ تمہارے بھائی جان کے پاس، کچھ ایسا ظاہر کر کے کہ میری آمد سے تم لاعلم ہو۔ پھر میں اپنی طرف سے انہیں سمجھاؤں گی کہ وہ کسی طرح خود آ کر تمہیں لے جائیں۔ ورنہ تمہاری بھابی کو بھیج دیں۔ پھر تو تمہیں ان کے ساتھ جانے میں کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔" فلورا نے آخری فقرے کو سوال کی شکل دے دی تو سلوطہ کچھ دیر سوچنے کے بعد آہستہ سے بولی۔

"ٹھیک ہے، آپ یہ کوشش بھی کر کے دیکھ لیں۔" کہنے کا مقصد جو بھی تھا فلورا نے اس پر غور کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی بلکہ اس جواب کو بہت کافی سمجھا۔

"اچھا اب منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کر لو۔ بلکہ بہتر ہوتا کہ نہا دھو کر کوئی اچھا سا لباس پہن لیتیں لیکن یہاں تو روز ہی پانی کی قلت رہتی ہے۔ خیر بلا نہائے ہی بدل لو۔ اصل میں آج چونکہ میں چھٹی پر ہوں اس لیے میں نے سوچا کہ آج ہی تمہارے بھائی جان کے پاس ہو آؤں۔ یوں بھی آج کا کام کل پر ڈالنے کی

عادت نہیں ہے مجھے۔" فلورا نے کہا۔

"لیکن کیا آپ کو بھائی جان کا پتا معلوم ہے؟" سلوط نے پوچھا۔

"ظاہر ہے وہ تمہاری بھابی کے بھائی کے یہاں ٹھہرے ہوں گے۔ اور وہ پتا تو خود تم نے مجھے بتا رکھا ہے۔" فلورا نے جواب میں کہا تو سلوط چپ چاپ منہ دھونے چلی گئی۔

فلورا کے کہنے کے باوجود اگر سلوط کے کپڑے میلے اور مسلے ہوئے نہ ہوتے تو وہ کبھی لباس تبدیل نہیں کرتی۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ فلورا نے اس لیے اسے لباس تبدیل کرنے کی تاکید کی ہے کہ اس کے خیال میں اگر کوئی اسے لینے آیا تو اسے عین وقت کے وقت کپڑے تبدیل کرنے نہ پڑیں۔ جبکہ دل ہی دل میں وہ فلورا کی اس خوش فہمی پر ہنس رہی تھی کہ وہ اس کے بھائی بھاوج کو اپنے گھر لانے میں کامیاب ہو جائے گی۔

منہ ہاتھ دھونے کے بعد لباس تبدیل کر کے وہ باورچی خانے میں آئی تو دوپہر کا کھانا تیار رکھا۔ گو فلورا کا معمول تھا کہ وہ ناشتے کے ساتھ ہی دوپہر کا کھانا تیار کر لیتی تھی۔ کیونکہ وہ دوپہر کا کھانا اپنے ساتھ کلینک لے کر جایا کرتی تھی۔ مگر اس روز سلوط نے یہی سمجھا کہ اس نے یہ کھانا پکا کر گویا پہلے سے ہی اس کے بھائی کے پاس جانے کی تیاری کر رکھی ہے۔

بہر حال اپنے لیے چائے دم کی۔ کیتلی سے دو پاپے نکال کر ان سے ناشتہ کیا اور پیالی کیتلی دھو کر باہر آ گئی۔ تبھی دروازے پر ہلکی ہلکی سی کٹ کٹ کی آواز آئی تو فلورا نے جو اسی چٹائی پر بیٹھی اپنی چوٹی گوندھ رہی تھی۔ اس نے سلوط سے کہا۔

"ارے ذرا دیکھنا تو مونا۔ کہیں وہ وارڈ بوائے عظمت میری خیریت معلوم کرنے نہ آیا ہو۔ بے چارا بچہ میرا بڑا خیال رکھتا ہے۔" تو سلوط نے دروازے تک جانے میں تھوڑا سا تامل کیا کیونکہ فلورا نے اس کو سختی سے ممانعت کر رکھی تھی کہ وہ کسی کے لیے بھی دروازہ نہ کھولے۔ اسی وجہ سے وہ دروازہ کھولتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔ تبھی فلورا کو احساس ہوا تو اٹھتی ہوئی بولی۔

"نہیں، تم ٹھہرو میں دیکھتی ہوں کہ کون آیا ہے؟" اور پھر اس نے "کون ہے" کہتے ہوئے دروازہ کھولا تو دروازے پر ایک سوٹڈ بوٹڈ اور بہت ہی پر وقار شخص کو کھڑا دیکھ کر تھوڑا سا پیچھے ہٹ گئی۔ کہ یوں بھی دروازہ کھولتے ہی کسی قیمتی خوشبو کا ایک جھونکا اس کی ناک میں گھس آیا تھا۔

"کیا مسز فلورا یہیں رہتی ہیں؟" آنے والے نے پوچھا۔

"جی۔ جی ہاں۔"

"اوہ، تو میں ٹھیک جگہ ہی پہنچا ہوں۔" آنے والے نے کہا۔

"لیکن آپ کون ہیں اور کیوں آئے ہیں؟" فلورا نے قدرے درشت لہجے میں پوچھا۔

"میں شعیب منصور ہوں، سلوط کا ماموں اور ان سے ملنے آیا ہوں۔" شعیب منصور نے کہا۔ سلوط ابھی تک دروازے کے قریب ہی کھڑی تھی۔ شعیب منصور کی آواز سنی کہ اس کی رنگت پھیکی سی پڑ گئی تھی۔ فلورا نے تصدیق کرنے کی غرض سے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا اور اسے اضطراری سی کیفیت میں انگلیاں مروڑتے دیکھ کر اس نے نہایت خلیق لہجے میں شعیب منصور سے کہا۔

"اوہ، آپ سلوط کے ماموں ہیں۔ اندر تشریف لے آئیے۔ اصل میں آج کل کچھ واقعات ایسے ہو رہے ہیں کہ بلا پوچھے اور معلوم کیے، کسی کو اندر نہیں بلایا جا سکتا۔"

"جی ہاں، درست کیا آپ نے۔ احتیاط تو بہر حال اچھی چیز ہے۔" شعیب منصور نے اندر آتے ہوئے کہا۔ ان کو اندر آتا دیکھ کر سلوط اتنی گھبرائی کہ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کمرے سے باہر نکل جائے یا وہیں کھڑی رہے۔ ادھر شعیب منصور سیدھے اس کی طرف ہی بڑھ آئے۔

"آہا سلوط، کہو کیسی ہو بیٹیا۔ ہم تو تمہاری صورت کو ہی ترس گئے تھے۔ جونہی سنا کہ تم مل گئی ہو بس اپنی بہن اور میں بھاگتا تم سے ملنے چلے آئے۔" انہوں نے اس کے نزدیک آ کر اس کے تھوڑے تھوڑے جھکتے ہوئے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ بس اتنا کہنا تھا کہ نہ سلام نہ دعا۔ وہ ان کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔ اس کے اس طرح رونے پر شعیب منصور کا بھی دل بھر آیا۔ ان کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے۔ لیکن بڑی سختی سے خود پر قابو پا کر اپنی آواز کو شگفتہ بنا کر آہستہ سے اس کے سر کو بھینچ کر اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

"ارے ارے یہ اتنا رونا دھونا۔ اگر یہ خوشی کے آنسو بھی ہیں مائی سویٹ گرل۔ تو بھی اپنے اشکوں کی اس طغیانی میں ہمیں نہ بہا دینا۔ دیکھو بھئی، ہم تو نشو رڈ بھی نہیں ہیں۔ اور پھر کئی جانوں کے کفیل بھی ہیں۔" اور ان کی اس بات پر آبدیدہ سی فلورا ہنسنے لگی۔ لیکن سلوط کی گریہ و زاری میں مزید اضافہ ہو گیا۔ شعیب منصور کچھ پریشان ہو گئے۔

"دیکھو بھئی، رونا تو ہمیں چاہیے تھا کہ ہماری وجہ سے تمہیں بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ارے قصوروار تو تمہارے ہم ہیں بیٹی، پھر تم اتنا رو دھو کر ہماری شرمندگی میں اضافہ کیوں کر رہی ہو۔" شعیب منصور نے گلوگیر آواز میں کہا تو سلوط اپنے آنسو پونچھتی ہوئی ان سے علیحدہ ہو کر کھڑی ہو گئی۔ "نہیں ماموں جان، یہ تو خوشی کے آنسو ہیں۔ یوں بھی آپ سے تو مجھے کوئی شکایت نہیں۔" اتنا کہہ کر وہ پھر رونے لگی۔

"اتنا مت رو مونا بیٹی۔ دیکھو تمہارے ماموں تمہارے رونے کی وجہ سے کتنے پریشان ہو رہے ہیں۔ انہیں بٹھاؤ، ان کی خاطر کرو۔" فلورا اس کے قریب آ کر آہستہ سے بولی۔ اور پھر اس نے شعیب منصور سے کہا۔

"جب سے آئے ہیں کھڑے ہی ہیں۔ آپ تشریف تو رکھیں مگر میرے پاس آپ کے شایان شان بیٹھنے کے لیے کوئی چیز نہیں ہے پھر بھی۔"

"ارے نہیں مسز، آپ کہاں مجھے کانٹوں میں گھسیٹنے لگیں۔ میں تو خود ایک ذرہ حقیر ہوں۔ اس وقت جلدی میں ہوں۔ ورنہ بیٹھ جاتا۔" شعیب منصور حد درجے انکساری سے کام لے کر بولے۔ اور پھر انہوں نے سلوط سے کہا۔

"اب اپنے آنسو پونچھ لو بیٹی اور جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ میں تمہیں لینے آیا ہوں۔ کیوں مسز، اگر میں انہیں اپنے ساتھ لے جاؤں تو آپ کو اعتراض تو نہ ہوگا۔" انہوں نے اس سے بات کرتے کرتے فلورا کو مخاطب کر کے پوچھا تو وہ نہایت خندہ پیشانی سے بولی۔

"نہیں نہیں، مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ سر، آپ ان کے ماموں ہیں اور میں ایک ادنیٰ سی خدمت گزار۔ آپ انہیں شوق سے لے جائیں۔" لیکن سلوط کو تو کسی قیمت پر بھی گوارا نہ تھا کہ وہ پھر پلٹ کر ان کے یہاں جائے۔ وہ تو ان کے گھر میں قدم رکھنے کی روادار نہیں تھی۔ تھوڑا سا پیچھے ہٹ کر بولی۔

"نہیں ممی جان آنٹی۔ آئی ایم سوری، میں آپ کے یہاں نہیں جاؤں گی۔ جس گھر سے اتنی بے عزت کر کے نکالی گئی ہوں، اس گھر میں قدم رکھنا میری توہین اور گراوٹ کے سوا کچھ نہ ہوگا۔" شعیب منصور کو فلورا کے سامنے اس کا یہ کہنا ناگوار تو گزرا لیکن مصلحت کا تقاضا کچھ یہی تھا کہ حلم اور نرمی سے کام لیا جائے۔ وہ مسکرا کر بولے۔

"لیکن میرا ارادہ نہیں اس گھر میں لے جانے کا تو نہیں ہے بیٹیا۔ میں تو۔۔۔" اور فلورا نے جو اس کے انکار پر حیرت زدہ سی ہو رہی تھی، ان کی بات کاٹ کر کہا۔

"نہیں بھائی صاحب، اگر آپ اپنے گھر میں انہیں لے جانا چاہ رہے ہیں تو انہیں انکار نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اپنوں کے درمیان تو کبھی کبھی اس سے بھی کہیں بڑی بڑی باتیں ہو جاتی ہیں۔ اصل میں یہ مونا ابھی بہت نا تجربہ کار اور حساس ہے۔ اس نے اس معاملے کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا ہے۔ اسی لیے اس نے اپنے بھائی کو بھی دھتکار دیا ہے۔ یہ ان کے ساتھ بھی نہیں گئی۔ گو میں اسے آپ کے ساتھ بھیج کر رہوں گی۔"

"نہیں۔ آپ کے میرے اوپر بہت زیادہ احسانات ضرور ہیں لیکن آپ مجھے کسی بات کے لیے مجبور نہیں کر سکتیں آنٹی فلورا۔ آپ کو ایسا کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔" سلوط نے ساری مروت اور رواداری کو بالائے طاق رکھ کر سخت لہجے سے کہا۔

"اچھا اچھا بھئی، یہ مسز فلورا تو کیا میں بھی تمہیں کسی بات کے لیے مجبور نہیں کروں گا۔ لیکن بیٹی میں سچ کہہ رہا ہوں، کہ میں بھی تمہیں اپنے گھر لے جانے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ لیکن میں تمہیں اپنے ساتھ لے جائے بغیر نہ رہوں گا۔ آخر میری بھی تو کوئی حیثیت ہے، کوئی پوزیشن ہے اور میں بڑے مان اور دعوے سے تمہیں لینے آیا ہوں۔" اپنی بات کہتے کہتے

شعیب منصور جذب میں آ گئے۔

"دیکھو مونا، تمہارے بقول میں تم پر کوئی حق رکھتی ہوں نہ اختیار لیکن اپنی حد تک تمہاری ذمہ داری سے دستبردار ہونے کا حق تو مجھے ہے نا۔ اور یہ بات میں پہلے بھی تم کو بتا چکی ہوں۔ لہٰذا تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ تم آج ہی اپنے ماموں کے ساتھ چلی جاؤ۔" فلورا نے یہ کہہ کر گویا اسے اپنے گھر سے نکلنے کا حکم دے دیا۔

"ہاں بیٹی ضرور چلو۔ ہم تو خیر تمہارے لیے غیر ہی ہیں لیکن تمہارے اپنے والد اور والدہ تو موجود ہیں نا۔ اپنا گھر چھوڑ کر ان بیچاری پر اپنی ذمہ داری کا بار ڈالنا کوئی معقول بات تو نہیں۔ چلو اب جلدی سے تیار ہو جاؤ۔" شعیب منصور نے باتوں ہی باتوں میں اس پر بڑی گہری چوٹ کرتے ہوئے کہا۔ کم از کم اسے تو یہی لگا۔

مگر گویا مجبوری ہی مجبوری تھی۔ کہ اب ان کے ساتھ جانے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں رہا تھا۔ اس پر غصے میں فلورا کو ایک تیکھا سا جواب دے کر اس نے اس کے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا تھا۔ بلکہ اس کے بے لوث جذبے کو تہہ تیغ کر دیا تھا۔

اس نے فلورا سے آنکھ نہیں ملائی اور چپ چاپ جا کر پلنگ کے نیچے سے اپنا سوٹ کیس گھسیٹا۔ اپنے میلے کپڑے اخبار میں لپیٹ کر اس میں رکھے اور پھر سوٹ کیس اٹھا کر باہر نکل آئی۔ جبکہ شعیب منصور نے اس کے ہاتھ سے سوٹ کیس لینا بھی چاہا مگر وہ تیزی سے باہر نکل گئی تھی۔ باہر آ کر شعیب منصور نے گز بھر کے فاصلے پر کھڑی کار کی ڈکی کھولی اور اس کے ہاتھ سے سوٹ کیس لے کر ڈکی میں رکھ دیا۔ اور جب شعیب منصور نے فلورا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے خدا حافظ کہہ کر سلوط کے لیے کار کی اگلی نشست کا دروازہ کھولا تو اس نے بیٹھتے بیٹھتے پلٹ کر دروازے کی دہلیز پر کھڑی فلورا کی طرف دیکھا۔ اور بھاگ کر اس کے گلے لگ گئی۔

"آنٹی مجھے معاف کر دیجیے میں اپنے ہوش میں نہیں تھی۔ پلیز آنٹی، آپ میری باتوں کا کچھ خیال نہ کیجیے گا۔ کیونکہ آپ کے میرے اوپر اتنے احسانات ہیں کہ جن کا اتارنا تو بڑی بات، مجھے وہ الفاظ بھی نہیں مل رہے جن سے آپ کے ان احسانوں کا شکریہ ادا کر سکوں۔" وہ روتی ہوئی بولی تو فلورا جو خود بھی اس سے جدا ہونے کے خیال سے رو رہی تھی، اپنے آنسو پونچھ کر بولی۔

"ارے نہیں بیٹی، میں نے تو تمہیں اپنی بیٹی سمجھ کر اپنے پاس رکھا تھا۔ تمہیں تحفظ دیا تھا اور تم مجھ پر میرے احسانات جتا کر غیریت کی باتیں کر رہی ہو۔ میں نے تو تمہاری کسی بات کا بھی برا نہیں مانا کہ میں تمہاری ذہنی کیفیت سے واقف ہوں۔ اچھا خیر، جاؤ جہاں بھی رہو خوش و خرم اور سلامت رہو۔" پھر فلورا نے اس کی پیشانی چوم لی۔ اور خود دہلیز سے اتر کر اسے کار میں بٹھا دیا۔ اور ایک بار پھر شعیب منصور نے اسے خدا حافظ کہہ کر کار آگے بڑھائی اور سلوط کو لے کر روانہ ہو گئے۔

اس سمے ان کی کیفیت کسی فاتح کی سی تھی۔

اپنی اتنی زبردست کامیابی پر اتنے مسرور، اتنے سرشار تھے کہ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کار میں نہیں ہواؤں کے دوش پر اڑتے جا رہے ہوں۔ یوں بھی سلوط کا ان کی لاعلمی میں ان کے گھر سے چلے جانا کوئی معمولی بات تو نہ تھی۔ بڑی ذمہ داری کا معاملہ تھا۔

بلکہ دوسرے معنوں میں ان کی ناک کا معاملہ تھا۔

اور جس روز سے سلوط ان کے یہاں سے گئی تھی۔ انہوں نے ایک دن بھی چین کا نہ گزارا تھا۔ یہاں تک کہ بیٹے کے گھر چھوڑ کر چلے جانے کی بھی انہوں نے پروا نہیں کی تھی۔ بلکہ حقیقت جان لینے کے بعد بیٹے سے بھی وہ نالاں ہو گئے تھے اور اس کی اور بیوی کی ملی بھگت سمجھنے لگے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ زینت سے بھی ان کا رویہ اچھا نہ رہا تھا۔ اور اب ان کے لیے یہ کتنی خوشی اور سرخروئی کی بات تھی کہ وہ اسے منا کر لانے میں کامیاب ہوئے تھے۔ گویا پہل انہوں نے کی تھی۔ ان کا رخ شہر کی سمت تھا۔

سلوط ان راستوں سے بالکل واقف نہیں تھی۔

پھر انہوں نے خاصا فاصلہ طے کر کے ایک پُر رونق بازار میں مٹھائی کی دکان کے سامنے اپنی کار روکی۔ اور اس سے

"ابھی آتا ہوں" کہہ کر کار سے اتر کر وہ مٹھائی کی دکان میں چلے گئے۔ انہوں نے کاؤنٹر پر کھڑے ایک شخص سے کچھ کہہ کر وہیں رکھے فون سے کوئی نمبر ڈائل کیا اور تھوڑی دیر تک کسی سے باتیں کرتے رہے۔ پھر ریسیور رکھ کر باہر نکلے تو دکان کا ملازم ایک بہت بڑا مٹھائی کا ڈبہ اٹھائے ان کے پیچھے آتا نظر آیا۔ انہوں نے وہ ڈبہ ملازم سے پچھلی سیٹ پر رکھوایا اور کار میں بیٹھ کر پھر روانہ ہو گئے۔ انہوں نے ابھی تک ایک بات بھی نہیں کی تھی۔ ماسوائے "ابھی آتا ہوں" کہنے کے اور وہ اس سمے بڑی الجھن میں گرفتار تھی۔ اسے معلوم ہی نہ تھا کہ شعیب منصور اسے کہاں لے جا رہے ہیں۔ نہ اس نے کچھ پوچھا ہی تھا۔ وہ تو سیٹ کی پشت سے کمر لگائے، اپنی طرف کی کھڑکی سے باہر دیکھے جا رہی تھی۔ وہ مٹھائی پچھلی نشست پر رکھوا کر روانہ ہوئے تو کار چلاتے چلاتے اس پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر مسرور سے انداز میں بولے۔

"میں نے سوچا خوشی کا موقع ہے سب کا منہ میٹھا کرانا بھی ضروری ہوگا؟" وہ جواب میں بھلا کیا کہتی۔ ان پر ایک نظر ان پر ڈال کر رہ گئی۔ لیکن دل میں ان کے اتنے خوش ہونے پر متاثر ہوئے بغیر نہ رہی۔ یوں بھی اسے ان سے کوئی شکوہ تھا نہ پرخاش۔ کیونکہ بھائی کے عزیزوں میں صرف وہی ایک تو تھے۔ جن سے اسے کچھ دلی انسیت تھی اور یہی وجہ تھی کہ وہ ان کے ساتھ بھی آ گئی تھی۔ ورنہ تو اس کا دل سب سے اتنا کھٹا ہوا تھا کہ وہ اپنے بھائی کو بھی خاطر میں نہیں لائی تھی۔ شعیب منصور چاہتے تھے کہ وہ کچھ بات کرے تاکہ اس کے دل پر چھایا تکدر کچھ کم ہو سکے۔ وہ اس سے فلورا کے متعلق پوچھتے رہے کہ وہ کون ہے، کیسی ہے اور تم سے اس کی واقفیت کیونکر ہوئی؟؟ اور وہ نپے تلے انداز میں انہیں فلورا کے متعلق بتاتی رہی۔ پھر کچھ دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ اور مزید کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد شعیب منصور اصل مقصد پر آتے ہوئے بولے۔ جس پر گفتگو کرنے کی غرض سے ہی اصل میں وہ کار کو بلا مقصد ہی ادھر ادھر سڑکوں پر گھما رہے تھے۔ ورنہ فرسیر ہال کا علاقہ اتنی دور تو نہیں تھا۔ آخر انہوں نے اس بات کی ابتدا کی۔

"دیکھو بیٹی، سب سے پہلے تو میں اپنی اور اسفند کی طرف سے تم سے معافی کا خواستگار ہوں کیونکہ تم نے میری وجہ سے ہی سب سے زیادہ مصیبتیں اٹھائی ہیں۔ رہا اسفند کا سوال تو بعد میں آتا ہے کیونکہ اسفند کا قصور صرف اتنا تھا کہ اسے تمہارے بارے میں بہت غلط انداز میں بتایا گیا تھا۔ اور اس نے تم سے غلط رویہ اختیار کیا۔ بیٹی، تم ذرا اس معاملے کو اپنے اوپر رکھ کر سوچو۔ اگر تم کسی کی ذات میں اتنی دلچسپی لیتیں کہ اسے اپنی موت و زیست کا مسئلہ بنا لیتیں اور پھر ایک دن تم کو معلوم ہوتا کہ وہ تو پہلے سے شادی شدہ ہے، دو بچوں کا باپ ہے۔ تو تمہارے بارے میں میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ سننے کے بعد تمہارا کیا ری ایکشن ہوتا یا تمہارے دل پر کیا گزرتی۔ لیکن اسفند چونکہ مرد ہے اس کے بارے میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کے دل پر یہ انکشاف قیامت بن کر ٹوٹا ہوگا۔ اس لیے وہ اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکا تھا۔" اتنی بات کہہ کر انہوں نے اس پر ایک نظر ڈالی۔ وہ سیٹ سے پشت لگائے چہرہ تھوڑا سا جھکائے بلا کوئی تاثر دیے گود میں رکھے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ شعیب منصور سمجھ گئے کہ صفائی کے لیے اتنے سے الفاظ آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں۔ جبکہ وہاں تو ایک ذخیرۂ الفاظ بھی اس کے دل پر پڑی نفرت اور تکدر کو نہیں چھانٹ سکتا تھا۔ لہٰذا انہیں بڑے تدبر اور حکمت عملی سے کام لینا ہوگا۔ انہوں نے پھر کہا۔

"میں مانتا ہوں اس کی بدسلوکی کی وجہ سے تمہیں گھر سے بے گھر ہونا پڑا۔ اور بڑے مصائب برداشت کرنے پڑے۔ مجھے معلوم ہے کہ ایک شریف اور پارسا لڑکی کو اپنی عزت اور آبرو جان سے زیادہ پیاری ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے تمہاری عزت اور آبرو بھی خطرے میں پڑ گئی تھی۔ لیکن بیٹی، اس نے بھی تم پر ظلم کر کے خود کو سزا دے لی ہے۔ وہ بھی تمہارے جانے کے اگلے روز بلا کسی کو بتائے گھر سے نکل گیا تھا۔ اس نے اپنی اچھی ملازمت تمہارے ہی غم میں چھوڑ دی تھی اور پورے ڈیڑھ ماہ تک تمہاری تلاش میں جانے کہاں کہاں کی خاک چھانتا پھرا تھا۔ دیکھو غلطی تو بڑے بڑے نبیوں اور اولیاؤں سے ہو جاتی ہے۔ وہ تو پھر ان کے پیروں کی خاک ہے، ایک معمولی سا شخص۔" تب وہ جو ان کے اسفند کی حمایت کرنے کو برداشت نہ کر سکی تھی بڑے تلخ و ترش لہجے میں بولی۔

"ہونہہ۔ آپ ان کی تکلیفوں کا، جو کچھ میں نے بھگتا ہے اس سے مقابلہ کر رہے ہیں منجھلے ابا۔ شاید آپ یہ بھول گئے کہ وہ مرد ہیں اور میں ایک کمزور سی عورت۔ بڑا فرق ہے میری اور ان کی تکلیفوں میں۔ اور پھر میں

نے تو کسی سے کسی بات کا کبھی شکوہ نہیں کیا۔ کیونکہ میرے نزدیک شکوے شکایت کی کوئی بات نہیں۔ جو کچھ میرے مقدر میں تھا، وہی ہوا ہے۔"

"ہاں۔ مگر ہر بات کا دارومدار مقدر پر ہی نہیں ہوتا۔ کچھ باتیں یا معاملے انسان کے اپنے اختیارات کے دائرے میں بھی شامل ہوتے ہیں۔ ورنہ پھر انسان سے یہ نہ کہا جاتا کہ نیکی یا بدی وہ جو چاہے اختیار کرے۔ بلکہ یا تو معض بدی ہی رہ جاتی یا صرف نیکی۔ میرا مطلب ہے بہت سی باتیں انسان کے اپنے اختیار میں بھی ہوتی ہیں۔ اور ان سے ہٹ کر جو ہوتی ہیں انہیں اتفاقات یا مقدر پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ اور تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا محض اتفاقات کی بنیاد پر ہوا۔ اور ان اتفاقات کے رونما ہونے میں ہماری کوتاہیوں اور زیادتیوں کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔" شعیب منصور نے اپنا کوئی فلسفہ جھاڑا تو اس نے بیزار ہو کر دل میں سوچا۔ "اف، یہ منجھلے آکا جانے کیوں اتفاقات اتفاقات کی رٹ لگائے ہوئے ہیں۔ جبکہ جو کچھ مجھ پر گزر چکی ہے اس کا مداوا ہو سکتا ہے نہ ازالہ۔ گویا ان کی کوئی بات کوئی دلیل اس کو متاثر نہیں کر سکی تھی۔ انہوں نے بھی اس کی خاموشی اور بے نیازانہ سے انداز سے اخذ کر لیا تھا کہ وہ ان کی کسی بات پر بھی کان نہیں دھر رہی۔ چنانچہ انہوں نے پھر موضوع ہی بدل دیا۔

"بہرحال۔ آج میں بہت خوش ہوں۔ کیونکہ آج کا دن میری نصرت اور کامیابی کا دن ہے۔ آج نہایت غیر متوقع طور پر میرا بیٹا مجھے مل گیا۔ ادھر تم بھی مل گئیں۔ آج کا دن میرے لیے بہت مبارک ہے۔ کم از کم اب میں ثاقب حسن کے سامنے سرخروئی سے تو جا سکوں گا۔" شعیب منصور کا اپنی ایک شخصیت ایک وقار تھا۔ وہ نہایت بردبار اور سنجیدہ مزاج بھی تھے۔ کم از کم اپنے چھوٹوں کے لیے تو بہت بارعب تھے۔ اور اس وقت سلوط سے انہوں نے جتنی باتیں بھی کیں، اسفند کی درخواست پر کی تھیں۔ اس نے ہوٹل پہنچ کر باپ سے دبے لفظوں میں کہا تھا۔

"ڈیڈی! سلوط مجھ سے خفا ہی نہیں متنفر بھی ہو گئی ہیں۔ ڈیڈی پلیز! میری طرف سے ان کے دل میں پھر آکر رنگ لانے کی کوشش ضرور کیجیے گا۔ کیونکہ میری کوشش کے نتیجے میں تو یہی ہوا تھا کہ انہوں نے ہوسٹل ہی چھوڑ دیا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ مجھ سے پہلے سے بھی انکار کر دیا تھا مگر آپ کی بات اور ہو گی۔" اور شعیب منصور نے جواب میں کہا تھا۔

"ڈونٹ وری مائی سن، آئی ول ٹرائی مائی بیسٹ۔ (تم فکر نہ کرو میرے بیٹے، میں اپنے طور پر پوری کوشش کروں گا۔)"

وہ روشن خیال اور ایڈوانس تھے۔ اور اولاد کے بارے میں ان کا نظریہ یہ تھا کہ اس پر رعب گانٹھ کر اور سختی کر کے نہیں، دوستانہ طریقے سے پیش آنا چاہیے۔ ورنہ سختی کرنے سے اولاد باغی اور اجنبی ہو جاتی ہے۔ ورنہ باپ کے اور اس کے درمیان عزت کی ایک دیوار سی حائل ہو جاتی ہے۔

مگر انہوں نے کچھ تو بیٹے کی خوشی کی خاطر اس سے اتنی باتیں کی تھیں اور کچھ بہن کا گھر سلامت رکھنے کی غرض سے کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ جب سلوط عرصے بعد ثاقب حسن سے ملے گی اور اسے اس حقیقت کا علم ہو گا کہ وہ ثاقب کی اپنی بیٹی ہے تو ثاقب حسن کے لیے اس کے تاثرات اور جذبات دوسرے ہی ہو جائیں گے۔ عین ممکن ہے وہ باپ کے ساتھ مل کر ہم سب کی زیادتیوں کا بدلہ نا خرہ سے نہ یا نہیں لے تو بھی نا خرہ کو ہم سب چھڑوا دیں گے۔

بہرحال پھر انہوں نے کوئی بات نہیں کی۔ یوں بھی ہوٹل نزدیک آ گیا تھا۔ انہوں نے کار باہر فٹ پاتھ کے کنارے پارکنگ پلیس میں کھڑی کی اور اسے لے کر اندر آئے تو اسفند انہیں سامنے ہی کھڑا نظر آیا۔ جسے دیکھ کر اس نے نفرت سے منہ موڑ لیا۔ اور جہاں تک ان کے ساتھ آئی تھی، وہیں ٹھٹک گئی۔ مگر شعیب منصور اس کے قریب جا کر بولے۔

"شاباش بیٹے! تم ٹھیک وقت پر یہاں پہنچے۔ ورنہ مجھے تو ان دونوں کے کمرے کا نمبر تک معلوم نہیں تھا۔" پھر انہوں نے مڑ کر پیچھے دیکھا اور سلوط کو کچھ فاصلے پر کھڑا دیکھ کر انہوں نے اس سے کہا۔

"آؤ چلو بیٹی! آج تم نے یہاں تک مل کر مجھے ایک سرپرائز دیا ہے اور اب میں تم کو ایک زبردست سرپرائز دوں گا۔" وہ بچوں کی طرح خوش نظر آ رہے تھے۔

پھر وہ اسے اپنے ساتھ لے کر ثاقب حسن کے کمرے میں پہنچے تو سلوط کو جوان کے پیچھے تھی ان کے سامنے کر کے بولے۔

"ذرا دیکھیے تو ثاقب میاں! کون آیا ہے؟" اور ثاقب حسن جوان کو اور اسفند کو اندر آتا دیکھ کر منہ پھلا کر اور لیپ اٹھا کر ان کر بیٹھ گئے تھے۔ جیسے انہیں آتے دیکھا ہی نہ ہو۔ انہوں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور سلوط کو آنکھوں کے سامنے کھڑا دیکھ کر گھڑی بھر کو تو ان کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ مگر پھر جلدی سے اٹھے اور اپنے دونوں ہاتھ وا کر دیے۔ سلوط بھی بھاگ کر ان سے لپٹ گئی۔ کچھ دیر تک دونوں آنسو بہاتے رہے اور فاخرہ بھی رونے میں ان کا ساتھ دیتی رہیں۔ ماحول کچھ اتنا افسردہ اور اثر انگیز ہو گیا تھا کہ شعیب منصور پر بھی اثر انداز ہونے لگا۔ اور وہ کچھ کہنے والے ہی تھے کہ تبھی آگئے پیچھے سہیل منصور اپنی فیملی کے ساتھ اندر ان کے پیچھے خود ان کی دونوں چھوٹی بیٹیاں اور بیوی اندر داخل ہوئیں۔ تو شعیب منصور بیوی کو دیکھ کر کھل ہی اٹھے۔ ماحول سارا بدل ہی گیا تھا۔

ہنسی قہقہے، مبارکباد۔ اور شادمانی گویا خوشیوں کے سارے رنگ۔ مگر سلوط اسفند کی موجودگی کی وجہ سے بہت چپ چپ سی تھی۔ یوں بھی اسے یہاں آنے سے پہلے بالکل توقع نہیں تھی کہ ثاقب حسن اتنی آسانی سے اسے معاف کر دیں گے۔ مگر اسے کیا معلوم تھا کہ اولاد کی محبت کیا ہوتی ہے۔ وہ بھی اکلوتی اولاد کی۔ ایسی اولاد کی جسے تمام عمر انہوں نے عقیدت اور بے توجہی کی مار دی تھی۔ اور ایک بوڑھے شخص سے اس کی شادی کر کے اس کی زندگی برباد کر دی تھی۔

اسے کیا معلوم تھا کہ وہ رنج و پچھتاوے کی آگ میں کس بری طرح جل رہے ہیں۔

اور اب وہ آئی ہے تو اسے ہاتھ سے کیسے کھو سکتے ہیں۔

اس لیے انہوں نے اس کے اتنے گستاخانہ رویے کے باوجود اسے سینے سے لگا لیا ہے۔

پھر ثاقب حسن نے خود ہی سب کے سامنے یہ چونکا دینے والا انکشاف کیا کہ سلوط ان کی بہن نہیں بلکہ بیٹی ہے۔ سلوط تو اس انکشاف پر اتنی مسرور ہوئی کہ باپ سے لپٹ گئی کہ اس کی زبان تو ابھی کہنے کو ترستی تھی۔ بڑی دیر تک تو اس بات پر بھی مبارک سلامت ہوتی رہی۔ سب کو ان کے ہوٹل میں ٹھہرنے پر اعتراض تھا۔ اس لیے سب کی متفقہ رائے سے طے یہ پایا کہ وہ سہیل منصور کے ہاں منتقل ہو جائیں گے۔ لہٰذا اگلے روز ہی وہ ہوٹل کی رہائش چھوڑ کر سہیل منصور کے یہاں آ گئے۔

وقت گزرتے دیر نہیں لگتی۔ ثاقب کو سہیل منصور کے یہاں آئے بیس بائیس روز ہو گئے تھے۔ ان کے لیے کسی معقول اور ڈھنگ کے مکان کی تلاش بھی برابر جاری تھی۔ ادھر وہ سلوط کا جہیز بھی۔ انہیں اسفند سے کیا وعدہ بھی اچھی طرح یاد تھا۔

لیکن وہ اتنے جلد بیٹی کو خود سے جدا کرنا نہیں چاہتے تھے۔

اس لیے خاموش تھے کہ اب تو یہ عالم تھا کہ سلوط کو دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔

ادھر زینت بھی کئی بار اسفند سے کہہ چکی تھیں کہ اگر وہ کہے تو وہ سلوط پر اس کا پیغام دے دیں۔ لیکن وہ یہ کہہ کر انہیں ٹال دیتا تھا کہ ابھی ایسی کیا جلدی ہے۔

اصل میں تو چونکہ سلوط اس سے خفا تھی بلکہ سخت بدظن تھی۔ اس لیے وہ ڈرتا تھا کہ کہیں وہ اس کے پرپوز کرنے پر انکار ہی نہ کر دے۔ اسی وجہ سے وہ سلوط سے مل کر پہلے اسے منانا چاہتا تھا اور کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھا کہ تنہائی میں اس سے بات ہو سکے۔ کوثر ایک طرح اس کی رازداں تھی اور اس کی طرف سے سلوط کا دل صاف کرنے میں کوشاں رہتی تھی۔ اسی سے اسفند نے کہہ دیا تھا کہ کبھی ایسا اتفاق ہو کہ کوئی گھر میں موجود نہ ہو تو مجھے فون پر اطلاع دے دینا۔ آخر ایک روز جب ثاقب حسن ایک مکان دیکھنے گئے ہوئے تھے۔ سہیل اپنے آفس اور نازش اور فاخرہ شاپنگ کے لیے گئی ہوئی تھیں۔ کوثر نے موقع دیکھ کر اسے مطلع کر دیا۔

اس لمحے سلوط اپنے کمرے میں بیٹھی لیٹے نئے دوپٹے کے آنچل ترپ رہی تھی جب اسفند نے کمرے میں قدم رکھا۔ فرش پر قالین بچھا ہونے کی وجہ سے سلوط کو اس کی آمد کا پتا ہی نہ چلا۔ وہ سر جھکائے اپنا کام کرتی رہی۔

"سلو کیا ہو رہا ہے؟" اسفند نے ایک دم ہی قریب آ کر کہا تو وہ ڈر کر اس بری طرح چونکی کہ سوئی کی نوک اس کی انگلی میں چبھ گئی۔

"آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟" اس نے بڑے سخت لہجے میں تیوری چڑھا کر کہا۔

"آپ سے معافی مانگنے اور آپ کو منانے۔" اسفند مسکرا کر بولا۔ وہ ہلکے نیلے رنگ کی ٹی شرٹ اور سفید پینٹ پہنے

ہوئے تھا۔ حالانکہ بہت نچا رہی تھی مگر سلوطہ کو تو اس سے ایسی نفرت ہو گئی تھی۔ اس کی مسکراہٹ ہی کیا وہ خود مجسم اسے زہر لگتا۔

"کس بات کی معافی مانگ رہے ہیں آپ نے جو کچھ میرے ساتھ کیا ٹھیک ہی کیا۔ میں ایسے ہی سلوک کی مستحق تھی۔"

وہ ایک دم ہی بیڈ سے اتر کر کھڑی ہوتی ہوئی بولی

"اوہ نو۔ مستحق تو اصل میں، میں تھا، ہوں۔ آپ جتنا چاہیں مجھے برا بھلا کہہ لیں۔ لیکن خدارا اب تو اپنا غصہ تھوک دیں۔ میں ایک بار پھر اپنے کیے کی آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ واقعی مجھ سے بڑی زیادتی ہو گئی تھی۔ لیکن یقین جانیے میں نے جو کچھ کیا محض لاعلمی اور غصے میں کیا تھا۔" اسفند کے لہجے میں عاجزی سی آ گئی۔

"جب میں نے آپ سے کہہ دیا ہے کہ میرا آپ سے کوئی تعلق نہیں۔ تو پھر معافی کا سوال ہی کیسا۔ وضاحت اور صفائی کا کیا۔ آپ یہاں سے چلے جائیے یہی آپ کا مجھ پر احسان ہو گا۔" اس نے بڑے سخت اور تلخ لہجے میں کہا۔

"وضاحت اور صفائی اگر آپ کو نہیں پسند تو مجھے تو پسند ہے۔ اور میں اس وقت آپ کو منانے آیا ہوں تو منا کر ہی جاؤں گا۔ بس اب غصہ تھوک دیجیے۔ کیا آپ کے دل میں میری کوئی عزت نہیں رہی؟" وہ ہٹیلے انداز میں اپنے موقف پر ڈٹ کر بولا۔

"نہیں بالکل نہیں ذرا بھی نہیں ہے۔ دیکھیں آپ فوراً یہاں سے چلے جائیں۔ مجھے آپ سے سخت نفرت ہے۔ میں آپ کی شکل تک دیکھنے کی روادار نہیں ہوں بات کرنی تو کجا۔" اس نے خوبصورت آنکھوں سے قہر کی بجلیاں گراتے ہوئے کہا۔

اور اس کی یہ باتیں سن کر اسفند کو لگا جیسے اس نے بھرے بازار میں اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا ہو جس طرح وہ شروع سے بات کر رہی تھی۔ وہ بھی نہ معلوم کیسے برداشت کر رہا تھا۔ مگر اب معاملہ برداشت کی حد سے گزر چکا تھا۔

اور وہ تو یہاں اپنی مراد پانے آیا تھا۔ اپنی خوشیاں لوٹنے آیا تھا۔

یہ احساس اس کے لیے کتنا اطمینان بخش تھا کہ وہ مل گئی ہے اور اس کے قریب ہی آ گئی ہے اور پھر جو بہیا کی بلال مٹول پر اس نے سوچا تھا کہ گھر کا معاملہ ہے۔ میں اسے جلد ہی منا لوں گا اور یہ یقین بھی کہ پھر کیا اپنا وعدہ ضرور نبھائیں گے۔ اور وہ تو اس خوش فہمی میں اس وقت یہاں آیا تھا کہ سلوطہ پر اپنی تمام تر محبت نچھاور کر کے کسی نہ کسی طرح اسے منا ہی لے گا۔ لیکن اس نے نفرت کا اظہار کر کے اور سب سے بڑھ کر اس کی تحقیر کر کے بری طرح اسے دھتکار دیا تھا۔

بس وہ غصے کی ایک طوفانی سی لہر تھی جو نیچے سے اوپر اٹھی تھی۔ ایک کھولن تھی جس نے تن بدن میں آگ لگا دی۔ تھی، جس کے ریلے میں کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

وہ تیزی سے پلٹا اور آندھی کے کسی تیز جھونکے کی طرح کمرے سے باہر نکل گیا۔ اور سیدھا سہیل منصور کے کمرے ـــــ میں پہنچا۔ ان کے کیبنٹ کی دراز کھولی اور بھرا ہوا پستول باہر نکال لیا۔ جو سہیل منصور اپنی حفاظت کی غرض سے رات کو اپنے ساتھ رکھ کر سویا کرتے تھے۔ کوثر تو اسے فون کرنے کے بعد اپنے کمرے سے نکل کر یہ معلوم کرنے آئی تھی کہ وہ ابھی تک آیا بھی نہیں کہ اندر سے سلوطہ کے للکارنے کی آوازیں سن کر وہیں دیوار سے چپک کر کھڑی ہو گئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ آندھی اور طوفان کی طرح کمرے سے باہر نکلا اور سیدھا اس کے بابا کے کمرے کی طرف بڑھتا چلا گیا تو کسی انجانے سے خیال سے کوثر کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ بھاگ کر سہیل منصور کے کمرے میں پہنچی تو اسے بھرا ہوا پستول ہاتھ میں لیے دیکھا۔ جسے وہ کنپٹی پر لگا رہا تھا۔ اور بس کوثر صرف چیخ ہی سکی تھی۔

اور سلوطہ کے دل کو اس کی چیخ سے کچھ ایسا دھچکا لگا تھا کہ وہ دہل اٹھی تھی۔ وہ جس آگ بگولا سی کیفیت میں اس کے کمرے سے نکلا تھا۔ اس پر اندر ہی اندر وہ ہول کر رہ گئی تھی۔ اس پر حبیب کو ثر کے چیخنے کی آواز آئی۔

"نہیں نہیں بھائی جان خدا کے لیے نہیں۔" تو وہ درمیان ایک طرف پھینک کر بری طرح دھک دھک کرتے دل کے ساتھ ننگے پاؤں باہر بھاگی۔ کوثر کی آواز اب بھی اسے آ رہی تھی۔ اس نے بھاگ کر سامنے کمرے جھانک ڈالے۔ آخر سہیل منصور کے کمرے میں اسے کوثر اور اسفند نظر آ ہی گئے۔ اسفند پستول کی نال کنپٹی پر لگائے کھڑا تھا۔ اور کوثر اچک اچک کر اس کے ہاتھ سے چھیننا چاہ رہی تھی۔ یہ صورت حال بڑی خطرناک تھی۔ کیونکہ ٹریگر پر اگر ہلکا سا

بھی دباؤ کبھی پڑ جاتا تو اسی وقت گولی چل جاتی۔ لہٰذا وہ بھی بھاگ کر اسفند سے پستول چھیننے میں اس کی مدد کرنے لگی۔ کہ اس سے بیزار اور نفرت سہی لیکن اس کے دل کو اب بھی پیارا تھا۔

اس کی جان اسے اب بھی بہت عزیز تھی۔

مگر سلوطہ کو دیکھ کر تو گویا وہ آپے سے باہر ہی ہو گیا۔

کوثر کو پیچھے دھکیل کر اس نے اس کا ہاتھ بھی بڑی سختی سے جھٹک دیا اور نال کو کنپٹی سے لگا کر ٹریگر دبانا ہی چاہتا تھا کہ وہ بھاگ کر اس سے لپٹ گئی۔

"نہیں نہیں اسفند یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ پلیز اسفند! پہلے میری بات تو سنیے۔"

"نہیں نہیں۔ اب میں تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گا۔ تم تو مجھ سے نفرت کرتی ہو۔ جاؤ ہٹو۔ میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔ گیٹ لاسٹ ـــ گو۔" اس نے سلوطہ کو بھی پیچھے دھکیل دیا۔

"لیٹ می ڈائی (مجھے مرنے دو) میں اپنی توہین برداشت نہیں کر سکتا۔ تم نے میری توہین کی ہے۔ میرے سچے جذبے کو تہہ تیغ کر دیا ہے مغرور لڑکی تم نے میرے احساسات کو مجروح کر دیا ہے۔ اب مجھے مر ہی جانا چاہیے۔ مر ہی جانا چاہیے۔" اس نے پھر پستول کو کنپٹی سے لگاتے ہوئے کہا تو وہ پاگلوں کی طرح چیخی۔

"نہیں نہیں، میں نے آپ کی توہین نہیں کی۔ میں آپ سے نفرت نہیں کرتی۔ کر ہی کیسے سکتی ہوں بھلا۔ میں تو آپ سے صرف خفا تھی۔ ایمان سے میں نے یونہی غصے میں کہہ دیا تھا۔ سچ یاد بھی نہیں کہ کیا کہا تھا۔ اور آپ نے تو مجھے گھر سے نکالا تھا۔ بڑے بڑے الزامات لگائے تھے مجھ پر۔ آپ یہ کیوں بھول گئے۔ اس کی وجہ سے ہی سخت بدظن ہو گئی تھی آپ سے۔ مگر اب تو نہیں ہوں ـــ نہیں ہوں اسفند۔" بات کے اختتام پر وہ بے بسی سے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کر رو دینے لگی۔ تو اسفند نے مسکرا کر کوثر کی طرف دیکھا۔ اور کوثر نے منہ پھیر کر اپنی ہنسی چھپائی۔

"سچ؟ تم کہہ رہی ہو تو مان لیتا ہوں۔ مگر اب تو تم مجھ سے کبھی نہیں روٹھو گی؟" اس نے پستول کو اس کی جگہ رکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں ـــ کبھی نہیں اب تک جو زندگی گزاری ہے۔ اس میں زیادہ تر روتی ہی رہی ہوں۔ اب میں اپنے آنسو خشک کر لوں گی۔ اور آئندہ کبھی نہیں روٹھوں گی۔ کبھی نہیں۔" اس نے گریہ سے بوجھل بھاری اور مدھم آواز میں کہا۔ "اچھا" دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا۔ اور پھر اسفند نے اس کا آنچل اس کے سر پر ڈال دیا۔ اور کوثر ان کے ملن کی خوشی میں گلدان سے پھولوں کی پتیاں توڑ توڑ کر ان پر برسانے لگی۔

✿✿✿